www.Paksociety.com
خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ
خواتین ڈائجسٹ
www.Paksociety.com
Proudly Presented by Paksociety.com

کہنی سننی — مدیرہ — 14

کرن کرن روشنی — ادارہ — 15

ہمارے نام — نادرہ خاتون — 270

فقیر بن کر — انشاجی — 20

میری ڈائری سے — امت الصبور — 275

فرحت علی گوہر — شاہین رشید — 21

انٹرویو

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ — شاہین رشید — 25

ناول

محبت خواب سفر — رخسانہ نگار — 250

چراغ آخر شب — رفعت ناہید — 36

مکمل ناول

جو بھول رہ کی دھول تھے — عفت سحر — 74

پہلی کرن — سعدیہ عزیز — 124

قبول ہے — نایاب جیلانی — 156

ناولٹ

سفال گر — بشریٰ سعید — 200

تیرے تجربے — ردا فاطمہ — 232

افسانے

قافلے راہ بھول جاتے ہیں — ام سلیم — 67

آگہی — راشدہ رفعت — 60

کرائے دار — نعیمہ ناز — 118

کوئی حاصل نہ تھا — کومل صبا — 58

غزل — محشر بدایونی — 269

غزل — فاطمہ حسن — 270

نظم — کامی شاہ — 270

غزل — شمیم فاطمہ — 269

رنگا رنگ سلسلہ — شگفتہ جاہ — 271

خبریں ویریں — غزل نوشین — 286

روشن حرف — ایمان علی — 278

میری بیاض سے

آپ کی بیاض سے — خالدہ جیلانی — 276

پکوان

آپ کا باورچی خانہ — نصرت شاہین — 280

موسم کے پکوان — خالدہ جیلانی — 283

نفسیات

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں — عدنان — 288

بیوٹی بکس

بیوٹی بکس کے مشورے — امت الصبور — 290

فروری 2011
جلد 38 شمارہ 10
قیمت 40 روپے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)	500	روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ	4000	روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا	5000	روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام اشاعت: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: khawateendigest@hotmail.com , info@khawateendigest.com

خواتین ڈائجسٹ کا فروری کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

اسی مہینے میں ربیع الاول کا آغاز ہو رہا ہے۔ یہ وہ بابرکت مہینہ ہے جس میں محسن انسانیت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے۔ وہ آخری نبی جس کی آمد کی بشارت تمام انبیاء اور مرسلین دیتے رہے۔ اس سے پہلے ہر نبی ایک مخصوص قوم کے لیے مبعوث ہوتا تھا لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام عالم انسانیت کے لیے مبعوث کیے گئے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اخوت، محبت اور امن کا پیغام لے کر آئے تھے۔ مخلوق سے محبت اور رحم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات میں شامل تھا۔ سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اسلامی وحدت کا پیغام تھا کہ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ آپ نے باہمی محبت اور رواداری کا درس دیا۔ اسی صفت کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو رحمت اللعالمین کے خطاب سے نوازا۔

جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی تو اس وقت اہل عرب کفر و شرک کی تاریکیوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ہر طرف جہالت کا دور دورہ تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات نے ایک انقلاب بپا کر دیا۔ مختصر عرصہ میں اہل عرب کی کایا پلٹ گئی اور عرب کے پسماندہ ترین معاشرے سے وہ شخصیات ابھریں جنہوں نے اخلاق و کردار کی بے مثال داستانیں رقم کیں اور پوری دنیا پر حکومت قائم کی۔

آج ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کی خوشیاں مناتے ہیں۔ گھر گھر میلاد کی محفلیں منعقد ہوتی ہیں۔ سڑکوں، چوراہوں پر چراغاں کیا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و عظمت ہمارے دلوں میں اس قدر راسخ ہے کہ ہم آپ کی شان میں ادنیٰ سی بات بھی گوارا نہیں کر سکتے۔ ہم آپ کی تعلیمات پر بھی اسی جوش و جذبے سے عمل کریں تو اس زبوں حالی سے نکل کر علم و ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکتے ہیں۔ لسانی، مذہبی اور علاقائی تعصبات میں الجھائے رکھنا ان لوگوں کی سازش ہے جو پاکستان کی سلامتی کے دشمن ہیں۔ ہم صرف اپنے اتحاد اور یکجہتی سے ہی اس سازش کو ناکام بنا سکتے ہیں۔

اس شمارے میں،

- عفت سحر طاہر کا مکمل ناول "جو بھول راہ کی دھول تھے"،
- سعدیہ عزیز آفریدی کا مکمل ناول "قبول ہے"،
- نایاب جیلانی کا مکمل ناول "محبت سورج کی پہلی کرن"،
- رفعت ناہید سجاد اور رخسانہ نگار کے سلسلے وار ناول،
- بشریٰ سعید اور ردا فاطمہ کے ناولٹ،
- نعیمہ ناز، راشدہ رفعت، ام مریم اور کومل صبا کے افسانے،
- دانتوں کے امراض کے ماہر مرزا حامد بیگ سے ملاقات،
- ایف ایم 101 کے آر جے فرحت علی گوہر سے باتیں،
- باتیں کتابوں کی۔ نئی کتابوں پر تبصرہ،
- کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور دیگر دلچسپیاں شامل ہیں۔

خواتین ڈائجسٹ پڑھ کر ہمیں خط لکھنا نہ بھولیے گا۔ آپ کی رائے کے منتظر ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے۔ اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

مشتبہ کام

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"قتل و غارت (اور فتنوں کے ایام) کے دوران میں عبادت کرنا ایسے ہے جیسے میری طرف ہجرت کرنا۔"

فوائد و مسائل :

1۔ فتنہ و فساد کے ایام میں فتنوں میں شمولیت سے بہتر ہے کہ ان سے الگ تھلگ رہا جائے۔ اس کے لیے بہتر طریقہ یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ وقت عبادت میں گزارا جائے۔

2۔ رہبانیت ممنوع ہے لیکن فتنوں کے ایام میں گوشہ نشینی رہبانیت میں شامل نہیں کیونکہ رہبانیت کا مطلب ہے کہ عوام سے جائز میل جول سے بھی اجتناب کیا جائے اور عبادت میں اس طرح کی سختی کی جائے جو سنت کے خلاف ہے جب کہ اس گوشہ نشینی کا مقصد اپنے آپ کو قتل و غارت اور فساد میں ملوث ہونے سے محفوظ رکھنا ہے۔ اس دوران میں مسنون نفلی عبادات میں اس حد تک مشغول ہوا جا سکتا ہے کہ اپنی ذات اور بیوی بچوں کے حقوق ادا کرنے کے علاوہ کسی اور مشکوک سرگرمی میں حصہ نہ لیا جا سکے۔

3۔ ہجرت میں وطن چھوڑا جاتا ہے اور گوشہ نشینی میں اہل وطن کی برائیوں اور شرارتوں سے دامن بچانے کے لیے ان سے تعلق محدود کیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ دونوں عمل مشابہ ہیں اور ان دونوں کا ثواب بھی بہت زیادہ ہے۔

اسلام شروع میں اجنبی تھا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اسلام شروع میں اجنبی تھا' اور وہ دوبارہ اجنبی ہو جائے گا' اس لیے اجنبیوں کو مبارک ہو۔"

فوائد و مسائل :

1۔ "غریب" اجنبی اور بے وطن کو کہتے ہیں۔ شروع میں اسلام کی یہ کیفیت تھی کہ اسے کوئی جانتا نہ تھا۔

معاشرہ اسے قبول کرنے پر تیار نہ تھا۔ آہستہ آہستہ لوگ اسے سمجھتے اور قبول کرتے گئے حتیٰ کہ ہر طرف اسلام کا بول بالا ہو گیا اور کفر و شرک ختم ہو گیا۔

2۔ خلفائے راشدینؓ کے دور کے بعد اسلام میں بدعات کا ظہور ہوا' بعد کے ادوار میں مسلمانوں نے غیر مسلموں کے رسم و رواج اور خیالات اپنا لیے۔ اس طرح اصل اسلام چند لوگوں تک محدود ہو کر رہ گیا۔ اکثریت نے خود ساختہ رسم و رواج اور غلط عقائد و اعمال ہی کو صحیح اسلام سمجھ لیا۔

3۔ جن اجنبیوں کو مبارک باد دی گئی ہے' ان سے مراد وہ لوگ ہیں جو بدعات کی کثرت میں سنت پر عمل پیرا رہیں' غلط عقائد مشہور ہونے پر صحیح عقیدے پر قائم رہیں اور اخلاقی انحطاط کے دور میں صحیح اسلامی اخلاق کو اختیار کریں۔

4۔ حق و باطل کا دارومدار کسی نام کو اختیار کرنے پر نہیں بلکہ قرآن و حدیث کی موافقت اور مخالفت پر ہے۔

فتنوں سے سلامتی

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' وہ ایک دن مسجد نبویؐ میں تشریف لے گئے تو دیکھا کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے پاس بیٹھے رو رہے ہیں۔ انہوں نے کہا۔

"آپ کیوں رو رہے ہیں؟"

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔

"مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنے ہوئے ایک ارشاد کی وجہ سے رونا آرہا ہے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا' آپ فرما رہے تھے "تھوڑا سا دکھاوا بھی شرک ہے۔ اور جو کوئی اللہ کے کسی دوست سے دشمنی رکھتا ہے' وہ (گویا) اللہ تعالیٰ کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو وہ گمنام متقی نیک لوگ پسند ہیں جو غیر حاضر ہوں تو انہیں تلاش نہیں کیا جاتا' اگر موجود ہوں' انہیں بلایا نہیں جاتا' نہ انہیں پہچانا جاتا ہے۔ ان کے دل ہدایت کے چراغ ہیں۔ وہ ہر ایک غبار آلود تاریک فتنے سے نکل جاتے ہیں" (اور فتنوں سے متاثر ہو کر گمراہ نہیں ہوتے۔)

کامل انسان

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"لوگوں کی مثال ان سو اونٹوں کی سی ہے جن میں سے ایک بھی سواری کے قابل نہ ملے۔"

فوائد و مسائل :۔

1۔ صاحب کمال لوگ تعداد میں بہت کم ہوتے ہیں۔

2۔ عوام میں زیادہ تر لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کسی اہم ذمہ داری کو اٹھانے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ اگر کامل اہلیت والا فرد نہ ملے تو ناقص اہلیت والے ہی سے کام چلانا چاہیے' تاہم ان کی مناسب رہنمائی اور ان کے کام کی مناسب نگرانی ضروری ہے۔

3۔ مربی تربیت میں محنت کرے اور اس کا مطلوب نتیجہ نہ نکلے تو ضروری نہیں کہ تربیت میں نقص ہو۔ بعض اوقات تربیت پانے والوں کے نقص کی وجہ سے مطلوب نتائج حاصل نہیں ہوتے۔

امتوں کا فرقوں میں تقسیم ہونا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"یہودی 71 فرقوں میں تقسیم ہوئے۔ اور میری امت تہتر (73) فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی۔"

حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"یہودی اکہتر فرقوں میں تقسیم ہوئے۔ (ان میں سے) ایک فرقہ جنتی تھا اور ستر جہنمی۔ عیسائی بہتر (72) فرقوں میں تقسیم ہوئے۔ (ان میں سے) 71 جہنمی تھے اور ایک جنتی۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے!

میری امت ضرور تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی۔ (ان میں سے) ایک فرقہ جنت میں جائے گا اور بہتر جہنم میں۔"

عرض کیا گیا "اے اللہ کے رسولؐ! وہ کون لوگ ہیں؟"

فرمایا "جماعت۔"

فوائد و مسائل :۔

1۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مستقبل میں پیش آنے والے جن جن واقعات کی جس جس طرح خبر دی تھی وہ اسی طرح پیش آئے۔ یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور صداقت کی دلیل ہے۔

2۔ فرقوں میں تقسیم ہونے کے بارے میں اس لیے بتایا گیا ہے کہ مسلمان ان اختلافات میں صحیح طرز عمل اختیار کرنے کی کوشش کریں۔

3۔ نصاریٰ اور مسلمانوں میں اختلاف کی اصل وجہ خواہشات نفس کی پیروی اور تعصب ہے اور یہ جرائم جہنم میں لے جانے والے ہیں۔

4۔ مسلمانوں کی اصل "جماعت" وہ ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طریقے پر چلی آرہی ہے۔ اس جماعت سے لوگ الگ ہو کر مختلف فرقوں کی شکل اختیار کر گئے لیکن اصل "جماعت" بھی قائم ہے۔ مسلمانوں کو اسی "جماعت" کے ساتھ رہنے اور ان کی پیروی کرنے کا حکم ہے۔

5۔ جماعت سے الگ ہونے والے خواہش نفس یا غلط تاویلات کی وجہ سے الگ ہوئے۔ جو لوگ ان فرقوں میں شامل نہیں ہوئے وہ قرآن و حدیث پر قائم رہے۔ یہی سیدھا راستہ ہے۔

6۔ نجات کا دارومدار اپنی پارٹی کا کوئی خاص نام رکھ لینے پر نہیں بلکہ قرآن و سنت کے مطابق عمل کرنے پر ہے۔ عاملین کتاب و سنت مختلف زمانوں اور علاقوں میں مختلف ناموں سے مشہور ہو جائیں تو اس کا مطلب نہیں کہ وہ الگ الگ فرقے بن گئے ہیں' بلکہ وہ سب تنظیمیں یا جماعتیں "الجماعۃ" میں شامل ہیں۔

گمراہی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم لوگ پہلوں کے طریقے کی (پوری طرح) پیروی کرو گے' جیسے باع باع کے برابر' ہاتھ ہاتھ کے برابر' اور بالشت بالشت کے برابر ہوتی ہے حتیٰ کہ اگر وہ کسی سانڈے کے بل میں گھسے ہوں گے تو تم بھی ضرور اس میں گھسو گے۔"

صحابہؓ نے عرض کیا۔

"اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا ہم یہودیوں اور عیسائیوں کی (پیروی کریں گے؟)"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اور کن کی؟"

فوائد و مسائل :۔

1۔ یہود و نصاریٰ کے رسم و رواج کی پیروی کرنا گمراہی کا باعث ہے۔

2۔ یہود و نصاریٰ اور ہندوؤں کے تہواروں میں شریک ہونا ان کی محبت پیدا کرتا ہے' جس کے نتیجے میں ان کا مذہب بھی اچھا محسوس ہونے لگتا ہے۔ جب اسلام کے مقابلے میں کفر کے طور طریقے اچھے لگنے لگیں تو پھر نام نہاد ایمان کا باقی رہنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔

3۔ "باع" سے مراد وہ فاصلہ ہے جو دونوں ہاتھوں کے سروں کے درمیان اس وقت ہوتا ہے' جب دونوں بازو مخالف سمتوں میں دائیں بائیں پھیلا لیے جائیں۔ "ہاتھ" (ذراع) سے مراد ہاتھ کی انگلیوں سے کہنی تک کا فاصلہ ہے۔

4۔ سانڈے کے بل میں گھسنے کی کوشش کرنا ایک نامعقول حرکت ہے' لیکن یہود و نصاریٰ کی پیروی میں مسلمان یہ بھی نہیں دیکھیں گے کہ یہ کام یا سوچ درست بھی ہے یا نہیں' بغیر سوچے سمجھے اس کی پیروی شروع کر دیں گے۔

5۔ اس پیش گوئی پر عمل کی موجودہ دور میں متعدد مثالیں ہیں۔ مغرب کی تہذیبی و ثقافتی یلغار ہے جس کا مسلمانوں کی نسل نو بڑی تیزی سے شکار ہوتی جا رہی ہے۔

مال کا فتنہ

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر لوگوں کو خطبہ دیا' اور فرمایا۔

"لوگو' قسم ہے اللہ کی! مجھے تمہارے بارے میں صرف دنیا کی زینت (اور مال و دولت) سے خطرہ ہے' جو اللہ تعالیٰ تمہیں عطا فرمائے گا۔"

ایک آدمی نے کہا۔ "اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا خیر سے بھی شر حاصل ہو جاتا ہے؟"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھوڑی دیر خاموش رہے' پھر فرمایا "تم نے کیا سوال کیا؟"

اس نے کہا "میں نے کہا تھا کیا خیر سے بھی شر حاصل ہوتا ہے؟"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "خیر (حلال مال) سے خیر ہی حاصل ہوتا ہے' کیا وہ خیر ہے؟ (دنیا کا ہر مال خیر نہیں ہوتا) موسم بہار میں جو سبزہ اگتا ہے' اس سے جانور اپھارے کا شکار ہو کر مر جاتا ہے یا مرنے کے قریب ہو جاتا ہے' مگر وہ چرنے والا جانور (بچ جاتا ہے) جو کھاتا ہے' پھر جب اس کی کوکھیں بھر جاتی ہیں تو دھوپ کی طرف منہ کر کے گوبر اور پیشاب کرتا ہے' پھر جگالی کرتا ہے۔ اس کے بعد دوبارہ کھانے لگتا ہے۔ جو شخص جائز طریقے سے مال حاصل کرتا ہے' اسے اس میں برکت حاصل ہوتی ہے اور جو شخص ناجائز طریقے سے مال حاصل کرتا ہے' اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی کھاتا رہتا ہے' لیکن سیر نہیں ہوتا۔"

فوائد و مسائل :۔

1۔ مال و دولت کی حرص انسان کے دین کے لیے خطرناک ہے۔

2۔ مال اللہ کی نعمت ہے' اس لیے حلال طریقے سے حاصل کرنا منع نہیں۔

3۔ حلال کمائی سے حاصل ہونے والا مال بھی خرچ نہ کرنا بلکہ سمیٹ کر رکھنا نقصان دہ ہے۔

4۔ گھاس اور سبزہ جانور کے لیے مفید ہے' بشرطیکہ پہلا کھایا ہوا ہضم ہونے کے بعد اور کھائے۔ اگر مسلسل کھاتا جائے گا تو نقصان اٹھائے گا۔ اسی طرح مال مفید چیز ہے بشرطیکہ اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ بھی کیا جائے۔

5۔ مثال دے کر سمجھانے سے بات زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے۔

مال و دنیا

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جب تم فارس اور روم (کی سلطنتوں) کے خزانے فتح کر لو گے تو تمہاری کیا حالت ہو گی؟"

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ "ہم وہی کچھ (شکر کے کلمات) کہیں گے (اور شکر والے عمل کریں گے) جن کا اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "یا دوسری بات ہو گی۔ تم ایک دوسرے پر رشک کرو گے' پھر ایک دوسرے سے حسد کرو گے' پھر ایک دوسرے سے منہ پھیرو گے' پھر ایک دوسرے سے ناراض رہنے لگو گے یا اس طرح کا کوئی اور لفظ فرمایا۔ پھر غریب مہاجرین میں جاؤ گے اور انہیں ایک دوسرے کی گردنوں پر لادو گے۔"

فوائد و مسائل :۔

1۔ رشک سے یہاں دنیا کے مال کی طرف مسابقت مراد ہے۔ کسی نعمت کے بارے میں یہ خواہش کہ وہ مجھے ملے' دوسرے کو نہ ملے' ناجائز رشک ہے۔ اس قسم کا رشک حسد تک لے جاتا ہے' جو ناپسندیدہ ہے۔ جائز رشک کا مطلب یہ خواہش ہے کہ جیسی نعمت کسی کو ملی ہے ویسی مجھے بھی ملے۔ یہ رشک جائز ہے۔

2۔ حسد کے نتیجے میں تعلقات کشیدہ ہوتے ہیں اور دشمنی تک نوبت جا پہنچتی ہے۔ یہ سب عادتیں مذموم ہیں۔

3۔ آخری جملے کا مطلب یہ ہے کہ دولت مند افراد تنگ دست افراد پر سختی کریں گے اور رعب جمائیں گے۔ یہ صفات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں نہیں تھیں' بعد والوں میں ایسے افراد ظاہر ہوئے جن میں ایسی خصلتیں موجود تھیں۔

مال

حضرت عمرو بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔۔۔ وہ بنو عامر بن لوی کی حلیف تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ غزوۂ بدر میں شریک ہوئے تھے۔۔۔ انہوں نے بیان کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو بحرین روانہ فرمایا تاکہ وہاں (کے لوگوں) کا جزیہ لے کر آئیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بحرین والوں سے صلح کی تھی اور ان پر حضرت علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر فرمایا تھا۔

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بحرین سے مال لے کر آئے۔ انصار کو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی آمد کا علم ہوا تو انہوں نے فجر کی نماز (مسجد نبوی میں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا میں ادا کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز سے فارغ ہوئے تو وہ لوگ آپ کے سامنے آگئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دیکھا تو مسکرا دیے' پھر فرمایا۔

"میرا خیال ہے' تم نے سنا ہے کہ ابوعبیدہ' بحرین سے کچھ لائے ہیں؟" انہوں نے کہا۔

"جی ہاں' اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم!"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "خوش ہو جاؤ اور خوشی والی چیزوں کی امید رکھو۔ قسم ہے اللہ کی! مجھے تم پر فقر کا اندیشہ نہیں۔ مجھے تو یہ خطرہ ہے کہ دنیا تم پر اسی طرح فراخ ہو جائے گی جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر ہوئی تھی' پھر تم اس کے لیے ایک دوسرے پر رشک (اور مسابقت) کرو گے جس طرح تم سے پہلے لوگوں نے کیا' تو یہ (دنیا) تمہیں تباہ کر دے گی جس طرح اس نے تم سے پہلے لوگوں کو تباہ کر دیا تھا۔"

فوائد و مسائل :۔

1۔ دولت ایک آزمائش ہے۔ اس کی حرص کی وجہ سے ظلم اور گناہ کا ارتکاب ہوتا ہے۔

2۔ مال حلال طریقے سے حاصل ہو اور اس پر قناعت کی جائے تو برا نہیں۔

نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"نیکی کا حکم دو اور برائی سے منع کرو' قبل اس کے کہ تم دعائیں مانگو اور تمہاری دعائیں قبول نہ کی جائیں۔"

فوائد و مسائل :۔

1۔ نیکی کا حکم دینے سے مراد مناسب طریقے سے نیکی کی ترغیب دینا ہے۔ حاکم اپنی رعایا کو' والد اپنی اولاد کو اور شوہر اپنی بیوی کو حکم دے سکتا ہے' جس کی وہ تعمیل کرتے ہیں۔ دوسروں کو اس انداز سے حکم نہیں دیا جا سکتا۔

2۔ برائی سے منع کرنے کی طاقت ہو تو ہاتھ سے منع کرنا (جیسے حاکم' والدین اور خاوند وغیرہ) ورنہ زبان سے سمجھانا ضروری ہے (جیسے عالم عوام کو سمجھاتا ہے) اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو گناہ سے دلی نفرت ضروری ہے۔

3۔ گناہوں کا ارتکاب دعا کی قبولیت میں رکاوٹ بن جاتا ہے' لہٰذا توبہ کرنی چاہیے۔

فتنہ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں بیٹھے تھے کہ قبیلہ' مزینہ کی ایک عورت زینت والا لباس پہنے اتراتی ہوئی مسجد میں آئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"لوگو! اپنی عورتوں کو مسجد میں زینت والا لباس پہننے اور تفاخر والی چال چلنے سے منع کرو۔ بنی اسرائیل پر اسی وقت لعنت کی گئی تھی جب ان کی عورتوں نے زینت والا لباس پہنا اور مسجدوں میں فخر سے چلنے لگیں۔"

فقیر بن کر

ابنِ انشا

فقیر بن کر تم ان کے در پر ہزار دھونی رما کے بیٹھو
جبیں کے لکھے کو کیا کرو گے، جبیں کا لکھا مٹا کے بیٹھو

اے ان کی محفل میں آنے والو، اے سود و سودا بتانے والو
جو ان کی محفل میں آکے بیٹھو تو ساری دنیا بھلا کے بیٹھو

بہت جتاتے ہو چاہ ہم سے، مگر کرو گے نباہ ہم سے؟
ذرا ملاؤ نگاہ ہم سے، ہمارے پہلو میں آکے بیٹھو

جنوں پرانا ہے عاشقوں کا، جو یہ بہانہ ہے عاشقوں کا
تو اک ٹھکانا ہے عاشقوں کا، حضور جنگل میں جا کے بیٹھو

ہمیں دکھاؤ نہ زرد چہرا، لیے یہ وحشت کی گرد چہرا
رہے گا تصویرِ درد چہرا جو روگ ایسے لگا کے بیٹھو

جنابِ انشا یہ عاشقی ہے، جنابِ انشا یہ زندگی ہے
جنابِ انشا جو ہے یہی ہے، نہ اس سے دامن چھڑا کے بیٹھو

1 "اصلی نام؟"
"فرحت علی گوہر۔"
2 "پیار کا نام؟"
"زیادہ تر فرحت ہی کہتے ہیں یا بہت پیار آجائے تو فرو کہہ دیتے ہیں۔"
3 "تاریخ پیدائش / شہر / ستارہ؟"
"23 جون 1978ء / کراچی / کینسر۔"
4 "تعلیمی قابلیت؟"
"ایم پی ایس ایف سی پی ایس پارٹ ون۔"
5 "بہن بھائی / آپ کا نمبر؟"
"میرے تین بھائی اور ہم تین بہنیں ہیں اور میرا نمبر دوسرا ہے۔"
6 "شادی کب کرنی ہے / اپنی یا گھر والوں کی پسند؟"
"کب کرنی کا تو جواب نہیں ہے میرے پاس

باتیں فرحت علی گوہر سے

شاہین رشید

کیونکہ جب نصیب میں ہوگا ہو جائے گی اور جوڑے آسمانوں پہ بنتے ہیں اور ارینج میرج ہو تو زیادہ بہتر ہے۔"
7 "ریڈیو پہ آمد؟ کس نے متعارف کرایا؟"
"بزم طلبہ میں "ایک منٹ" کے عنوان سے مقابلہ ہوتا تھا تو مجھے موقع ملا شرکت کا اور میری غزل کو پہلا انعام ملا تھا اور چونکہ مجھے شوق تھا تو اپنی صلاحیت سے آئی۔"
8 "پہلا پروگرام بحیثیت آر جے؟"
"میوزک آن ڈیمانڈ۔"
9 "پہلی کمائی کہاں خرچ کی؟"
"(قہقہہ) ریڈیو کی پہلی کمائی اور آخری کمائی تو آپ نہ ہی پوچھیں تو بہتر ہے۔"
10 "صبح اٹھتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟"
"ناشتہ کرنے کا۔"
11 "اپنے چہرے کے نقش و نگار میں کیا پسند ہے؟"
"مسکراہٹ کے ذریعے جو ڈمپل پڑتے ہیں وہ اچھے لگتے ہیں۔"
12 "گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟"
"اپنے کمرے میں۔"
13 "شدید بھوک میں آپ کا ردعمل؟"
"بہت غصہ آتا ہے اور میں کچھ پڑھ رہی ہوں اور بھوک لگ جائے تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا پڑھ رہی ہوں۔"
14 "اپنے مسائل کس سے شیئر کرتی ہیں؟"
"اپنی چھوٹی بہن عروج سے یا پھر بڑی بہن سے۔"

15 "کوئی گہری نیند سے اٹھادے تو؟"
"اگر کوئی کسی کام سے اٹھادے تو برا نہیں لگتا اور ویسے عموماً ایسا ہوتا کم ہے۔"
16 "پہلی ملاقات میں شخصیت میں کیا دیکھتی ہیں؟"
"ڈریسنگ، جوتے وغیرہ۔ کیونکہ یہ چیزیں شخصیت کی عکاسی کرتی ہیں۔"
17 "آئینہ دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟"
"اتنا ٹائم نہیں ہوتا کہ آئینہ دیکھوں اور کچھ سوچوں اپنے بارے میں۔"
18 "اگر اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کی آزادی ہوتی تو؟"
"ابھی بھی اپنی مرضی سے ہی گزار رہی ہوں۔"
19 "اپنے آپ کو کب بے بس محسوس کرتی ہیں؟"
"جب سامنے والا شخص بہت نگیٹو ہو اور آپ کی بات سمجھنے کو تیار ہی نہ ہو۔"
20 "زندگی میں کس چیز کے لیے وقت نکالنا مشکل ہے؟"
"مجھے کبھی ایسی مشکل نہیں ہوئی میں اپنے شوق اور ضرورت کے لیے وقت نکال لیتی ہوں۔"
21 "آپ کے لیے کون جان دے سکتا ہے؟"
"اب یہ تو اللہ ہی جانتا ہے۔"
22 "اگر دعا سے کچھ مل سکتا تو کیا مانگتیں؟"
"اپنی کامیابیوں کی دعائیں سب کی صحت و تندرستی کی دعائیں۔"
23 "کوئی شخص جس نے آپ کی زندگی بدل دی ہو؟"
"نہیں کوئی بھی نہیں۔"
24 "جب آپ پہلی مرتبہ نیا پین استعمال کرتی ہیں تو کیا لکھتی ہیں؟"
"میں تو لکیریں، لائنیں مار کر دیکھتی ہوں کہ چل رہا ہے کہ نہیں۔"
25 "کوئی غلطی جس کو سوچ کر گلٹی محسوس ہوتی ہو؟"
"کچھ لوگ ہوتے ہیں جن سے تعلقات رکھ کر لگتا ہے کہ ہم نے غلطی کی ہے۔"
26 "کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟"
"نہیں میں کھانا پینا کبھی نہیں چھوڑتی۔ مجھے بھوک بہت لگتی ہے۔"
27 "کبھی سوچا کہ آج سے چند سال بعد آپ کہاں ہوں گی؟"
"سوچتی ہوں اور سوچتی ہوں کہ میں کنسلٹنٹ بن جاؤں گی اور میری لائف سیکیور ہوگی۔"
28 "کھانا کس کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند ہے؟"
"اپنے ہاتھ کی کوکنگ بھی مجھے بہت پسند ہے۔"
29 "ناشتہ میں کیا کھانا پسند کرتی ہیں؟"
"ہلکا ناشتہ کرتی ہوں۔ عموماً چائے توس۔"
30 "موڈ کب خراب ہوتا ہے؟"
"بھوک کے وقت اور جب بہت تھک جاؤں تب۔"
31 "ملک میں کون سی تبدیلی بہت ضروری ہے؟"
"کیا کہہ سکتی ہوں یہاں تو ہر اقدام پہلے سے زیادہ برا ہوتا ہے۔"
32 "ملک کو بحران سے کیسے نکال سکتے ہیں؟"
"قوانین پر عمل درآمد کرا کے۔"
33 "پسندیدہ چینل؟"
"جیو ہی دیکھتی ہوں۔"
34 "بھروسے کے قابل کون ہوتا ہے لڑکیاں یا لڑکے؟"
"میرا خیال ہے کہ لڑکیاں۔"
35 "کیا دعا سے قسمت بدل جاتی ہے؟"
"لگتا تو نہیں ہے کیونکہ جو چیز آپ کے نصیب میں لکھ دی جاتی ہے وہی ملتی ہے۔"
36 "قسمت پر آپ کا یقین؟"
"سو فیصد جو لکھا گیا ہے وہی ملے گا۔"
37 "اپنی شخصیت میں کیا چیز بدلنا چاہتی ہیں؟"
"ذرا مزاج کو ٹھنڈا کرلوں۔ تھوڑا غصہ کم کرلوں۔"
38 "ایک سوال جو خدا سے روزانہ کرتی ہیں؟"

"نہیں کوئی سوال نہیں کرتی کہ اس نے بہت نوازا ہوا ہے۔"
39 "کبھی چھٹی حس ایکٹو ہوئی؟"
"ہاں بہت مرتبہ، بہت ساری باتوں کا مجھے بہت پہلے علم ہوجاتا ہے۔"
40 "گھر آکر پہلی خواہش کیا ہوتی ہے؟"
"کہ کھانا کھاؤں۔"
41 "موت سے ڈر لگتا ہے؟"
"نہیں۔"
42 "کون سی تقریبات پسند نہیں؟"
"نہیں ایسا نہیں ہے مجھے تقریبات میں جانا اچھا لگتا ہے۔"
43 "سائنس کی بہترین ایجاد؟"
"کمپیوٹر۔"
44 "جھوٹ کب بولتی ہیں؟"
"جب بہت مشکل حالات ہوں اور جھوٹ کے بغیر گزارا نہ ہو۔"
45 "کیا تہوار شوق سے مناتی ہیں؟"
"جی ہاں شوق سے مناتی ہوں۔"
46 "ویلنٹائن ڈے کیسا لگتا ہے؟"
"میری زندگی میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔"
47 "ریڈیو کی فیلڈ میں سب سے بڑی برائی؟"
"لوگوں کے پاس فالتو ٹائم بہت ہوتا ہے، وقت کو پوزیٹو وے میں استعمال نہیں کرتے۔"
48 "چھٹی کا دن کیسے گزارتی ہیں؟"
"میری چھٹی کا دن فکس نہیں ہوتا اور جس دن چھٹی ہوتی ہے دل چاہتا ہے کہ آرام کروں۔ کپڑوں کی ورڈائمنگ کرلوں۔"
49 "موبائل فون، آپ کے تاثرات؟"
"بہترین ایجاد ہے لوگوں کو ٹریس کرنا بہت آسان ہو گیا ہے۔"
50 "شہرت کیسی لگتی ہے؟"
"اچھی لگتی ہے لوگ پہچان لیتے ہیں تو اچھا لگتا ہے۔"
51 "زندگی کب بری لگتی ہے؟"
"بہت کم بری لگتی ہے۔ کبھی کبھی جب بہت ڈیپریس ہوتی ہوں تب بری لگتی ہے۔"
52 "صحافیوں کا ایک سوال جو برا لگتا ہے؟"
"ایسا کوئی خاص سوال تو نہیں ہے۔"
53 "کوئی لڑکا مسلسل گھورے تو؟"
"نظر انداز کردوں گی۔"
54 "سارے دن میں پسندیدہ وقت؟"
"صبح کا، جب آپ فریش ہوتے ہیں، کام پہ جارہے ہوتے ہیں۔"
55 "کب چیخنے چلانے کو دل چاہ رہا ہوتا ہے؟"
"جب کسی پہ غصہ آرہا ہوتا ہے۔"
57 "زندگی میں کس چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے؟"
"چیز تو نہیں مجھے اپنی امی کی کمی بہت شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ ماں کا سایہ بہت بڑی نعمت ہوتا ہے۔"
58 "نصیحت جو بری لگتی ہے؟"
"نصیحت کرنے کا اگر انداز اچھا ہو تو نصیحت بری نہیں لگتی۔"
59 "رشتہ جس نے دکھ دیا ہو؟"
"ایسا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ چھوٹی موٹی باتیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔"
60 "غصہ کب آتا ہے اور رد عمل کیا ہوتا ہے؟"
"جب کوئی میری بات نہ سمجھ رہا ہو، اپنی ہی بات پہ قائم ہو تو پھر غصہ آتا ہے پھر میں بولنا شروع کردیتی ہوں۔"
"کنٹرول تو مجھے اپنے آپ پر اچھا خاصا ہے۔ اپنے جذبات پر آسانی سے کنٹرول کرلیتی ہوں۔"
63 "کیا محبت ایک بار ہوتی ہے؟"
"ضروری نہیں اور محبت بہت سارے لوگوں سے ہوسکتی ہے۔"
64 "کبھی مانگ کر تحفہ لیا؟"

”ہاں کیوں نہیں کسی کو میری برتھ ڈے پہ تحفہ دینا یاد نہ رہے تو کہہ دیتی ہوں کہ میرا گفٹ کہاں ہے۔ اپنے بہن بھائیوں سے مانگ لیتی ہوں۔“

65 ”پسندیدہ صحافی؟“

”اخبارات کا زیادہ مطالعہ نہیں کرتی۔ اس لیے معلوم نہیں۔“

68 ”گھر والوں کی کس بات سے موڈ آف ہو جاتا ہے؟“

”وہی بات کہ کوئی مجھے غلط سمجھ رہا ہو اور میں ٹھیک ہوں۔“

69 ”کن چیزوں پر بہت خرچ کرتی ہیں؟“

”جوتوں پہ، کپڑوں پہ اور اپنی گاڑی پر۔“

70 ”فٹ پاتھ پہ کھڑے ہو کر کس چیز کا جائزہ لیتی ہیں؟“

”کہ ہمارے یہاں کتنی بری ڈرائیونگ کی جاتی ہے۔ کوئی ٹریفک کے قوانین کو فالو نہیں کرتا۔“

71 ”کس کے بغیر نہیں رہ سکتیں؟“

”نہیں ایسا نہیں ہوتا یہ سب کتابی باتیں ہیں۔ آپ سب چیزوں کے بغیر رہ سکتے ہیں۔“

72 ”کس شخصیت سے خوفزدہ رہتی ہیں؟“

”کوئی نہیں، مجھے ڈر نہیں لگتا کسی سے۔“

73 ”اپنی کوئی اچھی اور بری عادت بتائیں؟“

”اچھی عادت یہ ہے کہ میں بہت محبت کرنے والی ہوں۔ بری یہ کہ لاپروا ہوں۔ چیزیں بہت پھیلا دیتی ہوں۔“

74 ”دن کے کس حصے میں اپنے آپ کو تر و تازہ محسوس کرتی ہیں۔“

”وہی صبح کے وقت۔“

75 ”آدھی رات کو آنکھ کھل جائے تو؟“

”مجھے نیند اچھی آتی ہے پھر بھی اگر کھل جائے تو دعائیں پڑھ لیتی ہوں۔“

76 ”ایک شام جو آپ اپنی پسندیدہ شخصیت کے ساتھ گزارنا چاہتی ہیں؟“

”نہیں کوئی خاص شخصیت نہیں ہے۔“

77 ”کس ملک کے لیے کہتی ہیں کہ کاش یہ میرا ہوتا؟“

”مجھے یو کے بہت پسند ہے۔“

78 ”اچانک چوٹ لگنے پہ بے ساختہ کیا کہتی ہیں؟“

”چیخ نکلتی ہے درد سے بولتی کچھ نہیں۔“

79 ”بستر پہ لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے یا کروٹیں لیتی ہیں؟“

”عموماً جلدی نیند آجاتی ہے۔“

80 ”انسان کا بہترین روپ مرد / عورت؟“

”ضروری نہیں کہ مرد ہی بہترین روپ ہو اور ضروری نہیں کہ عورت ہی بہترین روپ ہو۔ میرا خیال ہے مرد ہو یا عورت انسانیت بہترین روپ ہے۔“

81 ”کھانے کے لیے پسندیدہ جگہ چٹائی یا ڈائننگ ٹیبل؟“

”ڈائننگ ٹیبل ہے گھر میں تو اسی پہ کھاتی ہوں۔“

82 ”کون سے الفاظ یا محاورے زیادہ استعمال کرتی ہیں؟“

”محاورے بہت زیادہ استعمال نہیں کرتی۔ بولتی بہت ہوں مگر کوئی مخصوص الفاظ کا استعمال زیادہ نہیں کرتی۔“

83 ”مرد کب برے لگتے ہیں؟“

”جب وہ کسی کو دھوکہ دیتے ہیں۔“

84 ”پیسہ کس شکل میں جمع کرتی ہیں؟“

”بینک میں کیش کی صورت میں۔“

85 ”اگر مذہب میں ایک قتل کی اجازت ہوتی تو کس کو قتل کرتیں؟“

”نہیں میں کسی سے ایسی نفرت نہیں کرتی کہ قتل کا سوچوں۔“

86 ”بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ کیا کیا چیزیں رکھتی ہیں؟“

”موبائل، ڈائری، پین، پانی کا گلاس۔“

”اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے؟“

”مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

میں سمجھتی ہوں کہ دنیا کے بہت سارے پروفیشنز میں میڈیکل کا پروفیشن سب سے زیادہ اچھا اور محفوظ ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ڈاکٹر کسی بھی شعبے کا ہو، وہ انسانوں کے لیے ایک نعمت ہوتا ہے اور انسان کی صحت کا سارا دارومدار دانت ہی ہوتے ہیں جن سے ہم اپنی پسندیدہ خوراک چبا کر اپنی جان بناتے ہیں۔ دانتوں کے مسائل ماہر ڈاکٹر مرزا حامد بیگ سے ایک انٹرویو میں دانتوں کی بیماریوں اور ان کے علاج پہ بات ہوئی جو آپ کی نذر ہے۔

”کیسے ہیں ڈاکٹر حامد! اور یہ بتائیں کہ میڈیکل کی فیلڈ میں آنے اور خاص طور پر Dentist بننے کی کیا وجوہات تھیں؟“

”ڈاکٹر بننے کا تو مجھے بچپن سے ہی شوق تھا اور جب والدین نے میرا اس طرف رجحان دیکھا تو میرے والد صاحب نے کہا کہ اگر آپ کو میڈیکل کی فیلڈ میں آنا ہے تو پھر آپ Dentist بنیں کیونکہ یہ ایک ٹیکنیکل

دانتوں کے امراض کے ماہر

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ سے ملاقات

شاہین رشید

فیلڈ ہے۔ اس میں ہنر بھی ہے اور تاج بھی زیادہ حاصل ہوتی ہے تو بس والد صاحب کے کہنے پر اور پھر اپنے شوق کی وجہ سے Dentist بنا۔“

”آپ ڈاکٹروں کے لیے کہا جاتا ہے کہ آپ کے ہاتھ لوگوں کے منہ کے اندر ہوتے ہیں اور اسمیل بھی آرہی ہوتی ہے۔ تو کچھ محسوس ہوتا تھا آپ کو؟“

”شروع میں محسوس ہوتا ہے مگر پھر انسان آہستہ آہستہ ”یوز ٹو“ ہو جاتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔“

”گویا آپ کی عادت ہو گئی ہے لوگوں کے منہ میں جھانکنے کی۔ عموماً لوگ اس وقت علاج کے لیے آتے ہیں جب دانت کافی خراب ہو چکے ہیں۔ اس وقت آپ ان کے جراثیم سے بچنے کے لیے کیا کرتے ہیں؟“

”اس وقت ہم ماسک کا استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کے جراثیم کا ہم بھی شکار ہو سکتے ہیں اور ہمارے منہ کے جراثیم بھی ان کو متاثر کر سکتے ہیں ماسک اور دستانوں کا استعمال ضروری ہوتا ہے۔“

”یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ دانتوں کا علاج کرواتے وقت لوگ خوفزدہ بہت ہوتے ہیں۔ کیوں؟“

"اس کی وجہ یہ ہے کہ دانت کا علاج زیادہ تر ڈرل سے ہوتا ہے تو لوگوں کو یہ احساس ہوتا ہے کہ ہمیں درد ہو گا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ انجکشن بھی لگانا پڑتا ہے تو چونکہ انجکشن اور ڈرل کا استعمال زیادہ ہے اور بہ وجہ اس میں درد بھی ہوتا ہے تو جب مریض دوسروں کو جا کر بتاتا ہے تو پھر لوگ خوف زدہ ہو جاتے ہیں کہ اگر ہم علاج کروائیں گے تو ہمیں بھی درد ہو گا لہٰذا جب تک گزارا کر سکتے ہیں کریں اور لوگوں کی اسی سوچ کی وجہ سے بہت کچھ خراب ہو چکا ہوتا ہے تب لوگ علاج کروانے آتے ہیں۔"

"دانتوں کی کون کون سی بیماریاں ہوتی ہیں؟"

"دانتوں میں کیڑا لگنا اور لسی میں انفیکشن ہونا اور گال کی بیماری میں چھالے نکل آنا اور کینسر کی بیماری بھی ہو سکتی ہے اور مسوڑوں میں 'پائریا' کی بیماری ہو سکتی ہے۔"

"اور کامن بیماری کیا ہے دانتوں کی؟"

"دانتوں میں کیڑا لگنا اور کیڑا ایڈوانس ہو جائے تو وہ انفیکشن کا باعث بنتا ہے۔ منہ میں چھالے ہو جانا اور پائریا کی بیماری بہت کامن ہے۔"

"ان بیماریوں کی وجوہات کیا ہوتی ہیں؟"

"اپنی خوراک کا خیال نہ رکھا جائے۔ بازار میں کھلے عام بکنے والی چیزیں کھانا اور برش ٹائم پہ اور روزانہ نہ کیا جائے تو بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ خاص طور پر اگر دو ٹائم برش نہ کریں تو جو چیزیں ہم کھاتے ہیں وہ دانتوں میں پھنس کر گل سڑ جاتی ہیں اور دانتوں کی بیماری کا باعث بنتی ہیں اور اس سے کیڑا بھی لگ جاتا ہے اور مسوڑوں کی بیماری بھی ہو جاتی ہے۔"

"قابل علاج کون سی بیماری ہے اور ناقابل علاج کون سی بیماری ہے؟"

"ناقابل علاج تو کینسر کی بیماری ہے اگر اس کی اسٹیج بڑھ جائے۔ یعنی بہت دیر میں پتہ چلے تو... یا کچھ موذی امراض ہوتے ہیں جو ناقابل علاج ہوتے ہیں لیکن سب سے زیادہ ناقابل علاج کینسر ہے اگر اسے ابتدائی اسٹیج پہ نہ پکڑا جائے اگر یہ دانت سے ہڈی میں چلا جائے تو پھر موت بھی واقع ہو جاتی ہے۔"

"کیا دانتوں کی بیماریاں موروثی بھی ہوتی ہیں؟"

"ہاں جی موروثی بھی ہوتی ہیں۔ جیسے دانت کا صحیح نہ بننا یا جلد کے جو امراض ہوتے ہیں وہ منہ میں بھی آ جاتے ہیں۔ چھالوں کا پرابلم بھی عموماً "موروثی" ہوتا ہے اور اس کا کوئی خاطر خواہ علاج بھی نہیں ہے۔"

"پائریا کیا ہوتا ہے اور روٹ کنال کیا ہوتا ہے؟"

"مسوڑوں میں سوزش ہو جانا پائریا کہلاتا ہے اور اس سے دانت کی جڑیں متاثر ہوتی ہیں لہٰذا دانت ہلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ دانت کے اندر جو نس ہوتی ہے ہم اس کو نکال دیتے ہیں۔"

"کہتے ہیں کہ روٹ کنال نہیں کروانا چاہیے کیونکہ پھر آپ کے دانت ایک زندہ لاش بن جاتے ہیں؟"

(بے ساختہ ہنسی)... "ایسا نہیں ہے دانت کا فنکشن جاری رہتا ہے اور تکلیف نہیں ہوتی' بندہ آسانی سے کھا پی سکتا ہے۔ ایک طرح سے دانت save ہو جاتا ہے۔ نکلوانے سے تو بہتر ہے کہ روٹ کنال کروا لیا جائے' دانت اپنی جگہ موجود رہتا ہے اور کھانے پینے میں بھی مشکل نہیں ہوتی اور ٹھنڈا گرم بھی نہیں لگتا۔"

"کیڑا لگنا کیا ہوتا ہے... اور یہ عموماً بچوں کو بھی لگ جاتا ہے؟"

"یہ ایک بیکٹیریا ہوتا ہے جو دانت کو کھاتا ہے اور مائیکرو اسکوپ سے نظر آتا ہے اس کو ہم عام زبان میں "کیڑا" کہتے ہیں اور اس کے لگنے کی وجہ بھی صحت مند غذا نہ کھانا اور برش نہ کرنا ہے اور کھانا دانت میں رہ جائے تو پھر اس جگہ پہ یہ بیکٹیریا جنم لے لیتا ہے اور جب وہ Grow ہونا شروع ہو جاتا ہے تو اسے خوراک کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر وہ دانت کو کھاتا ہے۔"

"ایک صحت مند انسان کے دانت کس عمر سے خراب ہونا شروع ہو جاتے ہیں؟"

"اس کے لیے کوئی عمر مخصوص نہیں ہے بعض اوقات تو دودھ کے دانت ہوں تب سے ہی خرابی شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے لیے پریشانی والی بات اس لیے نہیں ہوتی کہ وہ ٹوٹ کر دوبارہ آ جاتے ہیں لیکن جب مستقل دانت نکلیں اور ان کی پروا نہ کی جائے تو پھر کم عمری سے ہی خراب ہونا شروع ہو جائیں گے اور اگر خیال رکھیں گے تو سو سال میں بھی آپ کے دانت خراب نہیں ہوں گے۔ یہ بات ریسرچ نے ثابت کی ہے کہ اگر آپ خیال رکھیں گے تو آپ کے دانت خراب نہیں ہوں گے یہ سوچنا کہ اب اتنی ایج ہو گئی ہے۔ اب تو دانت ہلیں گے ہی۔ تو ایسا نہیں ہے۔ دانتوں کا ہلنا' ان کی خرابی اور تکلیف دینے کا تعلق عمر سے ہرگز نہیں ہے۔"

"implant کیا ہے؟ کہا جاتا ہے کہ implant کروائیں تو دانت ساری زندگی کے لیے محفوظ ہو جاتے ہیں؟"

"بنیادی طور پر ہڈی کے اندر اسکرو ڈرل کر کے دے دیتے ہیں وہ اسکرو as a root کام کرتا ہے اور اس کے اوپر کراؤن ڈیولپ کرتے ہیں۔ جہاں آپ کے دانت نہیں ہوتے وہاں ہڈی کے ذریعے ایک اسکرو جائے گا اور اس کے اوپر ایک کراؤن ڈیولپ ہو گا۔"

"پھر تو یہ تکلیف دہ مرحلہ ہوتا ہو گا؟"

"تکلیف دہ اتنا نہیں ہے جتنا لمبا ہے۔ تکلیف اس لیے نہیں ہوتی کہ سن کر دیتے ہیں اور سرجری ہوتی ہے اور اس کام میں چار سے چھ مہینے تو لگ ہی جاتے ہیں اور فیلر کے چانسز بھی ہوتے ہیں۔"

"دانت فکس کروانا کیا ہوتا ہے؟ اب لوگوں کی اکثریت دانت فکس کروا لیتی ہے۔"

"یہ بنیادی طور پر اسٹیل کا ایک کراؤن ہوتا ہے جو کہ دانتوں کے اوپر سیمنٹ ہو جاتا ہے۔ اس کو فکس دانت کہتے ہیں یہ اپنے ہی دانتوں کے اوپر ہوتا ہے۔"

"کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ دانت فکس نہیں کروانے چاہئیں۔ اس سے کینسر ہو جاتا ہے یا کچھ اور پیچیدگیاں؟"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں... کینسر جن چیزوں سے ہوتا ہے اس کو تو لوگ نہیں چھوڑتے جیسے سگریٹ کا استعمال' چھالیہ' گٹکا' پان اور تمباکو کا استعمال اور جن سے کینسر نہیں ہوتا ان کے لیے شور مچاتے ہیں اور ابھی تک کوئی کیس ایسا سامنے نہیں آیا کہ Implant کی وجہ سے یا فکس کروانے سے کسی کو کینسر ہوا ہو۔ اس میں کسی قسم کا رسک فیکٹر بھی نہیں ہے۔"

"مشہور شخصیات بھی امپلانٹ اور فکس کرواتے ہیں؟"

"بالکل کرواتے ہیں' یہاں نام لینا مناسب نہیں مگر جب میں اس کام کی ٹریننگ لے رہا تھا تو ایک مشہور شخصیت کے دانت فکس کیے تھے۔"

"اکثر دانتوں کے اوپر کالے رنگ کے اسٹون سے بن جاتے ہیں۔ یہ کیا ہوتا ہے؟"

"یہ بھی ایک بیکٹیریا ہوتا ہے جو کیلشیم کے کور کے اندر Grow بھی ہوتا ہے اور چھپا ہوا بھی ہوتا ہے۔ یہ اسٹون اس وقت بنتے ہیں جب ٹھیک طرح سے برش نہ کیا جائے اور پلاک کو 72 گھنٹے ہو جائیں تو پھر کیلشیم جمع ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اس بیکٹیریا کی غذا ہڈی ہوتی ہے جو کہ خطرناک ہے۔"

"دانتوں کا چیک اپ سال میں کتنی مرتبہ کروانا چاہیے؟"

"ہر چھ مہینے کے بعد چیک اپ ضرور کروانا چاہیے۔ مگر یہاں تو لوگ سالوں چیک اپ نہیں کرواتے اور اس دوران اگر خدانخواستہ کینسر ڈیولپ ہو رہا ہو تو انہیں پتہ نہیں چلتا۔"

"اب کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟"

"میرے آباؤ اجداد کا تعلق دہلی سے ہے۔ ہم اردو اسپیکنگ ہیں۔ میرے والد ریٹائرڈ آرمی آفیسر تھے اور وہ کرنل کی پوسٹ سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ والدہ ہاؤس وائف ہیں۔ میں 6 مارچ 1980ء کو کراچی میں پیدا ہوا۔ ہم تین بھائی اور ایک بہن ہے اور میرا نمبر تیسرا ہے۔ بڑی بہن ہاؤس وائف ہیں۔ بڑا بھائی کمپیوٹر سائنس کے پروفیشن سے وابستہ ہیں اور چھوٹا بھائی بی بی اے کا طالب علم ہے۔ ابتدائی تعلیم بہاولپور اور گوجرانوالہ میں ہوئی۔ میٹرک کے بعد کراچی آ گئے یہاں ڈی جے سائنس کالج سے انٹر کیا۔ جناح میڈیکل ڈینٹل کالج سے گریجویشن کیا۔ جناح اسپتال میں ہاؤس جاب کی کچھ عرصہ سول اسپتال میں کام کیا' لیاقت نیشنل اسپتال میں کچھ عرصہ کام کیا۔ پھر انگلینڈ چلا گیا وہاں سے ایم آر سی ایس کی ڈگری حاصل کی۔ واپس پاکستان آیا اور یہاں پرائیویٹ پریکٹس کے علاوہ عباسی شہید اسپتال میں بھی پریکٹس کرتا ہوں۔"

"ملک میں واپس آنے کی کیا وجوہات تھیں اور آپ کا تعلیمی ریکارڈ کیسا تھا؟"

"میرے والد صاحب کی طرف سے تھوڑی سی پابندی تھی کہ تعلیم مکمل کر کے اپنے ہی ملک میں پریکٹس کرنی ہے ــــ جہاں تک پڑھائی کا تعلق ہے تو میں پڑھائی میں ہمیشہ ہی اچھا رہا۔ زیادہ تر میری پوزیشن آئی تھی۔ فرسٹ پروفیشنل سیکنڈ پروفیشنل اور فائنل پروفیشنل میں میں نے پوزیشن حاصل کی تھرڈ پروفیشنل میں کوئی پوزیشن نہیں تھی۔ مختلف مضامین میں Distinction لی یعنی 5 مضامین میں میری Distinction ہے میری اور تین سال کی اسکالرشپ بھی مجھے ملی۔ میرا ایم بی بی ایس 2004ء میں مکمل ہوا 2005ء میں میری ہاؤس جاب ختم ہوئی 2006ء میں لندن چلا گیا 2007ء میں واپس آیا۔ اور تب سے اب تک میں پرائیویٹ پریکٹس بھی کرتا ہوں اور عباسی شہید اسپتال میں بھی بیٹھتا ہوں پرائیویٹ پریکٹس میں میں نے مختلف ڈاکٹرز کے ساتھ بھی کام کیا ہے۔"

"کسی مریض نے کبھی تنگ کیا آپ کو؟"

"ہاں کیوں نہیں' کافی مریضوں نے تنگ کیا ہے مگر ہمارا پروفیشن ایسا ہے کہ ہمیں ری ایکٹ نہیں کرنا ہوتا۔ عباسی شہید اسپتال ہو یا کوئی بھی سرکاری اسپتال ہو وہاں تو ہر مریض ہی تنگ کرتا ہے کیونکہ کنڈیشن ایسی ہوتی ہے کہ ہر مریض۔ اپ سیٹ ہوتا ہے۔ تو وہ چلاتا بھی ہے اور غصہ بھی کرتا ہے..... مگر ہمیں برداشت کرنا پڑتا ہے۔"

"ویسے مزاجاً" کیسے ہیں آپ؟"

"ویسے تو اللہ کا شکر ہے میں نرم ہوں اور یہ نرم مزاجی ہی تو ہے کہ مریضوں کی بات پر ہم غصہ نہیں کرتے۔ ورنہ اگر غصہ تیز ہوتا تو کبھی کبھی تو مریض اتنا تنگ کرتا ہے کہ ہم اس پہ غصہ نکال سکتے ہیں۔ مگر میں ایسا نہیں کرتا۔"

"اور لائف پارٹنر کا انتخاب بھی آپ نے ابھی تک نہیں کیا' کیوں؟"

"میں آج کل ایف سی پی ایس F.C.P.S کی تیاری کر رہا ہوں اس کی ڈگری مجھے مل جائے گی تو میں سرجن بن جاؤں گا۔ اگر ابھی شادی کر لوں گا تو پھر میں اپنی پڑھائی پہ توجہ نہیں دے پاؤں گا۔"

"اپنی پسند سے کریں گے؟"

"نہیں..... والدین کی پسند سے کروں گا۔ یہ ان کا ہی شعبہ ہے۔ انہی کا ارمان ہوتا ہے۔ انہی کی خواہش کا احترام کروں گا۔"

اس کے ساتھ ہی ہم نے ڈاکٹر مرزا حامد بیگ سے اجازت چاہی۔

ماڈل	صائمہ
ٹرانسپرنسی	موسیٰ رضا
میک اپ	روز بیوٹی پارلر

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

ملائکہ کوثر..... بسم اللہ پور

"سفال گر" بشریٰ سعید کا کہانی تو بہت اچھی ہے مگر الجھاؤ اور پیچیدگی بہت ہے اس میں۔ "چراغ آخر شب" کی رفعت ناہید کی ہمیں تو میرا عقیدت بھرا سلام۔ اس دفعہ والی قسط پڑھ کر گتنے پرانے زخم تازہ ہو گئے۔ اپنے اور اپنے بچوں کے پسندیدہ کیپٹن مستنصر حسین تارڑ کا انٹرویو پڑھ کر بے حد لطف آیا۔ باقی مستقل سلسلے بھی ٹھیک ٹھاک تھے۔

ج: ملائکہ جی! آپ ہماری ان قارئین میں شامل ہیں جو ہر ماہ خط لکھتی ہیں۔ کسی ماہ آپ کا خط شامل نہ ہو تو کمی سی محسوس ہوتی ہے۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

سائرہ رضا..... کراچی

کتنے بہت سارے سالوں کے سورج خواتین کے ساتھ دیکھے ہیں کہ اب یاد نہیں بہت عرصے بعد تبصرہ لکھ رہی ہوں۔ ڈائجسٹ کے مندرجات پر کہ..... اور وجہ..... وجہ بہت ساری سال کا پہلا شمارہ اور مستنصر حسین تارڑ کا انٹرویو..... مزہ آ گیا ایک ایسا آدمی کہ جس کے بارے میں برملا کہتی ہوں کہ اپنے ابا کے بعد اور چاچوؤں کے بعد جو پہلا آدمی اچھا لگا وہ یہی تھے چاچا جی۔ باہر کی دنیا کا پہلا بندہ جو ہمیشہ اچھا لگا اور اتنا اچھا لگا کہ آج تک وہ اسی مقام پر براجمان ہے "وہ جگہ کوئی دوسرا لے ہی نہ سکا"

سال کے آغاز میں ایک اچھا آغاز مگر سال گزشتہ میں کیے جانے والے انٹرویو بھی بے حد بھلے معلوم ہوئے خصوصاً "عاصمہ شیرازی' حامد میر' کاشف عباسی وغیرہ کے انٹرویوز مگر گزشتہ برس کا سب سے نمایاں انٹرویو کسی بیگم کی (ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر) خاتون کا تھا' ان دونوں ہم ساجدہ حبیب کا "وعدہ وری اور وفائیں" پڑھ کر ویسے ہی بہت زود رنج ملول اور پچھتاووں کی آگ میں جھلس رہے تھے اور اس انٹرویو کو پڑھ کر دل اور جلا پھر بجھ گیا' دسمبر کا مہینہ آج بھی پرانے زخموں میں ٹیس دیتا ہے اور ایسے کئی روگ ہیں جو آج بھی اس المیہ پر کلستے ہیں مگر ان کا انداز بے فکری اور ہم سے الگ ہو جانے پر طمانیت کا اظہار دل کو لہو لہو کر گیا۔ اس خاتون کے انٹرویو نے پہلے ساجدہ حبیب اور اب رفعت ناہید سجاد کے دل گیر انداز تحریر کی نفی کر دی معلوم نہیں دوسروں کو ایسا لگا یا نہیں ایک اوپن فورم میں یہاں اور وہاں کے نئے پرانے لوگوں سے ضرور پوچھا جائے کہ کیا اچھا ہوا تھا اور کیا برا (بہرحال میری رائے میری سوچ سے بہت متفق نہ بھی ہوں گے۔)

اس ماہ پرچا میں نے نائٹ کوچ میں برتھ پر لیٹ کر کمبل میں چھپ کر پڑھا اور یہ بڑا دلچسپ تھا۔ اتنے بہت سارے لوگوں کے بیچ ہوتے ہوئے بھی آپ اپنی دنیا میں کھو جاتے ہیں

ٹرین کی دنیا وقتی ہوتی ہے' ہر پل رنگ بدلتی نئی بھی روشنیاں ہی روشنیاں کبھی اتنا اندھیرا کہ لگتا ہے بینائی چلی

گی بھی وا سے روشنی اور زندگی شاداب لگنے لگتی ہے۔ ہاں مگر ایک مسلسل خوشبو اور خوشی ہمراہ رہتی ہے۔ اپلوں سے سلگنے کی اور ہریالی مٹی کی مہک جلتی لکڑی اپلوں سے اٹھتا دھواں ہم کراچی جیسے شہروں میں رہنے والے لوگ فطرت کو خود سے اتنا قریب پاکر بے خود ہو جاتے ہیں کیا آپ سب بھی ایسا محسوس کرتی ہیں؟

ج:۔ سائرہ جی! آپ کا خوب صورت خط کتنی ہی پرانی یادیں تازہ کر گیا۔ جب پرانی قارئین کے خط ملتے ہیں تو لگتا ہے کہ دیرینہ دوستوں سے ملاقات ہو گئی ہو۔ خواتین ڈائجسٹ سے آپ کا تعلق اتنا پرانا ہے' یہ دیرینہ تعلق ہمیں یقین دلاتا ہے کہ خواتین ڈائجسٹ کا معیار آج بھی برقرار ہے۔ اللہ تعالیٰ اس تعلق کو ہمیشہ قائم رکھے۔ آمین۔

شفق ساحر۔۔۔ گوجرہ

اکثر مائیں اپنی بیٹیوں کو اور بڑی بہنیں چھوٹی بہنوں کو ڈائجسٹ پڑھنے نہیں دیتیں۔ تو مجھے ان سب سے کہنا ہے کہ وہ پلیز کسی کو بھی ڈائجسٹ پڑھنے سے نہ روکیں۔ یہ تو اندھیرے میں روشنی کی کرن ہے۔ بہت سے بھٹکے ہوئے ذہنوں کو سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔

اس کی ایک مثال میں آپ کو بتاتی ہوں' جب میں 10th میں تھی (اب بھی میں کوئی بہت بڑی نہیں ہو گئی فرسٹ ایئر میں ہوں) تب ایک لڑکی جو کہ میری ہی کلاس میں پڑھتی تھی۔ ایک دن میں ڈائجسٹ پڑھ رہی تھی تو کہنے لگی۔

''اس میں ایسا کیا ہے' جو تم بریک میں اور ہر فارغ پیریڈ میں اسے ہی پڑھتی رہتی ہو؟''

تو میں نے ڈائجسٹ اسے دیا اور کہا ''آج تم اسے گھر لے جاؤ اور اسے پڑھو۔ تمہیں جواب خود مل جائے گا'' اس سے اگلے دن جب وہ اسکول آئی تو اس کے الفاظ کچھ یوں تھے۔ چلیے آپ کو اسی کی زبانی سناتی ہوں۔

''شفق! مجھے سمجھ میں نہیں آرہی میں تمہیں کیسے تھینکس کہوں۔ تم نے مجھے ایک بہت بڑا غلط قدم اٹھانے سے بچالیا۔ میں گلی کے ایک لڑکے سے محبت کرتی تھی اور میں جانتی تھی کہ میرے والدین اس رشتے پہ نہیں مانیں گے' اس لڑکے کے والدین بھی نہیں مانتے کیونکہ ہماری برادری الگ ہے وہ لڑکا مجھ سے کہتا تھا کہ ہم بھاگ جائیں گے اور میں ایسا کرنے کے لیے تیار بھی تھی میں سمجھتی تھی کہ میرے والدین میرے دشمن ہیں جو میری خوشی کے درمیان آرہے ہیں۔ لیکن کل اس ڈائجسٹ میں ایک کہانی پڑھی اور مجھے پتہ چلا کہ میرے والدین نہیں بلکہ وہ لڑکا میرا دشمن ہے اور میں کتنے غلط راستے پر چلنے والی تھی۔ شفق! تم نے مجھے اس اندھے کنوئیں میں گرنے سے بچالیا' جس میں اگر میں گر جاتی تو میرے ساتھ ساتھ میرے گھر والے بھی مر جاتے۔ میں نے کل ہی اس لڑکے کا دیا ہوا موبائل اسے واپس کر کے اس سے ہر رابطہ ختم کر دیا۔ مجھے اس دلدل سے بچانے والا یہ ڈائجسٹ ہی ہے اور آئندہ زندگی میں' میں کبھی اس سے ناتا نہیں توڑوں گی۔''

آپ سب حیران ہو رہے ہوں گے لیکن یقین جانیے مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ میں بتا نہیں سکتی۔ اسی لیے میں کہتی ہوں کہ آپ بھی کبھی کسی کو ڈائجسٹ خاص طور پر ''شعاع'' اور ''خواتین'' پڑھنے سے نہ روکیں۔

ج:۔ پیاری شفق! آپ کا خط شائع کر رہے ہیں۔ وہ تمام لڑکیاں جن کے والدین لڑکیوں کو خواتین ڈائجسٹ پڑھنے سے منع کرتے ہیں۔ وہ اپنے والدین کو یہ خط دکھا سکتی ہیں۔

سوید حیدر۔۔۔ (ای میل)

مدہوش سی ماڈل گلے میں مفلر کا پھندا ڈالے اچھی ہی لگ رہی تھی۔ پھر فائزہ رخسانہ جی کا ''محبت خواب سفر'' پڑھا دل ڈوب گیا اگر پلیز اگلی قسط آخری ہی ہو۔ راحت جی کا ''امرت اور پیالہ'' زیادہ پسند آیا۔ مگر انہوں نے اینڈ اچھا نہیں کیا۔ کیا تھا جو ان میں سے ہی کسی ایک سے شادی کروا دیتیں آپ؟ پہلی بار جب 2003ء میں ڈائجسٹ خریدا تو وہ ستمبر کا مہینہ تھا اور اس میں بشریٰ سعید کی تحریر ''رقص جنوں'' پڑھ کر تب سے ہی ہم خواتین کے فین ہو گئے تھے۔ ''سفال گر'' بہت عرصے بعد ایسی عمدہ تحریر پڑھنے کو ملی ہے۔ مگر ایک درخواست ہے آپ سے کہ پلیز اس کو جلدی ختم کر دیجیے گا۔ زیادہ طول دینے سے کہانی کا چارم ختم ہو جاتا ہے۔ افسانوں میں تو ہمیں ''یہ دل آپ کا ہوا'' عفت سحر طاہر اور ''اساں تے جانا'' ام ثمامہ زیادہ پسند آئے عفت جی! بے چاری روبھا کی بھی سن لیں۔ کروا دیں اب از میرٹ سے اظہار محبت! بلکہ اب تو شادی ہی کروا دیں۔ بہت مزے کے کردار ہیں یہ دونوں اور بے چارہ شیرافگن! اینڈ اچھا ہوا تھا اس کا بھی' بلو کی سوچ اچھی تھی جس نے اس کی سوچ بھی بدل ڈالی۔ باقی سب کچھ بھی اچھا تھا۔ آپی! مجھے بھی ہلکا پھلکا لکھنے کا شوق ہے تو میں کیا کروں؟

ج:۔ پیاری سوید! آپ کا شکریہ۔ ''سفال گر'' کی زیادہ اقساط نہیں ہیں۔ آپ کو طوالت کی شکایت نہیں ہو گی۔ تفصیلی تبصرہ اچھا لگا۔ امید ہے آئندہ بھی اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

انعم عنبرین' عائشہ۔۔۔ فیصل آباد

یقیناً ''میری زندگی کا دوسرا خط ہے' میں نے پہلا خط لکھا اور وہ آپ کو پسند نہیں آیا۔ پلیز اس بار خط شامل کر لیں اور خط بھیجنے کی آخری تاریخ بھی بتا دیں اور ہمیں ڈائجسٹ لیٹ ملتا ہے اس لیے۔ ڈائجسٹ گھر میں مجھے اور بقیہ افراد کو بے حد پسند ہے بہت پسند۔ ماڈل بہت خوب صورت تھی بے حد معصوم سی۔ ''کرن کرن روشنی'' اور ''دو سو کے پکوان'' پڑھا اور بیوٹی کے مشورے' مسائل کا حل اور تمام ناولٹ اور سلسلے اچھے تھے ''سفال گر'' اچھا ہے ''چراغ آخر شب'' کچھ بور تھا پسند نہیں آیا۔ فرحت آنٹی کہاں ہیں انہیں ڈھونڈیں۔

ج:۔ انعم' عنبرین اور عائشہ خواتین کی محفل میں خوش آمدید فرحت اشتیاق آج کل ناول لکھ رہی ہیں۔ آپ جلد ہی ان کا ناول پڑھ سکیں گی۔

خواتین ڈائجسٹ کے لیے آپ خط اس طرح لکھیں کہ مہینے کی 22 تاریخ تک ہمیں موصول ہو جائے۔

مریم بانو۔۔۔ گارڈن کراچی

میں عمر کے اس حصے میں ہوں جہاں میرے بچے بھی ماشاء اللہ صاحب اولاد ہیں۔ میری بھانجیاں آپ کے ادارے سے نکلنے والے تمام ڈائجسٹ ہر ماہ منگواتی ہیں۔ میں نے ان سے لے کر ہی پڑھا تو پسند آیا اور یوں بس دل چاہا کہ ذرا خود کو یہاں بھی آزمایا جائے۔

آپ کے ڈائجسٹ کی رائٹر رخسانہ نگار مجھے بہت پسند ہیں۔ ان کے لکھے ہوئے ڈرامے Ary چینل پر پہلے بھی آئے تھے اور آج کل پھر ایک اور ڈرامہ آنے والا ہے۔ آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ T.V پر لکھنے والی اور آپ کے ڈائجسٹ میں لکھنے والی کیا ایک ہی رائٹر ہیں؟

ج:۔ مریم بہن! آپ نے خط لکھا' بہت خوشی ہوئی۔ ہمارے ڈائجسٹ میں لکھنے والی رخسانہ نگار کے ڈرامے ہی ٹی وی چینل پر آرہے ہیں۔

حنا رشید۔۔۔ اسلام آباد

''شعاع'' اور ''خواتین'' تو پڑھتے ہوئے سات یا آٹھ سال کا عرصہ ہو چکا ہے اگر زندگی کی انیس سے زیادہ بہاریں دیکھی ہوتیں تو ہمارا رشتہ اور بھی پرانا ہوتا مگر اٹوٹ تو اب بھی ہے۔

خط لکھنے کی وجہ کسی ایک رائٹر کی تعریف کرنا نہیں ہے کیونکہ میں جانتی ہوں کہ سب رائٹرز کے انداز تخاطب' اسلوب بیاں اور کہانیاں کردار ایسے ہیں کہ بہت سے دلوں کو فتح کر چکے ہیں' جتنی زندگی گزاری اب تک ان رسالوں سے بہت کچھ سیکھا ہو یا نہ ہو مگر عملی زندگی میں بہت سے اہم چھوٹے بڑے فیصلے کرنے میں اپنا مددگار پایا اور خوشی تو اس بات کی ہے کہ ان رسالوں میں خوب صورت انداز بیاں والی رائٹرز کے ساتھ بہت ہی باذوق قارئین بھی ہیں' خط لکھنے کی وجہ محض دل کے جذبات کو قارئین سے شیئر کرنا تھا۔

ج:۔ پیاری حنا! خوش آمدید آپ نے اپنے پرخلوص جذبات سے آگاہ کیا بہت اچھا لگا' زیادہ اچھا لگتا اگر خواتین ڈائجسٹ کی تحریروں پر مفصل تبصرہ کرتیں۔ آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجیے گا۔

ام طیفور۔۔۔ گوجرانوالہ

چار ماہ پہلے میں نے آپ کو اپنے دو افسانے ''نژاکل'' اور ''جو سمجھو تو منزل یہ نہیں'' کے نام سے بھیجے تھے اور کہا تھا کہ ضرور بتائیے گا کہ قابل اشاعت ہیں کہ نہیں؟

ج:۔ ام طیفور! آپ کا افسانہ ''نژاکل'' منتخب ہو چکا ہے۔ شائع ہو جائے گا۔ آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے۔ مزید لکھیں۔

ثمرین خان ۔۔۔ خان بیلہ

آج پہلی مرتبہ خط لکھنے کی جسارت کر رہی ہوں اور اس کی وجہ ہے نفیسہ سعید کی تحریر "اک تارہ جو ٹوٹ گیا" بلاشبہ یہ ایک بہت اچھی تحریر تھی' انہوں نے بہت اچھا لکھا اس کے علاوہ مکمل ناول بھی بہت اچھے تھے' راحت جبیں کا "امرت اور پیالہ" زبردست تحریر تھی۔ اس میں رانیہ کا کردار بہت اچھا تھا اور نایاب جیلانی کا "روشنی سی چار سو ہے" بہت اچھی تحریر تھی فرحت اشتیاق' عمیرہ احمد' تنزیلہ ریاض کہاں غائب ہو گئی ہیں۔ پلیز ان سے کوئی اچھی سی تحریر لکھوائیں باجی ایف ایم 94.6 پر ایک مارننگ شو 8:10 آتا ہے فریش مارننگ کے ڈی جے یاسر قاضی کا انٹرویو کریں۔

ج: پیاری ثمرین! خواتین کی محفل میں خوش آمدید اور دعائیں نفیسہ سعید اور دیگر مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔ یاسر قاضی کے انٹرویو کی فرمائش نوٹ کر لی گئی ہے' جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

بنت فریاد ۔۔۔ (ای میل) ساہیوال

"خواتین" اور میرا ساتھ آٹھ سال پرانا ہے' اس نے ایک ماں کی طرح میری تربیت کی ہے۔ ہمارے گھر میں ڈائجسٹ کو غیر اخلاقی چیز تصور کیا جاتا ہے۔ مگر اس کے باوجود میں پڑھتی ہوں' چھپ چھپ کر تو کبھی سامنے عمیرہ احمد' رخسانہ نگار عدنان' جبین سسٹرز' فرحت اشتیاق' نمرہ احمد' عنیزہ سید' فائزہ افتخار اور ثمرہ بخاری سمیت بہت سی رائٹرز ہماری فیورٹ ہیں۔ رخسانہ جی کا ناول "محبت خواب سفر" کی قسط کا ہر ماہ بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔ رفعت ناہید سجاد کا خوب صورت منظر نگاری سے سجا ناول "چراغ آخر شب" شاندار ہے۔ ہر ماہ اس کو پڑھتے ہوئے ہم اس کے سحر میں کھو جاتے ہیں۔ پاکستان کی تاریخ پر ان کی تحقیق بہت زیادہ ہے اور وہ نوجوان نسل کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ ماضی کے المناک واقعات سے آگاہ کر رہی ہیں۔

ج: بنت فریاد! آپ کا نام سمجھ میں نہیں آیا' فریاد آپ کے والد کا نام ہے؟ یا آپ نے خود اپنا یہ نام رکھا ہے۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

بلقیس اختر ۔۔۔ انگلینڈ

یہ میرا پہلا خط ہے گزشتہ بیس سال سے خواتین ڈائجسٹ سے رابطہ ہے میں برطانیہ میں تیس سال پہلے آئی تھی لیکن مطالعہ کا بہت شوق ہے جب سے "خواتین" سے رابطہ ہوا ہے' افسانوں سے لے کر سلسلے وار ناول تک پڑھتی ہوں اور جب ناول کتابی شکل میں آجاتا ہے تو لائبریری سے لے کر پڑھتی ہوں۔ پہلے کبھی خط نہیں لکھا۔

آج جس بات نے مجھے قلم اٹھانے پر مجبور کیا ہے وہ ایک بہن کا خط ہے جو نومبر کے خواتین میں شائع ہوا تھا' وہ ایک ناول کے بارے میں جاننا چاہ رہی تھیں جو ہما کوکب بخاری کا ناول تھا' جس میں اپنی ماں سگی اولاد کو نفرت کا نشانہ بناتی ہے۔ اس ناول کا نام "اک عمر کے طلسم میں" ہے' جس دن میں نے یہ خط پڑھا۔ اسی دن میں لائبریری سے یہ ناول لے کر آئی تھی۔

اس رسالے نے بہت جگہ میری رہنمائی کی' جتنی بھی تعریف کروں کم ہے۔

ج: بلقیس بہن! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ کا خط پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی' خاص طور پر یہ جان کر کے اتنی دور جا کر بھی "خواتین ڈائجسٹ" سے آپ کا تعلق برقرار ہے۔

آپ نے ہماری قاری بہن کے لیے خط لکھا' بہت شکریہ۔ اچھا ہو تا کہ آپ خواتین ڈائجسٹ کی تحریروں کے بارے میں تفصیلی اظہار رائے کرتیں۔ خواتین کی محفل میں شرکت کرتی رہیے گا۔

رخسار سلیم ۔۔۔ سیالکوٹ

جنوری کا شمارہ ملا۔ ٹائٹل زبردست لگا۔ اپنا خط دیکھا بہت اچھا لگا۔ افسانوں میں ام مریم کا افسانہ "فیصلہ" اتنا اچھا نہ لگا۔ پلاٹ پرانا تھا۔ ام ثمامہ کا افسانہ "اساں تے جانا" بہتر لگا۔ افسانوں میں سبقت فیضیہ عامر نے لی۔ فیضیہ عامر نے اچھا لکھا۔ "سفال گر" بشریٰ نے تیسری قسط میں بھی کمال کر دیا' ناولٹ زبردست جا رہا ہے۔ ویل ڈن بشریٰ سعید جی۔

ج: رخسار جی! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

سونیا ثوبیہ اینڈ منزہ ۔۔۔ ملتان

ٹائٹل گرل پیاری لگ رہی تھی۔ "کہانیاں اور کردار" کے تبصرے پڑھ کر مزہ آیا "مکمل ناول" دونوں ہی اچھے تھے۔ "سفال گر" بشریٰ سعید کی اچھی کاوش ہے' ویل ڈن بشریٰ جی۔ نفیسہ سعید نے "اک تارہ جو ٹوٹ گیا" میں بہت رلایا۔ ہیرو یعنی مرتضیٰ شاہ کی موت بلکہ اذیت ناک موت نے بہت رلایا۔

آپ کی بہت سی رائٹرز آج کل غائب ہیں' جن میں فرحت اشتیاق' عمیرہ احمد' فائزہ افتخار اور بھی بہت سی ہیں۔ پلیز ان سے کہیں ہمارے لیے بھی کچھ لکھیں۔

آپ سے گزارش ہے کہ FM-103 کے زیادہ سے زیادہ کمپیئرز کے انٹرویو شائع کیا کریں۔ اس کے علاوہ آپ سے التماس ہے کہ اپنے مقبول شمارے خواتین' کرن اور شعاع میں ایک ہی ایکٹر کے انٹرویو شائع نہ کیا کریں۔

ج: سونیا' ثوبیہ اور منزہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید ایف ایم 103 کے شعیب احمد کا انٹرویو خواتین ڈائجسٹ میں شائع ہو چکا ہے۔ دیگر کمپیئرز کا انٹرویو بھی جلد دینے کی کوشش کریں۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

ثمینہ چانڈیو ۔۔۔ گوٹھ پیر پریل شاہ

"خواتین" اور "شعاع" کی میں بہت پرانی قاری ہوں۔ خواتین ڈائجسٹ 100٪ زبردست ہے۔ پر پچھلے سال سے 98٪ پر آ گیا تھا' وہ اس لیے کہ پچھلے سال کوئی ایسا ناول شائع نہیں ہوا تھا جو مدتوں یاد رہتا' پر اب یہ پھر سے 100٪ پر آ گیا ہے اور وہ "سفال گر" کے شائع ہونے کی وجہ سے ہے۔ میری عادت ہے کہ کوئی بھی زبردست ناول پڑھتے ہوئے آس پاس کا ہوش نہیں رہتا اور یہ کیفیت بہت عرصے کے بعد وہ ایسے ناول پڑھتے ہوئی۔ پہلا ناول تو سفال گر ہے۔ "سفال گر" کے کیا ہی کہنے جب بھی بشریٰ سعید نے لکھا بہت اچھا لکھا۔ اس ناول کا کردار حکیم بیگم بہت اچھا ہے اور پلیز بشریٰ سعید جی اس ناول میں جتنی انگلش لکھتی ہیں تو ان کا مطلب بھی لکھ دیا کریں اور دوسرا ناولٹ "اک تارا جو ٹوٹ گیا" ہے اس کہانی نے بھی اپنا آپ منوا لیا تھا۔ ایسی بہت سے کہانیاں ہوتی ہیں جن میں کہیں نہ کہیں تھوڑی بہت کمی رہ جاتی ہے۔ پر اس ناولٹ میں کہیں کوئی کمی نہ تھی اور اینڈ پڑھتے ہوئے تو آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

نایاب جیلانی کے سسپنس والے ناول بہت اچھے لگتے ہیں نایاب جیلانی جب خانوں اور شاہوں کی حویلیوں پر لکھتی ہیں تو حقیقت میں مجھے حویلیوں سے ڈر لگنے لگتا ہے۔ پر جب جیجی کنیز نبوی جی حویلیوں پر لکھتی ہیں تو بے اختیار حویلیاں اچھی لگنے لگتی ہیں۔ جیجی سیدہ کنیز نبوی جی شادی ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ ہمیں بھول جائیں۔ اور آخر میں جیجی سیدہ کنیز نبوی کا تعلق کس شہر سے ہے؟

ج: پیاری ثمینہ! آپ نے خط لکھا بہت خوشی ہوئی' کنیز نبوی کا تعلق ٹنڈو محمد خان کے قریبی گاؤں سے ہے۔ آج کل ان کی طبیعت ناساز ہے۔ اس بنا پر لکھ نہیں پا رہی ہیں۔ بشریٰ سعید اور نفیسہ سعید بہنیں نہیں ہیں۔ بشریٰ اوکاڑہ میں رہتی ہیں جبکہ نفیسہ سعید کا تعلق کراچی سے ہے۔

شہناز فیضی ۔۔۔ کراچی

بہت طویل مدت کے بعد پھر حاضر' کچھ مجبوریاں آڑے آ گئیں کچھ دنیاوی اور کچھ گھریلو پریشانیاں بھی تھیں' سو کافی طویل مدت کے بعد آئی ہوں۔

"خواتین ڈائجسٹ" جب پندرہ بیس روپے کا ہوتا تھا میں جب لیتی تھی چالیس روپے کا ہو گیا ہے' اب بھی لے رہی ہوں۔

اصل میں میرے شوہر فیضی صاحب 19 ستمبر 2010ء کو مجھے چھوڑ کر چلے گئے اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرے (آمین)

سرورق کافی دیدہ زیب لگا۔ اقبال بانو' حمیرا راحت اور پرانی لکھنے والیاں کہاں ہیں؟ ذرا آواز تو دیں انہیں۔

مستنصر حسین تارڑ کا انٹرویو آمنہ مفتی نے اچھا لیا۔ "محبت خواب سفر" رخسانہ نگار کی اچھی کاوش ہے۔ مکمل ناول "امرت اور پیالہ" راحت جبیں کا اچھا لگا۔
ناولٹ نفیسہ سعید کا "اک تارا" خوب لگا' افسانوں میں جنوری کے شمارے میں "یہ دل آپ کا ہوا" عفت سحر "ڈور" فیضیہ عامر کا اور "فیصلہ" ام مریم کا اچھا لگا۔ باقی تمام سلسلے اپنی جگہ انگوٹھی کے نگینہ کی مانند تھے۔
ج : پیاری شہناز! آپ کے شوہر کی وفات کا پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور آپ کو صبر جمیل عطا کرے۔ آپ کا خط پڑھ کر پرانے زمانے یاد آ گئے' جب کرن میں ناظمہ طالب ہوتی تھیں "اقبال بانو" باقاعدگی سے آتی تھیں اور آپ کے خط ہر ماہ ہمارے پرچوں میں شامل ہوتے تھے۔

فائزہ نثار ہاشمی..... (ای میل) مراد آباد' ہری پور

میں گزشتہ دس سالوں سے آپ کے رسالوں کی خاموش قاری ہوں اور خاموشی توڑنے کی وجہ بنا ہے میری موسٹ فیورٹ رائٹر رفعت ناہید سجاد کا لازوال ناول "چراغ آخر شب" ہمیشہ کی طرح اس بار بھی کہانی نے سحر میں جکڑے رکھا اور رفعت کہیں بھی اپنے پوائنٹ سے نہیں ہٹیں جو بلاشبہ ایک اچھے رائٹر کی پہچان ہے۔ رخسانہ نگار کے ناول "محبت خواب سفر" پر تبصرہ اس کے اختتام تک محفوظ ہے۔ باقی پورا رسالہ اچھا تھا اور نئے سال کے لیے ایک اچھا آغاز کیونکہ "خواتین" زندگی کی کٹھن راہوں میں ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔
ج : فائزہ! دس سال بعد آپ نے خاموشی توڑی اور اپنی رائے کا اظہار کیا' بہت خوشی ہوئی' اب باقاعدگی سے شرکت کرتی رہیے گا۔ آپ کی تعریف متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔

نائلہ امیر..... کراچی

چراغ آخر شب "بہت ہی پیارا ناول ہے جیسے جیسے پڑھ رہے ہیں' ویسے ویسے رفعت ناہید سجاد کو داد دیتے ہیں۔ اتنا پیارا لکھنے پر۔
"سفال گر" پڑھا اس پر تبصرہ ابھی نہیں کروں گی کیونکہ ابھی وہ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف عفت سحر طاہر کی "یہ دل آپ کا ہوا" پڑھ کر بہت ہنسی آئی' مروی کی معصومیت پہ دل چاہتا ہے کہ از میرشٹ سے اس کی جلدی شادی کرا دیں تاکہ اب وہ مزید بے وقوف نہ بن سکے۔ کوئی تو سمجھانے والا ہوا ہے۔
راحت جبیں کا "امرت پیالہ" پڑھی۔ تیمور پر بڑا ہی افسوس ہوا کہ بے چارا ماں کی ضد کی بھینٹ چڑھ گیا۔ "ام ثمامہ" کی "اساں تے جاناں" پڑھی اچھی لگی۔ "ام مریم کی "فیصلہ" میں شروع میں تو میں سندس کو سمجھی کہ وہ لڑکا ہے۔ کیونکہ کہانی کی ساتویں لائن میں لکھا تھا (جیسے ہی انٹر کے امتحان کلیئر ہوئے اور وہ بہترین نمبروں سے پاس ہوا) اس کو پڑھ کر تو لگا کہ یہ ایک لڑکے کی کہانی ہے مگر..... خیر کہانی اچھی تھی۔ سندس کا فیصلہ پسند آیا۔
نایاب جیلانی کا "روشنی سی چار سو ہے" بہت ہی بہترین ناول تھا۔ نفیسہ سعید کا "اک تارہ جو ٹوٹ گیا" سو سو لگا "اتنا بڑا اتنا اچھا انسپکٹر اک لڑکی کے ہاتھوں برباد ہو گیا" صبا اسلام کی "دو دوپہریں" بھی اچھی لگی۔
ج : نائلہ جی! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ ناولٹ آپ کو پسند نہیں آیا۔ راحت جبیں اور دیگر مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

فوزیہ ثمر بٹ..... گجرات

دسمبر کا خواتین 11 تاریخ کو ملا۔ ہمیشہ کی طرح سب سے پہلے "کرن کرن روشنی" پڑھا۔ سب سے پہلے راحت جبیں کا مکمل ناول "امرت اور پیالہ" پڑھا بہت زبردست تھا۔ رائبہ کا کردار بہت اچھا تھا۔ تیمور کی ماں پر بڑا غصہ آیا کہ کم فہم عورت نے کھوٹے کھرے کی پہچان نہ کی۔ "روشنی سی چار سو ہے" نایاب جیلانی کا اچھا تھا۔ جیسے جیسے ناول پڑھتے گئے حیرانی ہوتی گئی کہ کوئی پھوپھو اتنی بھی ظالم ہو سکتی۔
ناولٹ "اک تارا جو ٹوٹ گیا" نفیسہ سعید کا بہت اچھا تھا۔ ہمارے معاشرے کی عکاسی کر رہا تھا۔ مرتضیٰ جیسے کردار کو مرنا نہیں چاہیے تھا۔ لائبہ کے پچھتاوے کا کیا فائدہ کوئی بے گناہ اپنی جان گنوا بیٹھا۔
"سفال گر" ناول میں کرداروں کی بھرمار ہے۔ ابھی تو کہانی میں بہت گنجلک ہیں۔ کسی بھی کردار کی کوئی سمجھ نہیں آ رہی۔ افسانہ "دو دوپہریں" پسند آیا۔ باقی افسانے بھی اچھے تھے ام مریم کا "فیصلہ" بھی اچھا لگا۔

انٹرویو میں مستنصر حسین تارڑ سے ملاقات اچھی رہی۔ انٹرویو کرنے والی آمنہ مفتی' ایک ناول تھا۔ شاید فیری طوطے اس ناول کی مصنفہ اگر یہی ہیں تو ان سے کوئی اس سا ناول لکھوائیے۔
"آپ کا باورچی خانہ" اور "موسم کے پکوان" اگر ان کے بجائے کوئی اور مزے دار سلسلہ شروع کیا جائے تو خواتین پڑھنے کا لطف دوبالا ہو جائے اور ہاں پلیز نادیہ امین! خواتین کے لیے کوئی ناول نہیں لکھ سکتیں کیا؟
ج : پیاری فوزیہ! آپ کی فرمائش نادیہ امین تک پہنچا رہے ہیں۔ وہ ناول لکھیں گی تو ہم ضرور شائع کریں گے۔ "آپ کا باورچی خانہ" اور "پکوان" ہماری بہت سی قارئین کو بہت پسند ہے۔ اگر قارئین کی اکثریت نے ناپسندیدگی ظاہر کی تو بند کر دیا جائے گا۔
"سفال گر" کے کردار آپ کو الجھا رہے ہیں تو اس کے لیے ہمارا آپ کو مشورہ ہے کہ آپ اس کا خلاصہ پہلے پڑھ لیں۔ اس سے آپ کو مختلف کردار سمجھنے میں مدد ملے گی۔

ثمینہ اکرم..... بہار کالونی' کراچی

جنوری کا خواتین ڈائجسٹ پڑھا' کچھ ابھی تک پڑھ رہی ہوں کہ دوبارہ پڑھنے میں بھی مزہ آ رہا ہے۔ ٹائٹل گرل کی سلیکشن تو خوب اچھی ہو رہی ہے' ہر ماہ ایک تر و تازہ اور دلکش چہرہ نظر آ رہا ہے۔ (بہت خوب) اب آتے ہیں تبصرے کی جانب تو محترمہ آمنہ مفتی نے "مستنصر حسین تارڑ" سے کیا خوب ملاقات کرائی ہے کیا ہی باکمال اور ہمہ گیر صلاحیتوں کے مالک شخصیت ہیں۔ یہ انٹرویو پڑھ کر مزہ آیا۔ نئے سال کا سروے "کہانیاں اور کردار" بھی پسند آیا۔
نایاب جیلانی میری پسندیدہ رائٹر ہیں' ہر مرتبہ مجھے ان کی کہانیاں بہت پسند آئی ہیں مگر اس مرتبہ نایاب جیلانی کا مکمل ناول مجھے کچھ متاثر نہ کر سکا (معذرت کے ساتھ)
کہانی' پلاٹ و کردار میں بہت جھول تھے۔ اس ناول نے مجھے خاص متاثر نہیں کیا۔ مگر اس کی کمی ناول "امرت اور پیالہ" راحت جبیں نے پوری کر دی' اس ناول میں ہمارے ایسے گھرانوں کی تصویر کشی کی گئی ہے' جن کے ہاں بہو کی پرکھ کے معیار جدا ہیں۔ جو خام ہیرے کو بھی پتھر سمجھ کر رد کر دیتے ہیں۔
"سفال گر" بشریٰ سعید کا انوکھا ناول..... ہر ماہ جس کی تعریف قارئین کے ہر خط میں موجود ہوتی ہے۔ یہ خطوط پڑھ کر مجھے اپنے اوپر بڑی شرمندگی ہوتی ہے کہ میں کیوں اتنی کم فہم اور عقل کی کوری ہوں مجھے اس کی ہر قسط (مشکل ورڈنگ) کی وجہ سے کئی کئی بار پڑھنی پڑتی ہے پھر بھی مجھے اس کی کہانی کافی پیچیدہ اور تکلف لگتی ہے۔ جس کا تانا بانا کچھ سمجھ ہی نہیں پائی۔ (ان قارئین سے معذرت جن کا یہ پسندیدہ ناول ہے۔) اس ماہ کے افسانے بس ٹھیک ہی لگے مگر صبا اسلام کا افسانہ "دو دوپہریں" سب افسانوں پر بازی لے گیا۔ مجھے حسن عباسی کی غزل "نیا سال موسم نہیں ہے" بہت زیادہ پسند آئی۔
ج : پیاری ثمینہ! ہمیں افسوس ہے کہ آپ کو اب تک ناولٹ "سفال گر" سمجھ میں نہیں آیا اور آپ کو بار بار پڑھنا پڑتا ہے۔ اگر آپ پہلے پچھلی اقساط کا خلاصہ جو آغاز میں دیا جاتا ہے۔ وہ پڑھ لیں تو آپ کی سمجھ میں کردار آ جائیں گے۔
خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

رفعت ناہید سجاد

پروفیسر عباس رشید کا گھرانہ علمی و تہذیبی اعتبار سے مڈل کلاس روایات کا امین ہے۔ پروفیسر صاحب کی قابلیت اور نیک نامی مثالی ہے۔ وہ تاریخ کے مضمون کے استاد رہ چکے ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں' ان کا دروازہ ہر طالب علم اور خاص و عام کے لیے کھلا رہتا ہے۔ شاگرد ان کے علمی خزینے سے فیض حاصل کرنے آتے رہتے ہیں۔ گھر کا تمام نظم و نسق پرانی گھریلو ملازمہ کریم بی کے ذمہ ہے، جو بڑی جانفشانی سے سنبھالے ہوئے ہیں۔ ان کی بیگم کے ساتھ اولادوں کو بھی آزادیٔ اظہار کی مکمل اجازت ہے۔ ان کی تین اولادیں ہیں۔ تنویر' عثمان اور عبیر۔

بڑی بیٹی تنویر ماں کی لاڈلی ہے۔ دوران تعلیم غیر نصابی سرگرمیوں میں خاصی سرگرم رہی۔ وہ مقامی کالج میں پڑھاتی۔ شادی کے بعد اس کی صلاحیتیں جیسے گہنا گئی ہیں۔ سسرال میں علم اور تہذیب دونوں کی کمی ہے۔ ساس گھر پر حاوی ہیں' اپنے آگے وہ شوہر سمیت کسی کی چلنے نہیں دیتیں۔ تنویر کا شوہر نعیم روایتی مرد ہے۔ وہ ایک مقامی روزنامے میں صحافی ہے لیکن ایک پڑھی لکھی بیوی کے ساتھ اس کا رویہ انتہائی بے حسی لیے ہوئے ہے۔ ایک بیٹی گڑیا ہے۔ جس کی نگرانی کریم بی کے سپرد ہے۔ پسند کی شادی اور نوکری کرنے کے باوجود سسرال میں اس پر زبان بندی کا اصول سختی سے لاگو ہے۔

عثمان عباس کا شمار ان نوجوانوں میں ہوتا ہے، جو قابلیت اور ڈگری کے باوجود معقول نوکری حاصل نہیں کر پاتے۔ تاہم گھر کے ماحول اور پراعتماد فضا نے اسے مکمل مایوس نہیں کیا ہے۔ وہ مختلف [illegible] کے لیے [illegible] اتنا کما لیتا ہے کہ گزر اوقات اچھی ہو جائے۔

عبیر آج کے دور کی لڑکی ہے جو اپنے ذہن سے فیصلہ کرنا جانتی ہے۔ گھر میں باپ سے قریب ہونے کے باعث ان کی علمی تجربے سے فیض اٹھانے کا موقع اسے زیادہ ملا ہے۔ وہ ماسٹرز کی طالبہ ہے' وہ حالات کو حساس انداز میں لیتی ہے۔

عبیرو اتنی بڑی، بن سے زیادہ بچپن کی سہیلی حمیرا اسے قریب ہے۔ او نچے طبقے کی پروردہ وثریا بھی عبیر کی دوست ہے لیکن وہ صرف عثمان کی وجہ سے اس گھر میں آتی جاتی ہے۔ عبیر اسے خاص وجہ سے عزیز رکھتی ہے۔

گھر میں چچا عبدالعزیز اور ماموں کریم بخش اپنے اسرار کے ساتھ بہ وجوہ رہائش پذیر ہیں۔ بڑی تائی بے اولاد ہیں اور بیوگی کے بعد سے کچھ دن قیام کرنے کے لیے پروفیسر صاحب کے یہاں آتی ہیں۔ جہاں ان کی ساس بھی رہتی ہیں۔

عبیر کا گروپ یوم پاکستان کے حوالے سے اسٹیج شو کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ وہ لوگ وطن سے محبت قوم کے دل میں اجاگر کرنے کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں ناکامیوں سے عبیر دل برداشتہ ہوتی ہے تو وہ کچھ دیر کے لیے حمیرا اور رضا کے یہاں چلی آتی ہے، جہاں ان دونوں کی والدہ آپائی اپنے خلوص اور ڈھیر ساری محبت سے ان کا سواگت کرتی ہیں۔ یہ محبتیں اسے روح تک سرشار کردیتی ہیں۔

ان کے گروپ میں ان کی کوششیں رنگ لاتی ہیں اور شو کرنا صرف اسپانسرمل جاتا ہے بلکہ ڈراما آڈینس میں بے حد پسند کیا جاتا ہے۔ عبیر کو سب سے زیادہ شو میں کزن شہریار کی موجودگی مسرور کرتی ہے، جو محض عبیر کی خاطر طویل سفر طے کر کے شو دیکھنے آتا ہے۔ دونوں میں لفظوں سے زیادہ دل کا رشتہ ہے، اس لیے ایک دوسرے کی بات فوری سمجھ لیتے ہیں۔ عثمان شہریار کے لیے عبیر کے جذبات سے آگاہ ہے۔

ان ہی دنوں بابا جان کی عدم موجودگی میں ایک واقف کار سے عبیر کی ملاقات ہوتی ہے، جن کی مختلف سی شخصیت اسے کچھ الجھا رہی ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

قسط 17

کمرے کے وسط میں دھری گول میز اخبار کے ٹکڑوں سے بھری پڑی تھی۔ ایک ایک صفحے کے بنگامی حالات میں چھپنے والے اخبار جس کے ہاتھ جو لگا، وہ اٹھا لایا۔ الٹے سیدھے بے ترتیب بکھرے۔ جن میں سوائے ایک خبر کے اور کچھ نہیں تھا۔ کیمیکل کی تازہ سیاہی کی ناگوار باس کمرے کو بوجھل بنائے دے رہی تھی۔ پتا نہیں یہ سیاہی کی بو تھی یا ان پر لکھے حرف بو دے رہے تھے۔ وہ کاغذوں کے بدرنگ ورق نہیں جیسے رینگتے کلبلاتے پھنکارتے زہریلے سانپ تھے۔ ان کو ہاتھ لگانا تو درکنار وہ ایک اچٹتی نظر بھی ان پر ڈالتے لرز جاتا تھا۔ تہ در تہ ایک کے اوپر ایک رکھے۔

وقت شاید اتنا اہم نہیں رہا تھا۔ گزر گیا تھا یا شاید وقت نہیں گزرتا ٹھہرا رہتا ہے۔ ہم گزر جاتے ہیں۔ بہت پرانی بات نہیں تھی۔ ابھی کل یا شاید پرسوں ایسے ہی ضمیموں میں پاکستان کی غیرت نے گالی کھائی تھی۔ حالانکہ وقت کی کل پرسوں نہیں ہوتی۔ وہ سب ہماری ہوتی ہے۔ اس نے دماغ پر زور دیا۔ کب کا قصہ تھا، جب ہم اپنا تاریخ سے بیٹھے کھیلتے ہیں۔ تو ایسے کلبلاتے سانپ ہم پر بار بار حملہ آور ہوتے ہیں۔ 47ء کو ہم نے حماقت جانا۔ 71ء کو ہم نے فراموش کردیا۔ ہم اس واقعے کو بھی بھول جائیں گے۔ کیونکہ ہم بچوں کی طرح زود فراموش ہیں۔

پتا نہیں کیوں وہ اس ایک سرخی پر توجہ مرکوز نہیں کرپا رہا تھا۔

وہ رات سے اسی ایک جگہ بیٹھا تھا۔ جب اس نے چھوٹے والے کو گھر میں ہراساں حالت میں دروازوں سے ٹکراتے ہمسایوں سے الجھتے ایک صفحے کا سیاہ ورق لیے آتے دیکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اخبار تھا جس کے آدھے حصے میں خون آشام سرخی کی سیاہی تھی۔ اور وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔

ہم نے تاریخ کی کتابیں پھاڑ کر پھینک دیں اور ضمیمے شائع کرلیے تھے۔ حادثے کی نوعیت کچھ بھی تھی لیکن اخباروں کا کاروبار چل نکلا تھا۔ سائیکلوں کے ہینڈل پر سیکڑوں کی تعداد میں الٹے لٹکے ورق، تیز تیز پیڈل مارتے ہراساں آوازیں نکالتے ہاکرز، ایک ہجوم ان کے گرد جمع ہوتا۔ سائیکل پر لٹکے سب اخبار بک جاتے۔ پھر کوئی اور سائیکل سوار، کوئی اور ورق۔ سکوں سے ان کی جیبیں بوجھل ہوگئی تھیں۔ موت کا کاروبار نئی چیز نہیں۔

ریڈیو پاکستان صرف لہریں نشر کرنے والی ایک مشین تھا۔ نہ اس نے معمول کی نشریات روکیں نہ کوئی نیوز بریک کی۔ نہایت اطمینان سے ہمیشہ کی طرح تربیت یافتہ آواز میں ایک لائن کی خبر نشر کرکے وہ شہر کی بقیہ خبریں اس انہماک سے سنانے میں مگن ہوگیا جیسے رہنماؤں کی پھانسی اور منڈیوں کے بھاؤ میں زیادہ فرق نہ ہو۔ جس پر پندرہ لفظوں اور سات لمحوں سے زیادہ وقت صرف نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کمرشل سروس کے زمانے میں ریڈیائی لہروں کا ایک ایک لمحہ قابل فروخت ہے۔ کس کا کتنا مول لگتا ہے۔ کون جانے؟

”آنکھیں غزل ہیں آپ کی اور ہونٹ ہیں گلاب۔“

ریڈیو پر فلمی غزلوں کا نشریہ جاری رہا۔

نیوز کاسٹر جب تک خبریں پڑھتا رہا۔ اس کی آواز ہموار رہی۔ نہ لڑکھڑاہٹ، نہ اشتعال، نہ کسی قسم کی بے بسی۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو آواز کی اس معمولی لغزش سے ملازمت سے ہاتھ دھوتے دیکھا تھا۔ بہت دن نہیں گزرے، جب اس کی ساتھی براڈ کاسٹر نے جو ہر صبح اپنے پروگرام کا آغاز کرکے خوش گوار لہجے میں کہتی۔

”آج جن جن کی سالگرہ ہے ان کو سالگرہ مبارک۔“

5 جنوری کی صبح جب اس نے یہی رٹا ہوا فقرہ بے سوچے سمجھے اسی چہکتی آواز میں دہرایا تو پروگرام کے اختتام پر لات مار کر نکال دی گئی۔

اب اخبار کے دفتروں پر تالے پڑے تھے۔ دفتر کی پیشانی پر آویزاں اخباروں کے بورڈ کوڑے کے ڈھیر میں پھینک دیے گئے۔ صحافی اس سے بھی بدتر حالت میں پڑے رہے تھے۔ صحافت کی اب مزید ضرورت نہیں رہی تھی۔ ریڈیو، ٹی وی کے کمروں کے دروازوں پر برسوں سے لگی نیم پلیٹ تبدیل ہوچکی تھی۔ صرف ایک نخوت بھری دھتکاری ہوئی نظر میں سب دانشور ملعون ٹھہرائے گئے۔ ہر نامور گمنام ہوا۔ ٹی وی کو زمین سے اٹھا کر یہاں تک لانے والے بلیک لسٹ تھے۔ (اور ملک کو گڑھے سے نکال کر کھڑا کرنے والا خود تختہ دار پر لٹک گیا تھا) ان کی جگہ ان ہی راہداریوں میں، ان کمروں میں، ان میزوں کے پیچھے راتوں رات بھرتی کیے، چور دروازوں سے آئے لوگ سر اٹھا کر حکمرانی کرتے تھے۔ ہمارے ہاں چور کبھی نہیں شرماتا۔ وہ سر اٹھا کر بڑی ڈھٹائی سے اپنی قابلیت کی ڈینگیں مارتا ہے۔ سر چھپاتا پھرتا ہے تو وہ جس پر ظلم ہوا تھا۔

بھائی نے ہر سائیکل والے سے ہر ضمیمہ خریدا تھا۔ شاید افواہ ہو۔ غلط خبر چھپ گئی ہو۔ دشمن نے اڑائی ہو۔

”حافظ صاحب! جو بنڈل اٹھائے آتے ہیں شاید ان میں تردید ہو۔“

اس ایک رات بھی وہ جہان بھر کے ریڈیو کھنگالتا پھرا تھا۔ شاید پاکستان نہ ٹوٹا ہو۔ شاید ہم نے ہتھیار نہ پھینکے ہوں۔ قوم کوئی ایسی اہم چیز نہیں۔ جس کے اندیشے حکمرانوں کو ڈراتے ہوں۔ کوئی تردید نہیں آئی۔ خبر غلط چھپ بھی نہیں سکتی تھی۔ اخباروں کی ایک ایک لائن سنسر کی جارہی تھی۔ وہ اخبارات جو پسند نہیں تھے۔ بند کرکے قصہ ہی ختم کردیا تھا۔ کچھ اخبارات اپنی موت مرگئے۔ کتنے لوگ بے روزگار ہوگئے۔ کتنے کا نقصان ہوا۔ نہ کہیں دادرسی تھی نہ کوئی شنوائی، مصلحت کوش بزنس مین کاروبار چمکاتے، صحافت کی جگہ لینے آگئے تھے۔ کوئی ایک لفظ بھی غیر محتاط اور اضافی لکھنے کا مطلب تھا کل سے یہ اخبار بھی نہیں چھپے گا۔ کوڑے لگیں گے، قید کی مدت نہ معلوم۔ وہ اتنے احمق نہیں تھے کہ حق بات کہہ کر اپنی دکان بڑھا لیتے۔

جابر سلطان کون تھا۔ کلمۂ حق کس کو ادا کرنا تھا۔ بہترین جہاد کہاں گیا۔ کبھی ملی فرصت تو دیکھا جائے گا۔
کتنی مرتبہ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس کو لگا۔ اس کے پاؤں اس کا وزن نہیں اٹھا سکتے۔ آموں کے کچے بور پر "یا پاک تو" کوکتی کوئل فضا پر چھائے جاد سنانے کو توڑنے میں ناکام ہوئی جارہی تھی۔ رات پیاسے اونٹ کی طرح سیروں پانی پی کر کے جب اس نے گھڑی میں وقت دیکھا اور تاریخ پر اتفاقاً اس کی نگاہ ٹھہری تو وہ جیسے اس وقت سے اس لمحۂ موجود تک کرسی پر بیٹھا رہ گیا تھا۔ اس کا مہینوں کا اضطراب ختم ہو گیا تھا۔ بار بار جگہیں بدل کر وہ تھک کر شل ہو چکا تھا۔ ایک طلسمی پھونک سے پتھر کا ہو کر وہ وہیں گڑ گیا تھا۔ انہونی کا خوف صرف اس کے ہونے تک ہی رہتا ہے۔ پھر وہ ہو جاتی ہے۔ اس کے سامنے بیٹھے بڑے تایا کی قراقلی ٹوپی ڈھلک کر آنکھوں پر آ گئی تھی۔

وہ جب بھی غصے میں جھلاتے ان کی ٹوپی نیچے کو ڈھلک جاتی اور عالم طیش وہ ٹوپی کو حرکت دیے بغیر غصے سے بڑبڑاتے رہتے۔

"ہم نے پاکستان اس لیے نہیں بنایا تھا۔" 47ء کے بعد جب اپنے بھائی کی تلاش میں گلی کوچوں میں بھٹکتے پھرے اور نامراد لوٹے تو انہوں نے خود کو اس گھر کے لیے وقف کر دیا تھا اور ہر بھرے کے لیے اپنے بقیہ ہم عمروں کی طرح بس یہی ایک فقرہ ہر جملے کا توڑ تھا۔ بار بار حکومتیں ایک دوسرے کو گراتیں۔ ایوب خان آیا اور گیا۔ یحییٰ خان نے پاکستان کے ساتھ ایک بھیانک مذاق کیا۔ مارشل لا در مارشل لا ہر حکومت کی تبدیلی پر بھناتے ہوئے ادھر سے ادھر پھرتے اب تو ایک مدت سے وہ فالج کا شکار اپنے مردہ ہاتھ کو دوسرے توانا ہاتھ سے دبا دبا کر اس میں زندگی کی رمق پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ بیٹھے بیٹھے اعلان کرتے تھے۔ "پاکستان اس لیے نہیں بنایا تھا۔" یہ جملہ ہماری میراث ہے۔ جنھوں نے علی الاعلان آخری لمحوں تک پاکستان کی مخالفت کی وہ بھی دھڑلے سے اپنے جملے یہیں سے شروع کرتے تھے۔ انہیں تو پھر یہ ملک آگ اور خون میں ڈوب کر ملا تھا۔
ابھی دو سال پہلے جب ان پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ اپنی بہوؤں پر بوجھ ہوئے تو نئی بیاہی نائلہ بیگم ان کو اپنے گھر لے آئی تھیں۔ وہ ایسی ہی تھیں بس۔

وہ سب سے زیادہ نائلہ بیگم پر ہی غراتے تھے۔ شوہر کی مسلسل بے روزگاری کے زمانے میں وہ ایک ٹیوشن سینٹر چلا رہی تھیں۔ تو عین اس وقت جب وہ بچوں کی اسکول کی کاپیوں میں گھری بے طرح مصروف ہوتیں۔ تو کھیاں تایا کو تنگ کرنے لگتیں۔ یا اچانک ان کو یاد آ جاتا کہ وہ صبح سے بھوکے بیٹھے ہیں۔ انہوں نے ناشتے میں پراٹھا بھی آدھا چھوڑ دیا تھا کیونکہ نائلہ بیگم کی نااہلی سے وہ سخت بنا تھا اور ان کے دانتوں سے چبایا نہیں گیا تھا۔ ایک نکھٹو والا ہے اور سو بیگم بچوں کا بازار سجائے بیٹھی ہیں۔
لیکن نائلہ بیگم کے چہرے کا اطمینان قابلِ رشک ہوتا۔ وہ ایک لفظ کہے بغیر ان کی طرف دیکھتیں۔ وہ جانتی تھیں۔ واقعات انسان کو تلخ بنا دیتے ہیں اور ان جیسے بے شمار بے روزگار کیے گئے لوگوں کے چولہے ویسے بھی ٹھنڈے پڑے تھے۔
تایا نے خبر سنی لیکن چپ سادھ لی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ان کا جملہ اپنے مخصوص لفظوں سے شروع ہونے سے رہ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

جب ان کا دو منزلہ مکان جلا۔ وہ مکان سے بہت دور نکل آئے تھے۔ جان بچا کر نکلتے انہوں نے پلٹ کر ایک

آخری نظر شعلوں میں بھڑبھڑاتے اپنے مکان پر ڈالی۔ جلتی آگ میں گھس کر بلوائی ان کا سامان گھسیٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جو جس کے ہاتھ لگا اٹھا کر لے دوڑا جب دوسری منزل سے لکڑی کی بخاری نیچے گری تو اس کھلے حصے سے انہوں نے دیکھا اتنی سی دیر میں ان کے گھر کی ہر چیز لوٹی جا چکی تھی۔ اس اجڑے گھر پہ آخری نظر بھی پھر وہاں دیکھنے کو کچھ بچا ہی نہیں سوا جلے ہوئے ملبے کے ڈھیر کے۔ وہ چلتے گئے اور چلتے چلتے ایسے ہی کسی قافلے میں شامل ہوئے جو ان ہی کی طرح جلتے گھروں سے اپنی جان بچا کر نکل سکے تھے۔ وہ جوان کے کچھ نہیں لگتے تھے لیکن کاروان کی صورت میں ایک ہی جگہ سے نکلے اور ایک ہی منزل کی طرف رواں دواں تھے۔ وہ اپنے بچوں، بھتیجے اور بھتیجیوں کو ان المناک دنوں کی کہانی بارہا سناتے تھے۔ قافلہ، جس کے ساتھ وہ گیارہ دن پیدل چلے اور جب چلتے چلتے ان کے پاؤں سوج گئے اور جوتا اس میں پھنس کر چلنے سے انکاری ہوا تو وہ جوتے پھینک کر ننگے پاؤں نکل آئے تھے۔ راستوں کے نوکیلے پتھر پیروں میں پڑے آبلوں کو پھوڑتے جن سے لیس دار مواد اور کچھ لہو زمین پر گرتا ہم کھات لگائے بلوائیوں کے لیے قافلے کے راستے کا نشان متعین کرتا جاتا تھا۔ انہوں نے راستے میں لاشیں دیکھیں۔ تھک کر بے دم ہو کر گرے مسافر دیکھے۔ پیاس سے بلکتے بچے، عورتوں کے مردہ بے جان اور بے لباس جسم اور آسمان پر منڈلاتے گدھ۔ پھر پاکستان کی سرحد پر پہنچ کے سجدے میں گرتے نحیف و نزار وجود دیکھے۔ پھر جب وہ لہجے میں تلخی بھر کے کہتے۔

"ہم نے پاکستان اس لیے نہیں بنایا تھا۔" تو نائلہ بیگم بڑی سہولت سے اس تلخی کو نظر انداز کر دیتی تھیں۔

اس پُرہول سناٹے میں اس کے اندر ہیبت ناک آوازیں گونجتی تھیں۔ جیسے کوئی اندھے کنوئیں میں پتھر پھینکے اور پلٹ کر آتی آوازوں کو دیر تک سنتا رہے۔ اسے ان سناٹوں سے خوف آنے لگا تھا۔ اسے لگا کھڑکی سے جھانکتے آسمان کا رنگ بے وجہ سرخ ہے۔ بیل اور ارنڈ کے درخت سر جھکائے افسردہ کھڑے ہیں۔ ناگنوں سی چلنے والی ہوا نوحہ کرتی ہے۔

شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے۔

اماں نے اس کو چابی دیے ایک گڈے کی طرح باہر نکلتا دیکھا۔ ان کا رنگ فق ہو گیا۔

"عباس! کچھ مت کرنا۔" ان کی آواز لرزیدہ تھی۔ وہ دروازے میں ٹھہر گیا۔

"ارے کرنے کو رہ بھی کیا گیا ہے؟" اتنا بے بس اس نے خود کو کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔

اس کی سائیکل کے تار اب جگمگاتے نہیں تھے۔ پیڈل مارنے گدی سے بھی چرخ چوں کی آوازیں آتی تھیں۔

اب اس کی پتلون کی کریز بھی اس قدر سیدھی نہیں رہی تھی۔ مدت سے کچھ بھی اچھا ہونا بند ہو گیا تھا۔ ماڈل ٹاؤن تو ویسے ہی خاموش بستی تھی۔ وہ ان خاموشیوں سے دور بھاگنا چاہتا تھا۔ شہر سناٹے کی لپیٹ میں تھا۔ اکا دکا سر جھکائے ادھر ادھر آتے جاتے لوگوں کے سوا سڑکوں پر دور دور تک ویرانی تھی۔ لوگ شہر چھوڑ کر کہاں نکل گئے آخر؟ وہ کتنے گھنٹوں سے سائیکل چلا رہا تھا اور کیوں چلا رہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا۔ راستے نامانوس اور منزلیں بے نشاں۔ وہ جیسے کسی اجنبی شہر میں آ بسا تھا۔ وہ دوسروں سے کم اور خود سے زیادہ خفا تھا۔ وہ کسی واقف سے بھی ملنا نہیں چاہتا تھا۔ اندر اٹھتے ابال اور الاؤ اس کا تن من سلگا رہے تھے۔

اور کسی نے خوشی کا اظہار کیا بھی تو وہ اس کا گلا دبا دے گا۔ یا کم از کم ایسی خواہش ضرور کرے گا۔ اجنبی چہرے اس لحاظ سے قابل برداشت تھے کہ اس کی طرف نہیں دیکھتے۔ اپنے آپ میں مگن اپنی دنیا گزارتے ہیں۔

ایک سناٹا ہے۔ لوگ سر جھکائے گزرتے ہیں۔ چپ چاپ۔ اس سناٹے کو کوئی توڑتا بھی نہیں۔ بے آواز آنسوؤں کی گونج اعصاب پر ہتھوڑے کی طرح لگتی ہے۔ جو روتا نہیں وہ ہنس بھی نہیں سکتا۔

دوسری طرف ایک اور گروہ ہے۔ بچوں کی طرح کھلنڈرا لوگوں کے غموں سے بے نیاز۔ اپنی خوشیوں میں مگن۔

یہ وہی بھائی ہے جہاں چھ دن تک احتجاج "ہر روز ایک شخص خود کو آگ لگا کر مار ڈالتا تھا۔ جو لوگ خود کو باہر کی آگ میں نہ جھونک سکے۔ وہ اپنے اندر کی آگ میں جلتے رہے۔ پتا نہیں ان کا یہ احتجاج کس کے سامنے فریاد تھا۔ حکمرانوں کے لیے تو آپ زندہ یا مردہ دونوں حالت میں ناکارہ مخلوق تھے۔ پھر یوم سبت آیا اور انسانوں کی بلی بند ہوگی۔ عجیب موسم تھا۔ غم کی اس حبس زدہ فضا میں ایک طبقہ جشن منا رہا تھا۔ انہیں خوشی کس بات کی ہے؟ گلیاں ہوں سونیاں؟

لوگ ایک دوسرے سے نظریں چراتے تھے کہ حالات سے۔ ان کے لب مقفل اور چہرے کسی بھی تاثر سے عاری تھے۔ سیاسی سرگرمیوں پر عرصہ دراز سے بندش تھی۔

ایک مختصر سے چھوٹے گروہ نے جو نئی سڑک پر نکل آیا تھا حلوہ بانٹنے والوں کو برداشت نہیں کیا۔ وہ ان کی دیگچیاں الٹنے کو لپکے۔ شاید ایک آدھ دیگچا انہوں نے الٹا بھی۔ پھر پولیس ڈنڈے برساتی ان پر ٹوٹ پڑی۔ کچھ نے گولیاں کھائیں۔ کچھ نے کوڑے، باقی غیر معینہ مدت کے لیے سلاخوں کے پیچھے بند ہو گئے۔ ایک دفعہ ان لوہے کی جالیوں کے پیچھے بند ہو جانے والوں کو حکمران اکثر باہر نکالنا بھی بھول جاتے تھے۔ قیدی اتنے تھے کہ جیلیں تنگ پڑنے لگیں۔ عورتیں قید ہوئیں۔ حتیٰ کہ معذور بچے جیلوں میں ٹھونسے گئے۔ غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھنے والے مصلوں سے اٹھا کر جیلوں میں ٹھونسے گئے۔

سرکاری اخباروں اور نشریاتی اداروں نے انصاف کے ڈنکے پیٹے۔ اداریے چھاپے۔ "انصاف کی فتح" فضا پر ایک ہی طبقے کی آواز حاوی تھی۔ ایک پراسرار سکوت کے ساتھ۔ اہل قلم جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ انقلابی شاعروں کے لیے وطن کی زمین تنگ کر دی گئی۔ ایسے لوگ بھی ملعون ٹھہرے جن کا دور سے سیاست سے کوئی تعلق تھا ہی نہیں۔ اچانک نئے نئے نام سننے میں آنے لگے۔ دانشوروں، ادیبوں، شاعروں کو رخصت کر کے راتوں رات ان کی جگہ بھی پُر کر لی گئی۔ صحافیوں کی ایک نئی کھیپ آ گئی اور یہ طے ہو گیا کہ خلاء کسی کے جانے سے پیدا نہیں ہوتا۔

جو بچ رہے ان پر سکتہ طاری تھا۔ وہ لوگ جو آزادیٔ صحافت، انسانی حقوق اور اسلامی نظام کے لیے کھڑے ہوئے تھے۔ ان کا خیال تھا "مشن مکمل ہو گیا تھا کہ ٹھنڈے ہو کر بیٹھ رہے۔ ہمارے دلوں میں لوگوں کے لیے کیسی عجیب نفرت ہے۔ جو ختم ہونے میں نہیں آتی۔ یہاں تک کہ وہ ہم سے زندہ برداشت بھی نہیں ہوتے۔ ہم اپنے لوگ مار دیتے ہیں، اپنے خطے مار دیتے ہیں اور انتقام کی آگ ہے کہ کسی صورت ٹھنڈی نہیں پڑتی۔

"سارے حادثے گزر جاتے ہیں۔ یہ واقعہ بھی گزر جائے گا۔" اس نے بڑبڑا کر خود کو جھڑکا تھا۔

"آج جن جن کو لگ رہا ہے وہ اس صدمے سے مر جائیں گے وہ بھی نہیں مریں گے۔ غم تو اسی بات کا ہے کہ ہم مرتے نہیں۔ مرنا بھی بھول جاتے ہیں۔ سب بھول جاتے ہیں۔ میں بھی بھول جاؤں گا۔"

اس نے ایک نظر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ پتا نہیں اس نگاہ میں شکوہ تھا کہ شکر... بھول جانے سے پہلے وہ ایک دفعہ کھل کر رونا چاہتا تھا۔

اس نے کسی اجنبی بند دروازے سے ٹیک لگائی۔ غنیمت ہوا چاروں طرف سے سر جھکائے گزرتے لوگوں میں اس کو کوئی نہیں پہچانتا تھا۔ وہ بند سبز دروازے سے کمر ٹکائے دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ اور وہ اتنا رویا کہ اس کی ہچکی بندھ گئی۔ آنسو تھے کہ پیاس جو بجھنے میں نہیں آتے تھے۔

اس کے پیچھے بند دروازے کے کواڑ کھلے۔ خاتون خانہ نے جھری سے جھانک کر کسی اجنبی کو اپنی سیڑھیوں پر بیٹھے چیخیں مار کر روتے دیکھا۔ لمحے بھر کو دروازہ کھلا رہا۔ اس کے بعد دروازہ ایک بے آواز صدا کے ساتھ اس پر بند ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

وہ جب گھر میں داخل ہوتا سب سے پہلے ابا کے کمرے میں جاتا تھا۔ لیکن وہ اپنے کمرے میں نہیں تھے۔ وہ لاؤنج میں بھی نہیں تھے۔ ڈرائنگ روم میں بھی نہیں ملے۔ ان کی گاڑی پورچ میں کھڑی تھی۔ اس کا مطلب وہ کہیں نہیں گئے تھے۔

پھر کچھ ان کے خلاف مرضی ہوا تھا شاید اور کچھ نہیں تو وہ مزاج شناس ضرور تھا۔

وہ جب اپنا احتساب چاہتے تو خود کو کمرے میں مقید کر لیتے اور ایک ایک کر کے اپنے ان گناہوں کو شمار کرنے لگتے جو انہوں نے کبھی کیے ہی نہیں تھے۔ گناہوں کی گنتی وہ اپنی پیدائش سے بھی قبل سے شروع کرتے۔

جب مسلم لیگ کے بجائے کانگریس کو مسلم ووٹ مل رہے تھے۔

جب علماء کا بیشتر گروپ قائداعظم پر فتوے لگا رہا تھا۔

اور تب جب کٹے ہاتھ پیروں والے مسافر لیے گاڑیاں ریلوے اسٹیشن پر رکنا شروع ہوئیں تو وہ بھائی چارہ جو اس دن تھا کس کے گناہ کے حساب میں ختم ہوا۔

وہ اپنے باپ کے لیے ایک خالی کنواں تھا۔ جس میں منہ دے کر وہ ہر بات کہہ دیتے تھے۔ ایک صدائے گمشدہ۔ وہ اپنی تاریخ کا گواہ اس کو تھمتی ـــ سے بنائے ہوئے تھے۔ شاید انہیں پھر کسی کندھے کی ضرورت ہو وہ ان کی تلاش سے مایوس ہو کر اپنے کمرے کی طرف پلٹا۔ غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ بجلی کے بٹن کی طرف گیا۔ لمحے بھر کے لیے وہ ہونقوں کا سارہ گیا۔

اس کے کمرے میں گھپ اندھیرا کیے اسی کی کرسی پر بیٹھے وہ جیسے خلاؤں میں نابود تھے۔ ایک دم سے اندھیرے سے تیز روشنی میں آنے پر ان کی آنکھیں چندھیا گئیں، پھر ان کا زرہ بکتر ٹوٹ رہا تھا۔ وہ پھر تیز روشنیوں کی زد میں تھے فرار کہیں نہیں۔

"پھر کچھ ہوا ہے؟" وہ پریشانی سے ان کی طرف دیکھتا رہا۔

سنا ہے جب سے وہ POW ہو کر واپس آئے تھے بار بار اسی حالت میں آجاتے تھے۔ ان کے دوست بتاتے تھے ابتدائی زمانے میں تو ان کی ذہنی حالت بالکل ٹھیک نہیں تھی۔ اس وقت کون صحیح الدماغ تھا؟ نہ ظالم نہ مظلوم۔

"ابا۔۔۔؟"

اسے ابا پر بڑا ترس آیا۔ ان کی آنکھوں میں سیلاب امنڈ تا تھا۔ لیکن پتا نہیں کیسا بند تھا کہ ٹوٹنے میں نہیں آتا تھا۔ چونکہ مدت سے وہ دونوں ساتھ ساتھ تھے۔ اس لیے اس نے اپنا آپ ان کے لیے وقف کر دیا تھا۔ انہوں نے کہا۔

"بیٹا! یہ بزنس دال روٹی چلانے کے لیے ہے۔ لیکن اس میں آدمی ملک کے لیے کوئی بہتری نہیں کر سکتا۔ سوائے اس کے کہ وہ بھیک نہیں مانگ رہا۔ ملک پر بوجھ نہیں ہے اور اسی کے طفیل چند گھروں میں چولہے جل رہے ہیں۔ تم میرا کاروبار نہیں سنبھالو گے۔"

اس نے ان کے کاروبار سے ہاتھ اٹھا لیا۔

"تم بہادر آدمی ہو گے۔ تم کوئی ایسا کام کرو گے جو ظالم کا ہاتھ پکڑ سکے۔ تمہیں پتا ہے میں بہت بزدل آدمی ہوں۔ انہوں نے میرے سامنے میرے بیچارے کی پشت پر کوڑے برسائے۔ ان کی حکمرانی بندوق پر تھی۔ میں ان کا ہاتھ نہیں پکڑ سکا۔ تم وعدہ کرو کسی پر ظلم نہیں ہونے دو گے؟"

اس نے اندھا وعدہ کرلیا۔ حالانکہ گھوم پھر کر دیکھتا تو جہاں جہاں ظالم طبقہ تھا، ستم رسیدگی کے لیے اس کو مظلوم مہیا کر دیے گئے تھے۔ وہ وعدہ نبھا نہیں سکتا' جانتا ہے' لیکن کر تو سکتا ہے' کون کہتا ہے رسم غلامی ختم ہو گئی' آج بھی لوگ لوگوں کے آقا ہیں۔

☼ ☼ ☼
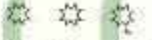
جب پولیس کی وین جھکڑے ڈالے اس کو واپس لے کر چلی تو احمد سلمان نے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس سے بہت دور نہیں تھا۔ لیکن لپک کر اس کی طرف نہ جا سکتا تھا کہ اس کی ٹانگوں سے جیسے جان سلب ہو گئی تھی۔ نہ اس کا سامنا کرنے کی اپنے اندر ہمت پاتا تھا۔ وہ ان کے ساتھ اس کو اپنے سے آہستہ آہستہ دور ہوتا فاصلوں سے دیکھتا رہا۔

"ہم اگر صرف روتے رہیں گے اور کچھ کریں گے نہیں تو ظالم ہمارے آنسو پونچھنے نہیں آئے گا۔ کچھ کرو سلمان! کچھ کرو' ورنہ وہ جو کرنا چاہتا ہے کر گزرے گا۔"

جیل جانے سے پہلے اس نے آخری جملہ اس سے یہی کہا تھا جو اس کی ٹانگوں سے لپٹا آج تک اس کی بیڑیاں بنا ہوا تھا۔ جب اس کو سزا کی تکمیل کے لیے باہر لایا گیا تو مہینوں پہلے کے اس دیے گئے حکم پر وہی لاچاری طاری تھی۔

"کیا کروں عباس؟" اس نے چاروں طرف بے بسی سے دیکھا تھا۔

سپاہیوں کی گاڑی تیز رفتار تھی اور وہ سست رو۔ محلوں میں دھول اڑی اور ایک پھیکی سی بے رنگی کے سوا منظر خالی تھا۔

وہ چپ چاپ اپنی گاڑی میں آ بیٹھا' اسٹیئرنگ سیٹ سے پار جیسے فضا میں دھند سی تھی۔ اسے لگا وہ گاڑی نہیں چلا سکتا۔ ونڈ اسکرین جیسے پانی میں جل تھل تھی۔ کہیں کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا' راستہ تھا بھی کہاں؟

ناچاہتے بھی اس کی آنکھوں سے دو قطرے ٹپکے اور بے اثر ضائع ہو گئے۔ یہ ظالم کا راستہ نہیں روکتے۔ چار سال کی عمر میں گھٹنے پر لگی چوٹ اور اس سے زیادہ اس سے رستے خون کی دہشت سے وہ اول اول رویا تھا۔

اس کی ماں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"مرد رویا نہیں کرتے۔ تم تو بہادر مرد ہو۔"

پھر وہ کبھی نہیں رویا۔ اپنی مردانگی کے زعم کے باوصف۔ زندگی مختصر نہیں تھی۔ کتنی مرتبہ آنسو اپنے حلق تک پہنچ کر منہ کا مزہ تلخ کرتے آنکھوں سے چھلکنے کو بے تاب ہوئے۔ لیکن پھر اس نے کڑواہٹ بھرے گھونٹ واپس نگل لیے۔ کتنی مرتبہ اس کے دل میں سوال اٹھا' اگر مرد رونا چاہے تو اسے کیا کرنا چاہیے' مگر ایسے بچکانہ سوالوں کے جواب دانشوروں کے پاس بھی نہیں تھے۔

سوال ہی سوال' اس کے چاروں طرف بڑے بڑے سوالیہ نشان تھے' اس کی آنکھوں کے آگے ناچتے تھے۔ شہری حقوق کیا ہوتے ہیں؟ جمہوریت کا کیا مطلب ہے۔ مارشل لا کیا ہے؟

اور جب لوگ پاکستان کا مطلب کیا کہ نعرے لگاتے' چاند تارے کا پرچم بلند کیے داخل ہوئے اور اپنی پرچم کو

پاؤں تلے روندتے جے بنگلہ کے نعرے لگاتے کسی اور سمت نکل گئے تو اس کے سوالوں میں اضافہ ہو گیا' پاکستان کیا ہے؟

اس کا بچپن' ناریلوں کے جھنڈ میں پھونس سے بنی جھونپڑیوں کے درمیان چمکتے بالوں اور نمکین چہرہ بچوں کے ساتھ کھیلتے گزرا تھا۔ اس کے بالوں اور چہرے کی رنگت وہاں موجود سب بچوں سے مختلف تھی۔ اور وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کا ذریعہ وسائل بھی ان سے جدا ہے۔ وہ کسی ہنر میں بھی ان کی طرح یکتا نہیں تھا۔ عمر بھر وہاں ہی رہنے کے باوجود الگ تھلک دکھائی دیتا تھا۔ اس کے ساتھی دوست نم ریت میں پاؤں دبا کر قلعے تعمیر کرتے۔ بھیگی ریت کی برجیاں' نم مینار' بھیجے ہوئے گولہ نما گنبد...

لیکن وہ جب بھی پاؤں باہر نکالتا احتیاط کے باوجود اس کا گھروندا ڈھے جاتا۔ وہ روہانسا ہو جاتا۔ جب بار بار اس نے گھر بنانا چاہا اور وہ بار بار گرا تو اس کی آنکھیں نمکین پانیوں سے لبریز ہو گئیں۔ جن کو پی جانے کا حکم ماں پہلے ہی دے چکی تھی۔ وہ اتنا نازک مزاج نہیں تھا۔ لیکن گھر کا گر جانا اس سے کبھی برداشت نہیں ہوا تھا۔

اس کی اپنی زندگی بھی ریت کا گھروندا نکلی۔ ایک دفعہ نہیں بار بار گری۔

ایک مرتبہ جب اس کے والدین ہجرت کر کے مشرقی بازو میں رہنے کے لیے آ بسے تھے۔ ان کے پاس پٹ سن کی سُتلی تیار کرنے کا ایک چھوٹا سا کارخانہ تھا اور وہ اپنے باقی سب ہم نشینوں کی طرح جھینگے خشک کرنے کے کاروبار میں بھی شریک تھے۔ ان کا کام چونکہ سائنسی پیمانے پر ہوتا تھا۔ لہٰذا ٹن پیک جھینگے ایکسپورٹ بھی کرتے تھے۔ چارپائی کی بنائی میں بروئی جانے والی سب سے اعلا اور ان کے علاقے میں بنتی تھی۔ ہموار ملائم ریشم کے لچھے کی طرح تنی ہوئی جس سے ہتھیلیاں سب سے کم زخمی ہوتی تھیں۔ انہوں نے اپنا مختصر سا گھر آباد کر لیا تھا۔ مختصر تر کاروبار کے ساتھ۔ آبا نسراج الدولہ کی محبت میں بنگالہ چلے آئے تھے۔ جنگ پلاسی' جنگ بالعموم ان کو زبانی یاد تھی۔ وہ میر قاسم کے بھی خلاف نہیں تھے۔ لیکن سراج الدولہ ان کی آنکھیں نم کر دیتا تھا۔ وہ اس کی محبت میں جب اس کی تاریخ شہادت بیان کرتے تو محمد امجد رام زائن موزوں کا وہ شعر سنانا بھی نہ بھولتے جو اس مرد مجاہد کی شہادت پر انہوں نے فی البدیہہ کہا تھا۔

لیکن انہیں قدم قدم پر میر جعفر ملے۔ حالانکہ میر جعفر صرف بنگال ہی میں پیدا نہیں ہوئے۔

دوسری دفعہ اس کا گھروندا گرا جب مارچ 71ء سے دسمبر تک اس نے اپنوں میں خود کو تنہا پایا۔ ابا اس کٹھن گھڑی کے آنے سے پہلے دنیا کو چھوڑ کے جا چکے تھے۔ ماں کب گئی اس کے حافظے میں بھی موجود نہیں تھا۔ وہ ایسا خوش فہم تھا۔ (بعد ازاں اس کی بیوی نے جو اس کے لیے رائے قائم کی کہ) وہ ایسا اذیت پسند تھا کہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے ہوتا دیکھتا۔ پھر بھی فرار سے ہچکچاتا تھا۔ اس کی رنگت اور اس کا پس منظر رکھنے والے لوگ کب کے جا چکے تھے۔ ٹھہرے تھے تو وہ جوان جو دُہری موت مر رہے تھے۔ یا وہ سرکاری ملازم جو مغربی پاکستان سے بھیجے گئے تھے۔

وہ ان کے درمیان کیوں تھا' وہ نہیں جانتا۔ یہ اس کا وطن تھا۔ اور اگر وطن یک لخت دو ہونے کا فیصلہ کر لے تو وہ اپنی وفاداریوں کو دو حصوں میں کیسے تقسیم کر سکتا تھا۔

ان آنکھوں نے بہت کچھ ہوتے دیکھا۔ وہ خون بھی دیکھا جو ہندوؤں کے ساتھ مل کر مکتی باہنی والے بہا رہے تھے اور وہ بھی دیکھا جو اس بہتے خون کو بہنے سے بچانے کے لیے بہایا گیا۔ بچھڑے لوگ دیکھے۔ مسلسل گونجتے دھماکوں سے عمارتوں کو ملبے کا ڈھیر بنتے دیکھا۔ دوست اور دشمن کے مرتبے بدلتے دیکھے۔ کل کے دشمن جگری دوست ہوئے۔ ساتھ ساتھ چلنے والے دوست دشمن کہلائے۔ میر جعفر بھی ہم ہیں' امین چند بھی...

وقت گزرنے کے بعد معلوم نہیں تاریخ میں یہ ہی کردار ساتھ چلیں گے یا اپنا اپنا رول پھر بدل لیں گے۔ یہ تاریخ اہم بھی رہے گی یا کوئی نئی تاریخ لکھی جائے گی۔

آج مورخہ 16 دسمبر 1971ء کو ہندوستان ان کا نجات دہندہ ہے۔ وہ ان کے حق کی جنگ لڑ رہا ہے۔ مشرقی پاکستان کو آزادی دلانے کے لیے اپنے خون سے کھیل رہا ہے۔ سوال پھر اس کے گرد منڈلانے لگتے ہیں۔ وہ بنگالیوں کا خیر خواہ ہے تو پورا کا پورا بنگال کیوں آزاد نہیں کرتا۔ اپنی طرف کے بنگالیوں کو آزادی کی اس نعمت سے محروم رکھے ہوئے کیوں ہے؟ لیکن شکست خوردہ قومیں سوال نہیں کرتیں، سر جھکایا کرتی ہیں۔

ریڈیو ڈھاکہ مدت سے بند پڑا ہے۔ لیکن آکاش وانی سے مانک شاہ کے بنگالیوں کے لیے لہو گرم رکھنے کے پیغامات نشر ہو رہے ہیں۔ وہ کہتا ہے "آزادی کی اس جنگ میں اس کا نقصان ہی نقصان ہے۔ وہ بنگلہ دیش پر ایک دن بھی قبضہ نہیں رکھیں گے۔

لیکن ان کا مفاد اس میں ہے بھلے سے ان کو کچھ نہ ملے، لیکن پاکستان کا کچھ بگڑے تو جو ظلم خود انہوں نے ڈھائے اس کا کہیں کوئی ذکر نہیں ملتا۔ جب جرائم کی کتاب ترتیب دی گئی تو ساری کہانی فوج کے مظالم کے گرد گھومتی تھی۔ فوج جو مغربی پاکستان تھی، اردو جو مغربی پاکستان تھی۔ کچھ داستان ہے اور کہیں اس میں زیب داستان ہے۔

اس کا گھروندا بکھر گیا۔ جب وہ ایک ٹرک میں سوار بے شمار اجنبی چہروں کے ہمراہ کسی ایک کے دستخط کے بعد رہائشی سے POW کہلایا۔ اب وہ اپنے لہو کی تلاش کے لیے کس کے ہاتھ دیکھے۔

ایک بڑے میدان میں بھیڑ بکریوں کی طرح اکٹھے کرکے انہیں ہانکا جا رہا تھا۔ یوں حشر کے میدان قیامت سے پہلے بھی برپا ہوتے ہیں۔

ایک ہجوم غفیر ہے جو بے قابو ہو رہا تھا۔ انڈین سپاہیوں کے حصار میں گھرے لوگوں پر ٹوٹ پڑنے کو بے تاب ان کو نوید دی جاتی ہے کہ مکتی باہنی والے ان کی تکہ بوٹی کر دیں گے۔ اپنے اس تحفظ کے لیے انہیں ہندوستانی فوج کا ممنون ہونا چاہیے۔ اسپیکر پر اردو زبان میں ایک عجیب سا گانا بجایا گیا۔

"مار دیا جائے یا چھوڑ دیا جائے بول تیرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔"

انسان پر ایک وقت ایسا بھی آیا جب وہ کوئی قابل ذکر مخلوق نہیں تھا۔

دو سال کے صبر آزما اور اذیتوں سے بھرپور طویل عرصے کے بعد جب اس نے پاکستان کی زمین پر قدم رکھا تو یقین سے سوچا۔

بس اب ختم ہوئی بارش سنگ۔

ہر کنکری نشان زدہ تھی۔ تماشا نہیں تھا مگر اس نے پلٹ کر دیکھا اور عذاب کا حصہ ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

ہم عجیب خوش فہم لوگ تھے۔ جب ہمیں انڈیا کے سب سے غلیظ ٹرکوں میں بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھونس ٹھونس کر بھرا جانے لگا اور اس وقت تک بھرا جاتا رہا جب ہمارے پاس سانس لینے کی جگہ بھی نہیں بچی تو ہمیں کیسا گمان ہوا کہ یہ ٹرک ہمیں سیدھا پاکستان لے جا کر اتاریں گے اور انہیں ہمارا کرایہ بھی کیا تھا۔

لیکن جب ہم سب کو ٹرکوں سے نکال کر کیمپوں میں بھر دیا گیا اور جب ہمارے کمروں پر POW کا ٹیگ لگا تو ہمیں پتا چلا ہم قیدی بن چکے ہیں۔

مدت قید نامعلوم، جرم ہنوز نامعلوم...

انڈین آرمی کی یونیفارم میں ملبوس ہمارے سر پہ کھڑا کوئی شخص ہمیں غلیظ گالیوں سے نوازتا۔ جیت کے نشے سے سرشار اس کے سینے پر تمغوں کے نشان تھے جو شاید اس نے ہمیں شکست دے کر حاصل کیے تھے۔

ہم شکست خوردہ قوم تھے۔ وہ ہم سے جو بھی سلوک کرتے کم تھا۔ لیکن وہیں کھڑے کھڑے اس نے اور اس کے ساتھیوں نے پاکستان کو بھی گالیاں دینا شروع کر دیں۔ قطعی غیر متوقع طور پر کیمپ سے ایک آواز بلند ہوئی۔

"پاکستان" تھکے ہارے' ہزیمت خوردہ اور مایوس مجمع میں ایک ہلچل ابھری۔

"زندہ باد" چاروں اور سے اپنی طرف تنی ہوئی بندوقوں سے بے نیاز۔

پھر ایک مارشل لا سے دوسرے مارشل لا تک۔ ایک دلدوز چیخ بھی اس گونج میں شامل ہو گئی۔ اتنے برسوں میں اس گونج کی دھمک میرے کانوں کو لرزاتی ہے۔

نسلیں بدل گئی' وقت گزر گیا۔

اب مورخ انڈیا سے دوستی کا دم بھرتے ہیں' پاکستان کا زندہ باد ہونا بھی اہم نہیں رہا۔

ایک دفعہ پھر ہم نے اپنے اپنے رول بدل ڈالے ہیں' لیکن یہ دو آوازیں اس کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔

☆ ☆ ☆

وہ چپ چاپ ان کے قدموں میں بیٹھ رہا۔

"کیا حرج ہے ابا! جب سینہ بہت بوجھل ہو جائے تو رو لیا کریں۔ رونا کوئی بری بات تو نہیں' میں بھی ایسے کرتا ہوں۔"

وہ دھیمے سے مسکرائے' آج ان کا بیٹا ان کا باپ بن کر آیا تھا۔ اور وہ چھوٹے بھولے بچے کی طرح اس کے سامنے خود کو بے بس محسوس کر رہے تھے۔

"تم سے گپ لگانے آیا تھا۔ تم کمرے میں نہیں تھے' یہاں بیٹھ کر انتظار کرتا رہا' پھر شاید سو گیا' وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔"

وہ ہوم ورک کر کے نہیں آئے تھے اور بچوں کی طرح بہانے بنا رہے تھے۔

وہ منتظر رہا۔ وہ خود کھلیں گے۔ بہت دیر وہ اس سے اپنے راز رکھ بھی نہیں سکتے۔ وہ جانتا تھا وہ کسی تشویش میں مبتلا ہوں گے تو اس ایک شخص کے حوالے سے۔ جس کو انہوں نے اپنے سامنے کوڑے کھاتے دیکھا اور کچھ نہیں کر سکے۔

"آج مجھے کسی نے بتایا ہے وہ ایک کتاب لکھ رہا ہے' شاید وہ اس پر غداری کا مقدمہ بنانا چاہتے ہیں۔"

"میں نے تو نہیں سنا۔" وہ خاموشی سے ان کی طرف دیکھتا رہا۔ "غداری کیسی؟"

"تمہیں پتا ہے' کسی کو غدار یا کافر قرار دینے کے لیے ہمیں کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ قانون کا زمانہ تو خیر کبھی آیا ہی نہیں۔ یہ تو بالکل لاقانونیت ہے۔"

"اب جب وہ اسے گرفتار کرنے آئیں تو تم اسے چھپا دینا' اپنے عہدے کا اتنا استعمال تو تم کر سکتے ہو نا؟"

"جی بہتر۔" اس نے نہایت تابعداری سے کہا۔ جیسے یہ اسی قدر آسان تھا۔

"میرا دل رکھ رہے ہو؟"

"نہیں ابا! اتنا بڑا دل میں کہاں رکھ سکتا ہوں بھلا۔"

وہ مسکرا دیے' حالانکہ مسکرانا نہیں چاہتے تھے۔ اس نے اپنے باپ کو بچپن سے ہی کسی احساس جرم کا شکار دیکھا تھا۔ جیسے مشرقی پاکستان کا المیہ اور ایک محبوب شخص کے پیٹھ پر لگے کوڑوں کے نشان ان کا گناہ تھے۔

"وہ ابھی تک میرے سامنے کھڑا ہے۔ وہ تمکنت سے نہیں ہٹا۔"

آخر اسے کس بات کی سزا دی گئی۔ وہ خود کو کوستے رہے اور عمر بھر اس سے نظریں نہیں ملا سکے۔

طویل و عریض آسمان اس کے سر پر تنا ہوا تھا۔ جس میں سے سوراخ دار ستاروں سے روشنی چھن چھن کر ان کی چھت پر آتی تھی۔ وہ اپنا تکیہ چھوڑ کر ان کے بازو پر سر رکھ کر لیٹ جاتا۔ کسی ہوئے بانوں کی چارپائی' جس کی پائنتی کی ادوائن وہ ہر رات سونے سے پہلے خود کسا کرتے تھے۔ پھر بانوں کی چادر جو لکڑی کی پٹیوں میں گھستی ہوئی تھی۔ ہاتھ کے وزن سے دبا کر دیکھتے اور جب تک مطلوبہ تناؤ حاصل نہ کر لیتے رسی کو کھینچتے جاتے۔ وہ ادوائن کی رسی پر سیر حاصل تقریر بھی کر سکتے تھے۔ اس کی ایک ایک بنت اور گانٹھ کے عیب گنوا سکتے تھے۔ وہ جب اس رسی کو ہاتھوں میں لے کر کھینچتے تو اسے لگتا پٹ سن کے اس لس کو طول دینے کے لیے وہ رسی کھینچے جاتے ہیں۔ ہر شام برساتی سے اٹھا کر وہ چارپائی چھت پر رکھ دی جاتی۔ سفید میز پوش بچھی میز پر کالا پنکھا ایک تار کے ذریعے سرہانے تک آتا تھا۔ وہ جب سے انڈیا کی قید سے واپس لوٹے تھے۔ بند کمروں میں ان کا دم گھٹتا تھا۔ وہ ہر ممکن کوشش کر کے کھلے آسمان کے نیچے سوتے تھے۔ رات میں کسی وقت بارش برستی تو اسے کندھے سے لگا کر چارپائی گھسیٹتے بارامدوں میں آ جاتے۔

وہ چپ چاپ ان کو کام کرتا دیکھتا تھا اور منتظر رہتا جب تک وہ لیٹ کر اپنا بازو تکیے کی جگہ پھیلا کر اس کو "آؤ بیٹا" نہ کہہ دیتے۔

اس کی آنکھیں بند ہو رہی ہوتی تھیں۔ "ابا کہانی۔"

یہ اس کا روز مرہ تھا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا ابا کی کہانی میں کوئی رنگ نہیں ہوتے۔ نہ وہ کارٹون کی طرح متحرک تھیں۔ نہ فلمی گانوں کی طرح بلند۔

"ایک بادشاہ تھا۔ وہ اپنی رعایا پر بڑا ظلم ڈھاتا تھا' ایک۔۔۔ نہیں تھا بلکہ۔۔۔" وہ مختصر سا وقفہ دے کر کہتے۔ "کئی بادشاہ تھے' اور وہ سب کے سب ظالم تھے۔ وعدہ کرو اگر تم بادشاہ بن گئے تو کبھی ظلم نہیں کرو گے۔" کہانی کے درمیان عہد و پیمان بھی آتے۔ موڑ توڑ بھی آتے۔ خود احتسابی بھی آتی۔ لیکن وہ اس خشک اور بنجر کہانی کا اس قدر عادی ہو گیا تھا کہ اس کے بغیر سو نہیں سکتا تھا۔

وہ ذرا بڑا ہوا اور ان کی چارپائی سے اتر کر اپنی چارپائی پر گیا اور وہاں سے اپنے الگ کمرے میں تو اس پر بڑا خوشگوار انکشاف ہوا کہ اس کے ابا بڑے مزے کی چیز تھے۔ کبھی ہنستے کھیلتے' قہقہے لگاتے' پھر ایک دم وہ اپنا خول اپنے اوپر فٹ کر کے سب کی نظروں سے چھپ کر محفوظ ہو جاتے اور وہیں بیٹھے بیٹھے اپنی غلطیاں انگلیوں پر گنتے جاتے۔ پھر اس ریاضت سے باہر نکل آتے' اور اس کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔

☆ ☆ ☆

اس کے ماں' باپ میں جھگڑا کبھی نہیں ہوا تھا۔ لیکن اختلافات کی بھرمار تھی۔ ماں کے خیال میں باپ ذہنی مریض تھا۔ وہ کسی ایک چیز پر اٹک کر رہ جاتا تو اس میں سے نکل نہیں سکتا تھا۔ وہ ان کی ضرورتیں پوری کرتے تھے' لیکن محبت نہیں کرتے تھے۔ محبت انہیں کسی سے نہیں تھی۔ اس جذبے کے لیے ان کا دل بانجھ تھا۔

ماما ایک پہلو بیٹھے بیٹھے تھک جاتیں تو رخ بدل کر بے تاثر آواز میں بولتی جاتیں' جیسے یہ ان کی زندگی کی کہانی نہیں۔ کسی ناول کا ایک باب ہے۔

"بہت سے جنگی قیدی ذہنی مریض بن گئے تھے۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ نارمل ہونے کی طرف پلٹ آئے۔ انہوں نے واپسی کا سفر دانستہ اختیار نہیں کیا۔ کیونکہ انہیں خود کو اذیت دینے میں مزہ آتا تھا۔

یہ سچ ہے انہوں نے اپنے سوا کبھی کسی کو تکلیف نہیں دی۔ لیکن وہ اپنے آپ کو بڑے اہتمام سے کچوکے

لگاتے تھے۔ کبھی کبھی وہ بے وجہ خوش ہوجاتے اور سارا دن کھلکھلا کر ہنستے۔ تحقیق پر معلوم ہوتا ان کے بچھڑے دوست کی کوئی اچھی خبر آئی ہے۔

وہ کوئی دوست تھا بھی یا کوئی فرضی کردار تھا میں نہیں جانتی' میں نے اس کو کبھی نہیں دیکھا' نہ وہ اس کو کبھی اپنے گھر لائے' نہ ہمیں ان کے گھر لے کے گئے۔

طلاق ان دنوں کوئی بہت اچھی چیز نہیں سمجھی جاتی تھی اور عمر بھر کی چخ چخ بک بک اور زمانے بھر کی الزام تراشیوں کے بعد ہی ہوا کرتی تھی۔ لیکن ہم دونوں ایک دوسرے پر کوئی الزام لگائے بغیر پڑھے لکھے لوگوں کی طرح علیحدہ ہوگئے۔ ہم نے تم پر بھی رسہ کشی نہیں کی۔ لیکن یہ شادی چونکہ یک طرفہ محبت تھی' اس لیے یک طرفہ طور پر ختم ہوگئی۔

تمہارے باپ نے تمہیں کشادہ دلی سے میرے حوالے کرتے بتایا تھا' تمہارے بغیر اس کا جینا مشکل ہوجائے گا' میں بھی تمہارے بغیر جی نہیں سکتی تھی۔ لیکن تم اس کی وہ واحد محبت تھے جس کا اس نے اعتراف بھی کیا تھا۔ لہٰذا میں نے تم کو اسی کے حوالے کردیا۔

ہم دونوں نے تمہیں ایک دوسرے کے خلاف بھڑکانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ فیصلے غلط ہوجائیں تو ان پر ڈٹے رہنے کے بجائے اپنی غلطی مان لینی چاہیے۔

تمہاری تربیت تمہارے باپ نے بڑے شان دار طریقے سے کی ہے۔ اگر تم میں کوئی خامی رہ گئی ہے تو اس کی ذمہ دار میں ہوں۔ میں جس نسل کی پیداوار ہوں وہاں عورت کوئی اہم مخلوق نہیں تھی۔ وہ محض ظلم سہنے کے لیے پیدا کی گئی تھی۔

لیکن میں بڑی خوش قسمت تھی' جب میں نے محبت کی تو گھر سے بھاگنے کی نوبت نہیں آئی اور جب میں نے علیحدگی کا فیصلہ کیا تو میرے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں بنا۔"

"آپ کے زمانے میں سارہ حق نہیں ہوا کرتی تھیں؟"

"اس! یہ کہاں کی اینٹ کہاں کا روڑا جوڑا ہے تم نے' تم میں بھی اپنے باپ کی طرح کیڑا کلبلاتا ہے۔"

وہ زور سے ہنس پڑا۔

"حالانکہ ابھی آپ نے اعلان کیا تھا آپ نے شوہر پر کبھی الزام تراشی نہیں کی۔ پس والدہ جی اطلاع پایا کہ ہم میں سے کوئی نور جہاں و جہانگیر نہیں۔ اور تھوڑے بہت کھسکے ہوئے تو ہم بھی ہوتے ہیں۔ آپ ان سے خفا تو نہیں؟ یہ سچ ہے نا چاہتے بھی آپ کے ساتھ زیادتی ہوئی' لیکن جن حالات سے وہ گزرے ہیں کوئی بھی گزرتا ایسا ہی کرتا' یا شاید کچھ زیادہ کرتا۔"

"تم اپنے باپ کے بہت بڑے سپورٹر ہو فاروق!" وہ طویل وقفے کے لیے چپ ہوگئیں۔ "مجھے اچھا لگا۔"

☆ ☆ ☆
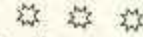
ابا کی عجیب و غریب محبت اس کی سمجھ میں کبھی نہیں آئی تھی۔ لیکن جب چیزیں سمجھ میں آنا بند ہوجائیں تو وہ ان سے الجھنے کے بجائے ان سے صلح کرلیتا تھا۔ کچھ تو ہوگا ایسا اس شخص میں جس کی خاطر وہ عمر بھر اک آگ میں جلے۔

ابا کے ماضی میں سنانے کے لیے ایک موٹی سی کتاب جیسی تاریخ موجود ہے۔ عموماً "لوگوں کے ساتھ کوئی ایک بڑا حادثہ پیش آتا ہے وہ اس کو جھیل جائے تو مجاہد' خوش اسلوبی سے گزر جائے تو شہید۔ لیکن ان کے پاس تو واقعات کی قطار تھی' ایک ہجرت' دوسری ہجرت.....
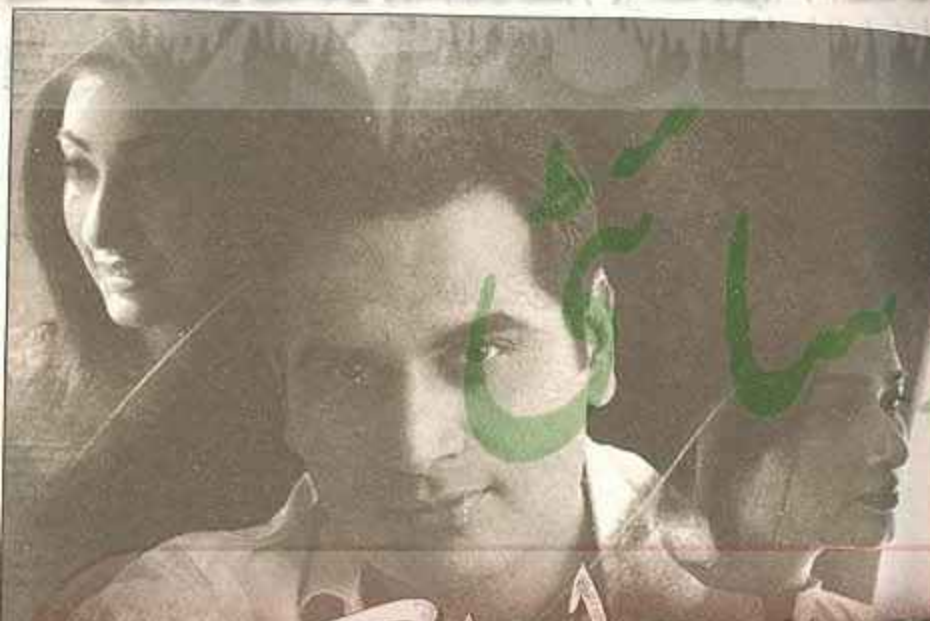
ایک اذیت ایک اور اذیت۔

اور جب وہ کسی کو بتاتے ذرا سے فخر سے بیان کرتا کہ ابا اپنا مال اسباب بچا کر بھاگنے کے بجائے اپنے ساتھیوں کے ساتھ جینے مرنے پر آمادہ POW بن گئے تھے۔

تو اس کے کالج کے زمانے کے ساتھی 'گلے میں سونے کی زنجیریں لٹکائے 'کان میں بالی پہنے 'واک مین کی دھنوں پر تھرتھراتے 'ذرا حیرت سے میوزک کا والیوم کم کرکے پوچھتے تھے۔ "POW کیا؟"

"عو۔" وہ جوابی وضاحت پر تاسف سے کہتے۔ "لیکن یہ تو حماقت ہے اس کا فائدہ؟"

واقعی ہے تو حماقت 'اسے وضاحت دینے پر افسوس لاحق ہو جاتا۔ وہ ابا کی ڈکشنری ان کو نہیں سمجھا سکتا تھا۔ جس میں فائدہ نقصان کے کچھ اور معنی درج ہیں۔ وہ ابا کی ڈکشنری نہیں بدل سکتا تھا 'لیکن اپنے دوست بدلنے سے بھی قاصر تھا۔ جیسے دوست وہ چھوڑ دیتا تھا 'اگلے بھی اس کو ویسے ہی ملتے تھے۔ وہ اپنے وقت میں 'بھس بھرے پرندے کی طرح محفوظ تھا 'لیکن دنیا بڑی برق رفتاری سے اڑان بھرتی آگے سے آگے نکلتی جا رہی تھی۔ اس کی ماں بھی معترض ہوئی۔ اس نے ایک بوڑھے آدمی کے ساتھ رہتے رہتے خود کو بوڑھا کر لیا تھا۔ اس کی سوچ فرسودہ تھی۔ پرواز محدود اور خواہشات صفر اور سب سے پریشانی کی بات یہ کہ اسے خود پر کوئی ملال نہیں تھا۔

وہ باپ 'بیٹا ایک دوسرے کے لیے بہترین دوست تھے۔ کبھی کبھی انہیں شک ہوتا وہ باپ کے رنگ میں اس طرح رنگا گیا ہے کہ شاید محبت جیسا لازوال جذبہ اسے بھی چھو کر نہیں گزرے گا اور یہ کوئی اچھی بات نہیں ہوگی۔

"مگر کچھ تو تھا 'کچھ تو ہوگا؟" اس کی سوئی وہیں اٹکی رہتی۔ دنیا بھر کے اپنے سے متعلق اندیشوں سے بالاتر۔ ابا نے اس کو کاروبار سے "حکما" بے دخل کر دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کیوں 'اس کو ان کا علم ہوتے ہوئے بھی کوئی تامل نہیں تھا۔ لیکن وہ جب لاہور آتا تو آتے جاتے ان کے دفتر چکر ضرور لگاتا۔ کبھی صرف کافی پی کر چلا آتا۔ کبھی ان کو ساتھ لے کر کہیں کھانے کے لیے نکل جاتا۔ لیکن اس آتے جاتے جھانکنے میں وہ ان کی ذہنی صحت سے باخبر رہتا۔ وہ جب اپنے خول میں بند ہونے کی خواہش کرتے تو وہ چھٹی لے کر آجاتا۔ خواہ ساری چھٹی اسے اکیلے اپنے کمرے میں ٹی وی دیکھتے گزارنی پڑے۔

"ایک اجازت درکار تھی آپ سے؟"

ان کی شیلف میں کتنی دیر کتابوں سے کھیلتے 'لفظوں کی خوب صورت ترتیب دیتے 'جیسے اپنے ارادے ترک کرکے اس نے ابا سے سیدھا سوال کر ڈالا تھا۔

"میں سر عباس رشید سے ملنا چاہتا ہوں 'آپ معترض نہ ہوں تو..."

کتنے دن بعد وہ آیا تھا اور اس کی آمد سے وہ کیسی عجیب مغرورانہ سی خوشی محسوس کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنا پائپ کش لیے بغیر واپس میز پر چپ چاپ چھوڑ دیا۔ ان کے چہرے پر ہلکی سی تکلیف کا سایہ ان کے چہرے کو چھوتا گزر گیا۔

"پتا نہیں فاروق!" ایک طویل وقفے کے بعد انہوں نے ٹھہری سی آواز میں کہا۔ "میں اس سے کیوں بھاگتا پھرتا ہوں 'نظریں بچاتا 'آنکھیں چراتا 'وہ اسی شہر میں رہتا ہے 'وہ جانتا ہے 'اور میں جانتا ہوں اور وہ مجھ سے ناراض نہیں ہوگا 'لیکن پھر بھی..."

کسی الجھی سی کیفیت میں انہوں نے ڈوبتے پھر پائپ کا سہارا لینا چاہا۔ وہ راکھ ہو گیا تھا۔ وہ جھنجلا سے گئے۔ یہ کیسی آگ ہے جو لمحوں میں ٹھنڈی پڑ جاتی ہے۔

"آپ نے ان کا کچھ نہیں چرایا بابا!" ایک مدت بعد اس نے ان سے اختلاف کیا تھا۔

"لیکن ان سے نظریں بچا کر آپ اپنا نقصان ضرور کر رہے ہیں۔ کیا وہ اپنی Suffering کے لیے آپ کو قصوروار ٹھہرا سکتے ہیں؟ ایسا آپ کو لگتا ہے، ان کو نہیں لگتا ہوگا۔ یا کم از کم مجھے دیکھ ہی لینے دیجیے۔ ان کو ایسا لگتا ہے؟"

وہ بڑا ہو گیا تھا۔ ان سے اختلاف کر رہا تھا۔ اپنے فیصلے کر رہا تھا۔ عجیب سی خوشی ان کی روح کو سرشار کر گئی۔ جب جب وہ بڑا لگتا، ان کے اندر بچہ بننے کی خواہش جاگنے لگتی ہے۔

"جو ذلت انڈین کیمپ میں اٹھانا پڑی۔ اسے بھولنا آسان نہیں تھا۔ کس سہولت سے اس نے کہا، بھول مت ایسی باتیں تو کبھی نہیں بھولنی چاہییں، ہاں اس میں سے نکل آنا چاہیے۔

اس نے مجھے بارہا منع کیا۔ لیکن جب میں نے اسے کوڑے کھاتے دیکھا تو میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں اس کے منع کرنے پر تاریخ کو معاف کیسے کروں۔ پولیس وین اس کو لے کر چلی اور میں وہیں نکل گیا۔ ایک ہجرت اور سہی لیکن جب تک بستی لال کمال کا حادثہ نہیں ہوا میں نے پلٹ کر واپس آنے کا سوچا بھی نہیں۔

"کیا تم نے کبھی اس کو دیکھا بھی نہیں۔"

"نہیں ابا! لیکن میں ان کو اس طرح نہیں دیکھنا چاہتا کہ ان سے کسی دانش گاہ میں علمی و سائنسی حقائق پر لیکچر سنوں یا کسی تعلیمی کانفرنس میں سوٹ پہنے ٹائی لگائے مائیک یا ملٹی میڈیا پر معلومات بکھیرتے دیکھوں۔ میں انھیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ ایسے جیسے آپ کو دیکھتا ہوں یا جیسے آپ انہیں دیکھتے ہیں۔

آپ جانتے ہیں بابا! ہیرو کو ہمیشہ بغیر میک اپ دیکھنا چاہیے۔ وہ کیسے رہتا ہے، کیسے باتیں کرتا ہے، کیا کھاتا ہے، بہت قریب سے۔ لیکن بالکل بے خبری میں۔"

"وہ تمہیں فوراً پہچان لے گا۔ تمہاری شکل حیران کن حد تک مجھ سے مشابہ ہے۔"

"اس کا مطلب میں نہایت ہینڈسم آدمی ہوں۔ تمہیں پہچان سکیں گے۔ میں یقین دلاتا ہوں، مجھے اپنے پروفیشن سے یہ ہی فائدہ اٹھانے دیں، کم از کم..."

"سوچ لو، وہ بڑا قابل آدمی ہے۔" ان کے لہجے میں اپنے دوست کے لیے ناقابل بیان سا فخر تھا۔

"کیا کرو گے؟ بہروپیے کی طرح نقلی داڑھی مونچھ لگا کر نہ چلے جانا۔ احمق نہیں ہے وہ۔ ویسے بھی یہ زندگی ہے کوئی اسٹیج نہیں۔"

"اور آپ نے کیسے توقع کر لی کہ میں ایسا احمق ہوں کہ یہ کروں گا؟"

"چہرے سے لگتا ہے ایسا ہی کرو گے۔"

"چلیں ایسا کیا بھی تو لگی شرط مجھے وہاں کوئی نہیں پہچان سکے گا۔"

"تم میرے دوست اور اس کے خاندان کو انڈر اسٹیمیٹ کر رہے ہو۔ اور میں نہیں چاہتا کہ تم دونوں میں سے کوئی بھی ہارے۔"

☼ ☼ ☼

"بابا میں ہار گیا۔" جس سے بھری ایک شام وہ کس خوش مزاجی سے چہکتا ہوا دروازہ کھول کر بابا کے آفس میں داخل ہوا۔

"پہچان لیے گئے نا!" بابا نے آفس چیئر پر حرکت کیے بغیر محض آنکھیں اٹھا کر شرارت سے اس کی طرف دیکھا۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

کوئی حاصل نہیں آرزو کا

کومل صبا

کھٹاک کی آواز سے دروازہ بند ہوا تو وہ جیسے کسی بھیانک خواب سے جاگی تھی۔ فرش پہ بکھری سی ورز اور کاغذوں پہ ایک نظر ڈالی' پھر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ایک ایک کاغذ سمیٹنے لگی۔ مگر منتشر ذہن اور مفلوج وجود نے ساتھ نہ دیا تو وہیں بیٹھ کر ہانپنے لگی تھی۔ جیسے کئی گھنٹوں تک بھاگنے کے بعد کوئی بے دم ہو کر زمین پہ گرے۔ صرف آدھے گھنٹے میں اس کے اس ویل فرنشڈ کمرے میں کیسا تعفن سا پھیل گیا تھا۔

''یقین نہیں آتا مجھے کہ یہ تم نے لکھا ہے۔ سیرت فاطمہ' یہ تمہارے قلم سے نکلے الفاظ ہیں' کبھی غور کیا ہے کہ تم کیسی عامیانہ باتیں اور واہیات تحریر لکھنے لگی ہو۔ تمہارے ہر لفظ میں زندگی سانس لیتی تھی۔ تمہاری تحریر میں ایمان اور محبت کے قصے تھے۔ تم اپنے لیے لکھتی تھیں سیرت' وہ تمہارا ذات حسن تھا' تمہاری سوچ کی پاکیزگی اور پختگی تھی جو تمہاری تحریر سے جھانکتی تھی اور اپنا آپ منوالیتی تھی۔ تم نے اپنی ذات کے ظاہر کو ہی نہیں باطن کو بھی اس چکا چوند دنیا کے ہاتھوں گروی رکھ دیا۔ سیرت! میں نے تم پہ اعتبار کیا' تاکہ تمہاری ذات کے رنگ ماند نہ پڑیں اور تم نے خود ہی وہ سارے رنگ دھندلا دیے۔''

دکھ خضر کے لہجے سے ہی نہیں' اس کے چہرے سے بھی ظاہر تھا۔

''یہ سب میڈیا کی ڈیمانڈ تھا' اس لیے۔'' سیرت نے ہکلا کر وضاحت کرنا چاہی۔

''ڈیمانڈ؟'' خضر استہزائیہ ہنسا۔ ''تم کب ڈیمانڈ کے تحت لکھنے لگیں' سیرت! تمہاری تحریر تمہاری ذات کا عکس تھی' تمہاری سوچ کی آئینہ دار' تمہارے جذبات کا اظہار' پھر تم کب سے اپنی سوچ اور جذبات کا اظہار دوسروں کی ڈیمانڈ کے مطابق کرنے لگیں۔''

خضر اسے آئینہ دکھا کر کب کا کمرے سے جا چکا تھا اور اب وہ تنہا کمرے میں بیٹھی اس کی آواز کی بازگشت سے لڑ رہی تھی۔ اس نے ایک نظر اپنے سراپے پہ ڈالی۔ جینز پہ وائٹ کرتا پہنے' شولڈرز تک آتے بال' ہاتھ میں دو نازک سے بریسلیٹ' ہلکی پھلکی جیولری۔ وہ مکمل ایک ورکنگ وومن کے حلیے میں تھی اور یہ حلیہ تو اسے اس شوبز کی چکا چوند دنیا نے عطا کیا تھا۔ وہ سادہ سی' لاپروا اور گھریلو سی سیرت فاطمہ تو کہیں کھو گئی تھی۔

اسے لکھنے کا جنون تو نہیں تھا' مگر اسے لکھنے سے عشق تھا۔ وہ لکھتی تب تھی جب وہ کوئی چیز شدت سے محسوس کرتی اور لفظ خود بخود اس کے اندر سر ابھارنے لگتے۔ لکھنے کے لیے اسے کبھی کسی مخصوص ماحول کی ضرورت نہ پڑتی تھی' کہیں بیٹھے بیٹھے کام کرتے ہوئے ذہن بس خود بخود ہی کسی منظر میں پہنچ جاتا' پھر کردار چلنے پھرنے لگتے' لفظ بولنے لگتے اور یوں تحریر مکمل ہو جاتی اور اگر کبھی کوئی منظر صفحۂ قرطاس پہ نہ بکھر پاتا تو جیسے کنڈلی مار کے ذہن کے کسی کونے میں پڑا رہتا۔ تاوقتیکہ وہ قلم بند نہ ہو جاتا۔ وہ لکھتی تھی مگر صرف اپنی ذات کے لیے' مگر پھر کب' کیسے اور کس کس کے اصرار پہ وہ اپنی تحریر کو منظر عام پہ لانا شروع ہوئی' اسے پتا ہی نہ چلا۔

پھر یوں ہوا کہ وہ تحریریں جو اس کی ذات کا عکس تھیں وہ لوگوں کے دلوں میں گھر کرنے لگیں۔ کچھ وقت گزرا تو احساس ہوا کہ جس ذات اور سوچ کو کسی خاطر میں نہ لائی تھی۔ وہ کتنی دلوں کی دھڑکن ہے۔ اس کے الفاظ دلوں میں محبت کی حرارت جگاتے تھے۔ وہ محبت جو روح کے احساس سے جڑی ہے۔ وہ محبت جو رشتے کے ریشم سے بندھی ہوئی ہے۔

نشہ ذات کو فنا کر دیتا ہے اور سوچ کو مفلوج' سیرت فاطمہ کو بھی شہرت کا نشہ چڑھنے لگا تھا۔ وہ عشق جو اسے تحریر سے تھا۔ وہ اپنی ذات کے عشق میں بدلنے لگا تھا۔ ان ہی دنوں اس کی زندگی میں خضر حیات کے نام کی دستک ہوئی اور یہ پہلی دستک ہی جیسے آخری تھی۔ پھر کوئی اجنبی شہزادت کے دروازے پہ آیا' نہ کسی کے لیے دل کا دروازہ کھلا اور جن دنوں وہ خضر حیات کے ساتھ شادی کے خوب صورت بندھن میں بندھی' اڑی اڑی پھر رہی تھی' ان ہی دنوں اسے ایک بہت نامی گرامی ڈراما ڈائریکٹر کا فون آیا۔ وہ اس کی تحریر ڈرامہ بنانا چاہتے تھے اور جب خواب ایسے راستے دکھانے لگیں۔

شہرت کا نشہ ایک بار پھر سے سر چڑھ کر بولنے لگا۔ مختلف چینلز پہ چلنے والے ڈرامے' شوبز کی چکا چوند روشنیاں' تقاریب' ایوارڈز' ایک نیا ہی جہان تھا جو اس کے سامنے کھلا پڑا تھا۔ اور پھر اس جہان میں سیرت فاطمہ کی ذات کھو گئی' اسے پتا ہی نہ چلا' اس کے تو بس خواب تھے اور وہ تتلی کی طرح ان خوابوں کے تعاقب میں اڑی پھر رہی تھی۔

کب اس تتلی کے رنگ اڑ گئے خبر ہی نہ ہوئی۔ خضر نے کبھی اسے کسی کام سے نہ روکا تھا۔ مگر اب شاید اس کی برداشت ختم ہو گئی تھی۔ جبھی تو وہ آئینہ لیے اس کے روبرو آ کھڑا ہوا تھا اور اس آئینے میں اس کا چہرہ کتنا بھیانک تھا۔ اس چکا چوند دنیا کے پیچھے جو سیاہی تھی' وہ سیرت کو اپنے چہرے پہ پھیلی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

وہ دنیا میں تبدیلی لانے چلی تھی' اپنی سوچ سے' اپنی تحریر سے' اور کتنے کچے تھے اس کے رنگ جو بس ذرا سی تبدیلی پہ ماند پڑ گئی۔ وہ تو خود سرتاپا بدل گئی تھی۔ وہ ساری باتیں' وہ سارے کام جن سے کبھی اسے نفرت تھی' وہ سارے اس نے اپنا لیے تھے۔

وہ اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ دوپٹے سے بے نیاز' یہ وہ تھی جس نے کبھی سر سے دوپٹہ ڈھلکنے نہ دیا تھا۔ وہ اضطراری انداز میں وارڈروب کی طرف بڑھی' کتنے ہی خانے کھنگالنے کے بعد اسے بلیک کلر کا دوپٹہ ملا تھا۔ کانپتے ہاتھوں سے دوپٹہ اوڑھنے کے بعد اس نے ڈریسنگ ٹیبل سے نیل پالش ریموور اٹھایا اور کیوٹیکس صاف کرنے لگی۔ یہ کام کرنے کے بعد اس نے ہیر بینڈ میں بال جکڑے' پھر آئینے کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ مگر کوئی کمی تھی ابھی بھی کوئی کمی تو تھی جو اسے محسوس نہ ہو رہی تھی۔

تھک کر وہ دوبارہ کارپٹ پہ بیٹھ گئی۔ ظاہری طور پہ وہ خود کو بدل بھی لیتی تو وہ اب پرانی سیرت فاطمہ نہیں بن سکتی تھی۔ وہ جس کا دل پیار اتھا جس کی سوچ خوب صورت تھی۔ اس سوچ نے جیسے اس پہ جنون سوار کر دیا تھا۔ سارے مسودے اس نے پھاڑ ڈالے تھے۔ اپنے ڈراموں کی سی ڈیز توڑ ڈالی تھیں۔ وہ چیخ چیخ کر رو دی تھی۔ وہ اب کبھی نہیں لکھ سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی' اس کے اندر کی رائٹر مر گئی ہے۔ خود کو کھو دینے کا پچھتاوا اب کبھی اسے لکھنے نہ دے گا۔ وہ اب کبھی قلم اٹھا ہی نہیں سکتی تھی۔

☆

ام مریم

قافلے راہ بھول جاتے ہیں

اس نے اس کی تصویر کو دیکھا اور مسکرا دی۔

"قافلے راہ بھول جاتے ہیں۔" تصویر کے نیچے لکھی یہ عبارت دوا سائیں کے ہاتھ کی تھی جنہوں نے بہت... بے تحاشا محبت کی تھی بازل خان سے اور ہمیشہ اتنے وثوق سے یہ بات کہا کرتے۔

"ہمارا بازل خان محبت کرنے کے لیے ہی بنایا گیا ہے۔ وہ اتنا حسین ہے کہ اس کے حسن و جمال کی آب و تاب کے سامنے نگاہ نہیں ٹھہرتی۔"

"ایسا حسن کہ خالق کی تخلیق پہ پیار آجائے۔" ہمیشہ کتنی محبت ہوا کرتی تھی ان کے لہجے میں۔

"جب ہماری ڈالے بڑی ہوجائے گی تو ہم اس کا بیاہ بازل خان سے کریں گے۔"

"وہ بھی بازل خان کی طرح سے ہی خوب صورت ہے نا دوا سائیں؟" وہ ٹھنک کر پوچھتا اور دوا سائیں اسے جھک کر چوم لیتے۔

"وہ بھی خوب صورت ہے مگر اپنے بازل خان کی تو بات الگ ہے اس کا کیا مقابلہ۔"

"بازل خان اپنے سے کم خوب صورت لڑکی سے شادی نہیں کرے گا۔" جواباً وہ نخوت سے کہتا اور دوا سائیں ہنستے جاتے پھر اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتے اور کہتے۔

"تجھ سے زیادہ حسین لڑکی کا ملنا مشکل نہیں ناممکن ہے پتر! اس لیے تو ڈالے سے ہی بیاہ کرلیتا۔ اتنا حسین من موہنا چہرہ بس ایک ہمارے بازل خان کا ہی ہوسکتا ہے جسے دیکھ کر قافلے راہ بھول جائیں۔"

"قافلے راہ کیوں بھول جاتے ہیں دوا؟" وہ معصومیت سے پوچھتا اور دوا مسکرانے لگتے۔

"خدا جب کسی شاہکار کو تخلیق کرتا ہے نا پتر! تو اس کی تخلیق کو خود بخود ہی اس سے محبت ہوجاتی ہے۔ یہ بھی قدرت والے کی ایک قدرت ہے۔ اس نے حسن کو ہر کسی کی کمزوری بنایا ہے۔ جیسے میری کمزوری 'یہ محبت' جو ہے نا پتر! بڑی ہی بے پروا اور انوکھا جذبہ ہے پہاڑوں سے نہریں نکلوا دیتا ہے۔"

دوا کہتے جاتے اور ان کی ہر بات تھوڑا ہی اس کی سمجھ میں آتی تھی۔ وہ اگلے ہی لمحے کسی کھیل میں مگن ہوجاتا اور دوا سائیں اپنی کسی کتاب کے مطالعے میں جبکہ ڈالے سوچتی رہتی قافلے راہ کیسے بھول جاتے ہیں؟

☆ ☆ ☆

دوا سائیں کی وفات کے بعد بازل خان پڑھائی کے لیے ہوسٹل میں ہی مقیم ہوگیا۔ وقت گزرتا گیا۔ وہ ایک بہت عام ساون تھا جب وہ اپنے کالج فیلو سے نوٹس لینے اس کے گھر آیا تھا۔ اس کی دستک کے جواب میں دروازہ ایک بوڑھی خاتون نے کھولا۔

"ارسلان ہے! مجھے اس سے کام تھا۔" بڑھیا کی بغور جائزہ لیتی نظروں سے جزبز ہوتا وہ گڑبڑا کر بولا تھا۔

"نہیں، وہ گھر پہ نہیں ہے تم کون ہو؟"

"میں بازل خان ہوں، وہ آئے تو اسے بتا دیجیے گا۔"

وہ جانے کو پلٹا تھا جب بڑھیا نے بے ساختہ پکار لیا تھا۔

"اندر آجاؤ۔ اس کا انتظار کرلو، آتا ہی ہوگا۔"

انہوں نے اسے بلا کر چائے بھی پلائی تھی۔ تب ہی تھوڑی دیر بعد ارسلان بھی آگیا۔ اسے دیکھ کر واقعی حیران ہوا۔

"مجھے دادی نے بٹھایا تھا چائے بھی پلائی۔" اس کے کمرے میں آکر وہ مزے سے بولا۔

"تم نے کون سا سحر پھونک دیا ان پہ، وہ تو کسی انجان کو گھر کے آس پاس بھی پھٹکنے نہیں دیتیں؟" ارسلان کی حیرت کم ہونے میں نہیں آرہی تھی۔ اس نے کاندھے اچکا دیے۔

"پتر! توں اپنا سوہنا ایں فلماں وچ کم کیوں نہیں کروا؟"

جب وہ واپس آرہا تھا دادی کے اس سوال پہ اس کا قہقہہ چھوٹ گیا تھا۔ مگر تب اس بات کو ہنسی میں اڑاتے ہوئے اس نے گمان تک نہ کیا تھا کبھی وہ سچ مچ فلموں میں کام کرنے لگے گا۔

☆ ☆ ☆

دوران تعلیم ہی اسے فلم میں کام کی آفر ہوئی تھی تو اس کی بنیادی وجہ اس کی بے تحاشا مردانہ وجاہت ہی تھی۔ بازل خان نے اس آفر کو قبول کیا اور کسی بے علم میں لائے بغیر پہلی فلم سائن کرلی۔ جو باکس آفس پہ پاکستان کی تاریخ میں کامیابی کے تمام ریکارڈ توڑ گئی۔

اور یہیں سے گویا اس کی شہرت و کامیابی کا آغاز ہوگیا۔ اسے دھڑا دھڑ فلموں میں سائن کیا جانے لگا۔ راتوں رات میں وہ سیلبرٹی بن گیا مگر گھر والوں کی طرف سے اتنا ہی شدید ری ایکشن سامنے آیا تھا۔

بابا تو باقاعدہ ناراض ہوئے اور اسے کبھی حویلی میں نہ گھسنے کا حکم سنا دیا۔ ساتھ ہی عاق کرنے کی بھی دھمکی دی۔ وہ ایسا لازمی کر گزرتے اگر جو اس کی ماں آڑے نہ آجاتیں۔ یہ اماں ہی تھیں جنہوں نے اپنی مسلسل کوششوں سے بابا کے دل کو اس کی طرف سے صاف کیا تھا۔ اس کی پے در پے کامیابیوں کے جھنڈے گڑتے دیکھ کر بابا کا دل بھی پسیج گیا وہ بھی اسے معاف کرنے پہ مجبور ہوگئے۔ نہیں کیا تو ژالے آفریدی نے۔ جو اس کے سگے چاچا کی بیٹی تھی اور اس کی بچپن کی منگ بھی۔

بازل خان کا ارادہ ہی کہاں تھا اس سے شادی کرنے کا۔ نہ اس کی ژالے سے کوئی جذباتی وابستگی تھی۔ ان کے ہاں پردے کی بہت سختی تھی اور اس نے تو بچپن کے بعد ژالے کو کبھی دیکھا بھی نہیں تھا مگر اس سالی شام جب اس کی بہن کی شادی تھی اور وہ اس روز شوٹنگ سے فارغ ہو کر واپس حویلی آیا تھا چونکہ روشانے کے لیے ہی ساری شاپنگ کرکے لایا تھا جب ہی سیدھا اس کے کمرے میں چلا آیا۔

"روشی! دیکھو کتنی خوب صورت شاپنگ کی ہے تمہارے لیے۔ کیا اب بھی خفا ہی رہوگی؟" ہاتھوں میں موجود شاپنگ بیگز بیڈ پہ اچھالتے وہ فوراً" آگے بڑھ کر کھڑکی کے سامنے کھڑی لڑکی کے گلے میں بازو حمائل کرتا ہوا شوخی سے بولا۔ مگر اگلے ہی لمحے اسے جھٹکا لگا تھا۔

وہ کرنٹ کھانے کے انداز میں پلٹی تھی اور سرعت سے فاصلہ بڑھا دیا۔ بازل خان تو اس کے حسن کی چکا چوند سے مبہوت کھڑا رہ گیا تھا' جبکہ وہ اسے تیز نظروں سے گھورتی کمرے سے نکل گئی۔

"لالہ! آپ؟" اسی سکتے سے روشی کی آواز نے نکالا جو ابھی ابھی واش روم سے نکلی تھی اسے دیکھ کر خوشی سے چیختی آکر اس سے لپٹ گئی۔

"آپ آگئے ہیں؟ مجھے یقین نہیں آرہا؟" روشی اس کا بازو ہلا کر بولی وہ جیسے چونک گیا۔

"یہ لڑکی کون تھی روشی! جو ابھی کمرے سے گئی ہے؟"

"کون؟ آپ ژالے کی بات کر رہے ہیں؟ آپ کو نہیں پتا وہ آپ کی منگیتر ہے۔" وہ شرارت سے آنکھیں نچا کر بولی اور بازل خان بری طرح سے چونک گیا۔

"یومین سرد چاچو کی بیٹی؟"

"ہاں تو اور کیا۔" وہ ہنسنے لگی۔

"کیسی لگی آپ کو؟" اور اس سوال پہ وہ جھینپ گیا تھا۔

"اب بھی آپ کو اس سے شادی نہیں کرنی؟" وہ شرارت سے پوچھ رہی تھی۔

"یہ میں نے کب کہا؟" وہ حیران ہوا۔

"اماں بتاتی ہیں آپ بچپن میں یہی کہا کرتے تھے کہ اپنے سے زیادہ حسین لڑکی سے شادی کریں گے۔"

"تو کیا وہ نہیں ہے؟"

"نہیں۔ وہ آپ سے کم خوب صورت ہے لالہ!" روشانے وثوق سے بولی تو وہ مسکرا دیا تھا۔

"پھر بھی اب مجھے اس سے شادی کرنی ہے۔"

"اوے ہوئے۔" روشی کے لہجے میں معنی خیزی تھی وہ مسکراتے ہوئے پلٹ گیا۔

☼ ☼ ☼

"اس سلسلے کو یہیں ختم کردیں مجھے آپ سے شادی نہیں کرنی۔"

روشی کی بارات والے دن جب وہ برسوں تک اپنی پسندیدگی پہنچا چکا تھا' ژالے نے اسے سیڑھیوں پہ روک کر اس سے کہا تھا اور وہ جو ہمیشہ چاہا اور سراہا گیا تھا یوں رد کیے جانے پہ ششدر رہ گیا۔

"وجہ پوچھ سکتا ہوں؟" اس کا لہجہ نا چاہتے ہوئے بھی تلخ ہو گیا۔

"یہ چھوٹی وجہ نہیں ہے کہ میں آپ کو پسند نہیں کرتی۔" جواباً" اس کے لہجے میں حقارت ہی حقارت تھی۔ بازل خان گنگ ہونے لگا۔

"اس ناپسندیدگی کی وجہ؟" وہ جیسے طیش سے بھڑنے کو تھا۔

"اور بھی ہیں مگر سب سے اہم اور بڑی وجہ آپ کا شوبز میں ہونا ہے؟" اس نے اسی انداز میں کہا بازل خان ٹھنڈا سانس بھر کے رہ گیا۔

"تم میری بچپن کی منگ ہو۔ میں تمہیں چھوڑنے والا نہیں ہوں۔" ژالے کے چہرے کا تناؤ بڑھنے لگا۔

"یہ قانون قدرت ہے بازل خان! کہ پاک دامن عورتوں کے لیے پاک دامن مرد ہے مجھے ایسا شخص کبھی قابل قبول ہو سکتا ہے جس کا کردار مشکوک ہو۔ جس گندگی سے منسلک ہو تم وہاں ہر قسم کی برائی پہ فخر کیا جاتا ہے۔ غیر عورتوں کو اتنے دھڑلے سے گلے کا ہار بناتے پھرتے ہو اور کس برائی سے بچے ہو گے۔"

تاک تاک کر وہ تیر چلاتی رہی اور ضبط کی سرخیوں سے بازل خان کا چہرا انگارہ ہو تا گیا۔ اور اس پل جب وہ اسی نخوت سے پلٹ کر جا رہی تھی بازل خان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک جھٹکے سے اپنے مقابل کھینچ لیا تھا' ابھی وہ سنبھل بھی نہ پائی تھی کہ وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا تھا۔

"بازل خان نے ہارنا نہیں سیکھا ہے ژالے میم! ہم آپ کو جیت کر دکھائیں گے چیلنج کرتے ہیں آپ کو۔"

وہ اس جھٹکے سے سنبھلی نہیں تھی کہ وہ اسے چھوڑ کر شنتاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ وہ دانت پیستی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنی حیثیت سے گو کہ بہت اچھی طرح آگاہ تھی جانتی تھی اس کے انکار کو تب بھی اہمیت نہ دی جاتی اگر جو بچپن میں اس کے ساتھ منگنی نہ بھی ہوئی ہوتی۔ پھر اب تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

بازل خان کے ایک بار کہنے کی ہی ضرورت پیش آئی۔ اور ان کے نکاح کی تاریخ مقرر کردی گئی۔ وہ تو صرف آنسوؤں پہ اختیار رکھتی تھی سو دل کھول کر آنسو بہائے۔

انہی بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ وہ بہت ہاری ہوئی کیفیت میں تھی جب وہ بہت استحقاق سمیت اس کے کمرے میں چلا آیا تھا۔ برابر بیڈ کے کنارے ٹکتے ہوئے اس کے آنسوؤں کو بہت نرمی سے اپنی پوروں پہ سمیٹ کر آہستگی سے گویا ہوا تھا۔

"بازل خان اتنا ارزاں تو نہیں ژالے آفریدی کہ بنا مانگے تمہیں ملے اور تم رب سے شاکی ہو کر رو پڑو۔"

"اس سے اندازہ کرو کہ تم اس سے زیادہ کم تر حیثیت رکھتے ہو' میرے نزدیک کہ میرے جیسی صابرو شاکر لڑکی بھی رب سے شاکی ہو کر رو پڑی۔" وہ حواسوں میں آئی تو اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے ناگواری سے بولی۔

"ایک دنیا دیوانی ہے بازل خان کی اور تم۔"

"مائی فٹ! میرے لیے تم قابل نفرت ہی ٹھہرو گے۔"

اس کا لہجہ ہنوز تھا۔ بازل خان نے بغور اس کی آنکھوں کو دیکھا اور ہونٹوں کو سختی سے بھینچ لیا۔

"ایک بات یاد رکھنا ژالے آفریدی! بازل خان کبھی ہارا نہیں ہے۔ ابھی ہی دیکھ لو' بنا لیا نا تمہیں اپنا؟"

اس کے لہجے میں موجود زعم کو پاکے ژالے زہرخند انداز میں ہنس پڑی تھی۔

"میرے وجود پہ اجارہ داری حاصل کرکے تم کیا سمجھتے ہو بازل خان! فتح کرلیا مجھے۔ ارے بے وقوف، جیت تو دلوں کی ہوتی ہے اور ژالے کا دل تم سے ہمیشہ نفرت کرے گا' سن لو تم۔" وہ اس کی بات سن کر مسکرایا پھر تحمل سے گویا ہوا تھا۔

”بازل خان دلوں کو جیتنے کے فن سے آگاہ ہے۔ یہ نفرت محبت میں بدل ڈالے گا چیلنج کرتے ہیں۔“ ژالے نے نخوت سے سر جھٹک دیا۔ بازل خان کچھ دیر اسے تکتے رہنے کے بعد اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”جا رہا ہوں۔ رخصتی اس لیے نہیں کرواؤں گا کہ مجھے بھی آپ کے وجود کو محبت کے بغیر پانا اچھا نہیں لگے گا۔“ اس نے جتلا کر کہا اور پلٹ کر چلا گیا۔

✲ ✲ ✲

پھر ایک سال چپ چپاتے گزر گیا۔ وہ فلموں میں اور بھی مصروف ہوتا چلا گیا۔ رمضان المبارک کا آغاز ہوا چاہتا تھا۔ بابا اسے گاؤں کا چکر لگانے کا کہہ رہے تھے۔ مگر اس کی مصروفیات ہی ختم ہونے میں نہ آتی تھیں۔ مگر پھوپو اماں کے اصرار پہ گاؤں آ گیا کہ روشانے کے ہاں بہت پیاری سی بیٹی نے جنم لیا تھا۔

ایک بار پھر وہ ڈھیروں تحائف کے ساتھ آیا تھا۔ جنہیں پا کر بھی اس مرتبہ روشی خوش نہ ہو سکی۔

”اس شہرت اور دولت کی چکاچوند نے ہم سے ہمارا لالہ چھین لیا ہے۔ کتنا کم دستیاب ہوتے ہو۔ شادی کے بعد اب دیکھ رہی ہوں۔“

روشی کی شکایتیں ختم ہونے میں نہ آ رہی تھیں۔ وہ بس ہنستے ہوئے مسکرائے گیا۔

”شادی بھی ادھوری کی ورنہ ژالے کی وجہ سے ہی بھاگ بھاگ کر آتے۔“

”رخصتی کرا دیں؟“ اماں نے پوچھا اور اس نے ایک بار پھر ٹال دیا۔ البتہ ژالے سے ملاقات کا ارادہ ضرور باندھ لیا تھا۔ مگر اسے چاچو کی طرف جانے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ اگلی صبح جب وہ حویلی کے پائیں باغ میں رائیڈنگ کر رہا تھا اس نے ژالے کو گیٹ سے اندر آتے دیکھا تھا۔

سیاہ بلوچی کڑھائی والی چادر میں اس کی دودھیا رنگت لشکارے مار رہی تھی وہ اپنے دھیان میں مگن تھی اس کی موجودگی سے بے خبر رہی اور اسے مبہوت ہو کر تکتے بازل خان کو اچانک شرارت پہ اکسا گئی۔ بازل خان نے گھوڑے کو ایڑھ لگائی اور دوڑاتا ہوا اس کے نزدیک لے آیا۔

ٹاپوں کی آواز پہ وہ چونکتے ہوئے متوجہ بھی ہوئی مگر اس کے ارادے کو نہ جان پائی تھی۔ جب ہی اس کے جھانسے میں آ گئی۔ اگلے لمحے وہ ہوا تھا جو کم از کم ژالے کے گمان تک میں نہیں تھا۔ اس کے قریب لا کر گھوڑے کی رفتار ہلکی کرتے ہوئے اس نے ذرا سا جھک کر ژالے کو اپنے بازو کے حصار میں لے لیا تھا اور دوسرے پل وہ اسے اپنے ساتھ گھوڑے کی پشت پہ سوار کرا چکا تھا۔

ژالے حیرت اور بے یقینی سے چند لمحوں کو حرکت بھی نہ کر پائی جبکہ بازل خان ہنستے ہوئے اس پہ جھک آیا تھا۔

”ہیلو مائی سویٹ ہارٹ! کیسا لگ رہا ہے پہلی بار اپنے شوہر کے اتنا نزدیک آنا؟“

اس کے شوخ لہجے میں معنی خیزی تھی۔ ژالے کی حیرت تمام ہوئی تو دماغ کو شدید قسم کے ہیجان اور تاؤ نے آن لیا۔ سو ایک دم پھیرے ہوئے انداز میں اس کی بانہوں کے حصار میں مچلی تھی۔

”ارے رے اپنے ساتھ مجھے بھی گراؤ گی ڈارلنگ! آرام سے پیار سے۔“

اس کی مزاحمت کے جواب میں وہ مصنوعی گھبراہٹ سے بولا تو ژالے کا اشتعال اور بڑھ گیا۔

”تمہیں جرات کیسے ہوئی اس قدر گھٹیا حرکت کی؟ اتارو مجھے فوراً۔ میں تمہاری فلم کی ہیروئن نہیں ہوں جس کے ساتھ تم جیسی مرضی چیپ حرکت کر گزرو اور میں آگے سے دانت نکال کر تمہاری حوصلہ افزائی کروں۔“ وہ دانت پیس کر پھنکاری تھی۔

مزاحمت ہنوز جاری تھی جس میں اضافہ اس کے بازوؤں پہ مکے مار کر اور ناخنوں سے کھروچ کر کیا گیا تھا بازل خان نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

”تم شوبز والوں سے اتنی متنفر کیوں ہو آخر؟ یہاں کام کرنے والا ہر ایکٹر یا ایکٹرس لازمی نہیں کہ اتنی سطحی سوچ ہی رکھتے ہوں۔“ اس نے گویا اپنی پوزیشن

کلیئر کرنا چاہی۔

”بازل! مجھے اتار دو پلیز!“ اس پہ اثر نہ ہوتا دیکھ کر وہ روہانسی ہو کر بولی تھی۔

خفت، شرم اور غم و غصے سے اس کا برا حال ہونے لگا تھا۔ اگر کوئی دیکھ لیتا تو کتنا غلط تاثر پڑتا اس کا۔ اور ایک یہ تھا احساس ہی نہ تھا گویا اسے۔

بازل خان نے کچھ کہے بنا پہلے گھوڑے کو روکا پھر سہارا دے کر اسے نیچے اتارنا چاہا مگر وہ اس کا ہاتھ جھٹکتی خود ہی نیچے کود گئی تھی۔

اور جب تک وہ اندر آیا وہ واپس جانے کو بھی تیار تھی۔

”اتنی جلدی کیوں جا رہی ہو بیٹھو نا؟“ روشی اس کے الٹے پیروں واپسی پہ حیران ہو کر بولی تھی۔

بازل خان نے بغور اس کی اٹھتی گرتی پلکوں کی جھالروں کو دیکھا۔ پتا نہیں کس احساس سے اس کا چہرہ بے تحاشا سرخ ہو رہا تھا۔

”نہیں۔ میں پھر آ جاؤں گی۔“ اس نے نرمی سے کہا تھا اور جانے کو پلٹ گئی۔

”چلو میں چھوڑ آتا ہوں۔ چاچو چچی سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔“

بازل خان کی نظریں اس کے چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ وہ دروازے سے اس کے ساتھ ہی باہر نکلا۔

”اس زحمت کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ جواباً بھڑک اٹھی۔ بازل نے نظریں اٹھا کر اس کا چہرہ جانچا۔

”ایسا رویہ کب تک رہے گا ژالے؟“

”ہمیشہ! ساری زندگی۔ میں کبھی تمہاری پذیرائی نہیں کروں گی۔ خود سوچ لو تمہیں کیا کرنا ہے۔“ وہ تلخی سے کہتی آگے بڑھ گئی۔

بازل خان کی سوچتی نگاہیں اس کے اٹھتے قدموں میں الجھ گئیں جو ہر لمحہ فاصلہ بڑھا رہے تھے۔

✲ ✲ ✲

اسے حویلی سے آئے چھ ماہ ہو رہے تھے۔ وہ اتنا بددل ہوا تھا کہ دوبارہ پلٹ کر وہاں گیا ہی نہیں۔ اب تو بابا اماں کے ساتھ چاچو بھی اسے بلانے لگے تھے مگر وہ مصروفیت کا بہانہ کر کے ٹالے جاتا۔

”بازل! تم نے رخصتی بھی کرانی ہے کہ نہیں؟“ ایک دن اماں نے تنگ آ کے اسے خود فون کر لیا تھا۔

”مجھے تو کرانی ہے اماں! آپ اپنی بہو سے پوچھیں اسے کب کرانی ہے۔“ وہ بے دلی سے بولا تو اماں نے جواباً اسے گھرک ڈالا تھا۔

”اچھا بس! اب اس نمانی پہ الزام نہ رکھ دینا۔ وہ تو تب بھی نہ بولی تھی جب تم نے ایک دم نکاح کا شوشا چھوڑ دیا تھا۔ اب بھلا اعتراض کیوں کرے گی؟“

اور ان کے اعتماد و یقین پہ وہ ٹھنڈا سانس بھر کے رہ گیا۔ اماں کا فون بند کرنے کے بعد اس نے اسی وقت ژالے سے رابطہ کر لیا تھا۔

”محترمہ! میری اماں کو اب میری شادی کا شوق ہو رہا ہے۔ بتاؤ کب آؤں؟“

”میری اجازت سے کرو گے نا تم؟“ وہ جواباً طنز سے پھنکاری تو بازل خان مسکرا دیا۔

”رضامندی سے تو کروں گا نا یار! ایویں ڈیڑھ سال سے انتظار کی سولی پہ لٹکا ہوا ہوں۔“

”اگر ایسا ہوتا تو پھر تمہاری منکوحہ نہ کہلا رہی ہوتی۔“

”اس کا مطلب رخصتی کرا لوں تمہیں کوئی اعتراض نہیں؟“

جواب میں اس نے بھنا کر فون بند کر دیا تھا۔ بازل خان نے سیل فون ہاتھ میں لیے کچھ دیر سوچا پھر ایک نظم ٹائپ کرنے لگا۔

میرے ہاتھ پر لکھ دو فیصلہ جدائی کا
اتنا مختصر لکھنا جتنی مختصر تم نے مجھ سے محبت کی
اتنا مختصر لکھو فیصلہ جدائی کا جتنی میری سانسیں ہیں
جتنی میری ہستی ہے
فیصلہ جدائی کا گر طویل لکھو گی تب میں پڑھ نہ پاؤں

گا

میں تو بس جدائی کے فیصلے کو پڑھنے تک زندگی کا ساتھی ہوں
زندگی تمہاری ہے

اس نے نظم ژالے کے نمبر پہ سینڈ کردی تھی جسے ژالے نے سرسری پڑھا اور اگلے لمحے اسے ڈیلیٹ کردیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ ایک عجیب دن طلوع ہوا تھا۔ بے چینی حد سے سوا تھی۔ رات بھی اسے عجیب خواب نظر آتے رہے۔ جن کی دہشت کا احساس ابھی بھی دل میں موجود تھا۔ وہ بے کل سی ہوئی پھرتی رہی تھی دن گزرا شام ڈھل گئی اسے بے چینی کی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔

اماں بابا یہاں تک کہ تاؤ اور تائی بھی ٹھیک تھے۔ وہ دوبار صبح سے فون کرکے ان کی خیریت دریافت کرچکی تھی۔ ایک چکر بھی ان کے پاس لگایا تھا۔

مغرب کی اذان کی پکار فضا میں گونجی تو اس نے وضو کرکے نماز کی نیت باندھ لی۔ دعا مانگ رہی تھی جب اس کے موبائل کی بیل ایک تواتر سے بجتی چلی گئی۔ گھبراتے دل کے ساتھ سیل فون تک آئی نمبر تاؤ جی کے گھر کا تھا اس نے جلدی سے کال ریسیو کی۔

”ژالے پتر! تو نے ٹی وی لگایا؟ خبر سنی؟“ دوسرے سمت تائی جی باذل کی اماں تھیں۔ اونچی آواز میں زور زور سے روتے ہوئے۔ وہ گھبرا سی گئی۔

”نہیں تو اماں! خیریت کیا ہوا؟“

”ہم لٹ گئے ہیں ژالے! برباد ہوگئے۔ باذل ــــ میرا باذل مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔“ وہ اسے بتاتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں اور ژالے کو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

”وہ“ زندگی جس کی آنکھوں میں ہر دم مسکراتی تھی مر گیا ہے یقین کرنا محال تھا۔ ایک قیامت تھی جو ناگہانی ٹوٹ پڑی تھی۔ تائی اماں کو ہذیانی دورے پڑنے لگے تھے۔ تاؤ جی کی حالت بھی بے حد خراب تھی۔

”پرسہ دینے کے لیے آئے لوگوں کو دیکھ کر وہ خود کو یقین دلایا کرتی کہ وہ واقعی ہی مر گیا ہے۔ مگر یقین تھا کہ آ کر نہ دیتا۔“

وہ جس سے ایک مدت اس نے اس لیے نفرت کی تھی کہ اس کے خیال میں وہ بھٹک گیا تھا گمراہ ہو گیا تھا جس کے ساتھ سے وہ بھی گمراہ ہو جاتی۔ گناہ گار ہو جاتی۔ مگر اس گمراہ انسان کو ایک لمحہ ہدایت کا تمام گناہوں سے پاک کر گیا تھا۔

شوٹنگ کے سلسلے میں اس مرتبہ وہ جس علاقے میں گئے تھے وہ سیلاب زدہ علاقے سے نزدیک ترین تھا۔ شوٹنگ کے دوران ان تک یہ اطلاع پہنچی تھی کہ اس گاؤں کی نہر کا بند ٹوٹ گیا ہے۔ ایک افراتفری کے عالم میں ان کی ساری ٹیم وہاں سے اپنی جانیں بچا کر بھاگی تھی سوائے باذل خان کے۔ اس نے وہاں آفت اور پریشانی میں گھرے لوگوں کی جانیں بچانے کی مقدور بھر کوشش کی تھی۔ اور اسی کوشش میں ہی وہ لوو بہتے لقمہ اجل بن جانے والے لوگوں میں شامل ہو گیا تھا۔

ٹی وی پہ اس کے جذبے کو اس کی نیکی کو سراہا جارہا تھا۔ چار دن بعد جب اس کی نعش تابوت میں بند کرکے حویلی پہنچائی گئی تو سفر آخرت کی اس کی تمام تیاریاں مکمل تھیں۔

پھولوں کی پتیوں کے درمیان گھرا اس کا چاند چہرہ ژالے نے دیکھا تھا اور کہیں کی نہ رہی تھی۔ وہ چلا گیا اور جاتے جاتے اس سے کیا وعدہ نبھا گیا۔

وہ ایک بار پھر جیت گیا تھا۔ ژالے کے دل کو اپنا گرویدہ کرکے۔ جو کام اس کا قول نہیں کرسکا تھا۔ اس کا آخری فعل کر گیا۔

اب دواسائیں کی بات سے وہ بھی متفق تھی۔ ہاں وہ ایسا تھا کہ اسے دیکھ کر قافلے آج بھی راہ بھول جاتے تھے۔ وہ بھی راہ بھول بیٹھی تھی۔

☼

راشدہ رفعت

آگہی

ویسے تو وہ صرف میری پروسن تھی لیکن مجھے اس سے شدید ترین چڑ تھی۔ اس ”چڑ“ کی وجوہات جاننے کے لیے آپ کو میرے ساتھ ماضی قریب میں ایک جھانکی مارنی پڑے گی۔ تین برس پہلے جب میں بیاہ کر ”نجیب ہاؤس“ آئی تو پوری کالونی میں میرے حسن کی دھوم اور جہیز کے چرچے پھیل گئے تھے حالانکہ میرا میکہ کچھ اتنا امیر و کبیر نہ تھا مگر آٹھ بہن بھائیوں میں آخری نمبر ہونے کی وجہ سے مجھے جہیز دل کھول کر دیا گیا۔

ابا جی تو اپنی استطاعت کے مطابق ہی جہیز دے رہے تھے مگر ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے چکر میں بہن، بہنوئیوں بھائیوں، بھابیوں نے میرے جہیز میں کئی قابل قدر آئٹم شامل کردیے تھے اور جہاں تک تعلق ہے حسن کا تو خوبصورت تو میں تھی لیکن جتنی حسین اپنی شادی پہ لگی اس کی بڑی وجہ میری بیسٹ فرینڈ نادیہ تھی جو شہر کے سب سے

مشہور بیوٹی پارلر میں بطور ہیلپر کام کرتی تھی اس نے اپنا سیکھا ہوا سارا ہنر مجھ پر آزما ڈالا تھا۔

ہر دیکھنے والے نے مجھے دل کھول کر سراہا تھا میں حق سمجھ کر اپنی تعریفیں وصول کرتے ہوئے خوب مغرور ہوئے جا رہی تھی۔ مگر صرف دس دن بعد شہلا نے مجھے منظرنامے سے دھکیل کر میری جگہ ہتھیالی تھی۔

شہلا "نجیب ہاؤس" کے عین سامنے والے "ارشاد ولا" کے ارشاد کی بیوی بن کر آئی تھی۔ جس طرح نجیب گھر کے بڑے بیٹے تھے اسی طرح سب بہن بھائیوں میں ارشاد بھائی کا نمبر بھی پہلا تھا۔ میری طرح شہلا نے بھی پہلی بہو بن کر سسرال میں قدم رنجہ فرمایا تھا۔

آمنے سامنے کے گھروں میں مثالی تعلقات تھے۔ نجیب کے ٹھیک دس دن بعد ارشاد کی شادی ہونا طے پائی تھی اور جس طرح نجیب کی شادی میں ان لوگوں نے کھلے دل سے شرکت کی تھی اسی طرح ارشاد بھائی کی شادی میں میرے سسرال والے بھی پیش پیش تھے بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ اس شادی میں شرکت کر کے مجھے بھی بڑا مزا آ رہا تھا۔ نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ جہیز بری کے کامدار جوڑے پہن کر میں خوب بن ٹھن کر اپنی ساس نندوں کے ساتھ ارشاد بھائی کی مایوں‘ مہندی میں شرکت کے لیے جاتی تھی۔ آس پڑوس کی لڑکیاں بالیاں جب میری تعریف کرتیں تو سیروں خون بڑھ جاتا لیکن جب شہلا بیاہ کر "ارشاد ولا" آئی تو میرا سیروں بڑھا خون جل جل کر آدھا رہ گیا۔

مانا وہ خوب صورت تھی رنگ بھی گورا چٹا تھا نقوش بھی تیکھے تھے مگر ایسی بھی کوئی اپسرا نہ تھی کہ ہر کوئی صرف اسے دیکھنے کا مشتاق اور ہر زبان پر صرف اسی کے حسن کے تذکرے‘ ولیمہ کی تقریب میں ہر کسی نے ارشاد بھائی کی امی کو چاند سی بہو لانے پر مبارک باد دی اور میں اپنی ساس کے پہلو میں بیٹھی منتظر ہی رہی کہ کوئی آنکھ اٹھا کر مجھے بھی دیکھے اور سراہے۔ مگر آج میری ساری تیاری اکارت چلی گئی تھی۔ شہلا کے سامنے میرا حسن ماند پڑ گیا تھا۔

"سارا کمال بیوٹی پارلر والوں کا ہے‘ اصل شکل تو دو چار دن بعد پتا چلے گی۔"

لوگوں کے تبصرے سن کر میں نے دل ہی دل میں خود کو تسلی دی مگر دو چار دنوں میں مجھے خود کو پتا چل گیا کہ میری یہ خوش فہمی محض غلط فہمی تھی‘ اس بات کا احساس مجھے سب سے زیادہ میری چھوٹی نند نے دلوایا تھا جو بھاگ بھاگ کر "ارشاد ولا" جاتی تھی۔

"سچ امی! شہلا بھابھی اتنی حسین ہیں کہ میں بتا نہیں سکتی۔ ابھی انہوں نے عصر کی نماز کے لیے وضو کیا تھا۔ بغیر میک اپ کے دھلا دھلایا چہرہ بالکل چاند کی طرح چمک رہا تھا۔"

یہ میری چھوٹی نند حنا تھی۔ ہر وقت رسالے ہاتھ میں رہتے تھے‘ نائنتھ کلاس کی بچی اور کیسے تشبیہ استعاروں کے ساتھ اس کے حسن کے قصیدے پڑھ رہی تھی۔ مجھے دل میں خوب تاؤ چڑھا۔

"ارشاد بھائی تو معمولی شکل و صورت کے ہیں۔ آنٹی کو سوچ سمجھ کر رشتہ کرنا چاہیے تھا ایسی لڑکیاں شوہر کو مٹھی میں کر کے سسرال والوں کو گھاس بھی نہیں ڈالتیں‘ پچھتائیں گی نویدہ آنٹی‘ اب ہر کوئی میری طرح تو سسرال میں گھلا ملا نہیں رہتا نا!"

رات کو میں نے نجیب کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا انہوں نے فوراً گردن ہلا کر میری بات کی تائید کی۔

ایک وہی تو تھے جو اب تک میرے حسن کے اسیر تھے۔ اپنی بڑی بہنوں کے مشوروں پر عمل کرتے ہوئے اور خوب ناز و انداز دکھا کر میں نے نجیب کو دس پندرہ دنوں میں ہی اپنی مٹھی میں کر لیا تھا۔

اور اگلے دن کا ذکر ہے گھر پر صرف میں اور میری ساس ہی موجود تھے جب ارشاد بھائی کی والدہ ایک ڈونگہ ہاتھ میں پکڑے خراماں خراماں تشریف لائیں۔

"شہلا کا کھیر میں ہاتھ ڈلوایا ہے۔ میں نے کہا چلو محلے میں کھیر بانٹ آؤں‘ پہلی بار میری بہو نے کچھ بنایا ہے۔"

نویدہ آنٹی نے مسرور سے انداز میں آگاہ کیا تھا اور میں جو اپنی ساس کے پاس بیٹھی بڑے اطمینان سے ناخن فائل کر رہی تھی اس اطلاع پر ذرا چونک کر نویدہ آنٹی کو دیکھا۔

"اتنی جلدی بھی کیا تھی۔ ابھی تو شہلا کی شادی کو محض ہفتہ ہوا ہے‘ ساری عمر پڑی ہے کام کاج کے لیے۔"

میری ساس بھلی مانس خاتون تھیں انہوں نے گویا میرے دل کی بات کہہ دی۔ میں نے بھی اچھی بہو ہونے کے ناتے زور و شور سے سر ہلا کر ان کی تائید کی۔

"ارے میں تو منع کر رہی تھی‘ پر اس اللہ کی بندی کو کون سمجھائے‘ اس کا بس چلتا تو ولیمہ والی صبح ہی مجھے کچن سے نکال کر خود ناشتہ بنانے کھڑی ہو جاتی۔ بڑی مشکل سے ہفتہ بھر کام کاج سے روکا ہے اسے۔ کہتی ہے بچے تو سارے اسکول کالج چلے جاتے ہیں امی! مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا کہ میں ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھی رہوں اور آپ کام کاج میں لگی رہیں۔ بس آج صبح سے ہی کچن میں گھس گئی تھی پہلے نندوں‘ دیوروں کو ناشتہ بنا کر دیا پھر کھیر چولہے پر چڑھا دی۔" نویدہ آنٹی نے پرمسرت انداز میں میری ساس کو اپنی بہو کی کارگزاری سے آگاہ کیا۔

"ہونہہ گھنی میسنی نہ ہو تو... ہمیں کب ایسے چلتر آتے تھے سسرال والوں کو قابو میں کرنے کے۔ میری شادی کو دو ڈھائی ہفتے ہونے کو آ رہے تھے اور مزید دو ڈھائی ہفتے تک میرا کھیر تو کیا کسی بھی کام میں ہاتھ ڈالنے کا کوئی ارادہ نہ تھا مگر اس سے پیشتر کہ میری ساس دل ہی دل میں شہلا کے ساتھ میرا موازنہ کر کے اسے اضافی نمبر دیتیں میں نے مارے باندھے گھر کے کام شروع کر دیے۔

یہ تو ایک چھوٹی سی مثال تھی شہلا سے چڑنے کی۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ شہلا کے ساتھ میری چڑ میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ اگرچہ منہ پر میں اس سے خوش دلی سے ہی ملتی مگر دل ہی دل میں خوب خار کھاتی۔

میرے سسرال والے اس چڑ کا بنیادی سبب تھے۔ میں بریانی بناتی وہ چپ کر کے کھا لیتے۔ دو دن بعد شہلا بریانی کی پلیٹ بھیجتی تو سب ایسے چٹخارے لے کر کھاتے جیسے زندگی میں پہلی بار بریانی نصیب ہوئی ہے۔

میں مہنگے ٹیلر سے کپڑے سلواتی مگر نہ صرف میری نندیں بلکہ آس پاس کی سب ہی عورتیں شہلا کی ڈریسنگ اور ڈیزائننگ کے قصیدے پڑھتیں۔ اس کا اخلاق‘ اس کی مہمان نوازی‘ اس کا سگھڑاپا‘ سلیقہ‘ خوب صورتی غرض خوبیوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا جو دنیا جہان کو اس میں نظر آتا۔

میں لاکھ کوشش کرتی کہ کسی طرح کسی بھی معاملے میں شہلا پر سبقت لے جاؤں مگر ہر بار ناکامی مقدر بنتی‘ ہم دونوں کی شادیوں کو سوا سال ہونے کو آ رہا تھا مگر اتفاق سے ہم دونوں کی گود ہنوز خالی تھی پھر آخر قدرت کو میرے اوپر رحم آ گیا۔ میں نے "نجیب ہاؤس" کو وہ خوش خبری دے دی جس کے وہ شادی کے دوسرے مہینے سے ہی منتظر تھے اور شہلا جانے اس معاملے میں مجھ سے پندرہ دن پیچھے کیوں رہ گئی‘ جی ہاں ٹھیک دو ہفتے بعد "ارشاد ولا" کو بھی خوش خبری مل گئی تھی۔

دو ہفتوں تک میں نے بستر سے نیچے قدم نہ اتارا تھا۔ ریسٹ کے متعلق ڈاکٹر کی ہدایت کو میں نے ذرا وضاحت سے اپنے سسرال والوں کے گوش گزار کر دیا تھا۔ وہ لوگ اتنے خوش تھے کہ میرے سارے ناز نخرے بخوشی اٹھانے کو تیار تھے مگر بس... جی ہاں پھر اس شہلا کی بچی نے مجھے بیڈ روم سے نکال کر دوبارہ کچن میں پہنچوا دیا۔

خوش خبری ملنے کے اگلے ہی روز حلیم بنا کر ہمارے گھر تشریف لے آئی۔ میری ساس نے سمجھایا کہ "اب زیادہ مشقت طلب کام کرنے سے گریز کرو۔"

تو ہنس کر کہنے لگی۔

"گھر کے کاموں میں کیسی مشقت آنٹی! اور ویسے تو امی میرا بہت خیال رکھ رہی ہیں آج حلیم مجھے گھوٹنے

بھی نہیں دی لیکن میری ڈاکٹر نے خود کہا ہے کہ گھر کے کام کاج میں حصہ لیتی رہیں گی تو ایکٹو رہیں گی۔ طبیعت خرابی کو زیادہ سر پر سوار کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس بھاری اور وزنی چیزیں اٹھانے سے گریز کریں۔ سیڑھیاں آرام سے چڑھیں اتریں' برابر ریسٹ کریں اور ڈائٹ پر توجہ دیں۔"

اب میری ڈاکٹر نے بھی ہدایت تو کچھ اسی قسم کی دی تھیں مگر شہلا کو کیا ضرورت تھی یہ ہدایت نامہ ہمارے گھر آکر نشر کرنے کی؟ ویسے وہ اگر نشر نہ بھی کرتی تو مجھے اس کی تقلید کرنا ہی پڑتی کہ بالکل سامنے والے گھر میں رہائش پذیر ہونے کی وجہ اس کا کوئی عمل میرے سسرال والوں سے پوشیدہ نہ رہتا تھا اور وہ بظاہر مجھے کچھ نہ جتاتے تھے مگر میں جانتی تھی کہ دل ہی دل میں ہر پل میرا اور اس کا موازنہ جاری رکھتے ہیں۔

خیر شہلا کی باتوں پر عمل کرنے کا فائدہ یہ ہوا کہ میں واقعی آخری مہینے تک تندرست اور ایکٹو رہی اور جب نارمل ڈلیوری کے بعد ریان میری گود میں آیا تو ساری کلفتیں دور ہو گئیں۔

شہلا بے چاری کی قسمت میں میجر سرجری لکھی تھی۔ اس کا حمزہ بڑے آپریشن سے ہوا۔ بچے تو خیر دونوں ہی پیارے تھے مگر میرا ریان ہمارے لیے بڑا خوش بخت ثابت ہوا۔ نجیب کی۔ ترقی جو گزشتہ کئی برسوں سے اٹکی ہوئی تھی ریان کی پیدائش کے اگلے ہی ہفتے ان کی پروموشن ہو گئی۔ ترقی کے ساتھ تنخواہ میں بھی ٹھیک ٹھاک اضافہ ہوا۔

بیٹے کی ماں بننے کے بعد سسرال میں تو میرے قدم ویسے ہی مضبوطی سے جم گئے تھے۔ اب میاں کی کمائی کا زعم بھی تھا۔ میں جیسے چاہتی پیسے لٹاتی کسی کی مجال نہ تھی کہ روک ٹوک کر سکے۔ شہلا پر اپنی برتری ثابت کرنے کے بھی اب بہتیرے موقعے تھے۔ آئے روز نئے کپڑے سلوا کر میں بہت اہتمام سے میچنگ جیولری اور میک اپ کے ساتھ شہلا کے گھر کا رخ کرتی۔

اسے اپنی ذات پر توجہ دینے کا اب کم ہی موقع ملتا تھا۔ حمزہ تو اگرچہ زیادہ تر اپنی دادی کے پاس ہوتا لیکن شہلا پہلے کی طرح ہنستی مسکراتی سب کی فرمائشیں پوری کرتی کچن میں ہی موجود ہوتی۔ مانا کہ اس کے سسرال والے ہر وقت اس کی شان میں رطب اللسان رہتے مگر ایسی تعریفوں کا بندے نے اچار ڈالنا ہوتا ہے کیا۔

میں نے تو اب کچن کا رخ کرنا خاصا کم کر دیا تھا' ہاں جب بھی ٹی وی پر کوئی کوکنگ شو دیکھ کر نئی سی ریسپی ٹرائی کرنے کا دل چاہتا تو میں بہت اہتمام سے وہ چیز پکاتی تھی اور شہلا کے گھر تو ضرور بھیجتی تھی۔

میرے سسرال والے ڈھکے چھپے الفاظ میں شہلا کی کفایت شعاری کی میرے سامنے مثالیں دیتے مگر اپنی روش بدلنے کا میرا کوئی ارادہ نہ تھا۔ ظاہر ہے کمانے والا میرا میاں تھا میں جیسے چاہتی پیسے خرچ کرتی اور آج کل تو میں نجیب کے سر پر ایک اور بڑا خرچا ڈالنے والی تھی۔ ریان کی پہلی سالگرہ آنے والی تھی اور میں یہ سالگرہ بہت دھوم دھام سے منانا چاہتی تھی۔ سچی بات تو ہے کہ پہلے میرا خیال تھا کہ گھر میں سالگرہ کی چھوٹی سی تقریب منعقد کر کے میں اور نجیب کسی اچھے سے ہوٹل میں ڈنر کرنے جائیں۔ مہمانوں کو انوائٹ کرنا' گھر کی نئے سرے سے صفائی' سیٹنگ' سالگرہ کا انتظام نری دردسری ہی تو تھی لیکن اس روز میں نے شہلا کی باتیں سن لیں۔

میری ساس کے پاس محلے کی عورتیں کمیٹی ڈالتی تھیں۔ شہلا بھی کمیٹی کی باقاعدہ ممبر تھی۔ پرانی کمیٹی ختم ہو کر نئی کمیٹی شروع ہوئی تو پرچیاں ڈالنے کے بعد پہلا نمبر شہلا کا نکل آیا۔ خوشی سے اس کا چہرہ تمتما اٹھا تھا۔

"اللہ نے کیسے میری دعائیں سن لیں۔ اس مہینے مجھے پیسوں کی اشد ضرورت تھی حمزہ سال کا ہونے والا ہے کب سے سوچ رکھا تھا کہ اس کی پہلی سالگرہ....."

وہ میری ساس سے مخاطب تھی اس کی بات ادھوری ہی تھی کہ اندر کمرے سے ریان کے رونے کی آواز آئی۔ وہ چلنا سیکھ رہا تھا اور شاید چلتے چلتے گرا تھا

میں لپک کر اندر گئی شہلا کی ادھوری بات سے میں نے پورا نتیجہ اخذ کر لیا تھا۔ وہ کمیٹی کے پیسوں سے اپنے بیٹے کی دھوم دھام سے سالگرہ منانا چاہتی تھی۔ فطری جلن اور حسد سے مغلوب ہو کر میں نے "فوراً" ہی ریان کی سالگرہ شان دار طریقے سے منعقد کرنے کا پروگرام بنا لیا۔ ویسے بھی ریان کی سالگرہ حمزہ سے دس دن پہلے ہوتی تھی میں اپنے بیٹے کی سالگرہ اتنی دھوم دھام سے منانا چاہتی تھی کہ شہلا لاکھ کوشش کرے پھر بھی وہ میری منعقد کردہ تقریب کی برابری نہ کر سکے۔ میں نے سالگرہ کے انتظامات اور اخراجات کا تخمینہ لگا کر خرچوں اور مہمانوں کی فہرست نجیب کے حوالے کر دی۔

"اتنا خرچا؟ یار! تم بیٹے کی سالگرہ کر رہی ہو یا شادی۔" نجیب لسٹ دیکھ کر چیخ ہی تو پڑے تھے میں نے سخت برا مانا تھا۔

"کیسے باپ ہیں آپ۔ بیٹے کی پہلی سالگرہ ہے۔ آپ کو کوئی ارمان ہی نہیں۔"

"ارمان ہے بابا کیوں نہیں ہے ریان جیسے تمہارا بیٹا ویسے میرا مگر سالگرہ پر اتنے خرچے کی کوئی تک بھی ہے۔ نئے پردے' نئے فلور کشنز' پھر کھانے کا مینیو تو دیکھو مٹن بریانی' کڑھائی گوشت' کھیر' کولڈ ڈرنکس اور سو سے اوپر مہمان۔ یار خرچا کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا۔" جانے نجیب آج اتنی پس و پیش کیوں کر رہے تھے۔

"رہنے دیں نجیب! آپ کے پاس پیسے نہیں تو کوئی بات نہیں میں اپنی سونے کی بالیاں بیچ دوں گی جو میری امی نے ریان کی پیدائش پر مجھے دی تھیں' بچے کی پہلی خوشی پر آپ اتنی تنگ دلی کا مظاہرہ کریں گے میں نے سوچا بھی نہ تھا۔"

میری آنکھیں بھر آئی تھیں اور حسب توقع نجیب ان بھرے ہوئے نین کٹوروں کی تاب نہ لا پائے تھے۔

"اچھا روتی کیوں ہو' میں دفتر سے لون پکڑ لوں گا جیسے مرضی سالگرہ مناؤ۔"

نجیب کی طرف سے گرین سگنل ملنے کی دیر تھی کہ میں نے سالگرہ کی تیاری شروع کر دی۔ سب رشتہ داروں' ملنے جلنے والوں کو فون کھڑکا دیا جو نزدیک رہتے تھے انہیں گھر جا کر انوائٹ کیا۔ محلے میں بھی سب کو مدعو کیا خصوصاً" ارشاد بھائی کی پوری فیملی کو مدعو کیا تھا۔

سالگرہ کی تقریب میری خواہش کے عین مطابق بہت شان دار طریقے سے منعقد ہوئی تھی۔ سب مہمانوں نے سالگرہ کے انتظامات' ریفریشمنٹ کے سامان اور پر تکلف کھانے کی دل کھول کر تعریف کی۔

میں خود پارلر سے تیار ہونے کے بعد نئی خوب صورت اور اسٹائلش سی ساڑھی میں ملبوس ادھر سے ادھر چہکتی پھرتی مہمانوں سے تعریف وصول کر رہی تھی۔ شہلا بھی ذرا سی دیر کو آئی تھی۔ ریان کو پیار کرنے کے بعد مجھے گفٹ پیک تھمایا پھر "فوراً" ہی جانے کی اجازت مانگ لی۔

"ارے ابھی سے کیسے واپسی' نہ کیک کٹا نہ کھانا لگا میں تمہیں ایسے کیسے جانے دوں۔" میں نے لگاوٹ سے کہا۔

"میں ضرور رکتی بھابھی مگر آپ جانتی ہیں آج ارشاد کی چھٹی ہے' امی کی طرف گئے بہت دن ہو گئے آج وہاں جانے کا پروگرام ہے۔" اس نے معذرت کرتے ہوئے بتایا تھا۔

"اچھا چلو جیسے تمہاری مرضی۔" میں بظاہر مسکراتی مگر اندر سے تلملاتی۔ "ہونہہ جل گئی ہے۔"

خیر میرا مقصد تو پورا ہو گیا تھا۔ شہلا نے دیکھ لیا تھا کہ ریان کی برتھ ڈے پارٹی کس قدر شان دار تھی۔ وہ بے چاری لاکھ کوشش کرتی اپنی کمیٹی کے سارے پیسے پھونک دیتی پھر بھی اس پائے کی تقریب منعقد نہ کر پاتی۔

اور اگلا پورا ہفتہ میں منتظر ہی رہی کہ شہلا کے ہاں سے بھی حمزہ کی سالگرہ کا بلاوا آئے مگر یہ انتظار انتظار ہی رہا۔ شاید بے چاری نے اپنا ارادہ ہی ملتوی کر دیا تھا۔ میرے دل میں ٹھنڈ پڑ گئی تھی مگر وہ چار دن بعد کی بات تھی جب ارشاد بھائی کی امی خوان سے ڈھکی ایک ڈش

اٹھائے تشریف لائیں۔

"آج کیا بنا لیا شہلا نے؟" میری ساس نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔

"آج شہلا نے نہیں قصائی نے بنایا ہے۔" نویدہ آنٹی نے بھی مسکراتے ہوئے ڈش میری ساس کو تھمائی۔

"حمزہ کا عقیقہ تھا نہ آج، ابھی ابھی قصائی گوشت بنا کر گیا ہے۔ میں نے کہا بھی رشتہ داروں اور غریب غرباء میں تم لوگ خود بانٹ آنا میں تو محلے کے گھروں میں گوشت تقسیم کر دیتی ہوں۔" اس بار نویدہ آنٹی نے وضاحت کی تھی۔

"حمزہ کا عقیقہ! اچھا ماشاء اللہ مبارک ہو نویدہ!" میری ساس نے خوش دلی سے انہیں مبارک باد دی تھی۔

"خیر مبارک۔ بس بس کیا بتاؤں اس اللہ کی بندی کو شوق تھا کہ حمزہ کا عقیقہ ہونا چاہیے۔ شکر ہے اللہ کا آج اس کی خواہش پوری ہو گئی۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اللہ کی بندی کی اصطلاح وہ پیار سے اپنی بہو کے لیے استعمال کرتی تھیں۔

"اگر حمزہ کی پیدائش کے وقت بڑا آپریشن نہ ہوا ہوتا تو ساتویں دن ہی عقیقہ کی سنت ادا کر لیتے مگر یہ پرائیویٹ ہسپتال والے بل بھی تو اتنا لمبا چوڑا بنا دیتے ہیں۔ اس وقت گنجائش ہی نہ بچی مگر شہلا نے دل میں ٹھان رکھی تھی کہ جب بھی گنجائش نکلی۔ عقیقہ ضرور کرے گی لیکن آپ کو تو پتا ہے کہ جانوروں کے ریٹ آسمانوں کو چھو رہے ہیں۔ ارشاد کی تنخواہ میں سے کب بچتا ہے میں نے بہت دفعہ سمجھایا کہ بچی کیوں اتنا سوچتی ہے عقیقہ کوئی فرض تھوڑی ہے مگر کہتی تھی امی اللہ نے صحت مند اولاد سے نوازا ہے۔ اتنی بڑی نعمت پر شکرانہ تو واجب ہے نا پھر اللہ نے بھی اس کی سن لی۔ اس کی خواہش تھی۔ سالگرہ والے دن ہی عقیقہ ہو جائے اسی مقصد کے لیے کمیٹی ڈالی تھی۔ پہلا ہی نمبر نکل آیا۔"

ارشاد بھائی کی باتونی والدہ تفصیل سے بات کرنے کی عادت تھیں اور میری ساس بہت اچھی سامع مگر سچ تو یہ ہے کہ آج میری سماعتیں بھی دونوں کی گفتگو کی جانب ہی لگی ہوئی تھی اور کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے نا کہ کوئی بڑی سے بڑی بات بھی آپ کے دل پر اثر نہیں کرتی اور کبھی کسی کی کہی چھوٹی بات تھاہ کر کے آپ کے دل پر لگتی ہے تو شاید وہ بھی کوئی ایسا لمحہ تھا۔

ہر بار میرے سسرال والے شہلا اور میرا موازنہ کرتے تھے مگر آج میں خود شہلا کے ساتھ اپنا موازنہ اور موازنے کے بعد محاسبہ کر رہی تھی۔ اللہ نے صحت مند اولاد سے تو مجھے بھی نوازا تھا۔ کتنا پیارا، گپلو گپلو سا بچہ تھا میرا میری آنکھوں کی ٹھنڈک ریان۔

اولاد کتنی بڑی نعمت ہے اس کی قدر تو کوئی کسی بے اولاد سے پوچھے اور جب اللہ نے مجھے اس بے پایاں نعمت سے نواز دیا تو کیا مجھے اس طریقے کے مطابق اللہ کی بارگاہ میں شکرانہ ادا کرنا چاہیے تھا جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا تھا؟

ہفتے پہلے ریان کی پہلی سالگرہ دھوم دھام سے منانے کے چکر میں میں نے بلا مبالغہ ہزاروں روپے خرچ کروا لیے تھے اگر کسی کی استطاعت نہ ہو تو الگ بات مگر میرا شمار ایسے لوگوں میں تو نہ ہوتا تھا پھر جانے کیوں میرے ذہن میں کبھی یہ بات نہ آئی کہ سالگرہ کے بجائے عقیقہ زیادہ ضروری اور باعث ثواب ہے۔

ارشاد بھائی کی والدہ تو تھوڑی دیر بعد چلی گئی تھیں مگر مجھے سوچوں کے گرداب میں الجھتا چھوڑ گیا تھا۔

اور اگلے دن میں اسٹیم رائس چکن رولز کی پلیٹ لیے شہلا کے گھر جا رہی تھی۔ آج میرا مقصد اس نئی ریسپی کا شہلا پر رعب ڈالنا ہرگز نہ تھا بلکہ میں شہلا کے ساتھ اپنے تعلقات بہتر بنانا چاہتی تھی۔ دل سے بہتر۔ کیونکہ عقل کی بات کسی سے بھی پتا چلے اسے پلو سے باندھ لینا چاہیے اور شہلا کے پاس میرے مقابلے میں عقل کی وافر مقدار موجود تھی۔

تین برسوں میں آخر میں نے یہ حقیقت تسلیم کر ہی لی تھی اور یہ عقل مندی کی جانب میرا پہلا قدم تھا۔

☆

عفت سحر پاشا

جینوں لا کی ڈھولا وے

اکتوبر کے اوائل میں دن تیزی سے سمٹنے اور راتیں بڑھنے لگی تھیں۔ وہ رات جو ادھر آنکھ لگی اور ادھر ختم ہوئی کی تفسیر بنی ہوئی تھی اب آئی تو یوں لگتا جیسے ختم ہی نہ ہوگی۔ آٹھ بجے تک عشاء کی نماز سے فارغ ہوجانے کے بعد زنبیہ کو لگتا اس پر امتحان کی گھڑی آن پہنچی ہے۔

جوانی کی نیند تو بہت بدمست اور مدہوشی سے بھرپور ہوتی ہے پھر کیوں اسے رات شروع ہوتے ہی خوف اور واہمے گھیرنے لگتے تھے۔

وہ کتنی ہی دیر بے چینی سے کروٹیں بدلتی رہی۔ دل تھا کہ کسی طور چین ہی نہ لے رہا تھا اور آنکھ... آنکھ تھی کہ خشک ہی نہ ہوتی تھی۔

"یا خدا... اے میرے خدا! میں تجھ سے کچھ نہیں مانگتی۔ بس ایک اسجد...." وہ خود پہ قابو پاتے ہوئے تکیے میں منہ دیے سسک اٹھی اور باہر سیاہ رات دھیرے دھیرے گزرنے لگی۔ کسی کی مجبوری، کسی کی بے بسی کا خیال کیے بغیر۔

☼ ☼ ☼

"لڑکیاں تو اپنی شادی کی خبر سن کے کھل اٹھتی ہیں، ذرا اس کی شکل دیکھو جیسے شادی نہ ہوئی کوئی سزا سنادی ہو اسے۔" آپا کے آتے ہی امی جس طرح شروع ہوئیں زنبیہ اور بھی پژمردہ ہونے لگی۔

"ٹھیک ہوجائے گی امی جی! جو لڑکیاں اپنے میکے سے زیادہ اٹیچ ہوتی ہیں ان کے ساتھ یہ ہی مسئلہ ہوتا ہے۔ خوامخواہ کی ٹینشن لے لیتی ہیں۔" آپا نے ایک

مکمل ناول

تیکھی نظر کتاب سامنے رکھے خاموش بیٹھی زنیرہ پر ڈالتے ہوئے امی کو تسلی دی۔

"ٹینشن لے لیتی ہیں یا دے دیتی ہیں؟" امی نے تیز لہجے میں کہا۔

"جب سے شادی کی تاریخ طے ہوئی ہے مجال ہے جو اس نے ایک بھی کام میں خود سے بڑھ کے دلچسپی لی ہو۔ تم بھی روز روز سسرال سے نہیں آسکتیں' میں اکیلی جان کہاں تک دیکھوں؟"

"چلیں۔ کرلینے دیں عیش' ویسے بھی اس بار میں پورے ہفتے کے لیے آئی ہوں۔ جتنی ہوسکی تیاری کروا کے جاؤں گی۔" آپا نے انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

"دیکھو کوئی شوخ اور بھڑکیلے سے کپڑے نہیں لینے کسی کے۔ پڑھی لکھی فیملی ہے' سب ہی بہت ڈیسنٹ اور سوبر سے ہیں۔ بس اسی کو سامنے رکھ کے شاپنگ کرنی ہے۔" امی کچھ ٹھنڈی پڑ ہی گئیں۔

ان کی گفتگو کو ایک ہی ٹریک پہ چلتا دیکھ کے زنیرہ کا دل بھر سا گیا۔

"کہنے کو یہ میری ماں... مجھے جنم دینے والی' میری رگ رگ سے واقف اور یہ میری ماں جائی جس سے کوئی خوشی' کوئی غم میں نے کبھی نہیں چھپایا اور اب یہ دونوں سب جانتے بوجھتے ایسے انجان بن رہی ہیں جیسے مجھے... میری خواہش کو جانتی ہی نہیں۔" وہ کتاب بند کرتی اٹھ گئی۔

"کل سے تم بھی ہمارے ساتھ بازار جاؤ گی۔ اپنی شاپنگ تم اپنی پسند سے کرلینا۔" آپا کو وہ نظر آ ہی گئی تھی۔

"ہونہہ..." اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیلی۔ "پسند؟ میری پسند کا کیا ہے آپا! شادی آپ کی پسند کے لوگ' آپ کی پسند سے تو پھر کپڑے میری پسند کے کیا معنی رکھتے ہیں۔ صرف آپ لوگوں کے شو کو کامیاب کرنے کے لیے؟" وہ اس قدر کڑوا بولے گی یہ نہ تو امی کے ذہن میں تھا اور نہ ہی آپا کے۔ پہلے تو وہ ششدر رہی رہ گئیں۔

"بہت اچھا... تم آرام سے گھر بیٹھو۔ میں اور امی خود ہی سب کچھ کرلیں گے۔" آپا نے تیزی سے ہاتھ ہلا کر امی کو کچھ بھی بولنے سے روکا اور قطعیت سے بولیں تو وہ پاؤں پٹختی وہاں سے چلی گئی۔

"دیکھ رہی ہو اس کی حرکتیں۔" امی نے جانے اپنے غصے کو کیسے جتن سے کنٹرول کیا تھا' اس کے جاتے ہی پھٹ پڑیں۔

"اوفوہ امی! کچھ حوصلہ وہ آزما رہی ہے' کچھ آپ آزمائیں گی' تبھی بات آگے بڑھے گی نا!" آپا نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی تو وہ اور بگڑنے لگیں۔

"وہ اپنا نہیں میرا حوصلہ آزما رہی ہے۔ غضب خدا کا' ماں' باپ نہ ہوئے دشمن ہوگئے اس کے۔ مانا کہ بات طے تھی اس کی اسجد سے۔ مگر منہ زبانی ہی نا' کون سا نکاح توڑا ہے ہم نے خدانخواستہ..."

"پھر بھی پانچ سال ہوگئے تھے بات ہوئے۔ کچھ تو اثر ہونا ہی تھا اس نے... اور باقاعدہ منگنی تھی کی۔ منہ زبانی بات پانچ سال تو نہیں رہتی نا!" آپا نے زنیرہ کا دفاع بھی بہت کمزور لہجے میں کیا۔ اس گھر میں جو مقام امی اور ابو کا تھا اسے چیلنج کرنے کی جرأت کسی میں نہ تھی۔ بلکہ ابو کے رعب تک تو بعد میں بات پہنچتی پہلے ہر معاملہ امی کے کورٹ میں اپرود ہوتا تھا۔

"فضول باتیں مت کرو فاریہ! ایسی کمزور سوچ کی ہے یہ لڑکی۔ ہم نے بات طے کی تھی' ہم نے ختم کردی۔ وہ تین میں نہ تیرہ میں۔ خوامخواہ اثر لیے بیٹھی ہے۔" انہوں نے اپنی ہی کہہ کر رہی سے سر جھٹکا۔

"اچھا چھوڑیں اسے کل کو جب اپنے گھر بار والی ہوجائے گی تو ہنسے گی اپنی ماضی کی بے وقوفی پر اور ویسے بھی کامران کافی اچھا بندہ لگتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کے یہ کہ اتنی پڑھی لکھی فیملی' تینوں بھائی پڑھے لکھے' بہنیں بھی لائق فائق اور بھابیاں بھی' اس کا مزاج مل گیا کامران کے ساتھ تو پھر کوئی مسئلہ ہی نہیں۔" آپا اور زنیرہ کے بیچ قاسم تھا۔ اس طرح وہ آپا سے پانچ

سال چھوٹی' یعنی پانچ سال کے فاصلے پر تھی۔ یہ فاصلہ دو' چار سال کم ہوتا تو شاید وہ زنیرہ کو زیادہ جان پاتیں۔ دل پہ لکھی تحریریں کسی ربڑ سے مٹائی جاسکتیں تو پھر رونا کاہے کا تھا۔ وہ بھی دل پہ لکھا اسجد کا نام مٹا کر آرام سے کامران کا نام چڑھا لیتی۔

مگر کوئی بھی تو ربڑ نہیں تھا ایسا۔ یہاں آکر سائنس فیل ہوگئی تھی۔

آپا کی باتوں نے امی کو وقتی طور پر بہلا دیا' مگر زنیرہ سے وہ کچھ زیادہ خوش نہ تھیں۔ سب سے چھوٹی ہونے کے باعث وہ ان کے رعب میں بھی تھی اور لاڈلی بھی۔ ان معنوں میں کہ "تقریباً" ہر فرمائش ہی پوری کی جاتی تھی کہ معاشی حالات اچھے تھے اور اب جب موقع آیا تھا تو...

پچھلے برآمدے کی ٹھنڈی سیڑھی پر بیٹھے گھٹنوں پر سر رکھے وہ آبدیدہ تھی۔ پانچ سالوں سے وہ ایک ہی شخص کا نام اپنے نام کے ساتھ سنتی چلی آرہی تھی۔ اور وہ شخص تھا ہی اس قابل کہ وہ اس کی ہمراہی پر فخر کرتی۔ خوشنما آنکھوں والا وہ شخص... کیسے دنوں میں ہی اس کے دل میں گھر کر گیا تھا۔ اس نے آنکھیں موندیں تو کتنے ہی آنسو پلکوں کی باڑ توڑ کر اس کے رخسار بھگونے لگے۔ بند پلکوں تلے کئی سہانے منظر جاگ اٹھے تھے۔

☼ ☼ ☼

فقط پانچ سال پہلے ہی کی بات تھی۔ جب گھر بھر میں لاڈلے بیٹے عاصم کی شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے۔

تب زنیرہ ایف اے کے ایگزیمز سے فارغ ہوئی تھی اور ساتھ ہی گھر میں بلکہ اس کے ہوش میں یہ پہلا بڑا فنکشن ہو رہا تھا۔ فاریہ کی شادی ایف اے کے "فوراً" بعد ہی ہوگئی تھی' گریجویشن اور پھر پوسٹ گریجویشن کی ڈگری اس نے شادی کے بعد لی تھی۔

"دادی اماں کو میں مہینہ پہلے ہی گھر لے آؤں گا۔" عاصم دادی کا بھی لاڈلا رہا تھا۔ یہ تو عافیہ بیگم یعنی اس کی ماں ہی ان کے ساتھ نہ رہ پائی تھیں اور ان کے سب سے بڑے نور نظر شبیر احمد کو لے کر بیٹے بھائیوں سے الگ گھر میں آن بسیں۔ سچی بات تو یہ تھی کہ بچوں میں سے کسی کا بھی دادی کے گھر کے بغیر گزارا نہیں تھا۔ مگر جب باپ ہی اس بات کو سمجھ نہیں پا رہا تھا تو وہ ماں کا شکوہ کیا کرتے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو غلط فہمیوں میں ڈھال کر شوہر کے دل کو انہوں نے اچھی طرح بھر دیا تو پھر نتیجہ علیحدہ گھر کی صورت میں نکلا' جہاں عافیہ بیگم نے طنطنے سے اپنی حکومت چلائی۔ شوہر کو انہوں نے ابھی تک اپنی آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی تک رکھا ہوا تھا۔ جو وہ کہتیں اسی کے مطابق وہ فیصلہ جاری کرتے تھے۔

اور اب عاصم کی یہ ضد... انہیں قطعی نہ بھائی۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے گھر کو لوگوں سے بھرنے کی۔" انہوں نے تیز لہجے میں کہا تو عاصم نے احتجاج کیا۔

"واٹ لوگ امی؟ میں دادی اماں کی بات کر رہا ہوں' ہمارے باپ کی ماں۔" اس کے برا مان جانے پر وہ سنبھلیں۔

"میرے کہنے کا مطلب ہے کہ ابھی نئے سرے سے گھر کی سیٹنگ اور پینٹ وغیرہ ہونے ہیں۔ اس گھر میں رہ کر ہی ہم نے یہ سب کرانا ہے' ایسے میں انہیں کہاں سنبھالتے پھریں گے۔ اچھا لگے گا ایک سے دوسرے' دوسرے سے تیسرے کمرے میں شفٹ کرتے۔" انہوں نے گویا بات ہی ختم کردی۔ اب پتا نہیں یہ منطق عاصم کے دل کو لگی یا نہیں' بہرحال وہ خاموش ہوگیا تھا۔

اس کے بعد گھر کی سیٹنگ بھی تبدیل ہوگئی اور پینٹ ڈسٹمپر کا کام بھی پار لگا۔ مگر دادی اماں شادی سے محض ایک ہفتہ پہلے ہی آئیں۔ وہ بھی عاصم کے پرزور اصرار پر۔

☼ ☼ ☼
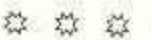
"زنیرہ! میں صدقے جاؤں' ادھر تو آ میری بچی۔ ماشاء اللہ کتنی پیاری لگ رہی ہے۔ ادھر آ نظر اتار دوں

ہیں۔" وہ مہندی والے روز تیار ہو کے آئی ہی تھی جب دادی اماں نے اس کی بلائیں لیتے ہوئے پتا نہیں کیا کچھ پڑھ کے اس پر پھونکا۔ کندن کے دیدہ زیب کام سے سجا چیچ کلر کا لہنگا اس کے الہڑ روپ کو چار چاند لگا رہا تھا۔

"کیا کر رہی ہیں دادی اماں! میں نے تو میک اپ بھی نہیں کیا۔" وہ شرما کر کسمسائی۔

انہوں نے اس کی ادا پر واری جاتے ہوئے اس کی پیشانی چوم لی۔

"میری شہزادی کو ان مصنوعی چیزوں کی ضرورت ہی کہاں ہے؟"

وہ بڑی بے تابی سے اپنے پوتے کا انتظار کر رہی تھیں۔

"خدا کے لیے دادی اماں! مجھے امتحان میں مت ڈالیں۔ تائی جان سے بہت ڈرتا ہوں میں۔" وہ اسے عاصم کی شادی میں شرکت کی پُرزور دعوت دے رہی تھیں جس کے جواب میں وہ فون پر ڈرنے کی اداکاری کرتے ہوئے بولا۔

"جتنا ہم لوگ بندوں سے ڈرتے ہیں اتنا خدا سے ڈرنے لگیں تو بخشے جائیں۔" وہ ناراض ہوئیں تو وہ خوب ہی ہنسا۔

"بس۔ میں کچھ نہیں جانتی تو شادی پہ آ رہا ہے۔" انہوں نے اب کے رعب جمایا۔ یہ شادی سے دو روز پہلے کی بات تھی۔

"امی آ رہی ہیں، بلکہ سبھی گھر والے ایسے میں میری کیا ضرورت ہے بھلا۔" وہ کنی کترا رہا تھا۔ عافیہ بیگم کی طنزیہ گفتگو اور لیے دیے انداز سے سبھی گھبراتے تھے۔ اوپر سے جس طرح وہ الگ ہوئی تھیں، وہ بات کسی کو نہ بھولتی تھی۔ دادی اماں کے دکھ کو سب اپنا دکھ مانتے تھے۔

"تو بھلا... ہر کسی کی اپنی جگہ ہوتی ہے۔ تم نہ آئے تو تمہاری کمی اپنی جگہ۔" وہ خفا ہوئیں۔

"مسئلہ کیا ہے دادی اماں! سیدھی بات بتائیں۔ آپ جانتی ہیں۔ نیا نیا ڈاکٹر بنا ہوں، چھٹی ملنا بہت مشکل ہے۔" لمحہ بھر خاموش رہنے کے بعد وہ مصالحانہ انداز میں بولا تو کچھ سوچنے کے بعد وہ رازداری سے بولیں۔

"ایک لڑکی دکھانی ہے تجھے۔"

"کیوں۔ کیا مرض ہے اسے؟" وہ چونکا۔

"اللہ نہ کرے۔" وہ دہل کر بولیں اور اسے ڈانٹ دیا۔

"سوچ سمجھ کر بولا کرو۔"

"اب ڈاکٹر ہوں تو ڈاکٹری نظر ہی سے سوچوں گا۔" وہ ہنسا۔ اس کی ہاؤس جاب مکمل ہونے والی تھی۔

"اچھا سنجیدگی سے میری بات سنو۔ زینیہ کو دکھانا ہے۔" وہ بالآخر بول ہی گئیں۔

"اسے کیا ہوا ہے؟" حیران ہو کر وہ پھر سے کہہ گیا' پھر ان کے ڈر سے فوراً ہی بولا۔

"میرا مطلب ہے کہ خیر تو ہے۔ سالوں ہمارے ساتھ رہ کے گئی ہے وہ دیکھی بھالی ہے۔"

"تو اس دیکھی بھالی کو تین سال ہونے کو آئے تب نویں جماعت میں تھی' اور اب بارہ پڑھ چکی ہے۔" وہ تفاخر سے بولیں تو اسے ہنسی آ گئی۔

"واہ۔ بڑا تیر مارا ہے۔"

"مذاق اڑا رہے ہو؟"

"ارے نہیں دادی اماں! ابھی کوئی بھی لڑکی جو تین سال پہلے نویں میں ہوتی اب تک وہ بھی بارہ پڑھ چکی ہوتی۔ آپ کی پوتی نے کیا کمال کر لیا بھلا۔"

"بے وقوف! شکل و صورت' رنگ ڈھنگ کی بات کر رہی ہوں۔" انہوں نے بلا تکلف اسے لتاڑا پھر شہد آگیں لہجے میں بولیں۔

"اتنی نازک' اتنی پیاری' طبیعت اس سے زیادہ میٹھی۔"

"ہو گی۔ بلکہ وہ پہلے بھی ایسی ہی تھی۔" اسجد کو تین سال پہلے والی چودہ سالہ زینیہ یاد آ گئی۔ جو اپنے بہن بھائیوں میں سب سے پیاری اور اتنی ہی ڈرپوک سی تھی۔

"ایک تو میں تمہاری اس بحث کرنے والی عادت سے بہت تنگ ہوں۔ آ لینے دو تمہارے باپ کو ایک کی دس نہ بتائیں تو کہنا۔" انہیں غصہ آ گیا۔ اپنے تئیں وہ اسے اتنی اہم معلومات دے رہی تھیں اور وہ کسی کھاتے میں نہیں لے رہا تھا۔

"اچھا سوری۔ کان پکڑتا ہوں۔ بلکہ کہتی ہیں تو مرغا بن کے حاضری دوں گا آپ کے پوتے کی شادی میں۔" وہ شرارت سے بولا۔

"کوئی ضرورت نہیں۔ سیدھے سیدھے انسانوں کی طرح آؤ۔ اچھے سے کپڑے پہن کے' زینیہ کو بھی تمہیں دکھانا ہے نا!" ان کے کہنے پر وہ ٹھٹکا۔

"یہ کون سی نئی رسم نکلی ہے دادی اماں؟"

"دادی کا اتنا تو مان رکھو گے نا۔ وہ تمہارے ساتھ بہت اچھی لگے گی۔" وہ معصومیت سے بولیں' اسجد خاموش رہ گیا۔

"شبیر کو میں باندھ کے نہ رکھ سکی۔ مگر تمہیں بھی دوسرے کے سنگ بندھ جائے گا تو اسی بہانے کبھی کبھار اس کی شکل دیکھ لیا کروں گی۔" بیٹے کے ذکر پر وہ آبدیدہ ہونے لگیں۔

"وہ بہت چھوٹی ہے مجھ سے دادی اماں!" اسے درحقیقت کوئی بہانہ نہ سوجھا تھا۔

"نہ میرے بچے! اتنی اچھی اٹھان ہے اس کی' رنگ' روپ' قد کاٹھ سب تیرے ساتھ جچنے والا ہے بچو!" وہ جو ٹھان چکی تھیں ان کے لہجے سے جھلک رہا تھا۔ اسجد گہری سانس بھر کے رہ گیا۔

وہ یہ بھی جانتا تھا کہ دادی اماں کے لب و لہجے کا یہ مان کہ اسجد ان کی بات ہر صورت مانے گا اس کے ماں باپ کا دیا ہوا تھا۔ یقیناً امی اور ابو اس بات پر راضی تھے' تب ہی دادی اماں اسے اوپن آفر کر رہی تھیں۔ اور خود تو وہ ان کا فرماں بردار تھا ہی۔

"او کے... اب جبکہ آپ مجھے پھانسنے کا ارادہ کر ہی چکی ہیں تو میں بے چارہ کیا کر سکتا ہوں' سوائے سرنڈر کرنے کے۔"

"ہیں... سلنڈر... کاہے کا سلنڈر؟" دادی اماں اتنی حیرانی سے پوچھنے لگیں کہ اسجد کو اپنے قہقہے پر قابو پانا محال ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

دادی اماں سے عافیہ بیگم کی کم ہی بنتی تھی' وجہ یہ کہ بڑے بزرگوں کی طرح دادی اماں کو بھی اپنے بچوں کو اچھے اور مفید مشورے اور نصیحتیں دینے کا شوق تھا' مگر کیا کیا جائے جب بچوں کو اس کی قدر ہی نہ ہو۔ مگر بظاہر وہ دادی اماں کے سامنے بالکل چپ رہتیں' البتہ شبیر احمد تک اپنے الفاظ میں ہر بات پہنچانے سے ہرگز نہ چوکتی تھیں۔

"یہ میں ہی ہوں، جو برداشت کر رہی ہوں شبیر!"

شدید غصے کے عالم میں وہ یہ بات جتانا ہرگز نہ بھولتی تھیں۔

"وہ کون سا ہمیشہ کے لیے ہمارے ساتھ رہنے آگئی ہیں' شادی کے دن گزار کر واپس چلی جائیں گی۔" شبیر احمد بھی یوں بولے جیسے کسی اور کی ماں کے متعلق گفتگو ہو رہی ہو۔

مگر عاصم' زینیہ اور قاسم کی تو موجیں ہو گئی تھیں۔ وہ تینوں ہی دادی کے لاڈلے تھے اور ان کی آمد پر خوش تھے۔ ناشتے میں دادی کے ہاتھ سے بنے مکھن کے پراٹھے اور چائے کے ساتھ کوئی نہ کوئی حلوہ۔ اس عمر میں بھی وہ بچوں کے لیے کمر کس کے کچن میں گھس جاتی تھیں۔ عافیہ بیگم اپنے کچن میں انہیں پا کر خون کے گھونٹ بھر کے رہ جاتی تھیں۔ بچوں کو البتہ گھرکتی۔

"کیا امی! اتنے عرصے کے بعد تو اتنی مزے کی چیزیں کھا رہے ہیں۔" عاصم منہ پھٹ تھا۔

"وہ ہر شے الٹ پلٹ کر دیتی ہیں۔ میرے کچن کا انہیں کیا پتا' کون سی چیز کہاں رکھتی ہے۔" وہ اپنے غصہ پر قابو پا کر بولیں تو وہ ہاتھ ہلا کر کہنے لگا۔

"ڈونٹ وری۔ چیزیں ہیں تو کچن میں ہی نا!"

"مگر مجھے یہ بے ترتیبی بالکل پسند نہیں۔" وہ تنک کر بولیں۔

"تو آپ ان کے ساتھ کھڑی ہوا کریں نا! ہیلپ کے لیے کچن میں۔" مشورہ مفت تھا۔ وہ جل کر رہ گئیں۔

"ساتھ ہی کھڑے ہونا ہوتا تو الگ نہ ہوتی۔"

"یہ تو آپ کی غلطی ہے نا!" وہ چل پڑا تھا۔

"کیا؟" وہ اس کی زبان درازی پر حیران ہوئیں۔ وہ باہر جا رہا تھا۔

"ادھر آؤ تو ذرا۔ کیا بکواس کر رہے ہو؟" وہ اس کے پیچھے لپکیں۔ مگر انہیں ستا کر وہ نکل گیا تھا۔

"خبیث۔" وہ دانت پیس کر رہ گئیں۔

☼ ☼ ☼

آج ان کا لڑکی والوں کے ہاں مہندی لے جانے کا پروگرام تھا۔

"کہاں رہ گیا یہ سجو کا بچہ!" دادی اماں کو ایک ہی فکر کھائے جا رہی تھی۔ اس کے ماں' باپ' بہن' بھائی پہنچ چکے تھے۔ اسپتال میں ایمرجنسی کیس سے نمٹنے کی وجہ سے وہ لیٹ تھا۔

"تین سالوں میں ان کی شادی تو ہوئی نہیں' پھر بچہ کون سا دادی اماں؟" زینیہ نے انہیں چھیڑا تھا۔

"شادی بھی ہو جائے گی جلد ہی۔" وہ مسکرائیں اور بے حد پیار سے اسے دیکھا۔

"چلو بھئی۔ اب نکلنا ہے' سب گاڑیوں میں بیٹھو۔" عاصم عجلت اندر آتے ہوئے بولا۔

امبرائیڈڈ کرتہ شلوار میں وہ بہت ہینڈسم لگ رہا تھا۔ اور گلے میں ڈالا دوپٹہ نما صافہ' زینیہ کو اس قدر خوب صورت لگا تھا کہ اس نے صاف کہا تھا۔

"یہ بعد میں' میں لوں گی اور اس کے ساتھ سوٹ میچنگ کر کے سلواؤں گی۔"

"ہو سکتا ہے عروبہ کا بھی یہ ہی خیال ہو۔" وہ شرارت سے ہنسا تھا۔ وہ دادی اماں کو عاصم کی گاڑی میں بٹھانے گئی تو عافیہ بیگم نے اسے اشارہ کیا۔

"ادھر کدھر۔ ادھر کوئی اور گاڑی دیکھو۔ مجھے ابھی بیٹھنا ہے۔"

"جگہ ہے نا اندر۔ آپ بھی بیٹھ سکتی ہیں۔" وہ ددھیال والوں کے متعلق ماں کی تنگ دلی اور بغض سے اچھی طرح واقف تھی۔ نرمی سے بولی تو وہ دانت پیس کر اسے گھورنے لگیں۔

"میں جلدی سے واش روم سے ہو آؤں۔" وہ کھڑکی میں جھک کر دادی اماں کو بتاتی لہنگا سنبھالتی تیزی سے اندر کی جانب بڑھی۔ تقریباً" سبھی گاڑیوں میں بیٹھ چکے تھے اور جو کھڑے تھے' وہ بھی جگہ دیکھ کر بیٹھنے کی تیاری میں تھے۔ نوکروں کو ہدایات دے کر عافیہ بیگم' بادل ناخواستہ دادی اماں کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ مجبوری تھی اگر عاصم اس گاڑی میں نہ ہوتا تو وہ بھی اس گاڑی میں نہ بیٹھتیں۔

"چلو بھئی' جلدی کرو' ہمیں پہلے نکلنا ہے۔"

انہوں نے عاصم سے کہا۔ اس کا دوست ڈرائیونگ سیٹ پر تھا۔

"سب بیٹھ گئے گاڑیوں میں؟" دادی اماں نے چوتھی مرتبہ پوچھا تھا۔

"بیٹھ گئے ہیں اماں جی! آپ آرام سے بیٹھیں۔" عافیہ بیگم اندر سے چڑ گئی تھیں۔ بدزبانی نہ کرنے کا تہیہ کرنے کے باوجود بے زاری ان کے لہجے سے ظاہر تھی۔

"بھئی دور کا سفر ہے' گجرات پہنچتے آدھا' پونا گھنٹہ تو لگے گا نا۔ کوئی پیچھے رہ گیا تو مشکل ہو گی۔" وہ صحیح کہہ رہی تھیں۔ عاصم نے ان کی تسلی کے لیے کھڑکی میں سے سر باہر نکال کے دیکھا۔ سب گاڑیاں چلنے کو تیار تھیں۔

"اے لو۔ وہ اپنی زینی کہاں ہے' باتھ روم گئی تھی۔" دادی اماں کو پھر سے خیال آیا۔

"اوفوہ' اماں جی! ابھی تک باتھ روم میں تھوڑی بیٹھی ہو گی۔ آ کے بیٹھ گئی ہو گی کسی گاڑی میں' چلو اب عاصم' تمہارے سسر کا بار' بار فون آ رہا ہے' دیر ہو رہی ہے۔" ضبط کرتے کرتے بھی انہیں غصہ آہی گیا تھا۔

"ایک بار دیکھ لوں۔" عاصم متذبذب تھا۔

"اب کہاں ساری گاڑیاں چیک کرو گے' لڑکیوں کے ساتھ بیٹھ گئی ہو گی' بچی تو نہیں ہے کہ پیچھے رہ جائے' چلو تم۔" وہ چڑ گئیں۔

"خدا معلوم۔" دادی اماں متفکر تھیں اور ان کی باتوں پر عافیہ بیگم کا پارہ ہائی ہو رہا تھا۔ دو' تین گاڑیاں ان سے آگے نکل گئی تھیں۔

"نوکر بے وقوف تو نہیں نا جنہوں نے دروازے بند کیے ہیں۔ خود سب کو بٹھایا ہے میں نے۔" عاصم نے ماں کا موڈ خراب ہوتے دیکھ کر اپنے دوست کو گاڑی چلانے کا اشارہ کیا تھا۔

"سب تو ٹھیک ہیں' میں فقط زینی کی بات کر رہی تھی۔" دادی اماں کے دل کو جانے کیسا وسوسہ لگا تھا۔ ہولے سے بولیں تو عافیہ بیگم گردن جھٹک کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگیں۔ بھنچے ہوئے لب اور ماتھے کی تیوری ان کے موڈ کی ساری کہانی بیان کر رہی تھی۔ وہ گہری سانس لے کے رہ گئیں۔

☼ ☼ ☼

اور دادی اماں کے وسوسے بے جا نہیں تھے۔ زینیہ واقع گھر میں ہی تھی۔ وہ واش روم میں داخل ہوئی' ادھر کمروں کو تالے لگانے کا کام شروع ہو گیا۔ واش روم سے فارغ ہو کر وہ جلدی سے ڈریسنگ کی طرف آئی اور اپنا کیچر اٹھا کر بال سمیٹنے لگی۔

"بھاڑ میں جائے فیشن' وہاں جا کے کھول لوں گی۔" کھلے بالوں سے اسے شدید گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ آئینے میں خود پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال کے وہ پلٹی اور دروازے تک آئی' ناب پہ ہاتھ رکھا' اسے گھمایا' مگر وہ اپنی جگہ سے نہ ہلا' ایک بار' دوبار' سہ بار۔ اس کا دل خوف سے دھڑک اٹھا۔ اسے خیال آیا سبھی گاڑیوں میں بیٹھنے والے تھے کہیں۔

"امی۔۔۔ امی' قاسم۔۔۔ عاصم بھائی!" وحشت کے عالم میں اس نے دونوں ہاتھوں سے دروازہ پیٹ ڈالا۔ ہاتھوں کی کتنی چوڑیاں ٹوٹ کر اسے زخمی کر گئیں' اسے اندازہ نہیں تھا' ابھی تو وہ ایک انجانے سے خوف کی زد میں آئی ہوئی تھی۔ وہ اوپری کمرے میں تھی' بمشکل ہی ٹی وی لگا کے بیٹھی صغراں تک آواز پہنچی۔

"اے نوری۔ اوپر دروازہ بج رہا ہے کوئی۔" اس نے اپنی بیٹی سے کہا تو وہ سیڑھیوں تک گئی۔

"ہائے میں مر جاؤں' پتا نہیں کون رہ گیا ہے اندر۔" اس نے سینے پہ ہاتھ رکھا' پھر دھڑ دھڑ کرتی سیڑھیاں چڑھ گئی۔

"کون ہے اندر؟" نوری نے دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے پاگلوں کی طرح دروازہ کھٹکھٹانا بند ہو گیا۔

"مر جاؤ تم نوری! دروازہ کھولو۔" وہ اندر سے چلائی۔

"ہائے۔۔۔ زینی بی بی!" نوری نے منہ پہ ہاتھ رکھا۔ پھر بے چارگی سے بولی۔

"دروازہ کیسے کھولوں جی' چابیاں تو بی بی جی ساتھ

لے گئی ہیں۔"

"مجھے نہیں پتا' توڑ دو دروازہ۔" وہ غصے سے چیخی' نوری الٹے قدموں بھاگی جا کے ماں کو ساری بات بتائی تو وہ سر پکڑ کے بیٹھ گئی۔

"لو کر لو گل بی بی کی' اپنی دھی کو گھر بھول گئی۔"

"اوفوہ۔ افسوس کا وقت نہیں ہے' زینی بی بی کو کمرے سے نکالنے کی سوچو۔" نوری جھنجلائی' مگر صغراں کے وجود کی طرح اس کا دماغ بھی موٹا تھا' کھسک بیٹھی رہی تو نوری پھر سے اوپر بھاگی۔ جدھر زنیبہ دروازہ دھڑ دھڑا رہی تھی۔

"وہ لوگ تو کب کے نکل گئے زینی بی بی! اب میں بھلا کیسے دروازہ کھولوں؟" وہ بے بسی سے بولی۔

اندر وہ رو رہی تھی۔

اپنا گھر' اپنا کمرہ تھا' مگر آج پتا چلا تھا قید ہونے کا احساس خوف دلاتا ہے' جگہ کوئی بھی ہو اس سے فرق نہیں پڑتا۔

"آپ ایسا کرو بالکنی میں جاؤ' میں لان کی طرف سے سیڑھی لگاتی ہوں بالکونی کے ساتھ۔" اچانک نوری کے ذہن میں جھماکا سا ہوا' وہ پُرجوش سی بولی تو زنیبہ کا بھی کچھ دل ٹھہرا۔

"جلدی سے آؤ' میں جاتی ہوں بالکنی میں۔" نوری قلانچیں بھرتی نیچے بھاگی۔

"اماں! دروازے کی گھنٹی بج رہی ہے' وہ تو دیکھ لے کون آیا ہے' میں سیڑھی لگا کے بی بی کو نیچے اتار لوں۔" نوری نے غصے سے ماں سے کہا جو پُرشوق انداز میں ٹی وی میں لگی ہوئی تھی۔ بے وقت اٹھی اور منہ بناتی بیرونی گیٹ کی طرف قصد کیا۔ نوری اسٹور سے فل سائز لکڑی کی سیڑھی تقریباً "گھسیٹ" کر لائی اور لان میں بالکنی کے ساتھ لگا دی۔

زنیبہ بالکنی ہی میں کھڑی تھی۔ لہنگا پہنے ہوئے سیڑھی اترنا کیسا جان جوکھوں کا کام ہے' یہ اسے ابھی پتا چل رہا تھا۔

"واہ۔ تم نے یہاں آ کے کیا سرکس میں کام شروع کر دیا ہے۔" وہ ابھی آخری سیڑھی پر ہی تھی کہ غیر متوقع مردانہ آواز ستائش لیے ابھری۔ اس نے لان میں چھلانگ لگائی اور ناگواری سے مڑ کے دیکھا۔

"اسجد بھائی!" اس نے فی الحال رونے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

"میں گھر میں ہی رہ گئی ہوں۔" منہ بسور کر اسے اطلاع دی۔

"وہ تو میں بھی رہ گیا ہوں' مگر اللہ کا شکر ہے قید و بند کی صعوبت برداشت نہیں کرنی پڑی۔" وہ مسکرایا۔

"اب کیا ہوگا' فون کر کے بلواؤں کسی کو' وہ تو آدھے راستے تک پہنچ گئے ہوں گے۔" اسے رونا آنے لگا۔

"میں آتے ہوئے ٹرائی کر رہا تھا' مگر نیٹ ورک بزی تھا۔ ابھی شاید کال مل جائے۔" اسجد نے اچٹتی نگاہ اس کی سوجی ہوئی آنکھوں اور سرخ ہوتی ناک پہ ڈالی اور عاصم کا نمبر ملانے لگا۔ "ارے یار! کہاں ہو تم' ہم تو نکل لیے' حد ہوتی ہے سستی کی۔" عاصم لائن ملتے ہی خفگی سے بولا۔

"تیزی کی بھی ایک حد ہی ہونی چاہیے۔ اب ایسی بھی کیا جلدی دولہے میاں کہ بہن کو بھی پیچھے چھوڑ گئے۔" وہ ہنسا تھا' زنیبہ کو اور رونا آیا' خفگی سے اسجد کو دیکھا۔ اس کے لیے یہ مذاق کی بات تھی۔

"کون۔ کس کا کہہ رہے ہو؟" عاصم چونکا۔

"زنیبہ شبیر احمد۔" وہ مزے سے بولا۔

"دھت تیرے کی' دادی اماں ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ وہ واش روم گئی تھی اور میرے خیال میں سب تالے لگا کے نکل آئے۔" وہ پریشان ہونے لگا۔

"ڈونٹ وری' وہ میرے ساتھ آجائے گی' پہنچے کہاں تک ہو تم لوگ؟" اسجد نے اسے تسلی دیتے ہوئے معلوم کیا' پھر بولا۔

"اوکے۔ پھر رابطہ کروں گا' ابھی نکلتے ہیں ہم۔" وہ موبائل جیب میں ڈالتا زنیبہ کی طرف متوجہ ہوا۔ نوری جس کی زخمی کلائیاں دیکھ کر پریشان ہو رہی تھی۔

"یہ؟" اسجد نے بھنویں اچکائیں۔

"زور سے دروازہ بجایا تو چوڑیاں ٹوٹ گئیں۔" وہ شرمندہ سی ہونے لگی۔ اسجد بھائی سے تین سالوں کے

بعد پہلی ملاقات' وہ بھی اس انداز میں' اس نے کبھی سوچا نہیں تھا۔ اسجد نے وہیں ڈھونڈ ڈھانڈ کے اس کے زخموں کو صاف کرنے کے بعد فی الحال ان پر سنی پلاسٹ لگا دی۔

"ابھی ٹائم نہیں ہے۔"

اسجد نے اسے چلنے کا اشارہ کیا تو وہ منہ بسورتی چل پڑی۔

"یہ آپ کی گاڑی ہے؟" سیاہ کلٹس کی چمک دمک اسے پسند آئی تھی۔ فرنٹ سیٹ سنبھالتے ہی پُرشوق انداز میں پوچھا تو وہ اگنیشن میں چابی گھماتے ہوئے بولا۔

"میں کیا شکل سے چور لگتا ہوں؟"

"یہ میں نے کب کہا؟"

"تو پھر اطمینان رکھو' یہ میری ہی گاڑی ہے۔" سفر شروع ہو گیا تھا۔

ان کا بھی۔ اور گاڑی کا بھی۔

"توبہ ہے۔ میں نے تو مبارک باد دینے کے خیال سے پوچھ لیا تھا۔ یہ تو نہیں کہا کہ کسی کی چوری کر کے لائے ہیں۔" وہ ناراضی سے بولی۔

"ویسے تم کون سا مجھے اتنا جانتی ہو۔" وہ آرام سے بولا۔

اور یہ گفتگو تو اک بہانہ تھی' اسے جاننے کا۔

تین سال پہلے کی زنیبہ بچی تھی' اور یہ زنیبہ ایک کھلتا ہوا گلاب' جو ہر سو اپنی دھیمی مہک بکھیر رہا تھا۔

تین سال پہلے ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے بھی اسجد نے شاید ہی کبھی زنیبہ سے بات کی ہو۔ ایک وجہ تو یہ کہ وہ میڈیکل کا اسٹوڈنٹ تھا' اتنا وقت ہی نہیں ملتا تھا کہ گیدرنگ میں شریک ہو سکتا' دوسرا یہ کہ وقت ملتا بھی تو زنیبہ اپنے ہم عمر کزنز کے ساتھ گیمز میں مصروف ہوتی۔ بھلا اسے میڈیکل فائنل ایئر کے اسٹوڈنٹ سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی اس عمر میں؟؟ اور اسجد۔ جو رزلٹ آنے کے بعد ہاؤس جاب شروع کرنے والا تھا وہ بھلا نویں کلاس کی "بچی" کو کیا سوچتا۔

(پر یہ دادیاں بھی نا' بڑی مزے کی شے ہوتی ہیں۔)

اپنی سوچ پر اسے خود ہی ہنسی آئی تھی۔

"جانتی ہوں' آپ اسجد بھائی ہیں' چچا جان کے بڑے بیٹے' ڈاکٹر بن گئے ہیں' بلکہ اب ہاؤس جاب کمپلیٹ کرنے کے بعد اپنا کلینک اسٹارٹ کرنے والے ہیں۔" وہ خفگی بھرے لہجے میں بولی تھی۔

"ارے واہ۔ تم کوئی جاسوسہ ہو۔ بڑی انفارمیشن رکھی ہے میرے متعلق۔" وہ ہنسا۔

"آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں؟؟" اس نے تیکھی نظروں سے اسجد کو دیکھا۔

"میں تو بالکل سیریس ہوں۔ تمہیں اپنا مذاق اڑتا محسوس ہو رہا ہے؟؟" وہ معصومیت سے پوچھنے لگا۔

"یہ سب مجھے دادی اماں نے بتایا ہے' مجھے کوئی شوق نہیں آپ کی جاسوسی کرنے کا۔" وہ چڑ گئی تھی۔

"تھینک گاڈ! ورنہ تمہاری معلومات سن کر تو مجھے شبہ ہوا کہیں انڈر ورلڈ والوں نے تو تمہیں میرے پیچھے نہیں لگا دیا۔" وہ باز نہیں آ رہا تھا۔

وہ ایسا ہی تھا۔ خوش دل' خوش مزاج' پُربہار طبیعت کا مالک' اتنا تو زنیبہ بھی جانتی تھی۔ حالانکہ عافیہ بیگم ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے انہیں دوسرے کزنز سے خاص گھلنے ملنے نہیں دیتی تھیں۔ اب بھی وہ اسی موڈ میں تھا۔

مگر وہ اپنی طبیعت کا کیا کرتی' تھڑدلی' بے حد جذباتی اور ہر وقت رونے کو تیار۔

"مجھے کیا ضرورت ہے آپ کے پیچھے لگنے کی؟" وہ قدرے خفگی سے اسے دیکھ رہی تھی' پھر یاد آنے پہ اشتیاق سے پوچھنے لگی۔

"آپ بتائیں نا' آپ کو کوئی لیڈی ڈاکٹر پسند نہیں آئی۔ دادی اماں تو ہر وقت آپ کی شادی کی باتیں کرتی رہتی ہیں۔" اسجد نے گہری سانس بھرتے ہوئے نوخیز گلاب کے سے روپ والی لڑکی کو دیکھا اور پھر مسکرا دیا۔

"اس کی نوبت ہی نہیں آئی' دادی اماں میرے لیے ایک لڑکی پسند کر چکی ہیں۔"

"اچھا۔؟" وہ حیران ہوئی۔ "آپ دادی اماں کی پسند

سے شادی کریں گے؟"

"مجبوری ہے۔" وہ اسٹیئرنگ گھماتے ہوئے مظلوم بنا۔

"چھ... چاہے کسی اندھی کانی سے بیاہ دیں۔" وہ مذاق اڑانے لگی۔

"اب کیا ہو سکتا ہے۔"

"چلیں۔ میں بات کروں گی دادی اماں سے۔ آپ تو ڈاکٹر ہیں۔ لڑکیاں تو ہنس کے آپ سے شادی کرنے کو تیار ہو جائیں گی۔" وہ فراخدلی سے بولی۔ وہ ہنس پڑا۔

"مگر مجھے تو ایک ہی لڑکی سے شادی کرنی ہے چاہے وہ ہنس کے کرے یا رو کے۔" سفر اسی طرح ہلکی پھلکی باتوں میں تمام ہوا۔ "العجنت میرج ہال۔" پہنچ کر اسجد نے اپنے چھوٹے بھائی احمر سے کنفرم کیا، سب اوپر والے ہال میں تھے۔

☆ ☆ ☆

امی نے اسے دیکھتے ہی وہ لتے لیے کہ خدا کی پناہ۔

"میرا کیا قصور ہے۔ خود ہی دروازے لاک کر کے چلی آئیں۔ میں تو بتانے گئی تھی۔" اس کے آنسو بہنے کو تیار تھے۔

اور اسجد کو بھی شاید اسی بات کی توقع تھی۔ دادی اماں کو چھوڑ تیزی سے ان کی طرف آیا۔

"تائی جان! کیا کرتی ہیں۔ یہ بے چاری تو پہلے ہی پریشان ہے۔ بالکنی کے ساتھ سیڑھی لگا کے اتارا ہے ملازمہ نے۔ آپ کو تو شکر کرنا چاہیے خدا کا کہ نوکر گھر میں موجود تھے، اگر بھی ساتھ آجاتے تو کیا ہوتا۔" وہ انہیں شانوں سے تھامے ملائمت سے موقع کی سنگینی سے آگاہ کرتا انہیں ٹھنڈا کر گیا۔

اسجد کا وہ کافی لحاظ کرتی تھیں۔ (ڈاکٹر جو بن رہا تھا۔)

"چلو اب موڈ ٹھیک کرو، دولہے کی بہن ہو۔" عافیہ بیگم نے اسے تنقیدی نظروں سے دیکھا۔

"اور یہ بال تو کھولو، میلاد تو نہیں آج۔"

"امی... !" وہ روہانسی ہونے لگی۔

"یوں بطور خاص تیاری اسے زہر لگتی تھی۔ بندہ ہر وقت کانشس پھرتا رہے کہ لڑکوں کی مائیں ہمیں دیکھ رہی ہوں گی۔ وہ اپنے کیچر کی طرف ہاتھ بڑھاتی تھم سی گئی۔ اسجد نے اسے اشارے سے منع کر دیا تھا۔

"وہ بھی گرمی لگ رہی ہے مجھے۔" اسے بہانہ سوجھ گیا تھا۔ عافیہ بیگم کو اور غصہ آیا۔

"تو جو بال کھول کے پھر رہی ہے، انہوں نے اے سی لگوا رکھے ہیں کیا۔" زنیرہ کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو بھر آئے۔ اوپر سے اسجد کی موجودگی۔

"اوفوہ۔ تائی جان! کیا کرتی ہیں۔ اسے فنکشن انجوائے کرنے دیں، اپنے ڈھنگ سے۔" وہ فوراً ہی اس کی مدد کو آیا تو بادل ناخواستہ انہوں نے اسے چھٹی دی۔

ان کی بہن شارجہ سے عاصم کی شادی میں شرکت کے لیے آئی تھیں اور ان کا لائق اور قابل بیٹا انجینئر ساتھ تھا۔ ان کا پکا ارادہ تھا کہ وہ اس بار خود ان سے زنیرہ اور عماد کے رشتے کی بات کریں گی۔ مگر یہ زنی کی بچی۔ مجال ہے جو ذرا برابر بھی عقل پکڑی ہو۔

"تھینک یو اسجد بھائی!" زنیرہ نے تیل مہندی کی رسم سے فارغ ہونے کے بعد موقع پا ہی لیا تھا۔

"وہ کس لیے؟" اسجد نے اس پرکشش سی آنکھوں والی لڑکی کو دلچسپی سے دیکھا۔

"آپ نے امی کی ڈانٹ سے بچا لیا اور کیا۔" وہ متشکر تھی۔

"تمہیں اکثر ڈانٹ پڑتی ہوگی؟"

"اور نہیں تو کیا، سب سے زیادہ 'زنی! یہ مت کرو، زنی! ایسے کرو، زنی! وہاں مت جاؤ، اس سے ملو، اس سے نہ ملو۔'" وہ ملول تھی پھر خود ہی کہنے لگی۔

"آپی کی شادی کے بعد شاید میں گھر میں ایک ہی لڑکی بچی ہوں، اس لیے۔"

"پھر تو تمہیں تائی جان کی ڈانٹ سے بچانے کا کوئی مستقل حل نکالنا پڑے گا۔" وہ مسکرانے لگا۔

دادی اماں اپنی ٹیبل پہ بیٹھی دور ہی سے دونوں کی بلائیں لے رہی ہیں۔ بلکہ چچی جان کو بھی دکھایا کہ ان

دونوں کی جوڑی کتنی اچھی لگ رہی ہے۔

"اچھا... وہ کیسے؟" وہ اشتیاق سے پوچھنے لگی۔

"وہ ایسے کہ ہم تمہیں اپنے ساتھ لے جائیں۔" وہ آرام سے بولا۔

"اف... دادی اماں کے ساتھ، میرا کتنا جی چاہتا ہے نا میں پھر سے اس گھر میں واپس چلی جاؤں۔" وہ کھل اٹھی۔

"تو۔ دادی اماں کہاں سے آ گئیں درمیان؟ یہ آفر تو میں کر رہا ہوں۔" وہ آرام سے بولا تھا، زنیرہ بے ساختہ بولی۔

"آپ کے ساتھ بھی چلے گا۔"

"او کے۔ ویٹ اینڈ سی۔" وہ معنی خیزی سے مسکرایا۔ اور پھر دادی اماں کے بلانے پہ ان کے پاس چلا گیا۔

"اب بتاؤ، کیسی لگی زنی؟" دادی اماں پرجوش تھیں۔ چچی جان بھی پاس ہی بیٹھی تھیں۔

"لڑکی تو ٹھیک ہے، لیکن لڑکی کی اماں ذرا ٹھیک ہونے والی نہیں ہیں، کیوں امی؟" وہ ہلکے پھلکے لفظوں میں گویا اپنی رضامندی بیان کرتے ہوئے ماں سے پوچھنے لگا۔

"شرم کرو، بڑی ہیں وہ، اور پھر بیاہ کے تو زنی کو آنا ہے۔" چچی جان نے اسے گھرکتے ہوئے ساتھ ہی شاید خود کو بھی تسلی دی۔

ادھر عافیہ بیگم جس چکر میں تھیں وہ کسی کو بھی خبر نہ تھی۔

واپسی پہ زنیرہ چچی جان کی فیملی کے ساتھ ان کی گاڑی میں تھی۔ دادی اماں واپسی پر بھی عاصم ہی کی گاڑی میں براجمان رہیں، جس پر عافیہ بیگم بس دانت کچکچا کے رہ گئیں۔ اب انہوں نے جو کیڑے دلہن والوں کے انتظامات میں نکالنے تھے وہ آزادی سے نہیں نکال سکتی تھیں، ورنہ عاصم کو ہی سناتیں۔

☆ ☆ ☆

اگلے روز بارات بھی بہت دھوم دھام سے گجرات کے "العجنت میرج ہال" پہنچی۔ دولہا والوں کا نہایت گرم جوشی سے استقبال کیا گیا۔ عافیہ بیگم نے مسلسل اپنی آپا رافعہ کو ساتھ رکھا ہوا تھا۔ انہیں وہ وہی پروٹوکول دے رہی تھیں جو ہونے والی سمدھن کو دینا چاہیے۔

"کچھ عاصم کی سسرال والوں کو بھی توجہ دو دلہن!" دادی اماں نے سنجیدگی سے کہا تو وہ اندر سے جل اٹھیں۔ پھر ان کے قریب ہو کر تفاخر سے بولیں۔

"بیٹی والوں کو کیا توجہ دینی، یہ کیا کم ہے ان کی بیٹی کو بیاہ کے لے جا رہے ہیں اور رہی بات آپا کی تو عماد سے رشتہ طے کر رہی ہوں میں زنیرہ کا۔" دادی اماں کی رنگت بدلنے لگی۔

"زنی کا؟ مجھے تو تم نے نہیں بتایا؟" چچی جان نے ان کے ہاتھ پر اپنا تسلی آمیز محبت بھرا دباؤ ڈالا۔

"ابھی بتا تو رہی ہوں۔ خط میں تو نہیں لکھ سکتی تھی نا! اللہ نے چاہا تو آپا منگنی کر کے ہی جائیں گی۔ عماد کو اگلے ہفتے چھٹی مل جائے گی۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں کہتی جان چھڑاتی وہاں سے چلی گئیں، مگر دادی اماں کے دل کو روگ لگا گئیں۔

"آپ پریشان نہ ہوں اماں! ہم نے کون سا رشتہ ڈال دیا تھا۔ ابھی تو محض سوچ ہی تھی۔"

چچی جان کو بھی افسوس ہوا۔ زنی انہیں بھی بہت عزیز تھی۔ مگر ساس کو صدمے کی گرفت سے آزاد کرانا بھی بہت ضروری تھا، سو ہلکے پھلکے لہجے میں بولیں۔

"خدا اس کے نصیب اچھے کرے، میری تو دعا ہے بہترین جگہ پہ اس کی شادی ہو، مگر عابدہ! میں صرف اس لیے کہتی ہوں بچی بہت نیک اور سادہ طبیعت کی ہے۔ ماں والی تیزی و تندی تو اس میں آئی ہی نہیں۔" دادی اماں ملول و افسردہ تھیں۔

عافیہ بیگم کی بہن بھی ان ہی کا پرتو تھیں، اسٹیٹس کانشس اور "میں" میں مبتلا۔ پتا نہیں زنیرہ جیسی سیدھی سادی معصوم لڑکی کا کیا حال کرتیں۔ جسے ماں نے ہمیشہ شیریں کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے پالا تھا اور وہ ہمہ وقت گھبرائی بوکھلائی ہوئی رہتی تھی۔

"ابھی اسجد سے تذکرہ مت کرنا' بچے کا دل برا ہوگا۔" انہوں نے چچی جان سے کہا تو انہوں نے فرماں برداری سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

عاصم نہایت شان و شوکت سے عروبہ کو بیاہ لایا۔ زنیرہ اور فاریہ نے باقی کزنز کے ساتھ پہلے گھر پہنچ کر دلہن کو خوب صورت سا ریسیپشن دیا۔

"مبارک ہو عافیہ! آج تم بھی بہو کی ساس بن گئیں۔ خدا تم دونوں کو اتفاق و سلوک دے' اور اس گھر کو خوشیاں نصیب کرے۔" اپنے کمرے میں جانے سے پہلے دادی اماں نے عافیہ بیگم کو دعا دی تو وہ بل کھا کر رہ گئیں۔

"یہ تو طنز کے تیر چلانے میں کوئی ثانی نہیں رکھتیں۔" ان کی آپا نے منہ بنایا تھا۔

زنیرہ اب عروبہ کے پاس گھسی بیٹھی تھی۔ نئی بھابھی والا شوق اور ایک خوب صورت دلہن کو اتنے پاس سے دیکھنا اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ چچی جان اور ان کے بچے گیسٹ روم میں رہائش پذیر تھے۔ ان کی واپسی ولیمہ کے بعد ہونا تھی' جبکہ دادی اماں زنیرہ کے کمرے میں تھیں۔

"سن لیں تم نے اپنی دادی کی سنہری باتیں۔" ان کے جاتے ہی عافیہ بیگم ترخ کر عاصم سے بولیں۔ جو خود اپنے کمرے میں جانے کو پر تول رہا تھا۔

"کیا... کیا کہا انہوں نے؟" وہ لاعلم تھا۔

"اے لو' ساری دنیا نے سنا' بس اسی نے نہیں سنا جو طعنوں کا باعث بن رہا ہے۔" وہ چمک کر بولیں۔

"میں...؟" وہ حیران ہو کر اپنی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"اور کیا... مبارک دے رہی تھیں کہ ساس بن گئی ہو۔" کڑوے لہجے میں بتایا تو وہ ہنس دیا۔

"تو کیا غلط کہہ رہی تھیں۔"

"تم نہیں سمجھتے ان کی چالاکی کو' ان کے اندر کیا ہے' وہ میں جانتی ہوں۔ طعنہ دے رہی تھیں کہ اب تو تم بھی ساس بن گئی ہو' اب دیکھنا ذرا کیا ہوتا ہے۔" انہوں نے اپنا اخذ کردہ مطلب بیان کیا تو عاصم دنگ رہ گیا۔

"کیا کرتی ہیں امی! وہ تو دعائیں دے رہی تھیں۔"

"بچے ہو تم ابھی۔ مجھ سے پوچھو جو ان کی ساری چالوں کو بھگت کے آئی ہوں۔ وہ کیوں دعائیں دے رہی تھیں' یہاں کون سا ہم بندوقیں لیے کھڑے ہیں' بہو کے لیے جو وہ اتفاق سلوک کی دعا کر رہی تھیں۔" وہ جل رہی تھیں' سلگ رہی تھیں۔

عاصم ماں کی اس تنگ نظری اور خود سے اخذ کیے تجزیات کو سن کر دل ہی دل میں استغفار پڑھ کے رہ گیا۔ پھر انہیں بہلانے لگا۔

"بزرگوں کی دعاؤں سے گھر میں خیر و برکت ہوتی ہے۔ اب آپ بھی تو ہمارے لیے دعائیں کرتی ہیں نا!"

"ان کی طرح دکھاوے نہیں کرتی۔ دل میں ہی مانگ لیتی ہوں خیر و برکت۔" وہ تنک کر بولیں۔

"اچھا چلیں ٹھیک ہے۔ بہت ٹائم ہو رہا ہے ریسٹ کریں' آپ بھی تھک گئی ہوں گی۔" کلائی پر بندھی گھڑی پر ایک نگاہ ڈال کر اس نے بات ختم کی تو انہوں نے بیٹے کو گہری نگاہ سے دیکھا۔ حالانکہ وہ کتنی دیر سے ان کی بے سروپا سنے جا رہا تھا' مگر اب اسے اپنے کمرے میں جانے کی جلدی ہوئی تو انہیں بہت محسوس ہوا۔

"ہاں' اپنی دادی کے خلاف تم کیوں کچھ سننے لگے' ماں ہی غلط ہے تمہاری۔"

"کب کہا میں نے؟ چلیں اگر ان کی کوئی بات آپ کو ٹھیک نہیں بھی لگی تو اب غصہ تھوک دیں۔ دو' چار روز میں وہ چلی ہی جائیں گی اور پھر یہ کوئی وقت ہے اس طرح کی باتوں کا۔"

عاصم نے اپنے کمرے کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے کہا تو وہ جلبلا کر بولیں۔

"ہاں۔ اب تم لوگ ماں کو پڑھاؤ گے' ابھی سے وقت ختم ہو گیا ہے تمہارے پاس میری باتوں کو سننے کا۔"

"اوفوہ امی! کیا ہو گیا ہے آپ کو۔" وہ پلٹا تھا۔

"ایک دنیا دیکھی ہے میں نے بیٹا! میں تو تمہارے پیروں کی دھمک سے تمہارا موڈ پہچان لیتی ہوں۔"

عاصم نے گہری سانس بھری۔

دھیان کے سارے دھاگے اس عروس جاں کی سوچ سے الجھے ہوئے تھے جو اکیلی کمرے میں اس کا انتظار کر رہی تھی۔ ایسے میں عافیہ بیگم کی یہ بے وجہ کلاس اسے سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

"اچھا۔ میں آپ کے پاس بیٹھ جاتا ہوں' جو باتیں کرنی ہیں کر لیں۔" وہ سکون سے کہتا صوفے کی طرف بڑھا تو وہ مسکرا دیں۔ مکمل طمانیت سے۔

"نہ بیٹا! تمہاری نئی نویلی دلہن کمرے میں تمہارا انتظار کر رہی ہوگی۔ میں تو صرف تمہیں ماں کے حقوق کی اولیت بتا رہی تھی۔ مجھے بھی نیند آ رہی ہے' شب بخیر۔"

وہ اطمینان سے کہتی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ عاصم کی پرسوچ نگاہ نے ان کا پیچھا کیا تھا' پھر وہ سر جھٹکتا خوش کن سوچیں لیے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

☆☆☆

ولیمہ کی تقریب کے بعد عافیہ بیگم سے صبر نہیں ہو سکا' ان کی شدید خواہش تھی کہ وہ رافعہ آپا سے عماد اور زنیرہ کے رشتے کی بات کریں اور گھر میں موجود رشتہ داروں (خصوصاً" سسرالی) کی موجودگی میں ہی بات طے ہو جائے' اور مشہور بھی ہو جائے کہ عافیہ بیگم کا داماد انجینئر ہے۔ انہیں ایک سو بیس فیصد یقین تھا کہ رافعہ آپا بھی یہ ہی چاہتی ہیں' تبھی تو وہ زنیرہ کے صدقے واری جاتی رہتی تھیں۔

"کاش' یہ میری بیٹی ہوتی۔" کتنی ہی بار وہ کہہ چکی تھیں۔ حالانکہ اپنی دو بڑی بیٹیاں وہ بیاہ چکی تھیں۔ بہرحال اسی یقین کے تحت انہوں نے دادی اماں کے سامنے ہی اس رشتے کی بات چھیڑ دی۔

"اب بہنوں میں کیا پردہ جھجک۔ آپ نے پوچھا یا میں نے بات ایک ہی ہے۔ بھئی ایک سے ایک رشتہ پڑا ہے میری زینی کے لیے' مگر میں نے کہا پہلا حق آپا کا ہے۔ عماد سے بڑھ کے مجھے کوئی نہیں۔" ان کا بات کرنے کا طریقہ بھی انوکھا تھا۔ اوپر سے ناک رکھنے والا۔

دادی اماں نے تاسف سے اپنی بہو کو دیکھا۔

"ہاں' لو بھلا' ایک سے ایک رشتہ پڑا ہے' تو کہیں بات طے کر دو نا! خیر سے ایف اے کر چکی ہے' دو سال تک شادی کر دینا' کچھ سمجھ دار بھی ہو جائے گی۔" یہ آپا صاحبہ کا صاف جواب تھا۔

عافیہ بیگم کو جھٹکا لگا۔ بے یقینی سے بہن کو دیکھا۔

"بھئی' ہم تو بچوں کی پسند کو ترجیح دینے والے لوگ ہیں۔ عماد کی بات تو بھائی صاحب کی ندا سے طے ہو گئی۔ امریکن نیشنلٹی ہے اس کی۔ فون پہ تو بات کر چکی ہوں میں' سوچا تھا باقاعدہ منگنی ہوگی تو خبر کروں گی' خیر' زینی کے لیے کون کون سا رشتہ ہے؟ اتنی پیاری بچی ہے ماشاءاللہ۔"

اگر عافیہ بیگم کو "انجینئر داماد" کا لالچ تھا تو ان کی بہن بھی "امریکن نیشنلٹی ہولڈر بہو" کے خواب دیکھ رہی تھیں۔

اگر تو اکیلے میں یہ منہ توڑ انکار ہوا ہوتا تو وہ برداشت کر ہی جاتیں' مگر اماں جان کے سامنے' عافیہ کی تو شرمندگی کی کوئی حد ہی نہ تھی۔

اور آپا کی زنیرہ سے محبت کا پول تو کھل ہی چکا تھا۔ اب بھی اتنے میٹھے لہجے میں پوچھ رہی تھیں گویا تمسخر اڑا رہی ہوں کہ کون سا "ایک سے ایک اچھا" رشتہ موجود ہے۔

ان کی پیشانی چمک اٹھی۔

"رشتے تو سبھی بہت اچھے ہیں بیٹا! مگر عافیہ کا دل تھا کہ ایک بار اپنی آپا سے پوچھ لوں تاکہ کل کو وہ شکایت نہ کریں' ورنہ عابدہ اسی لیے رکی ہوئی ہے یہاں کہ عافیہ ہاں کرے تو وہ زنیرہ کو اسجد کے نام کی انگوٹھی پہنا کے ہی جائے۔" دادی اماں کی بات تھی یا دھماکہ' عافیہ بیگم سن رہ گئیں۔

"اچھا۔ عابدہ... آپ کی چھوٹی بہو؟؟ کیا کرتا ہے۔ سرکاری نوکری ہے یا پرائیویٹ؟" وہ سرسری انداز میں پوچھ رہی تھیں۔

"ماشاء اللہ سے ڈاکٹر ہے اسجد۔ اب تو اپنا کلینک بھی بنالیا ہے اس نے۔ کچھ عرصے تک مزید پڑھائی کے لیے امریکہ بھی جائے گا' پھر آکے ان شاء اللہ اسپتال بنائے گا۔ مریضوں کے مفت علاج کے لیے۔" وہ سادگی سے بتارہی تھیں۔

"ماشاء اللہ' ماشاء اللہ۔" رافعہ بیگم کو شرم آگئی تھی۔ ادھر عافیہ بیگم کے دل کو بھی سکون ملا۔ دادی اماں نے موقع پر عزت رکھی تھی۔

اور یہ اسجد۔ اتنا قابل ڈاکٹر بن چکا ہے' اپنا کلینک بھی بنالیا۔

"چلو۔ فی الحال تو وقت گزرے' بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ وہاں ایک ہی گھر میں رہنے کے باوجود انہوں نے نہ تو عابدہ کو اور نہ ان کے بچوں کو کبھی کسی گنتی میں شمار کیا تھا۔ انہیں یہ تو پتا تھا کہ اسجد ڈاکٹری پڑھ رہا ہے' مگر اس کی کامیابیوں کا شمار نہیں رکھا تھا۔

مگر وہ جس بات کو وقتی پردہ سمجھ رہی تھیں' اسی کو کھول کر دادی اماں اور عابدہ نے زنیرہ کے سر کی چادر بنادیا۔ شبیر احمد سے بات کرکے۔

انہوں نے عافیہ کی طرف دیکھا۔

وہ بھی سسرالی رشتہ داروں کو منہ نہ لگاتیں۔ مگر ڈاکٹر داماد نے بہت کچھ بھلانے پر مجبور کردیا' اور پھر زنیرہ بھی کس کھاتے میں تھی' محض ایف اے۔

"دادی کی لاڈلی' دادی ہی کے پاس جائے گی تو سکھی ہی رہے گی۔" انہوں نے سوچا تھا اور پھر جو کچھ ان کی اپنی بہن نے کیا تھا۔

"بڑی دھوم دھام سے شادی ہوگی میری بیٹی کی۔" انہوں نے جتایا تھا۔ ابھی تو فی الحال سب کے سامنے بات ہی طے ہوئی تھی۔ آپا سے ان کا دل اچاٹ ہوگیا۔

زنیرہ تک خبر پہنچی تو وہ دم بخود رہ گئی۔

"تو یہ وجہ تھی اس سوال کے پیچھے؟" اسے خیال آیا۔

مگر کچھ خاص فیلنگز نہیں ہوئیں۔ وہ اس سے پورے دس سال بڑا تھا۔ اور اس نے پہلے کبھی بھی اسجد کے بارے میں اس نہج پر نہیں سوچا تھا۔

چچی جان نے اسی وقت اسجد کو فون کردیا کہ اگلے روز وہ دوبارہ آجائے۔ ولیمہ اٹینڈ کرتے ہی وہ واپسی کے لیے نکل گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

افراتفری میں بھی چچی جان اور ان کی بیٹی نمرو نے جو شاپنگ کی وہ ڈائمنڈ رنگ سمیت ہی بہت شان دار تھی۔ منگنی کے سوٹ کے علاوہ بھی زنیرہ کے پانچ خوب صورت جوڑے تھے' معہ میچنگ جیولری' زنیرہ الجھی ہوئی تھی۔

"اتنی جلدی؟"

"تو اور کیا بڈھی ہوکے بیاہ رچاؤ گی۔ فی الحال صرف منگنی ہورہی ہے۔ چار' پانچ سال پڑھ لو' پھر شادی ہوگی۔ تب کون سا ڈاکٹر بیٹھا ہوگا تمہارے لیے۔" وہ آپا سے جلی بیٹھی تھیں' شکر اللہ کرکے کوئی قابل داماد ملا تھا۔ تو اس پہ بھی یہ آنا کانی کرنے لگی تھی' سو انہوں نے جھاڑ دیا۔

"میں نے کون سا شرط رکھی ہوئی ہے ڈاکٹر کی۔" وہ خفا ہوگئی۔ شام کو اس کی منگنی کی شان دار سی تقریب منعقد کی گئی۔

اسجد بہترین سوٹ میں ملبوس تھا۔ اس کا اونچا لمبا وجیہہ سراپا سب میں نمایاں تھا۔ نمرو نے اپنے لاڈلے بھائی کی تعریفیں کرکرکے دلہن بنی زنیرہ کا دل بھی دھڑکا ہی دیا۔ اس پر اسجد کی کھلم کھلا فرمائش۔

"انگوٹھی میں خود پہناؤں گا۔ دادی اماں کی منگیتر تھوڑی ہے یہ۔" وہ بہت کانفیڈنٹ تھا۔

"مجھے شرم آئے گی۔" زنیرہ کو ایک دم سے اس چویشن کو قبول کرنے میں دقت پیش آرہی تھی۔ ابھی کل تک تو کسی نے زنیرہ کی شادی کا نام تک نہ لیا تھا اور آج وہ یوں بجی سنوری کسی کے نام ہونے جارہی تھی۔

"اسے کہو ایک بار انگوٹھی پہن لو' پھر یہ شرم ورم آنی بند ہوجائے گی۔" اسجد نے نمرو کے ہاتھ پیغام بھجوایا تھا۔

اور پھر وہ لمحہ بھی آیا جب وہ تو سیٹر پر اس کے ساتھ

آکر بیٹھا۔ زنیرہ کا دم حلق میں اٹکنے لگا۔

اسجد تو بھائی تھا۔ اسجد بھائی اور اب یہ نیا روپ' وہ کچھ عجیب سی کیفیت کا شکار ہورہی تھی۔

"اجازت ہے دادی اماں؟" اسجد نے انگوٹھی تھامتے ہوئے شرارت سے پوچھا تو عافیہ بیگم مسکرائیں۔

"اجازت ہے تو یہاں بیٹھے ہو بیٹا جی!"

"تھینک یو تائی جان!"

اس نے زنیرہ کا ہاتھ تھام لیا... اور پھر اسے ایک دم سے ٹھنڈا پڑتا محسوس بھی کرلیا۔

"چلو بھئی۔ تم تو تولنے بیٹھ گئے ہو۔ بہت بھاری ہاتھ ہے۔" عاصم نے شرارت سے کہا تو وہ ہنسا۔

"بڑا ٹھنڈا ہے یار! لی لو لگ رہا ہے۔"

"یہ لو' شروع ہوگئی ان کی ڈاکٹری۔ بھائی صاحب یہ آپ کی سسرال ہے' اسپتال نہیں۔" اسجد سے چھوٹے احمر نے اس کی توجہ دلائی۔ وہ انجینئرنگ کے آخری سال میں تھا۔

ادھر زنیرہ کا دل بہت تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ اپنے سرد پڑتے ہاتھ پر اس کے مضبوط ہاتھ کی گرمی اسے اچھی طرح محسوس ہورہی تھی۔

"چلو جی... کیا یاد کریں گی زنیرہ بی بی! آج تک تو ڈاکٹر فیس لیتے ہی آئے ہیں۔" اس نے شوخی سے کہتے ہوئے انگوٹھی زنیرہ کی مخروطی انگلی میں ڈال ہی دی۔ زنیرہ نے فوراً اپنا ہاتھ کھینچا' سبھی ہنسنے لگے۔

"اسے بھی صرف ہیرے کی انگوٹھی کا انتظار تھا۔" قاسم نے کہا۔ تو زنیرہ کو ہنسی بھی آئی اور غصہ بھی۔ خیر قاسم سے تو وہ اچھی طرح نمٹ لیتی تھی۔

فوٹو سیشن' مووی میکنگ... ایک لمبا سیشن' مگر سب بہت انجوائے کررہے تھے۔

اس طرف سے انگوٹھی پہنانے کی باری پر شبیر احمد کو آگے کیا گیا۔ "آپ کہاں زحمت کریں گے تایا جان... میں زینی ہی سے پہن لوں گا۔"

اسجد نے بڑی ہمدردی دکھائی تو انہوں نے ہنستے ہوئے ڈبیہ زنیرہ کو پکڑادی۔

"میں نہیں...؟" وہ منمنائی۔

"خبردار..." اسجد اسی کی طرف متوجہ تھا۔ وہ تلملائی۔ "یہ اچھا رعب ہے' ابھی سے اپنی من مانیاں۔"

"چلو بھئی۔ زینی انگوٹھی پہنادو۔" عروبہ نے کہا تو وہ انگوٹھی ہاتھ میں لیے منتظر ہوگئی کہ ابھی وہ ہاتھ آگے کرے گا۔

"کیا سوچ رہے ہو یار! بلکہ اب تو سوچنے کا ٹائم نکل چکا ہے۔"

عاصم نے اسے یاد دہانی کرائی تھی۔ اسجد نے مسکراتے ہوئے ہاتھ آگے کیا تو زنیرہ نے بغیر دیکھے انگوٹھی پہنانے کی کوشش کی۔ مگر انگوٹھی آگے جانے سے انکاری۔

"یہ چھوٹی ہے۔" وہ ہارگئی۔

"یہ چھوٹی نہیں' انگوٹھا بہت بڑا ہے۔" نمرو کی جگتی پر قہقہہ پڑا تو وہ یہ دیکھ کر شرمندہ ہوئی کہ وہ بنا دیکھے انگوٹھے میں رنگ ڈالنے کی کوشش کررہی تھی۔ تب اس نے بہت احتیاط سے اسجد کی انگلی میں انگوٹھی ڈال دی۔

"تھینک یو۔" وہ مسکرارہا تھا۔ نگاہ زنیرہ پر تھی۔ زنیرہ نے ایک نظر اسے دیکھا۔ وہاں اپنائیت کے سارے رنگ تھے۔ زنیرہ کو لگا وہ اسجد کے ساتھ خوش رہے گی۔

☼ ☼ ☼

آج ان کی واپسی تھی۔

"زنیرہ! فارغ ہو؟" وہ بیڈ شیٹ بچھا کر فارغ ہی ہوئی تھی جب نمرو نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔

"ہاں' ہاں' آجاؤ۔" وہ تکیے سیٹ کرتے ہوئے خوشگواری سے بولی۔ نمرو اس کی ہم عمر تھی اور اس سے دوستی بھی بہت تھی۔

"السلام علیکم۔"

غیر متوقع آواز... وہ اچھل کر پلٹی۔

وہاں نمرہ کی جگہ اس کے بھائی صاحب موجود تھے۔ اِدھر اُدھر نگاہ گھماتے کمرے کا جائزہ لیتے۔

"وہ... نمرہ..." زنیرہ ہکلائی۔

"پہلی لڑکی دیکھی ہے' جو منگیتر کی بجائے نند کا انتظار کررہی تھی۔" وہ اب مکمل طور پر اس کی طرف متوجہ تھا۔

اسے ٹوٹ کے شرم آگئی۔

"اب بتاؤ' خوش ہو منگنی سے؟" وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"پتا نہیں۔" زنیرہ کو اپنی ٹانگوں کی لرزش اچھی طرح محسوس ہورہی تھی۔

"یعنی کہ ناخوش ہو؟"

"مجھ سے کسی نے پوچھا ہی نہیں۔" وہ سادگی سے بولی۔

"اچھا تو اب پوچھ لیتے ہیں۔" وہ اس کی صاف گوئی سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔

"زنیرہ! اسجد سے شادی کرو گی؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"نہیں۔" بے اختیار ہی اس نے کہا تھا۔ پھر اس کے تاثرات دیکھتے ہوئے وضاحتاً" بولی۔

"ابھی منگنی ہی ٹھیک ہے' مجھے پڑھنا ہے۔"

"تھینکس گاڈ۔ اُڑا دیا تھا تم نے مجھے۔" وہ ہنسا تھا۔

اور اب۔

اب وہ نہیں تھا۔ کہیں بھی نہیں تھا۔ نہ اس ملک میں اور نہ ہی زنیرہ کی زندگی میں۔

وہ اپنے کمرے میں بند اندھیرا کیے اسجد کی یاد میں رو رہی تھی۔ اس کے دل میں بسنے والا اس کی دھڑکنوں کو نئے انداز سکھانے والا پہلا شخص۔ جسے اس سے جدا کردیا گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کل تمہاری ساس اور نند آرہی ہیں۔ ولیمہ کا لہنگا خریدنا ہے' تمہیں ساتھ لے جانے کے لیے کہہ رہی تھیں۔" امی نے اسے بتایا تو وہ ساکت رہ گئی۔

(تو دائمی جدائی اسجد۔)

وہ کھانا چھوڑ کے اٹھ گئی تھی۔

"زنی...!" عافیہ بیگم نے پیچھے سے پکارا' مگر وہ حواس میں ہی کہاں تھی۔ اوپر ٹیرس کی سیڑھیوں پہ آ بیٹھی۔

وہ بے بس ہوگئی تھی حالات کے سامنے۔

"یونہی چھوڑ دینا تھا تو میرے دل میں نئے جذبے کیوں جگائے تھے اسجد! میں تو کورا کاغذ تھی۔ اس پہ اپنی محبتوں کی داستان لکھ کے اب بے حس بے تماشا دیکھ رہے ہو۔ آ کیوں نہیں جاتے مجھے سب سے چھیننے کے لیے۔" اسے رونا آرہا تھا۔

اسے سال بھر پہلے کے دن یاد آئے' جب گریجویشن کے بعد جب چچی جان کے بعد اصرار پر وہ ان کے ہاں دو ہفتوں کے لیے گئی تھی۔

وہ سنہرے دن۔

اس کی آنکھوں میں روشنی سی بھر گئی۔

☼ ☼ ☼

ادھر عاصم کی شادی کے بعد گھر میں عروبہ کی شکل میں گویا ایک رونق آگئی۔ ہنستی مسکراتی ہر پل چہکتی عروبہ جہاں عاصم کی چہیتی بیوی بنی وہیں زنیرہ اور قاسم کی دوست نما بھابھی...

ہفتہ بھر ہی میں وہ جیسے اس گھر کی ایسی مکین بن گئی جو گویا سالوں سے یہیں رہتی آئی ہو۔

اصل مسئلہ تب شروع ہوا جب عروبہ نے کچن میں پاؤں رکھا۔

"امی! آج میں پکاؤں؟"

ہانڈی میں پیاز لال کرتی عافیہ بیگم سے اس نے بڑی چاہت سے کہا تو پہلے تو وہ حیران ہوئیں' پھر صفاچٹ انداز میں بولیں۔

"نہیں۔ یہ میں خود کرلوں گی۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں بھی تو فارغ ہی ہوں۔"

وہی بہوؤں والا گھرداری کا نیا نیا شوق۔ گھر والوں کو اچھا کھلا کروا پانے کا معصوم سا شوق۔

"فارغ وقت گزارنے کے اور بھی کئی طریقے ہیں۔ جا کے ٹی وی دیکھ لو۔" وہ بڑی مصروفیت ظاہر کرتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

اور عروبہ سمجھ نہ پائی کہ وہ کچن پر اپنی اجارہ داری چاہتی ہیں۔ وہ تو دادی اماں کو کچن میں برداشت نہ کرتی تھیں' بھلا یہ کل کی چھوکری۔ اسے تو وہ اول روز سے اس کی حد میں رکھنا چاہتی تھیں۔

اور پھر روزانہ یہ ہی ہونے لگا۔

سب کے لیے ناشتا تک وہ خود بناتی تھیں۔ ماسوائے عاصم اور عروبہ کے۔ اسے اپنا اور عاصم کا ناشتا بنانے کی اجازت تھی۔ اس کے علاوہ وہ چاہے' برتن دھوئے یا ماسی کے سر پہ کھڑی ہو کے صفائی کرائے اور کپڑے دھلوائے' وہ عافیہ بیگم کا درد سر نہ تھا۔

انہوں نے ابھی تک عروبہ کو ہانڈی نہ پکانے کی وجہ نہیں بتائی تھی۔

"وہ ہم دونوں کو زیادہ سے زیادہ قریب ہونے کا موقع دینا چاہتی ہیں جان!" عاصم کو اپنی الجھن بتائی تو وہ اسے بانہوں کے گھیرے میں لیتے ہوئے بولا۔

"بڑی دور کی کوڑی لائے ہیں جناب!" اسے ہنسی آگئی۔

"شکر کرو اتنی اچھی ساس ملی ہیں۔ ورنہ بہو کو ستانے کا سب سے اچھا طریقہ ہمارے معاشرے میں یہی ہے کہ اسے چولہے کے آگے مستقل کھڑا کردو۔" عاصم نے بات کو سرسری انداز میں لیا۔

آج تک کچن عافیہ بیگم ہی نے سنبھالا ہوا تھا' سو عروبہ کا یہ مسئلہ گھر میں سے تو شاید ہی کسی کو سمجھ میں آتا۔

"گھر میں بھی کچھ پکانا چاہتی ہوں۔ گھر والوں کے لیے' آپ کے لیے' میرا اتنا دل چاہتا ہے کہ آپ میرے ہاتھ کا بنا کھانا کھائیں۔ سچی میں بہت اچھا کھانا پکاتی ہوں۔" وہ الجھی الجھی سی کہہ رہی تھی۔ عاصم مسکرا دیا۔

"چلو ٹھیک ہے' میں امی سے کہہ دوں گا۔ کل سے کھانا تم ہی بناؤ گی۔"

"امی ناراض تو نہیں ہوں گی؟" اسے خدشہ لاحق ہوا۔

"کم آن رو با! وہ بھلا کیوں خفا ہوں گی بلکہ خوش ہوں گی' بہو جو ہو' اس لیے تمہارے نخرے اٹھا رہی ہیں۔"

عاصم نے اسے سمجھایا تو وہ شانے جھٹک کے رہ گئی۔

"کچن کا اتنا خیال ہے اور شوہر کی کوئی پروا نہیں' جو تمہاری ایک نظر کو ترس رہا ہے۔"

اس نے انداز بدلا تھا۔ کمرے میں عروبہ کی قلقل کرتی ہنسی گونج اٹھی۔

☼ ☼ ☼

آفس کے لیے نکلنے سے پہلے عاصم کچن میں آیا' جہاں عافیہ بیگم فریج میں موجود سبزیوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"کیا بات ہے' کچھ چاہیے؟" انہوں نے اس کی موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے پلٹ کر دیکھا اور پوچھا۔

"نہیں... خدا حافظ کہنے آیا تھا۔" وہ مسکرا دیا۔

"اچھا... دھیان سے جانا' اللہ حافظ۔" انہوں نے اسے اللہ کی امان میں سونپتے ہوئے اپنا مشغلہ جاری رکھا۔

"آج کیا پکنے والا ہے؟" وہ جیسے بے سبیل تذکرہ پوچھنے لگا۔

"گوشت کا ایک پیکٹ رکھا ہے' اسی کے لیے سبزی دیکھ رہی تھی۔ کیا خیال ہے گوبھی ڈال لوں یا مٹر؟" انہوں نے بتاتے ہوئے اس کی رائے چاہی تو وہ چند لمحے سوچنے کے بعد بولا۔

"مجھے تو دونوں ہی سبزیوں میں مٹن پسند ہے۔ آپ جو جی چاہے پکالیں۔"

"اچھا... چلو ٹھیک ہے۔" وہ ہنس دیں۔ "مٹر پلاؤ بنالوں گی اور چپاتیوں کے ساتھ گوبھی گوشت' ساتھ میں رائتہ سلاد تو ہوتا ہی ہے۔"

"اتنا لمبا چوڑا مینو ہے' تھک جائیں گی' عروبہ

سے ہیلپ لے لیجیے گا۔ بلکہ آج ہانڈی اسی سے بنوائیں۔ آپ پلاؤ بنا لیجیے گا۔" وہ خوش دلی سے انہیں مشورہ دے رہا تھا۔

"اتنا لمبا چوڑا بھی نہیں' پہلے بھی میں کرتی ہی ہوں' زینیہ رائتہ اور سلاد بنا لیتی ہے۔ اب عروبہ سے کہوں گی' وہ بنا دے گی۔"

وہ سنجیدہ ہو گئی تھیں' ٹوکری میں سبزی نکال کے پلٹیں تو وہ ابھی بھی جیسے کچھ کہنے کے ارادے سے کھڑا تھا۔ انہیں اچھی طرح سے اندازہ ہو گیا کہ وہ کیا مسئلہ سلجھانے آیا ہے۔

"چلو جاؤ اب' دیر ہو رہی ہو گی۔" انہوں نے چھری تلاش کر کے ٹوکری میں رکھی۔

"امی! میں چاہتا ہوں کہ عروبہ بھی کچن کے کاموں میں آپ کی ہیلپ کرے۔ ایسے ہی فارغ بیٹھی رہتی ہے۔"

لگ رہا تھا کہ وہ عروبہ کے مسئلے کا حل چاہتا ہے۔

"ہاں' ہاں' کیوں نہیں' یہ لو' اس سے بولو سبزی بنا دے اور پھر آ کے برتن دھو ڈالے۔ میں اتنی دیر میں گوشت چڑھا لیتی ہوں۔"

انہوں نے سبزی کی ٹوکری اسے تھمائی اور رواداری سے بولیں تو عاصم مزید بحث کیے بغیر عروبہ کو ٹوکری تھما کے آفس کے لیے نکل گیا۔

اور پھر یہ مسئلہ دن بہ دن زور پکڑنے لگا۔ عافیہ بیگم کسی طور عروبہ کو ہانڈی کی طرف آنے نہیں دیتی تھیں۔

"تم سبزی بنا لو' برتن دھو لو' سلاد یا رائتہ بنا لو۔"

عروبہ ایسی بھی کچن کے کاموں کی شوقین نہیں تھی' مگر یوں خود کو نکتی کیے جانا اسے اچھا نہیں لگا تھا۔ جیسے وہ کسی کام کی نہ ہو۔

"کبھی کبھار عروبہ سے بھی پکوا لیا کریں نا!" عاصم نے کئی بار کہا تھا۔

"تمہیں میرے ہاتھ کا پکا اچھا نہیں لگتا؟" انہوں نے خفگی سے پوچھا۔

"آپ سے اچھا تو کوئی بھی نہیں پکا سکتا۔"

"تو پھر کیا مسئلہ ہے؟" وہ الٹا پوچھتیں تو وہ لاجواب ہونے لگتا۔

"دیکھو ہم سب لوگ ایک ذائقے کے عادی ہو چکے ہیں۔ اب ایک دم سے نئے ذائقے کو اپنانا بہت مشکل ہے ہمارے لیے۔"

انہوں نے کہہ ہی دیا تھا۔

عاصم تو خاموش ہوا ہی تھا اس نے عروبہ کو بھی جیسے تیسے کر کے سمجھا بجھا دیا۔

"میرا بھی تو جی چاہ سکتا ہے بے وقت کوئی چیز پکا کے کھانے کو۔ اب ہر چیز امی سے تو فرمائش کر کے نہیں پکوا سکتی میں۔"

"اب ایسی بھی پابندی نہیں ہے تم پر۔"

عاصم نے اسے چھوٹ دی تھی۔ عروبہ نے اسی کو بہت جانا۔

عافیہ بیگم کھانا پکا کے فارغ ہو جاتیں تو وہ سویٹ ڈش بنانے گھس جاتی۔ کبھی زردہ' کبھی حلوہ اور کبھی گاجر کی کھیر۔

اور چیزیں بھی ایسی جو سب ہی شوق سے کھاتے تھے۔ ماسوائے عافیہ بیگم کے۔

وہ حلوے کی رنگت دیکھ کے ہی اسے ریجیکٹ کر دیتیں۔

"حلوہ تو میں بناتی ہوں' سب انگلیاں چاٹتے رہ جاتے ہیں۔ یہ دیکھو' ذرا سفید میدہ لگ رہا ہے۔ بھونا ہی نہیں سوجی کو۔"

اور اگر کبھی وہ سوجی کو زیادہ بھون لیتی تو۔

"تیز آگ پہ سوجی لال کر کے شیرہ ڈال لینے سے حلوہ تھوڑی بن جاتا ہے۔ کچا پن تو گیا نہیں' جو کھائے پیٹ میں درد ڈالے۔" اور یہ سب رے وہ بہ بانگ دہل کرتی تھیں۔ سب ہی کو ان پر اعتراض ہوتا' مگر کوئی بھی بول کر اپنی عزت خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ البتہ باقی سب کا شوق سے ہر چیز کھا لینا عروبہ کو تقویت دیے ہوئے تھا۔

مگر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ عافیہ بیگم کو اس سے کیا مسئلہ ہے۔

"دراصل امی نے شروع ہی سے ہمارے لیے ہر کام اپنے ہاتھ سے کیا ہے نا اس لیے۔"

زینیہ اور قاسم بھی شرمندہ ہوتے۔ بہر حال عروبہ کے دل میں عافیہ بیگم کی طرف سے گرہ پڑ چکی تھی۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ بمعہ شوہر وہ سب گھر والوں پر اپنا حکم چلانے کی عادی تھیں۔ اس لیے وہ ان کے سامنے آنے سے گریز ہی کرتی تھی۔

"زینی! کبھی اسجد کا فون نہیں آیا تمہیں؟" وہ کئی دنوں سے اس سے پوچھنا چاہ رہی تھی۔

"اچھا ہی ہے نا' میں بھلا ان سے کیا بات کرتی۔" وہ فوراً بولی۔

"بے وقوف' ہو سکتا ہے وہ تمہاری کال کا انتظار کر رہا ہو۔" عروبہ نے اس کا دھیان کرایا۔

"تو۔ میں کون سا پہلے بھی ان کے رابطے میں تھی۔"

وہ ایسی ہی تھی' سادہ طبیعت اور قدرے لاپروا۔

"ہٹو تم' پتا نہیں کون سی دنیا میں رہ رہی ہو' میں خود بات کروں گی اسجد سے۔"

عروبہ نے عزم کر لیا۔

اور پھر واقعی اس نے اسجد سے لمبی بات چیت کی اور اس کے بعد وہ عروبہ کو بھی کبھار اس کے موبائل پہ کال کرنے لگا۔

"تھوڑا بہت تو جان لو ایک دوسرے کو۔" عروبہ نے کہا تھا۔

دن پر لگا کے اڑے تو مہینے سالوں میں بدل گئے۔

عاصم اور عروبہ کے ہاں جڑواں بچوں کی پیدائش نے گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑا دی۔ ایک سی شکل کے دو بیٹے۔

اذان اور عفان۔

سب کے لاڈلے سب کے راج دلارے۔

زینیہ ایگزیمز سے فارغ تھی۔ جب اس کا دادی جان کے ہاں جانے کا ارادہ بنا۔

"میں ان دونوں کے بغیر کیسے رہوں گی؟" وہ سوئے ہوئے اذان اور عفان کی طرف دیکھتے ہوئے بے چارگی سے بولی تو عروبہ نے اسے گھر کا۔

"دادی جان نے اتنے پیار سے کہا ہے اور ویسے بھی اسجد نے اسپیشلائزیشن کے لیے لندن چلے جانا ہے' ایک اچھی سے ملاقات ہی ہو جائے گی۔ یہاں آتے ہیں تو سب میں ٹھیک سے بات تک نہیں ہوتی۔"

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ فون پر بھی وہ جیسی "تابع دارانہ" گفتگو کرتی تھی' اسجد بے چارہ سر پہ ہاتھ پھیر کے رہ جاتا۔

قاسم خود اسے پنڈی چھوڑ کے آیا تھا۔

نمرہ اور احمر اسے دیکھ کے بے حد خوش ہوئے۔ وہ دادی جان سے لپٹ گئی اور چچی جان کو تو وہ ویسے بھی بہت عزیز ہو گئی تھی۔ سب کا ڈھیروں پیار وصول کرنے کے بعد وہ نمرہ کے ساتھ کمرے میں آ گئی۔

"تھوڑا آرام کر لو' پھر خوب گپیں لگائیں گے اور تمہاری آمد ویسے بھی بھائی کے لیے سرپرائز ہے۔" نمرہ مزے سے بولی تھی۔

"میں نے بھی نہیں بتایا انہیں۔" کسی الوہی احساس کے تحت اس کی رنگت لال پڑ گئی۔ وہ تو فون پر ہی اس کی آواز سن کے گنگ ہو جاتی تھی' اب یوں آمنے سامنے جانے کیا حال ہوتا۔

"میں لیٹوں گی نہیں' بس فریش ہو کے آ رہی ہوں۔ دادی جان کے پاس۔"

واش روم کی جانب بڑھتے ہوئے زینیہ نے کہا تو وہ مسکراتی ہوئی اس کے انتظار میں بیڈ پہ دراز ہو گئی۔ اس کمرے میں وہ نمرہ کے ساتھ ہی رہنے والی تھی۔

قاسم تو شام کو واپسی کے لیے نکل گیا۔ اسجد سے اس کی ملاقات نہ ہو پائی تھی۔

"بس ان کی جاب ہی ایسی ہے۔"

"ہاں۔ بتایا تھا انہوں نے ہفتے میں دو دن وہ سرکاری اسپتال میں مریضوں کا فری چیک اپ کرتے ہیں۔" زینیہ مسکرائی۔

"ہاں۔ اگر کلینک پہ ہوتے تو قاسم جاتے ہوئے مل لیتا' مگر پھر سسپنس باقی نہ رہتا۔"

نمرہ کو صورت حال سوچ کے مزہ آ رہا تھا۔

رات دیر تک سب باتیں کرتے رہے۔ نمرہ کے ساتھ اس نے پورا گھر دیکھا۔ یہاں اس کا بچپن گزرا تھا اور وہ سالوں بعد دوبارہ آئی تھی۔

"لگتا ہے کوئی ایمرجنسی ہو گئی ہوگی۔ ورنہ تو جلدی ہی آجاتے ہیں۔" نمرہ نے اسے بتایا تھا۔

"میرے خیال میں انہیں فون کر دینا چاہیے۔" احمر نے مشورہ دیا۔

"تم اپنا خیال اپنے پاس ہی رکھو۔ سرپرائز بھی کوئی شے ہوتا ہے۔"

نمرہ نے اس کا خیال یکسر رد کر دیا تھا۔

"چلو پھوچی جی، جاگو پھر اور گیٹ کھولتی رہنا۔ میں تو چلا سونے۔" وہ بے دید بنا یہ گیا اور وہ گیا۔

"لو۔ آج بھی گیٹ میں ہی کھولوں گی بھلا۔" نمرہ ہنسی۔

"تو؟" زینیہ نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"تم۔" وہ اطمینان سے بولی۔

"نا۔ میں نہیں۔" وہ گھبرا گئی۔ "ایسے اچانک میں ان سے نہیں مل سکتی۔"

"تو آرام سے مل لینا، اتنی جلدی کا ہے کی ہے۔" نمرہ کو اس کی بات نے خوب ہی ہنسایا، تو وہ کھسیا گئی۔

"میرا مطلب ہے کہ میں صبح ہائے ہیلو کر لوں گی ان سے۔"

"بری بات... ان کی معصوم سی خوشی نہ چھینو جو تمہیں یوں اچانک سامنے پا کر انہیں ملنے والی ہے ظالم لڑکی۔" اور واقعی وہ منہ، سر لپیٹ کے خود تو سو گئی اور اسجد کا انتظار کرنے کو نیند بھری آنکھیں لیے سفر کی تکان سے چور وہ بیٹھی رہی۔ کہیں بارہ بجے جا کے ڈور بیل سنائی دی تو اس نے شکر کا کلمہ پڑھا، مگر وہیں ایک جھجک قدموں کو روک رہی تھی۔ نمرہ کو جھنجوڑا۔ سب کیا سوچیں گے کہ آتے ہی...

دوسری بار ڈور بیل کافی وقفے کے بعد بجی تو وہ جلدی سے بھاگی۔

گیٹ کھولنے تک اس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو چکی تھیں۔ گیٹ کھولتے ہی وہ فی الفور پلٹ گئی اس لیے وہ جان نہیں پایا تھا کہ گیٹ نمرہ نے نہیں کھولا۔

"اتنی دیر... اور میں نے کہا بھی تھا کہ احمر سے کہنا گیٹ کھولنے کو۔" وہ اندر داخل ہو کر چھوٹا گیٹ بند کرتے ہوئے نارمل سے انداز میں بولا۔ اب وہ اس کی بات کا کیا جواب دیتی۔

"نمو...!" وہ لمبے ڈگ بھرتا اس کے ہم قدم ہوا تو وہ ست پڑنے لگی۔ تب اسجد کو کچھ عجیب سا احساس ہوا۔

یہ سراپا اور پونی میں جکڑے کمر تک آتے سیاہ بال۔ وہ ایک دم سے اس کے سامنے آگیا۔

زینیہ اس خیال میں نہیں تھی، اس سے ٹکرا ہی گئی۔ مگر ادھر کون سا ایسا احساس تھا، بے اختیار ہی اسجد نے اس کے شانوں سے تھاما۔

"زینی! آئی ڈونٹ بلیووس۔ یہ تم ہو؟" وہ بے حد حیران تھا۔

زینیہ کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اسجد کے انداز میں محسوس کن بے اختیارانہ پن تھا۔

"میں دوپہر کو آئی تھی۔" وہ منمنائی۔

"مجھے کیوں نہیں بتایا۔ اگر کوئی اٹیک ہو جاتا مجھے تو...؟"

وہ اسے ہلکا سا جھٹکا دے کر بولا تو ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ زینیہ کسمسا کر پیچھے ہٹی۔

"مجھے نیند آرہی ہے۔ میں نے ذرا بھی ریسٹ نہیں کیا۔"

"فاول... سلام تک نہیں کیا تم نے۔"

"السلام علیکم۔" وہ خفیف سی ہو کر بولی۔

"وعلیکم السلام، جیتی رہو۔ ملوگی نہیں؟"

وہ اب شرارت پر اتر رہا تھا۔ زینیہ کا دل بے ترتیبی سے دھڑکنے لگا۔ وہ بھاگنے کے سے انداز میں اندر کی طرف بڑھی تھی۔ پیچھے ابھرنے والا اسجد کا قہقہہ اسے ٹھیک سنائی دیا تھا۔ اسے بھی ہنسی آگئی۔

☼ ☼ ☼

"اتنے اچھے چوکیدار رکھنے شروع کر دیے ہیں تم

لوگوں نے کہ میں آئندہ بھی گیٹ کی ڈپلی کیٹ چابی گھر بھول کے جانا پسند کروں گا۔"

نمرہ صبح کا ناشتا بنا رہی تھی، زینیہ کو لاکھ چچی جان نے منع کیا، مگر وہ بھی نمرہ کا ہاتھ بٹانے کھڑی ہو گئی۔

سب سے پہلے کچن میں انٹری اسجد کی تھی۔ وہ نمرہ سے کہہ رہا تھا، مگر نگاہ انڈے پھینٹتی زینیہ پر تھی۔ رائل بلیو کلر میں اس کی رنگت دمک رہی تھی۔ اور کچھ اسجد کی آمد کا اعجاز، اوپر سے اس کی گفتگو۔

"منہ دھو رکھیے بھائی جان! یہ بہت مہنگے والا چوکیدار ہے، آپ افورڈ نہیں کر سکتے۔"

نمرہ نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

"اپنا پیکج بتاؤ۔ میں ہر قیمت پر تیار ہوں۔"

وہ کچن کیبنٹ کی ماربل ٹاپ پہ چڑھ بیٹھا۔

زینیہ نے نان اسٹک فرائنگ پین میں کوکنگ آئل والا تو کچھ زیادہ ہی چلا گیا۔

"ڈاکٹری نقطہ نظر سے اتنا آئل صحت کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے۔" اسجد کی نگاہ اسی پر تھی۔

زینیہ نے [illegible] سے اسے دیکھا۔ وہ بھنویں اچکا کر مسکرا دیا۔

"آپ یہاں سے جائیں گے تو ہی ناشتا بنے گا۔"

وہ صاف گوئی سے بولی تو نمرہ قہقہہ لگا بیٹھی۔

"ہاں نا۔ یہ عجیب عجیب باتیں کرتے رہیں گے تو مجھ سے بھی الٹا سیدھا کام ہی ہوگا۔"

وہ کچھ الجھ کر بولی تھی۔

"میرے خیال میں تو آپ نے سن ہی لیا ہوگا۔" نمرہ نے شرارت سے بھائی کو دیکھا۔

"ہاں جی، بہت اچھے سے۔" اس نے گہری سانس بھری۔

نمرہ نے دادی جان کے ناشتے کی ٹرے اٹھائی اور مسکراتے ہوئے کچن سے نکل گئی۔

اتنی دیر میں زینیہ فرائنگ پین میں سے زائد آئل نکال چکی تھی۔

"سفر کیسا گزرا تھا؟" اسجد نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"ٹھیک۔"

"بس ٹھیک؟ کوئی خوشی نہیں تھی آ کے مجھ سے ملنے کی، کوئی دل کی دھڑکن وڑکن ابنارمل نہیں ہوئی؟"

وہ قدرے خفگی سے پوچھنے لگا تو زینیہ کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔

"یا تو آپ ڈائجسٹ پڑھتے ہیں یا پھر فلمیں بہت دیکھتے ہیں۔"

اس نے انڈوں کا آمیزہ فرائنگ پین میں الٹ دیا اور اب چمچے سے اسے پھیلا رہی تھی۔

"مطلب ایسا کچھ نہیں ہوا؟" وہ جیسے بہت بے یقینی سے پوچھ رہا تھا۔

"آپ بھی آملیٹ کھائیں گے یا آپ کو فرائی کروں؟" زینیہ نے اپنی طرف سے بہت ہوشیاری سے بات پلٹی۔

"شاباش، آتے ہی مجھے فرائی کر دو۔"

وہ کچھ اس طرح سے بدک کر بولا کہ کچن میں داخل ہوتی نمرہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔

زینیہ خجل ہوئی۔

"میرا مطلب انڈے سے تھا، فرائی ایگ۔"

"اب بندہ اس سے پوچھے، انڈوں سے مطلب رکھنے کا کیا مطلب ہے؟ انسان تھوڑے پڑ گئے ہیں کیا؟"

وہ خفا خفا سا نمرہ سے مخاطب تھا۔

"آپ دونوں ڈائریکٹ ایک دوسرے سے بات نہیں کر سکتے کیا؟" نمرہ کو ابھی بھی ہنسی آرہی تھی۔

"میں تو کر رہا تھا۔ یہ آگے سے پوچھ رہی ہے کہ میرے ہاتھ کا بنا آملیٹ کھانا ہے یا آپ کو فرائی کروں، یعنی ایک عدد آملیٹ نہ کھانے کی پاداش میں یہ ظالم لڑکی مجھے روسٹ کرنے کو تیار ہے۔" وہ نمرہ سے شکایت کر رہا تھا۔

ان تینوں بہن بھائیوں کا یہ ہی اسٹائل تھا۔ بے تکلف سا، مگر زینیہ کے لیے یہ سب نیا تھا۔

اسے اسجد کے مذاق اور سنجیدگی میں فرق کرنا مشکل تھا۔

"میں نے یہ تو نہیں کہا۔" وہ احتجاجاً بولی۔

"اچھا۔ میرے خیال میں تو یہی کہا تھا کہ کھاتے ہیں آملیٹ یا پھر کروں آپ کو فرائی۔"

وہ مزہ لے رہا تھا' زنیرہ روہانسی ہونے لگی۔

"مگر میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

"ہاں۔ میں جانتا ہوں تمہارا مطلب صرف انڈے تک تھا۔ بڑی مطلبی ہو تم۔" وہ شکایتی انداز میں بولا تو لحہ بھر اسے دیکھنے کے بعد وہ تیزی سے کچن سے نکل گئی۔

"اوہ گاڈ!" نمرہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

اسجد بھی کود کر نیچے اترا۔ وہ بڑبڑایا تھا۔

"لگتا ہے کچھ زیادہ ہی ہو گیا۔"

نمرہ نے خفگی سے کہا۔

"کر دیا ناراض اسے۔ لڑکیوں کا پتا بھی ہے آسانی سے نہیں مانتیں۔"

"خیر لڑکیوں کا تو نہیں۔ تمہارا ہی پتا ہے مجھے' صرف خرچے سے مانتی ہو تم۔"

وہ صاف گوئی سے کہہ رہا تھا۔

"مجھ پہ تو صرف چاکلیٹس اور آئس کریم خرچ ہوتی تھی۔ (ادھر) دیکھیے کیا کیا خرچ ہوتا ہے۔"

وہ مزے سے بولی تو گہری سانس بھرتا وہ کچن سے نکل آیا۔

زنیرہ دادی جان کے کمرے میں پھر ملی۔

اسے دیکھ کے بھی یوں ظاہر کیا جیسے دیکھا ہی نہ ہو۔

"دادی جان! آپ نے ناشتا کر لیا؟" وہ ان کے ناشتے کی ٹرے میں رکھے خالی برتنوں کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"ہاں میرے چاند! فجر کی جاگی ہوتی ہوں تو صبح سویرے ہی ناشتے کی طلب ہونے لگتی ہے۔"

وہ بولیں۔

"خوش قسمت ہیں آپ' جو کسی نے آپ کو ناشتا کروا دیا۔"

وہ گہری سانس بھرتا ان کے بستر پر ٹک گیا۔ ان کے بائیں طرف زنیرہ تھی۔ ان کی تسبیح کے دانے گنتی۔

"کیا مطلب ہے' تم نے ناشتا نہیں کیا ابھی تک؟"

وہ چونکیں۔

"مسئلہ ہے نا ذرا سا۔ اکیلی نمرہ کیا کیا دیکھے' بے چاری کبھی توس سینک رہی ہے' کبھی پراٹھے اور کبھی آملیٹ۔ سب کے فارغ ہوتے ہی میری باری آئے گی۔ آج تو ویسے بھی چھٹی کا دن ہے۔"

وہ بڑی معصومیت سے کہہ رہا تھا' زنیرہ کا تو تپ سی ہو بیٹھی' صاف اس پر کام چوری کا الزام دھرا جا رہا تھا۔

"نمو کہہ رہی تھی زنیرہ نے مل کے ناشتا بنایا ہے اس کے ساتھ۔" دادی جان باخبر تھیں۔

"میرا تو نہیں بنایا' جس کا بنایا ہو اسے پتا ہو۔" وہ فوراً مکر گیا۔

"کیوں زینی! ٹھیک کہہ رہا ہے یہ؟"

دادی جان نے پوچھا تو تھک کر اس نے تسبیح رکھ دی۔

"میں تو بنا ہی رہی تھی' ہمگران کا شاید ناشتے کا موڈ ہی نہیں تھا۔ تنگ کر کے مجھے کچن سے ہی نکال دیا۔"

صاف گوئی کی حد تھی۔ اسجد نے مسکراہٹ دبائی۔ مگر وہ دیکھ چکی تھی خفگی سے منہ پھیرا۔

"بری بات ہے اسجد! مہمان کو تنگ کرنے سے گناہ ملتا ہے۔" دادی جان مسکرائیں۔

"پیاری دادی! میں اسے مہمان کب سمجھتا ہوں۔ لیکن حریم دل و جان ہے یہ تو...؟"

وہ روانی سے بولا تو دادی جان اتنی شستہ اردو میں اٹکیں جبکہ زنیرہ کی رنگت پل بھر میں لال پڑی تھی۔

"چلو جو بھی ہے' اب دوستی کرو اور خبردار جو آئندہ کبھی اسے تنگ کیا ہو تو۔"

دادی جان نے معاملہ نمٹانا چاہا۔

"بصد شوق۔"

اسجد گویا تیار ہی بیٹھا تھا' فوراً داہنا ہاتھ آگے بڑھایا' دوستی مگر زنیرہ سٹپٹا گئی۔

"دیکھ لیں' آپ کی پوتی میں اتنی اکڑ ہے' اللہ نے شکل تھوڑی زیادہ ہی اچھی دے دی ہے شاید اسی کا

غرور ہے۔"

وہ شکایتاً کہہ بھی رہا تھا تو کیا۔ وہ ہاتھ بڑھانے کی ہمت کرتی بھی تو کیسے۔

"نہ' نہ... میری بچی بہت نیک سیرت ہے' سادہ طبیعت والی' غرور اور تنفر سے پاک۔"

دادی جان کو تو وہ ویسے بھی بہت پیاری تھی' فوراً اس کا فی البدیہہ قصیدہ پڑھ دیا تو اسجد نے مایوسی سے اپنا بڑھا ہوا ہاتھ ہلایا۔

"اچھا' میرا تجربہ تو کچھ اور ہی کہتا ہے۔" اس کی شکل دیکھ کے زنیرہ کا جی چاہا ہاتھ ملا ہی لے مگر اس کی زبان جو پھلجھڑیاں چھوڑ رہی تھی' اس سے کچھ بعید نہ تھا کہ کیا کہہ ڈالتی۔ اسجد نے ہاتھ کھینچا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"ادھار رہا۔"

ایک نظر اسے دیکھتے ہوئے وہ ناشتا کرنے کا کہہ کر کمرے سے نکل گیا تو زنیرہ کو افسوس ہوا۔

☼ ☼ ☼

"جلدی سے تیار ہو جاؤ' بھائی جان' باہر لے کے جا رہے ہیں۔" نمرہ شام کو بڑی پرجوش سی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

"خیریت۔ لندن لے جا رہے ہیں یا پیرس؟" وہ ڈائجسٹ کے صفحات پلٹتی خفگی سے۔

"اوفوہ۔ بھائی جان کا کہیں تفریح کے لیے لے جانا لندن' پیرس جانے کے برابر ہی ہے کنجوس ڈیر! مہینوں بعد ہاتھ آتے ہیں' آج تو صرف تمہارے طفیل...!"

وہ الماری میں سر گھسائے خوش دلی سے کہہ رہی تھی۔

زنیرہ کا دل بہت ترنگ میں دھڑکا۔ ڈائجسٹ پرے رکھ کے وہ تکیہ ٹھیک کرتی لیٹ گئی۔

نمرہ اپنے کپڑے نکال کے پلٹی تو اسے یوں اطمینان سے لیٹے دیکھ کر حیران ہوئی۔

"کیا ہوا؟ اٹھو نا!"

"آج دوپہر میں بھی نہیں لیٹی۔ ابھی بہت زوروں کی نیند آ رہی ہے۔" وہ جان بوجھ کر کسل مندی سے بولی۔

"کم آن زینی! اسپیل نہیں جانا' گاڑی پہ جا رہے ہیں۔" نمرہ نے اسے پچکارا۔

"موڈ نہیں ہو رہا۔" وہ کروٹ بدل گئی تو اس نے حربہ آزمایا۔

"بھائی جان کو خفا کرو گی؟" زنیرہ کے لبوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔

"میرے جانے نہ جانے سے بھلا کیا فرق پڑتا ہے' تم جاؤ نا' ساتھ احمر کو لے جاؤ۔"

"وہ بھی جا رہا ہے' بلکہ صرف ہم چاروں جا رہے تھے۔"

"جا رہے تھے نہیں بلکہ جا رہے ہیں' جاؤ تیار ہو جاؤ۔" زنیرہ نے اسے تسلی دی تو وہ جل کر بولی۔

"لگ تو نہیں رہا' تم پروگرام خراب کرواؤ گی' اٹھو جلدی سے۔"

"نہ۔ میرے ہاتھ میں درد ہو رہا ہے۔ مطلب میرے سر میں۔" اس نے تھکے سے بہانے بنائے تو نمرہ شانے اچکاتی کپڑے تبدیل کرنے واش روم میں گھس گئی۔

"تم دیکھنا ابھی پتا چلے گا بھائی جان کو تو وہ ہمیں بھی گھر ہی چھوڑ کے جائیں گے بہت پٹو گی تم ہم سے۔"

نمرہ اسے ڈرا رہی تھی۔

"اب اتنی بھی اہم نہیں ہوں تمہارے بھائی جان کے لیے کہ میرے لیے وہ اپنا موڈ اور اپنی تفریح تباہ کرتے پھریں۔"

بالوں کو احتیاط سے کیچر میں سمیٹتے ہوئے وہ مگن سی تھی۔ دروازہ کھول کے اندر آتے اسجد کو دیکھ نہیں پائی۔

"چلو بھئی۔ ابھی تمہاری تیاری ہی ختم نہیں ہو رہی' رات پڑ جائے گی۔"

"بھائی جان! یہ زینی نہیں جا رہی۔" نمرہ نے پول کھول ہی دی۔

"تم تیار ہو نا؟ چل کے گاڑی میں بیٹھو۔" وہ سرسری انداز میں نمرہ سے بولا تو اس نے منہ لٹکایا۔

"اور زینی۔! اس کے ہاتھ میں یا شاید سر میں درد ہے۔"

"تمہارے تو نہیں ہے نا۔ چلو تمہیں فوراً" نکلنا ہے۔" وہ کہتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا تو نمرہ کو بھی بھاگنا پڑا۔ زینیہ کا دل مایوسی سے بھر گیا۔

لو جی۔ یہ ہیں منگیتر صاحب' کون سا دل اور کہاں کی دلداریاں۔

دروازہ کھول کے نمرہ کو باہر نکالا اور دروازہ بند کر کے وہ واپس پلٹ آیا۔

"ہاں جی' کیا مسئلہ ہے آپ کو؟"

عین اس کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے اسجد نے پوچھا تو وہ چونک کر حال میں پلٹی۔

"جی۔ ٹھیک ہوں۔" سٹپٹا کر کہا۔

"تیار کیوں نہیں ہوئیں؟ "میں" نے کہا تھا کہ باہر جانا ہے۔" وہ "میں" پہ زور دیتے ہوئے بولا تو زینیہ نے شانے اچکائے۔

"بس یونہی' دل نہیں چاہ رہا تھا۔"

"میرے ساتھ پہلی بار نہیں جا رہی تھیں اور تمہارا دل نہیں چاہ رہا تھا۔"

اس نے گویا تصدیق چاہی۔

زینیہ دھک سے رہ گئی۔

"میں نے یہ تو نہیں کہا۔"

جلدی سے کہا مبادا کچھ غلط فہمی نہ پنپ جائے۔

"اوکے۔ یعنی دل چاہ رہا تھا۔ پھر تیار کیوں نہیں ہوئیں؟" وہ مسکرایا۔ اس کی ہوشیاری پر زینیہ نے خفگی سے اسے دیکھا۔

وہ اتنا زبردست تھا کہ اس کی ایک بھی چلنے نہیں دیتا تھا۔ ایسے مرد کی بھی اپنی ہی ایک شان ہوا کرتی ہے۔

وہ شلوار قمیص بہت کم پہنتا تھا' زیادہ تر پینٹ شرٹ استعمال کرتا۔ مگر ابھی وہ نیوی بلو کرتا شلوار میں ملبوس بہت عام سے حلیے میں بھی شان دار لگ رہا تھا۔ بلکہ بہت خاص' دھڑکن کا انداز بدلا تو زینیہ کی نگاہ دل کی بے ایمانی پر جھک گئی۔

"ہم۔۔۔ میری طبیعت' ہاتھ میں درد تھا۔" وہ ہکلائی۔

اسجد نے نگاہ بھر کے اس کے سرخ پڑتے رخساروں کو دیکھا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"اس ہاتھ میں؟"

"نہیں۔۔۔ اس ہاتھ میں۔۔۔!"

زینیہ نے فی الفور داہنا ہاتھ لہرایا۔ تاکہ وہ دوسرا ہاتھ چھوڑ دے' مگر ادھر ایسا کوئی ارادہ نہ تھا۔ اس نے اس کا دایاں ہاتھ بھی تھام لیا۔

"اتنی نازک سی تو ہو۔ صبح پراٹھے بناتے ہوئے کچھ ہوا ہو گا یا پھر انڈے پھینٹتے ہوئے۔"

وہ شرارت سے کہتے ہوئے اس کے قریب ہوا۔ وہ برا ضرور مانتی اگر دل کی دھڑکنیں قابو میں ہوتیں۔

اسجد نے اس کے ہاتھ کو خفیف سا لبوں سے چھوا۔

"خدا کرے تمہارا درد ٹھیک ہو جائے۔" وہ دھیمے لہجے میں بولا تو وہ دق دق سی کھڑی رہ گئی۔

"اور کہاں درد تھا' سر میں؟"

اس کی سانسیں زینیہ نے اپنی سرد پڑتی پیشانی پر محسوس کی تھیں۔ وہ تیزی سے اپنے ہاتھ چھڑا کر پلٹ گئی۔

اس سے نگاہ ملانے کا یارا ہی نہ رہا تھا۔

"آپ جائیں۔"

"تمہارے بغیر؟ ناممکن' لاکھوں بار کی دیکھی جگہیں ہیں' نیا پن تو صرف تم ہو یار!"

اسجد نے آگے بڑھ کے اس کے شانوں سے تھاما اور محبت سے بولا۔ زینیہ کے وجود میں خوشی اور سرمستی کی لہر سی دوڑ گئی۔

وہ محبوب اور شان دار سا شخص اسے اتنا خاص سمجھتا تھا۔

"تم ساتھ ہو گی تو ہر چیز کا نیا رنگ اور ہر رنگ کا نیا انداز ہو گا زینی!" اس کا رخ اپنی طرف موڑتے ہوئے وہ بہت چاہت سے کہہ رہا تھا' زینیہ کی نگاہ اس کی نگاہ کی شدت سے جھکنے لگی۔

"اور اس سے پہلے کہ میں کچھ اور رومینٹک ہونے لگوں تم تیار ہو جاؤ' پلیز۔"

وہ یوں لجاجت سے بولا کہ زینیہ کو نا صرف ہنسی آ گئی بلکہ بہت سارا اعتماد بھی اپنے وجود میں سرایت کرتا محسوس ہوا۔

"اوکے۔" وہ دانتوں تلے لب دبا کے بولی۔

"اچھا۔" اسجد نے ہاتھ تھام کے روکا تو وہ ٹھٹکی۔

"پنک کلر بہت اچھا ہے تم پہ۔" وہ مسکرا رہا تھا۔

"گیٹ آؤٹ۔"

وہ محجوب سی ہو کر گھتی الماری کی طرف بڑھی تو وہ ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

اور پھر ایک لمبے عرصے اور بہت سی بد مزگیوں کے بعد عروبہ کو کچن میں ہانڈی پکانے کی اجازت تو مل گئی مگر عافیہ بیگم کی کڑی نگرانی میں عروبہ سر تھام کے رہ گئی۔ کیا درد سر مول لے لیا تھا اس نے بھی۔ سسرال میں کچھ پکانے کا شوق جیسے مر ہی گیا۔ اب تو وہ پکاتے ہوئے بھی یا اللہ ٹھیک پک جانے کی دعائیں مانگتی رہتی تھی۔

عافیہ بیگم کے اعتراضات بے شمار تھے۔ کاؤنٹر پہ کھڑے ہو کے آٹا گوندھنے پر اعتراض۔

"یہ اچھی رہی۔ ہم تو دو' دو گھنٹے آٹا گوندھتے رہتے تھے۔ ادھر اچھا مذاق ہے۔ آٹا ڈھیلا سا بھگو کے رکھا' آدھے گھنٹے کے بعد دو چار ہاتھ مار کے فارغ۔ ہم تو زمین پر پیڑھی پہ بیٹھ کے آٹا گوندھا کرتے تھے۔"

"مطلب تو آٹا گوندھنے سے ہے اور پھر روٹی تو ٹھیک بنتی ہے نا۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے۔" عروبہ نے تحمل سے کہا تھا۔ مگر یہ مسئلہ آئے دن وہ کھانے کی میز پہ چھیڑتیں۔

ہانڈی کو کتنا بھوننا ہے۔ یہ عافیہ بیگم بتاتیں' کتنا پانی ڈالنا ہے' اس کا حساب انہوں نے ایک مگ کے ساتھ رکھا ہوا تھا۔

وہ ہر کھانے کے ساتھ پانی کے مگوں کا حساب رکھتی ہلکان ہوتی رہتی۔ نتیجتاً" کوئی سبزی صحیح بنتی تو کوئی بیٹھ جاتی۔

"یہ ہے کوکنگ تمہاری؟"

عاصم مذاق اڑاتا تو وہ سلگتی۔

"ڈنڈا لے کے سر پہ کھڑے ہو کر کام کرانے اور فری ہینڈ دینے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ میں ان کے ذہن سے تو کھانا نہیں پکا سکتی نا!"

"تو خود سے پکاؤ' وہ تو صرف طریقہ بتاتی ہیں نا!" وہ کہتا۔

"ان کے طریقے سے خود سے کیسے پکا سکتی ہوں۔ اب وہ تو بتا کے ہٹ جاتی ہیں کہ اس میں چار مگ پانی کے ڈال دو' اب اتنے پانی کے ساتھ سبزی کو گلانا' پانی سکھانا اور پھر اسے بھوننا' اتنی دیر میں سبزی کی جان نکل جاتی ہے۔ ہم نے تو کبھی سبزی میں پانی ڈال کے نہیں گلایا۔ دم پہ پکا کے پھر ہلکا سا بھون لو' بس۔" وہ تنگ آ گئی تھی۔

عافیہ بیگم اور اس کے درمیان غیر معمولی سا کھنچاؤ در آیا تھا۔ اس کا کوئی کام کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ جب اس کی حوصلہ افزائی کرنے کی بجائے وہ سب کو سناتیں۔

"کھانا تو بناتی تھی میں۔ مگر اب تو جو سامنے آ گیا شکر الحمد للہ۔"

عروبہ کو ان کا یہ ناشکرا پن بہت کھلتا۔ اس کا شدت سے جی چاہتا کہ وہ بھی کوئی بد مزاج اور سڑیل سی بہو ہوتی تو پھر عافیہ بیگم کو پتا چلتا جو اس کے سامنے صاف لفظوں میں کہتی تھیں۔

"بیٹی تو بیٹی ہوتی ہے' بہو کبھی بیٹی نہیں بن سکتی۔"

تو جہاں یہ الفاظ بہو کے منہ پہ کہے جائیں تو اس کے ذہن میں ساس کا تصور ماں کا سا ہو سکتا ہے؟

ایک لڑکی جو اپنے گھر کے ساتھ ساتھ اپنے خونی رشتوں کو چھوڑ کر آپ کی نسل کی امین بن کے آپ کے گھر آتی ہے' اس کے حوصلے کا اندازہ کیجیے' اپنی ماں کے علاوہ کسی اور کو ماں کہنے کے لیے بہت بڑا دل چاہیے' عروبہ کو یاد تھا شادی کے اولین دنوں میں ایک دفعہ عافیہ بیگم کے سامنے عاصم نے عروبہ کی امی کو "امی" کہہ کر بلایا تو عافیہ بیگم کو تو جیسے آگ ہی لگ گئی۔

"تمہاری اپنی ماں نہیں ہے کیا' حد ہوگئی'۔ سو رشتے ہیں بلانے کے لیے' ساس کو امی کہوگے اب۔"

وہ دن اور آج کا دن عاصم اس کی امی کو آنٹی کہہ کر ہی مخاطب کرتا تھا یا پھر تمہاری امی۔

اور اگر یہ حرکت بہو کرے تو "جی ہمیں ماں نہیں سمجھتی' یہ ہی کہا جاتا ہے۔

بہرحال چھوٹی چھوٹی کئی باتوں کو عافیہ بیگم کی بدمزاجی اور ڈکٹیٹرانہ طبیعت بہت بڑا بنائے ہوئے تھی۔

وہ جو ایک ولولے اور نئی سوچوں کے ساتھ سسرال میں آئی تھی' دل مسوس کر رہ گئی۔

دوسرے وہ چھوٹی سی چھوٹی بات فون پر اپنی بڑی بیٹی فاریہ سے شیئر کرنے کی عادی تھیں۔ صبح سے لے کر شام تک کے تمام معمولات کی رپورٹ اور ساتھ ساتھ اپنے خیالات اور تجزیے اسے بتاتیں اور یہ تمام باتیں بہ بانگ دہل کرتیں۔ بہو سنتی کڑھتی ان کی بلا سے۔ مگر وہ یہ قطعاً "نہیں سوچتی تھیں کہ اس طرز عمل سے وہ اپنی عزت بڑھا نہیں بلکہ گھٹا رہی تھیں۔

عروبہ کو بظاہر اس قدر پالشڈ اور ہمدرد دکھائی دینے والی عافیہ بیگم کا یہ روپ بہت ناقابل برداشت لگتا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ بے وقت گھر آیا تھا۔ گیٹ کی چابی اس کے پاس ہی ہوا کرتی تھی۔ نمرہ اور احمر بھی ابھی نہیں لوٹے تھے۔ چچی جان اور دادی جان' نمرہ کے لیے آئے کسی پروپوزل پر غور و فکر کر رہی تھیں۔

زنیرہ روٹیاں بنانے کے لیے کچن میں آئی تھی۔

اسجد سیدھا وہیں آیا۔

"السلام علیکم۔" اس کی دھڑکن اس اچانک سلامتی پر تیز ہو گئی۔ تیزی سے پلٹی تو اسجد کو سامنے پا کر حیران ہوئی۔

"آپ..... اس وقت؟"

"یہ سلام کا نیا جواب ہے کیا؟"

وہ بھنویں اچکا کر پوچھنے لگا۔ زنیرہ خفیف سی ہوئی۔

"وعلیکم السلام۔"

"امی کدھر ہیں؟"

"دادی جان کے کمرے میں ہیں۔"

وہ فریج میں سے آٹے کا باؤل نکالنے لگی۔

"ایک کپ چائے ملے گی؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"ہاں ضرور..... مگر پہلے کھانا تو کھالیں۔ میں روٹیاں بنانے لگی ہوں۔" زنیرہ نے کہا۔

"سر میں سخت درد ہے پارٹنر' ایک کپ چائے اور ایک پُرسکون نیند کی سخت ضرورت ہے۔"

زنیرہ نے دیکھا' اس کی آنکھوں میں ہلکی سی سرخی تھی۔ ذرا' ذرا بڑھی ہوئی شیو' وہ واقعی تھکا ہوا لگ رہا تھا۔

تین دن پہلے ہونے والے بم بلاسٹ کے زخمیوں سے اسپتال بھرا پڑا تھا۔ وہ کلینک سے زیادہ اسپتال ہی میں پایا جاتا تھا۔ تھوڑی نیند اور زیادہ کام نے اثر دکھا ہی دیا تھا۔

"او کے' میں لاتی ہوں۔" زنیرہ نے سر ہلایا اور ساس پین میں پانی ڈال کر چولہے پر چڑھا دیا۔

وہ دادی جان کے کمرے میں گیا' پھر ان سے مل کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

چچی جان متفکر سی کچن میں چلی آئیں۔

"کہا بھی ہے یوں دیوانوں کی طرح کام مت کیا کرو۔ مگر یہ لڑکا سنے تو نا' اب رات کو کلینک پہ چلا جائے گا۔" وہ شاکی انداز میں کہہ رہی تھیں۔

"اسجد کے لیے چائے بنا رہی ہو' خالی چائے مت دینا' ساتھ میں بسکٹ لے جاؤ' کھانے پینے کا ہوش نہیں ہے اسے۔"

انہوں نے کیبنٹ میں سے بسکٹ کا ہاف رول نکال کر پلیٹ میں بسکٹ رکھے اور خود توے کے نیچے آگ جلانے لگیں۔

"میں روٹیاں بنالوں گی چچی جان!" زنیرہ نے کہا تو وہ بولیں۔

"تم چائے بنا کے دو اسے' دو' چار پھلکے ڈالنے ہیں' میں ڈال لوں گی۔" وہ مگ میں چائے ڈال کے بسکٹ کی پلیٹ ٹرے میں رکھنے لگی۔

ہلکا سا دروازہ کھٹکھٹا کر اندر داخل ہوئی تو نیم اندھیرے کمرے میں وہ بیڈ پر اوندھے منہ آڑا ترچھا لیٹا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ مار کر لائٹ آن کی تو وہ چونک کر پلٹا پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ زنیرہ نے ٹرے اس کے سامنے رکھی۔

"صرف چائے کہا تھا۔" وہ بسکٹ کی پلیٹ دیکھ کر بولا۔

"خالی پیٹ دوا نہیں کھانی چاہیے۔"

"میں صرف ایک ٹیبلیٹ لوں گا۔" اس نے کہا تھا۔

"اس کے لیے بھی کچھ کھانا ضروری ہے۔" وہ اطمینان سے بولی۔ اسجد نے نگاہ بھر کے اسے دیکھا' پنک اور فیروزی رنگ کے لباس میں وہ اچھی لگ رہی تھی۔ اس کا خود سے لاپروا اور سادہ سا انداز اس کے روپ کو مزید دلکش بناتا تھا۔

"خیر..... ضروری تو نہیں اور بھی بہت سے طریقے ہیں سر درد کو بھگانے کے' میں نے بتایا تو تھا ایک طریقہ۔" وہ شرارت سے بولا تو اس کی رنگت تپ اٹھی۔

"میں چلتی ہوں۔ نمرہ آنے والی ہے روٹیاں بنانی ہیں۔"

"کم آن یار! بیٹھو تو' پہلی بار میرے کمرے میں آئی ہو۔" وہ جلدی سے بولا۔

"نہیں۔ آپ عجیب سی باتیں کرتے ہیں۔" وہ صاف گوئی سے کہتی اسجد کو قہقہہ لگانے پر مجبور کر گئی۔

"اچھا نہیں کروں گا' پرامس۔"

اس نے وعدہ کیا تھا' اور زنیرہ اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

اس روز چائے پیتے ہوئے اسجد نے اس سے ڈھیروں باتیں کی تھیں۔ اس کی پسند و ناپسند' اس کے خیالات' اس کی دلچسپیاں۔

اور زنیرہ نے بھی اسے قریب سے جانا کہ وہ کتنا پیارا شخص تھا' اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ زنیرہ کو پسند کرنے لگا تھا۔

"میں نے تو دادی جان کے کہنے پر ہاں کردی تھی' بس۔ لیکن اب میں اپنے اس فیصلے سے بہت خوش ہوں۔" اس نے چھپایا نہیں تھا۔

اور اس کے اس برملا اعتراف نے زنیرہ کی روح تک کو شانت کر دیا۔ پھر وہ اٹھ کر اپنی وارڈروب کی طرف بڑھا۔ واپس آیا تو اس کی مٹھی میں کچھ تھا۔

وہ زنیرہ کے پاس آبیٹھا۔

"یہ تمہارے لیے۔" اس نے چٹکی میں پکڑ کر سونے کا نفیس سا بریسلیٹ لہرایا۔

"اونہوں۔" زنیرہ نے نفی میں سر ہلایا۔

"خبردار' کسی بہت اچھے موقع پر دینے کا سوچا تھا اور قسمت نے آج اتنا حسین موقع دے دیا۔" اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔

"اچھا نہیں لگتا ایسے' بے وجہ کا گفٹ۔" وہ ہچکچائی۔

"منگنی ہو چکی ہے ہماری' بے وجہ کا کیوں۔" وہ لاپروائی سے کہتے اس کی کلائی میں بریسلٹ پہنا کر لاک لگا رہا تھا۔

"پھر بھی....." وہ شرمندہ ہو رہی تھی' اتنا قیمتی گفٹ لے کر۔

"تو چلو جواب میں تم بھی کوئی گفٹ دے دو۔" وہ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے مسکرا کر بولا تو وہ گڑبڑائی۔

"میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

"ضروری تو نہیں پیسوں کی کوئی چیز ہو۔ ایک اچھی سی یاد..... کوئی رومینٹک سی یاد۔"

وہ کہتے ہوئے شرارت سے اس کی طرف جھکا تو وہ تیزی سے اٹھ گئی۔ اسجد نے پھرتی سے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔

"رکو تو۔"

"بہت باتیں ہو گئیں اب بس۔" وہ قطعیت سے بولی تو وہ بھی اس کے مقابل کھڑا ہو گیا۔

"لگتا تو نہیں کہ آپ کے سر میں درد ہے۔" زنیرہ کے طنز نے اسے ہنسا دیا۔

"یہ تو تمہارے قرب کا اعجاز ہے میری شریکِ سفر! مجھے ہر دکھ، ہر درد بھول گیا ہے۔ اے میری ہم نفس! زندگی کے سفر میں تم میرے ہم قدم ہو یہ احساس ہی مجھے ہر درد سے بے خبر کرنے کو کافی ہے۔"

وہ بے حد جذباتی اور شدّت آمیز لہجے میں کہہ رہا تھا۔ زنیبہ جیسے پگھل پگھل گئی۔ جانے کیوں اس کی آنکھ بھر آئی تھی۔

اس کے لبوں سے ایک سسکی ابھری اور آنکھ سے آنسو کا قطرہ اس کے ہاتھ پہ ٹپکا۔

وہ چونک کر جیسے حال میں لوٹی تھی۔

"اسجد۔"

اس کا نام پھر سے سسکی کی صورت اس کے لبوں سے آزاد ہوا تھا۔

"میری زندگی کس درد سے بھر گئی ہے، کیا اس سے تم واقف نہیں ہو؟ اب تمہارا دل تمہیں کوئی سگنل نہیں دے رہا کہ مجھ پہ کیا بیتنے والی ہے۔"

اس نے بائیں کلائی سے لپٹے اس خوب صورت بریسلٹ کو دیکھا اور پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔

☼ ☼ ☼

عافیہ بیگم کے منع کرنے کے باوجود عروبہ نے جس طرح کچن سنبھالا تھا اس نے ان کے دل میں غصہ بھر دیا تھا۔ ایک بے وجہ کا غصہ اور مقابلہ۔ عروبہ ایک سالن ان کے انداز اور مرضی کا پکاتی تو دوسرا یقیناً "اپنی مرضی اور پسند سے بناتی۔

"دراصل مجھے ٹنڈے گوشت پسند نہیں۔ میں نے اپنے لیے چنے کی دال ڈالی ہے گوشت میں۔" وہ آرام سے کہتی اور جب سب ہی ٹنڈوں سے زیادہ دال گوشت شوق سے کھاتے تو ان کا دل زہر سے بھر جاتا۔

وہ ان عورتوں میں سے تھیں، جو اپنی شہنشاہی آسانی سے چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتیں۔ اپنی من مرضی کرنے کو ہی تو وہ الگ ہوئی تھیں، ایسے کیسے سب کچھ عروبہ کے حوالے کر کے پلنگ پہ بیٹھ جاتیں اور انا کی اس لڑائی میں انہوں نے یہ بھی نہ سوچا تھا کہ مل جل کر زیادہ اچھے طریقے سے گھر سنبھالا جا سکتا ہے۔

ان کے اس شدید طرزِ عمل نے عروبہ کے اندر بھی ضد پیدا کر دی تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر وہ اس کی ماں اور اس کی تربیت پر جا پہنچتیں۔ وہ بھی ہر بات عاصم کو من و عن بتاتی۔

"یہ شکایت نہیں ہے۔ میں صرف ہر بات سے آپ کو باخبر رکھنا چاہتی ہوں۔ کل کو آپ یہ نہیں کہیں کہ میرے علم میں تو کوئی بات نہیں۔" ساتھ ہی وضاحت بھی کر دی۔

مگر روزانہ ہی کسی نہ کسی بات پر بدمزگی ہوتی رہتی۔

اب عافیہ بیگم نے طریقہ یہ اپنایا کہ ہر کام ہی عروبہ پر چھوڑ دیا۔ چھوٹے چھوٹے دو بچے سنبھالنے کے ساتھ ساتھ سبزی بنانے سے لے کر برتن دھونے تک، وہ بوکھلا کر رہ گئی۔

زنیبہ کو انہوں نے پڑھائی تک محدود کر دیا تھا۔

"ساری عمر پڑی ہے ان کاموں کے لیے۔" وہ آرام سے کہتیں۔

اور پھر یہ چھوٹے چھوٹے بادل ایک بڑے طوفان کی شکل اختیار کر گئے اور کسی کو پتا بھی نہیں چلا۔

یہ ان دنوں کی بات تھی، جب زنیبہ دادی جان سے ملنے گئی ہوئی تھی۔ بخار کی وجہ سے عروبہ میں کام کی سکت نہ رہی۔ مگر عافیہ بیگم نے نہ تو بچوں کو سنبھالا اور نہ ہی ہانڈی کی ذمہ داری واپس قبول کی۔ مجبوراً جیسے تیسے کر کے عروبہ نے ہانڈی بنائی اور بچوں کو لے کر کمرے میں جا پڑی۔

رات کھانے کی میز پر انہوں نے چن چن کر کھانے میں نقص نکالے۔

"اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی امی!" عاصم نے ایک نظر سر جھکائے کھانا کھاتی عروبہ کو دیکھ کر کہا تو وہ چٹخیں۔

"ہم نے بھی چار بچے سنبھالے اور ساتھ ساتھ گھر کی ذمہ داریاں بھی نبھائیں۔ یہ بہانے ہمارے سامنے

نہ چلاؤ۔"

"بہانے بنانے والی کیا بات ہے امی! میں نے آپ کو بتایا تھا مجھے بخار ہو رہا ہے۔"

عروبہ نے برداشت سے کام لیا تھا۔

"تو بی بی! بخار میں کون سا فاقے ہوتے ہیں۔ یہ بیٹھے ہیں تمہارے سسر صاحب، پوچھ لو جو ایک دن بھی ناغہ ہوا ہو کھانے کا۔"

وہ بے حد تلخی سے بولیں تو شبیر احمد کو بھی بولنا پڑا۔

"اچھا اب خاموشی سے کھانا کھاؤ سب۔"

"کیا کھاؤ، یہ زہر کھانے کے قابل ہے کیا، ذرا نمک۔" انہوں نے پلیٹ پرے کھسکائی اور تنفر سے بولیں۔

"دوپہر کو میں نے چکھا تھا۔ اتنا تیز تو نہیں تھا۔ شاید گرم کرنے سے مسالا خشک ہو گیا ہے۔"

عروبہ بمشکل بولی۔ مگر عافیہ بیگم نے تو جیسے اس کا پہلا جملہ ہی سنا ہو۔ ان کے تو تلوؤں لگی سر پہ جا بجھی۔

"ہاں ہاں، تم نے تو بالکل ٹھیک پکایا تھا۔ [illegible] ہیں آپ۔ مطلب یہ ہوا کہ جب اس نے پکایا تو اس وقت نمک ٹھیک تھا اور اس وقت جب کھا رہے ہیں تو تیز ہے۔ یعنی میں نے ڈالا ہے اس میں نمک۔ یہ ہے اس کی تربیت، حد ہو گئی، صحیح پڑھا کے بھیجا ہے ماں نے [illegible] کہ میں نے کیا ہے۔"

اب کی بار تو عافیہ بیگم نے حد ہی کر دی تھی۔

عروبہ تو زرد پڑتی رنگت لیے چھوٹے بچوں کے سامنے اپنی کھنچائی ہوتی دیکھ رہی تھی۔ مجبوراً "عاصم ہی کو ٹوکنا پڑا۔

"امی پلیز! یہاں بات عروبہ کی ہو رہی ہے۔"

"ارے جاؤ، بڑے آئے اس کے سگے۔ ایسی تربیت ماؤں ہی کی ہوتی ہے۔ سسرال میں لڑکی نہیں اس کی ماں کی تربیت بولتی ہے اور اسے تو میں بہت اچھی طرح سے دیکھ چکی ہوں۔"

وہ تذلیل کرنے میں ثانی نہیں رکھتی تھیں۔

"آپ مجھ سے کچھ بھی کہیں، مگر میری ماں تک نہ پہنچیں۔" عروبہ نے ہمت مجتمع کی تھی۔

"دیکھ رہے ہیں آپ بہو تو بہو اب تو بیٹا بھی منہ کو آنے لگا ہے۔"

عافیہ بیگم نے فوراً "ہی آب دیدہ ہو کر شبیر احمد سے کہا تو ان کا غصہ آسمان کو چھونے لگا۔

"اٹھو اور دفع ہو جاؤ۔ اس گھر میں بدتمیزیوں کی کوئی جگہ نہیں ہے۔"

ان کا فیصلہ اٹل تھا۔ مگر وہ بھول گئے کہ مقابل بھی ان ہی کا خون تھا۔ وہ بھی اسی وقت نوالہ پھینک کر اٹھ گیا۔

عافیہ بیگم کو بہت کچھ غلط ہونے کا احساس تو ہوا مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ قاسم نے بھی بات سنبھالنے کی کوشش کی، مگر دونوں میں سے کوئی بھی فریق جھکنے کو تیار نہ تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ عافیہ بیگم نیچا نہیں پڑنا چاہتی تھیں، سو دل پہ پتھر رکھ کے سر منہ لپیٹے پڑی رہیں۔

گاڑی کی آواز آئی تو قاسم نے آکر بتایا کہ وہ لوگ جا چکے ہیں تو وہ دل تھام کے رہ گئیں۔ بھلا کہاں جاتا وہ اس رات میں چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ؟

"چار دن سسرال میں رہے گا تو زمانے کے جوتے کھا کر واپس لوٹے گا۔"

شبیر احمد نے تبصرہ کیا اور کروٹ بدل کے لیٹ گئے۔

☼ ☼ ☼

اگلی صبح زنیبہ کو اسجد خود چھوڑنے آیا۔

"بہت یاد آؤ گی اس بار، میرے خیال میں باہر جانے سے پہلے میں تمہیں رخصت کرا کے لے جاؤں۔"

اس نے کہا تھا اور وہ سرخ چہرہ لیے اسے گھور کر رہ گئی تھی۔ شام کو وہ واپس ہو لیا۔

زنیبہ کو قاسم کے ذریعے تمام حالات کا علم ہوا تو وہ دل تھام کے رہ گئی۔ فاریہ کو فون کر کے عاصم اور عروبہ کا پوچھا، مگر وہ تمام واقعہ سے لاعلم تھی، پریشان ہونے لگی۔

ادھر عاصم نے وہ دن ہوٹل میں سوچ بچار میں گزارے اور تیسرے روز سیدھا پنڈی کا رخ کیا اور دادی جان کے پُرشفقت سائے میں جا کر سکھ کی سانس لی۔

مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی یہ حرکت زنیرہ کی زندگی میں کیسا خطرناک موڑ لانے والی ہے۔

زنیرہ کو اسجد نے انفارم کیا اور وہ خوشی خوشی عافیہ بیگم کے پاس گئی۔

عاصم کی طرف سے کوئی اطلاع نہ ملنے پر وہ بہت ملول و افسردہ تھیں مگر اپنی ہار ظاہر نہ کرتیں۔

"امی! بھائی کا پتا چل گیا' وہ دادی جان کے پاس ہیں۔" زنیرہ نے جیسے "خوش خبری" سنائی تو وہ پہلے تو اسے گھورتی رہیں۔

زنیرہ کنفیوز ہونے لگی۔

"اسجد نے بتایا ہے۔"

"بہت خوب' تو اب دادی کے ساتھ محاذ بنا کے جنگ لڑے گا وہ۔" انہوں نے کہا بھی تو کیا؟ وہی اپنی مرضی کا مطلب۔

اور شبیر احمد کو بھی پتا نہیں کن لفظوں میں ساری رپورٹ دی۔

انہوں نے صاف لفظوں میں زنیرہ اور اسجد کے رشتہ کو ختم کرنے کا اعلان کیا تھا۔

"جن کو ہماری عزت کا احساس نہیں' ہمیں ان سے کوئی رشتہ نہیں رکھنا۔"

انہوں نے فون پر بھائی سے صاف لفظوں میں کہا تھا۔

"ہم کسی بھی صورت عاصم اور بھابھی کو یہاں سے کہیں نہیں جانے دیں گے۔ آپ گھر لے جانا چاہیں تو بصد شوق' مگر وہ یہاں سے نکل کر در' در کی ٹھوکریں کھائیں' یہ کبھی نہیں ہوگا۔"

اسجد نے ان کا فیصلہ سن کر بھی صاف اور متوازن لہجے میں اپنا فیصلہ سنایا تو وہ تلملا کر رہ گئے۔

یہ سوچے بغیر کہ مقابل ان کا اپنا خون ہے۔

اور زنیرہ۔۔۔

اس کا کون سوچتا؟

وہ تو جیسے بے پتوار کی کشتی میں سوار تھی۔ خوف زدہ اور منزل سے لاعلم۔

اور پھر اسجد نے اسے شاید آخری فون کیا تھا۔

"یہ تمہاری لڑائی ہے زنی! تائی جان کے سامنے تمہیں اٹھنا ہوگا۔ تم میری منکوحہ نہیں ہو کہ عدالت میں مقدمہ کر کے تمہیں جیت لاؤں۔ تم اسٹینڈ لوگی تب ہی کوئی فیصلہ ہوگا۔ عاصم اور عروبہ کو میں یہاں سے کہیں جانے نہیں دوں گا اور رہا میں' تو میں تاعمر تمہارا انتظار کروں گا۔" وہ اس کی کمزور جان پر سارا بوجھ ڈال کر مطمئن ہو گیا تھا اور ادھر وہ کیا کرتی۔

دنوں میں عافیہ بیگم نے اس کے لیے رشتہ ڈھونڈ کر بات طے بھی کر دی' بلکہ ایک مہینے کے اندر اندر شادی کا فیصلہ بھی کر لیا۔ تقدیر جانے کیا رنگ دکھانے والی تھی؟

٭ ٭ ٭

"ہوش کے ناخن لو عافیہ! رشتے ایسے نہیں توڑے جاتے۔ بیٹا اور بہو تو ہاتھ سے گئے ہی تھے اب بیٹی کا گھر بھی اجاڑ رہی ہو۔"

دادی جان نے اتنے سخت لہجے میں ان سے کبھی بات نہیں کی تھی۔ حتیٰ کہ وہ ان کے بیٹے کو لے کر الگ بھی ہو گئیں۔ مگر اب جب بات ان کے پوتے اور پوتی کی تھی تو وہ یقیناً "اصل سے سود کو پیارا" جانتے ہوئے کمر کس کے میدان میں کودی تھیں۔

عافیہ سلگ اٹھیں۔

"گھر میں نے اجاڑا ہے یا آپ بدلے لینے پر اتری ہوئی ہیں۔" ان کی تیز لہجے میں کہی گئی بات پر دادی جان حیران ہوئی تھیں۔

"میں۔۔۔ کاہے کے بدلے لوں گی تم سے؟"

"کسی کو بھی میرا ہنستا بستا گھر برداشت نہیں تھا۔ جوڑ توڑ کر کے میرے بیٹے کو تو ورغلا ہی لیا مگر اپنی بیٹی کو برباد ہونے نہیں دوں گی میں۔"

وہ کہاں کی کہاں لے گئی تھیں۔

"خدا کی پناہ مانگو عافیہ!" وہ غصے سے کانپنے لگیں۔

"اور ذرا اپنے اطوار پر بھی غور کرو۔ دوسروں کی تربیت میں کیڑے تو فوراً دکھائی دے جاتے ہیں مگر خود کو تو ہمیشہ بالکل درست سمجھتی ہو۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ پہلے بھی تم نے ناعاقبت اندیشی سے کام لیا اور ایک بستے بستے گھر کو تباہ کیا اور اب اپنے گھر کے سکون کو بھی تم خود ہی تہ و بالا کیے دے رہی ہو۔ زنیرہ کا اس سارے قصے میں کیا قصور ہے؟"

"اس کا کوئی قصور نہیں' اسی لیے تو اسے قربانی کا بکرا بنانے سے گریز کر رہی ہوں۔"

وہ اطمینان سے بولیں۔ دادی جان کو کلسا کر انہیں بہت سکون ملا تھا۔

"شرم کرو عافیہ! رشتے ناتے کھیل نہیں ہوتے کہ جب جی چاہا کھیل لیا جب مرضی نہ ہوئی کھیل خراب کر دیا۔ یہ بچوں کی زندگیوں کا معاملہ ہے پانچ سال ان کی منگنی رہی ہے۔"

انہوں نے ٹوکا تھا۔

"کمال ہے تو نہیں نبھانا اور ویسے بھی زنی کو خدا کے فضل سے اچھا رشتہ مل چکا ہے۔ وہ لوگ ایک ماہ کے اندر اندر شادی پر زور دے رہے ہیں۔"

وہ تفاخر سے کہتی انہیں دکھ اور تاسف کا شکار کر گئیں۔

"اسجد میں کیا برائی تھی بھلا' اتنا خوب سیرت و خوب صورت برسرِ روزگار ہے۔"

"گیہوں کے ساتھ گھن پسنے کی روایت تو بہت پرانی ہے۔ ویسے بھی آپ سے بات کرنا عبث ہی ہے۔ آپ نے میرے مقابلے میں ہمیشہ ہی دوسروں کا ساتھ دیا ہے۔" وہ آرام سے بولیں۔

"مگر اس بار دوسروں کی صف میں تمہارا بیٹا ہے عافیہ! سوچ کر قدم اٹھاؤ اور وہ خود میرے پاس آیا ہے نہ کہ میں نے اسے۔۔۔" انہوں نے نصیحت کی تھی۔ مگر کوئی نصیحت چاہے بھی تو۔

"میری طرف سے تو یہ رشتہ ختم ہی ہے' باقی باتیں اپنے بیٹے سے طے کر لیجیے گا۔ خدا حافظ۔"

عافیہ بیگم نے رکھائی سے بات ختم کر دی تھی۔

٭ ٭ ٭

قاسم نے تو صاف اس نئی منگنی کا بائیکاٹ کیا تھا اور زنیرہ کو بھی انکار کے لیے ڈٹ جانے کے لیے خوب اکسایا تھا۔

"کیا کروں۔ ماں باپ کے سامنے آکھڑی ہوں؟ وہ ماں باپ خود سے جنہیں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ میری زندگی برباد کر رہے ہیں۔" وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

"بغاوت اسی کو کہتے ہیں۔ فی الحال زندگی بربادی کی طرف جا رہی ہے۔ مکمل بربادی سے پہلے سدِباب کر لو۔"

اس نے سمجھایا کہ جب تک وہ خود گھر والوں سے بات نہیں کرے گی بات میں وزن نہیں آئے گا۔

مگر عافیہ بیگم اور شبیر احمد سے اس موضوع پہ بات کرنے اور اسجد کے بغیر مر جانے کے ڈائیلاگ بولنے کی ہمت تو وہ مر کر بھی نہ کر سکتی تھی۔ عافیہ بیگم تو اسے نگاہوں ہی سے چیر پھاڑ ڈالتیں اور رہے شبیر احمد تو ان تک عافیہ بیگم نے اولاد کو جانے ہی کب دیا تھا۔

البتہ فاریہ کے سامنے اس نے ڈھیروں ڈھیر اعتراض کیا۔

"دیکھو زنی! امی ایسے ہی تو یہ فیصلہ نہیں کر رہیں۔ دل دکھا ہے تو ہی مقابلے پہ آگئی ہیں۔"

اسے پہلے جملے ہی سے اندازہ ہو گیا کہ فاریہ کی برین واشنگ عافیہ بیگم اچھی طرح کر چکی ہیں' ورنہ یہی فاریہ' اسجد سے بے حد متاثر تھی' بلکہ اس سے کافی دوستی بھی تھی فاریہ کی۔

"جس کا دل دکھا ہو' وہ دوسروں کا دل نہ دکھانے کی سوچتا ہے۔ امی تو میرا بھی دل دکھانا چاہتی ہیں۔" زنیرہ نے آنکھوں میں آنسو بھر کے ملتجیانہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"تم بے وقوف ہو۔ اسجد پوری زندگی نہیں تھا تمہاری۔" فاریہ نے اسے سمجھانا چاہا۔

"وہ میری پوری زندگی ہے آپی! پچھلے پانچ برسوں سے میں جس شخص کو آئندہ زندگی میں ہر پل اپنے ساتھ سوچتی آئی ہوں اسے میں یوں اپنی زندگی سے مائنس نہیں کر سکتی۔"

اس کے آنسو بہہ نکلے تھے۔

"اتنی کمزور مت بنو زینی! زندگی اتنی آسانی سے ختم نہیں ہو جاتی یہ بے وقوفی کی وہ باتیں ہیں جن پر بعد میں ہنسی آتی ہے۔"

"ہنسی انہیں آئے گی جن کے فیصلے چلیں گے میرے لیے تو فقط رونا ہی رونا ہو گا آپی۔"

وہ واقعی رو دی تھی۔ فاریہ کو غصہ آیا۔

"تمہیں اپنے دل کی اپنی زندگی کی بہت فکر ہے۔ امی کا سوچا ہے کبھی۔۔۔ عاصم کے فیصلے سے ان کے دل پہ کیا بیتی ہے کیسے نیچا دکھایا ہے انہیں وہاں رکھ کے ان لوگوں نے امی کو۔"

مارے دکھ کے اس کے آنسو تھمنے لگے۔

"اس میں بھی وہ لوگ غلط ہیں آپی۔۔۔؟" وہ شدید تاسف سے بولی تو الفاظ زبان کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔

"ہمارا بھائی ہمارا ماں جایا اپنے چھوٹے بچوں اور بیوی کو لے کر آدھی رات کو گھر سے نکلتا ہے تو اسے پناہ دینے والا ہمارا دشمن ہے؟ انہیں چاہیے تھا کہ اپنے گھر کے دروازے بند کر لیتے یا پھر انہیں دھکے دے کر نکال دیتے؟"

فاریہ سنبھلی۔

"میں نے یہ نہیں کہا۔ مگر عاصم کی بھی غلطی ہے۔ اس سے کس نے کہا کہ ایسا قدم اٹھائے اور اپنے ساتھ تمہاری زندگی بھی برباد کرے۔"

"امی نے کبھی مفاہمت اختیار ہی نہیں کی آپی! عروبہ بھابی تو بہو تھیں مگر امی نے کبھی بھی ماں بن کے انہیں اس گھر میں قبول نہیں کیا۔ جہاں رشتوں کو قبولنے کے بجائے محض "برداشت" کیا جاتا ہو وہاں رشتوں کی بنیاد فقط ریت ہوتی ہے فولاد نہیں۔"

وہ تلخی سے حقیقت بیان کر رہی تھی۔ فاریہ نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

"وہ بھی کچھ کم نہیں کر کے گئی۔"

"ہاں۔ ان کا قصور تو بہت بڑا ہے۔ آرام سے بیٹھی رہتیں بستر پہ پکا پکایا کھاتی رہتیں۔" وہ اسی انداز میں بولی۔

"اب بھی دیکھ لو بنا سوچے سمجھے فیصلے کا نتیجہ۔"

فاریہ نے فی الفور کہا تھا۔ اسے رونا آنے لگا۔

"امی کو میری زندگی کی بربادی کا کوئی احساس نہیں؟"

"احساس ہے تب ہی تو یہ قدم اٹھا رہی ہیں۔ جو لوگ ابھی ان کی عزت نہیں رکھ رہے' وہ بعد میں کیا کریں گے۔"

فاریہ کو ماں نے مکمل پٹی پڑھائی ہوئی تھی۔ اس کی اپنی تو گویا کوئی سوچ ہے ہی نہیں تھی۔

"عزت ہی تو رکھی ہے انہوں نے آپی! مگر امی سمجھیں تو نا! اگر وہ دروازے سے لوٹا دیتے بھائی جان اور ان کے بیوی بچوں کو سڑکوں پہ رلنے دیتے تو عزت بچتی آپ کی؟"

وہ رنج و دکھ سے چیخ اٹھی تو فاریہ سٹپٹائی۔ کہہ تو وہ ٹھیک ہی رہی تھی۔ مگر عافیہ بیگم نے بھی رشتہ ختم کرنے کی جو وجوہات بتائی تھیں وہ غلط نہ تھیں۔

"امی! صرف اپنی انا کی ہار برداشت نہیں کر پا رہیں اور اس کھیل میں وہ بیٹا تو ہار ہی چکی ہیں' اب بیٹی کی زندگی بھی داؤ پر لگا رہی ہیں۔"

وہ بھیگے تلخ لہجے میں بولی تو فاریہ نے سر تھام لیا۔ مطلب۔۔۔ وہ بے بس و لاچار تھی۔

☼ ☼ ☼

اسجد کا فون آیا تو وہ روتی چلی گئی ساتھ ہی جو منہ میں آیا وہ بھی کہہ دیا۔ اس نے بہت تحمل کے ساتھ ساری لعن طعن سنی اور اسے دل کا غبار نکالنے دیا۔ جب وہ تھمی تو رسان سے بولا۔

"اب جاؤ اور منہ پہ پانی کا ایک چھینٹا مار کے آؤ۔"

اور واقعی وہ سیل فون رکھ کے گئی اور جب منہ دھو کے تاؤل سے خشک کر کے آئی تو خود کو بہتر محسوس کر رہی تھی۔

"کیسی ہو۔۔۔؟" وہ جیسے بڑے نارمل حالات میں گفتگو کر رہا تھا۔

"میرے زخموں پہ نمک چھڑکنے کو فون کیا ہے آپ نے؟" وہ جس پہ تپ سکتی تھی تپی۔

"میں نے سوچا تھا شاید تائی جان بدل گئی ہیں مگر وائے حسرت۔" وہ گہری سانس بھر کے بولا تو زنیرہ کو رونا آ گیا۔

"اسجد! پلیز کچھ کریں۔ امی کہیں اور میری بات طے کر چکی ہیں۔" وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔

"بتایا ہے مجھے عاصم نے۔ وہ تو بہت غصے میں ہے۔ یہاں سے جانے کا کہہ رہا تھا۔ مگر میں اسے ایسا نہیں کرنے دوں گا۔ کوئی اور ٹھکانہ تو ہے نہیں اس کا۔۔۔"

"ہمارا کیا ہو گا اسجد۔۔۔؟" اس کی آواز کپکپا سی گئی۔

"دیکھو زینی۔۔۔! عاصم کا یہاں سے چلے جانا مسئلے کا حل نہیں ہے۔ جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اگر وہ یہاں سے چلا بھی جاتا ہے تب بھی تائی جان جتنی آگے جا چکی ہیں' ان کی واپسی مشکل ہے۔"

وہ بڑے معتدل لہجے میں گویا ہوا تو زنیرہ صدمے سے چلا اٹھی۔

"تو۔۔۔ کیا کرنا چاہیے مجھے۔ اس الو کے پٹھے سے شادی کر لینی چاہیے جسے انہوں نے میرے لیے ڈھونڈا ہے۔"

"میں یہ نہیں کہہ رہا۔۔۔" اسجد نے کہنا چاہا مگر وہ سن کہاں رہی تھی۔

"واپسی تو میری مشکل کر دی ہے آپ نے اسجد! میں تو ان جذبوں سے انجان تھی ان راستوں سے یکسر لاعلم اور اب بند گلی میں لا کے کہتے ہو راستہ خود تلاشو؟"

"تو کیا کروں۔۔۔ بھگا کے لے آؤں تمہیں؟" وہ بھی قدرے غصے میں آیا تھا۔ تیز آواز میں بولا تو وہ رونے لگی۔

"آئم سوری زینی۔۔۔!" وہ فوراً ہی ٹھنڈا پڑ گیا۔

"میری جان! میں بھی اسی سولی پہ لٹک رہا ہوں۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ تائی جان کے اس فیصلے نے میری زندگی کو ہلا کر نہیں رکھ دیا؟ تم میری زندگی میں پہلی اور واحد لڑکی ہو جس کے لیے میری بہت خاص فیلنگز ہیں زینی! اتنے عرصے میں میں نے تمہارے بغیر کچھ سوچا ہی نہیں مگر اب جو کچھ بھی کرنا ہے تم ہی کو کرنا ہے۔"

"میں کیا کروں۔۔۔ نکاح کے وقت انکار کر دوں؟" وہ چڑی۔

"ہاں تم کر سکتی ہو۔ تمہارا مذہب تمہیں حق دیتا ہے۔" وہ فی الفور بولا۔

"مذہب تو بہت سے حقوق دیتا ہے غضب تو یہ دنیا والے ہی کرتے ہیں۔"

اس نے تلخی سے کہتے ہوئے رخسار سے آنسو جھٹکا۔

"میری بس میں کچھ بھی نہیں ہے زینی! تائی جان نے فون کر کے میری ماں اور ماں سے بڑھ کے دادی جان سے بہت فضول باتیں کی ہیں۔ جو میری برداشت سے باہر ہیں۔ ایسی صورت میں میں انہیں تمہاری ہاں بھیجنے کا رسک نہیں لے سکتا کیونکہ یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتی ہو اور میں بھی کہ تائی جان وہی کریں گی جو وہ سوچ چکی ہیں۔"

"تو میں کیا کروں۔ کامران سے شادی کر لوں چپ چاپ؟" اس کا دل کٹنے لگا۔

"تم حق رکھتی ہو انکار کا زینی!" اسجد نے اسے یاد دلایا۔

"دن ہی کتنے رہ گئے ہیں اسجد!" وہ بلک گئی۔

"انکار کا کیا ہے زینی! وہ تو تم عین نکاح کے وقت بھی کر سکتی ہو۔ مگر بہتر ہے کہ ابھی کرو اور اس پر اڑ جاؤ۔ کم سے کم لڑکے والوں کی نکاح والے روز تو انسلٹ نہ ہو۔" وہ اسے سمجھا رہا تھا۔

"آپ خود کیوں نہیں کچھ کرتے۔ میرے اندر اتنی ہمت نہیں ہے۔" اسے اپنے ماں باپ کا سوچ کر ہی ڈر

لگنے لگا۔ وہ بھلا اتنی ہمت دکھا سکتی تھی۔

مگر اسجد نے صاف لفظوں میں اس سے کہہ دیا تھا کہ اس آزمائش میں سے اسے خود ہی نکلنا ہو گا۔ وہ اسے بھگا لے جانے کے حق میں قطعی نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

اور آج کامران کی ماں اور بہن اسے شاپنگ کے لیے لے جانے والی تھیں۔

"اچھا ہے نا! تڑپتے رہنا پھر۔ اگر تم کچھ نہیں کر سکتے تو میں بھی اتنی دلیر نہیں بن سکتی۔" وہ غصے میں ہی ان کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئی تھی۔ صبح بطورِ خاص اسجد کو میسج کر کے بتایا بھی تھا۔

دوپہر کا کھانا کامران کی امی اور اس کی بڑی بہن نازیہ نے انہی کی طرف کھایا اور اس کے بعد چائے کا دور چلا ..... آج عافیہ بیگم نے بطورِ خاص زنیبہ کی کلاس لی تھی۔

"خبردار جو آج ان کے سامنے ماتمی شکل بنا کے آئیں تو.... یاد رکھو شادی تو تمہاری کامران ہی کے ساتھ ہونی ہے پھر آج یہ سب کر کے آئندہ کے لیے مشکلات پیدا مت کرو۔"

"میرا دل نہیں چاہتا...." وہ رونے کو تھی۔ مگر کوئی رونا دیکھنے کو تیار بھی تو ہو۔ وہ غرائیں۔

"تو پھر میں تمہارے باپ سے بات کرتی ہوں۔ یہ دل کی باتیں انہی کو بتانا۔"

ان کی دھمکی محض دھمکی نہیں تھی.... یہ زنیبہ اچھی طرح جانتی تھی۔ اسجد سے بات ہونے کے بعد اس نے سوچ لیا تھا کہ اب وہ ہنسی خوشی کامران کے گھر والوں کے ساتھ جا کے شاپنگ کرے گی۔ محبت کا دعوا تو وہ بھی کرتا تھا.... اتنی آسانی سے برداشت کر پائے گا؟ مگر اب جبکہ وہ ان کے ساتھ گاڑی میں چلی آئی تھی تو دل ڈوبنے لگا۔

(تو کیا میں نے اسجد سے بچھڑنے کی پہلی سیڑھی پہ قدم رکھ دیا ہے؟) اس کے قدم سست پڑنے لگے۔

"کیا ہوا.... ابھی سے تھک گئیں؟" نازیہ اس کی سست روی پہ ہنسی۔

"میں گاڑی میں جا کر بیٹھتی ہوں۔" اس نے خشک ہوتے لبوں پہ زبان پھیری۔

"ابھی تو برائیڈل ڈریس رہتا ہے زنیبہ!" وہ کچھ برا مان گئیں۔

"میں تھک گئی ہوں۔ میں نے کبھی اتنی شاپنگ نہیں کی۔" وہ بے بسی سے بولی۔

جی تو چاہ رہا تھا سب کچھ چھوڑ چھاڑ یہاں سے بھاگ جائے۔

"چلو کوئی بات نہیں۔ تم چل کے گاڑی میں بیٹھو۔ ہمارا تھوڑا سا کام باقی ہے تھوڑی دیر تک ہم بھی آ رہے ہیں۔"

اس کی ہونے والی ساس نسرین بیگم اچھے مزاج کی خاتون تھیں۔ بیٹی کی طرح انہیں ذرا ذرا سی بات پر برا ماننے کی عادت نہ تھی۔ اب بھی انہوں نے زنیبہ کی زرد پڑتی رنگت پر ترس کھایا تھا۔

"گاڑی میں ڈرائیور ہو گا....؟" وہ ہچکچائی۔

"تم جا کے بیٹھو گی تو وہ خود ہی باہر چلا جائے گا، کہنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ہمارا بس پندرہ منٹ کا کام ہے۔" انہوں نے اس کا رخسار تھپتھپا کر تسلی آمیز لہجے میں کہا تو وہ ان کا شکریہ ادا کرتی شاپنگ پلازہ کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھی۔ یہ جانے بغیر کہ کوئی گھر سے شاپنگ سینٹرز اور اب اس پلازہ سے باہر جاتے ہوئے اس کے تعاقب میں ہے۔

آٹومیٹک ڈور سے باہر نکلتے ہی کسی نے ایک دم سے اس کی کلائی تھامی تو زنیبہ کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ سرعت سے جسارت کرنے والے کو دیکھا تو اسجد کو سامنے پا کر متحیر ہو گئی۔

کچھ کہے بنا وہ اس کا ہاتھ تھامے ایک طرف چل دیا اور ساتھ زنیبہ بے جان قدموں سے جیسے گھسٹتی جا رہی تھی۔

پلازہ کے بالکل پاس ہی موجود چھوٹے سے کیفے میں لا کر اس نے زنیبہ کا سرد پڑتا ہاتھ چھوڑا تو وہ بے دم سی کرسی پر گر گئی۔ وہ اس کے مقابل بیٹھا تھا۔

"اب بتاؤ۔ کیا حال چال ہیں؟"

وہ بے حد بشاشت سے پوچھنے لگا تو زنیبہ نے خفا سی نگاہ اس پر ڈالی۔ موسم کی مناسبت سے جینز پر گرم شرٹ چڑھائے وہ لیدر کی براؤن جیکٹ کی ہاف زپ کھولے ہوئے تھا گویا کسی قدر مطمئن اور آرام دہ صورت حال میں ہو۔

وہ مزید شاکی ہوئی۔

"بہت اچھے حال میں ہوں۔ خدا کا شکر ہے۔" اسے جلانے کے لیے کہا تو وہ برجستہ بولا۔

"ہاں وہ تو میں نے دیکھا۔ پچھلے دو گھنٹوں سے جیسے تم اپنی شادی کی شاپنگ کر رہی ہو، دل لگا کے۔"

زنیبہ کو رونا آنے لگا۔ ایک تو وہ اتنی بڑی مشکل کا شکار تھی اوپر سے وہ طنزیہ مذاق کرنے آن پہنچا تھا۔

"میرے بس میں جو کچھ ہے وہی کروں گی نا!" وہ تڑخی۔

"ہاں ٹھیک کہا۔ عورتوں کے بس میں سب سے اچھی صلاحیت شاپنگ کرنا ہی ہوتی ہے۔" وہ سرہلا کر بولا۔

"آپ...." وہ غصے سے کچھ کہتے کہتے لب بھینچ گئی۔ اسجد نے دلچسپی سے اس کے لال بھبوکا ہوتے چہرے کو دیکھا۔

"مجھے اس طرح لانے کا کیا مقصد ہے؟" اس نے بے کلی سے پوچھا۔

"ایم سوری تمہاری شاپنگ میں خلل پڑا۔ مگر میرا دل چاہ رہا تھا تم سے ملنے کو۔" وہ مزے سے بولا۔

"ملنے کو یا دل دکھانے کو؟" وہ کڑھی۔

دانستہ اس کی طرف دیکھ نہیں رہی تھی۔ اتنے شاندار بندے سے جدائی اب یقینی تھی تو دل کیوں نہ دکھتا۔

مگر ادھر تو جیسے کوئی پروا ہی نہ تھی۔ ذرا سی جو مسکراہٹ بھی ماند پڑی ہو۔

"میں کیوں دل دکھاؤں گا بھلا۔ ڈیڑھ گھنٹے سے تمہارے گھر کے باہر کھڑا ہوں۔ آئی مین گاڑی میں بیٹھا تھا۔ جب سے تمہارا ایس ایم ایس ملا کہ تم شاپنگ کے لیے جا رہی ہو آج۔"

وہ کہہ رہا تھا۔ زنیبہ کا دل قدرے کھل سا گیا تو اسے فکر تھی۔ تب ہی تو پنڈی سے یہاں تک کا سفر کر کے آیا تھا۔

"کیا فائدہ اس دوڑ لگانے کا۔ اب کیا رہ گیا ہے باقی؟" اسے یاد کر کے پھر سے رونا آیا تو وہ ضبط کرنے کو ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔

"فائدہ کیوں نہیں....؟" وہ الٹا اس سے پوچھنے لگا۔

"کوشش کر کے ہارنا سکون آور ہوتا ہے۔"

"اب کیا کوشش کریں گے آپ؟ دن ہی کتنے رہ گئے ہیں پیچھے۔ پہلے جب میں نے کہا تھا تو آپ کا جواب تھا کہ تمہیں خود کوشش کرنی ہے۔ تو پھر اب کیا تماشا دیکھنے آئے ہیں؟" وہ پھٹ پڑی۔ تو اسجد نے آرام سے کہا۔

"میں نے تو یہی سوچا تھا کہ تم کوئی اسٹینڈ لو گی۔"

"ہنہ...." اس نے سر جھٹکا۔

"میں امی ابو کے سامنے کچھ نہیں کہہ سکتی۔" پتہ نہیں یہ صاف گوئی تھی یا اپنی بزدلی کا اعتراف۔

"عاصم وہاں سے جانے کو تیار ہے۔ مگر میں جانتا ہوں کہ تائی جان اب کبھی بھی دوبارہ ہمارے رشتے کے لیے ہامی نہیں بھریں گی تاوقتیکہ لڑکے والے خود انکار نہ کر دیں۔"

ویٹر چائے رکھ گیا تھا۔ اسجد نے کپ اٹھانے کا اشارہ کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

"ان کا دماغ خراب ہے جو مجھے اتنی مہنگی شاپنگ کرا رہے ہیں۔ اگر انکار ہی کرنا ہوتا تو اس کے سستے طریقے بھی موجود تھے۔" وہ چڑ گئی۔

سر بری طرح دکھنے لگا تھا سو دل جمعی سے چائے کا کپ تھاما۔ ایسے میں قطعاً دھیان نہ رہا تھا کہ وہ ہونے والی ساس اور نند کے ساتھ آئی تھی.... اور اب وہ اسے ڈھونڈ نہ رہی ہوں۔ اسجد نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے نگاہ اس پر ٹکائی۔

جدید تراش کے لباس میں ملبوس دوپٹہ شانوں پہ

ڈالے وہ اچھی لگ رہی تھی۔ ایسے میں اس کا خفا سا انداز اسجد کو وہ پہلے سے کمزور لگی۔

اس کی نگاہوں کی تپش نے زینیہ کو پہلو بدلنے پر مجبور کر دیا۔ تو وہ مسکرا کر چائے ختم کرنے لگا۔ زینیہ نے چائے ختم کر کے کپ رکھا اور کرسی کھسکا کر اٹھنے لگی۔ اسجد نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر اسے روکا۔

"کدھر.....؟"

"میں لیٹ ہو رہی ہوں۔ آنٹی اور نازیہ آپی مجھے ڈھونڈ رہی ہوں گی۔ مائی گاڈ!"

اسے یک لخت ہی دھیان آیا کہ کیا غضب ہونے والا ہے۔ اگر وہ اس کے گھر پہنچ گئیں تو.....

"ڈونٹ وری زینی! میرے ساتھ ہو تم۔" وہ نرمی سے بولا۔

"کب تک؟" زینیہ نے دکھ سے اسے دیکھا۔

"جانے سب کو جواب مجھے دینا ہے آپ کا ایڈونچر تو یہیں پر ختم ہو جائے گا۔"

"تمہارا چائے پینے رک گئی تھیں۔ سو واٹ.....؟" وہ لاپروائی سے بولا تو زینیہ نے اپنا ہاتھ کھینچا اور کرسی سے ٹیک لگا کے بیٹھ گئی۔

اسجد نے جیکٹ کی اندرونی جیب میں سے البم نکال کے اس کے سامنے رکھی۔

وہ مستفسرانہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

"کچھ یاد ہیں....." وہ ہلکے سے مسکرایا۔

زینیہ نے البم کھولی۔ پہلی ہی تصویر دیکھ کے اسے زوروں کا رونا آنے لگا۔

یہ تب کی تصویریں تھیں جب وہ پنڈی گئی تھی اور اسجد انہیں باہر لے کر گیا تھا۔ نمرہ اور کچھ احمر نے ان کی تصویریں بنائی تھیں۔ ڈھیروں تصویریں۔ جن میں صرف وہ اور اسجد تھے۔

کتنے پاس ہنستے شاداں و فرحاں۔ مستقبل کے اندیشوں سے بے خبر۔

آنسو اس کے رخساروں پر اتر آئے تھے۔ اسجد نے لب بھینچے۔

حقیقت تو یہ تھی کہ وہ بھی کچھ نہیں کر پا رہا تھا۔ یہ کانچ سی لڑکی' بڑوں نے جسے اس کی شریک سفر بنایا تھا کیسے آرام سے اس کے دل میں اتر گئی تھی اور اب..... ابھی تو خوابوں کا سفر شروع ہوا تھا۔ ابھی تو ان کی تعبیریں ملی تھیں..... اور یہ جدائی...

یہ تو کہیں نہ تھی دونوں کے بیچ۔ پانسا ہی پلٹ گیا تھا۔

"تم پنڈی چلو میرے ساتھ۔" وہ دفعتاً بولا۔

زینیہ نے البم بند کر کے پرے کھسکائی اور ہاتھوں سے چہرہ رگڑ کر گویا شکست و ریخت کے نشانات مٹانے کی سعی کی۔

"اس سے کیا ہو گا؟"

"سیاسی پناہ لے لو یار! تمہارا بھائی پہلے سے موجود ہے۔" وہ مسکرایا تو زینیہ نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"آپ کو ایسی حالت میں بھی مذاق سوجھ رہا ہے۔"

"مجبور ہوں کیا کروں؟ تایا کی بیٹی ہو۔ ورنہ کہتا چلو کورٹ میرج کر لیتے ہیں۔" وہ بے بسی سے بولا۔

"تمہیں یہاں تک نوبت آنے ہی نہیں دینی چاہیے تھی۔ انکار کرتیں اور پھر اس پہ ڈٹی رہتیں۔ مگر تم بہت بزدل ہو زندگی کو اپنے موڈ سے گزارا کرتے ہیں اس کے موڈ سے نہیں۔"

"ہاں۔ سارا قصور میرا ہی ہے۔ مجھے شوق ہو رہا تھا کسی اور سے شادی کرنے کا۔" وہ اس الزام تراشی پر غصے میں آ گئی۔

"اچھا چلو اٹھو۔ لانگ ڈرائیو پہ چلتے ہیں۔ پھر واپس بھی جانا ہے مجھے۔"

وہ بولا تو زینیہ نے ملامتی انداز میں کہا۔

"آپ یہاں ٹائم پاس کرنے آئے ہیں؟"

"بے وقوف۔ واپسی پہ تمہیں گھر چھوڑوں گا۔ تایا جان سے ملوں گا۔" وہ ہنستے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ زینیہ کو خوف نے گھیرا۔

"نہیں میں ان ہی کے ساتھ واپس جاتی ہوں۔ گھر میں قیامت مچ جائے گی۔" اس نے موبائل اسکرین

پہ وقت دیکھا۔

"ابھی آدھا گھنٹہ ہی ہوا ہے۔ وہ شاید ہی آئی ہوں واپس۔"

"شٹ اپ۔ تم میرے ساتھ چل رہی ہو۔" وہ آرام سے بولا۔ بل کے پیسے ادا کیے اور اس کا ہاتھ تھام کر باہر لے آیا۔

"خدا کے لیے اسجد! کہیں ان لوگوں نے دیکھ لیا تو....؟" وہ خوف زدہ ہوئی۔

"اچھا ہے۔ رشتہ ٹوٹنے میں مزید آسانی ہو گی۔" وہ لاپروائی سے کہتا اسے اپنی گاڑی تک لے آیا۔

"یہ ہے وہ گاڑی جس کی فرنٹ سیٹ پہ صرف تمہارا حق ہے۔" وہ محبت سے کہہ رہا تھا۔ زینیہ کی پلکیں نم ہونے لگیں۔

"اب کیا ہو گا اسجد! کیا ہم کبھی مل نہیں پائیں گے۔" وہ زود رنج ہو رہی تھی۔

"نہیں کبھی کبھی مل لیا کریں گے۔" اگنیشن میں چابی گھماتے ہوئے وہ شرارت سے بولا تو وہ چلا اٹھی۔

"آپ بس یہی کر سکتے ہیں اور بس گھر چھوڑ دیں مجھے۔"

"اتنی جلدی ابھی تو لانگ ڈرائیو....." وہ معترض ہوا تو زینیہ نے دانت پیسے۔

"بھاڑ میں گئی آپ کی لانگ ڈرائیو۔ آپ مجھے گھر چھوڑتے ہیں یا میں رکشہ کر لوں؟" وہ غصے سے لال ٹماٹر ہو گئی۔

"کم آن زینی! اتنا غصہ کیوں کر رہی ہو؟" پارکنگ لاٹ سے گاڑی نکالتے ہوئے وہ رسان سے بولا۔

"ہاں۔ میں کیوں غصہ کر رہی ہوں۔ مجھے تو خوشی سے پھولے نہیں سمانا چاہیے' آخر کو پانچ سالہ منگنی ٹوٹی ہے میری اور اس سے بھی بڑھ کے فخر تو اس بات پہ ہونا چاہیے کہ ساتھ ہی دوسرا رشتہ بھی مل گیا اور اب شادی کی تیاریاں جاری ہیں۔"

بے حد ضبط سے کہتے ہوئے بھی اس کی آواز بھرا گئی تو اسجد کو اپنی شرارت پر افسوس ہوا۔

"آئم سوری....."

"نہیں۔ معذرت تو مجھے کرنی چاہیے۔ میں ہی بے وقوف تھی جو محض زبانی کلامی بات کو پوری زندگی پر محیط کر بیٹھی تھی۔ آپ کو نہ تو پہلے مجھ میں انٹرسٹ تھا اور نہ اب ہے۔ اچھا ہی ہوا کسی لیڈی ڈاکٹر سے شادی کر لیجیے گا۔"

وہ تلخی سے بولی تو اسے ہنسی آ گئی۔ پھر اس کے تاثرات دیکھ کر وہ جلدی سے بولا۔

"دیکھو اب تم خود مزاحیہ باتیں کر رہی ہو۔ ہنسی ہی آئے گی نا۔" مگر اس نے طے کر لیا تھا کہ اب ایک لفظ بھی نہ بولے گی۔ گھر آنے تک وہ بت بنی ونڈ اسکرین کے پار دیکھتی رہی۔

اسجد گہری سانس بھر کے رہ گیا۔

کامران کے گھر سے آئی گاڑی وہیں کھڑی تھی ڈرائیور سمیت۔

"آپ جائیں۔ وہ لوگ بھی گھر میں ہیں۔" وہ کہتی نیچے اتری' مبادا کوئی گھر سے نکل ہی نہ آئے۔

"تو میں بھی مل لیتا ہوں نا! پانچ سال پرانا منگیتر ہوں تمہارا۔" اس نے ہانک لگائی تو اسے زخمی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی نیم وا گیٹ سے اندر داخل ہو گئی۔

اندر آنے تک اسجد کا ساتھ بھلا بیٹھی تھی صرف زبان پر جل تو جلال تو کا ورد تھا۔ اسے خبر تھی کہ عافیہ بیگم اس کا حشر کرنے والی ہیں۔

"میں تو کال کر کر کے تھک گئی مگر اس کا سیل آف ہے شاید....." فاریہ کی آواز کوریڈور کے سرے پر ہی اسے الرٹ کر گئی۔ اسے خیال آیا اپنا موبائل اس نے آف کر کے پرس میں ڈال رکھا تھا وہ رک گئی۔

"خدا خیر کرے۔ شہر کے حالات ویسے بھی ٹھیک نہیں۔" کامران کی امی کی آواز ہی سے پریشانی ٹپک رہی تھی۔

"میں نے تو جیتی جاگتی بچی آپ کے حوالے کی تھی۔ مجھے تو سمجھ نہیں آئی کہ....." عافیہ بیگم اپنے لہجے کی تیزی پر کنٹرول نہیں کر پائی تھیں۔

"کمال کرتی ہیں آنٹی! آپ کا خیال ہے کہ

خدانخواستہ ہم نے اسے کہیں اِدھر اُدھر کر دیا ہے۔“ نازیہ کو غصہ آیا۔

”اتنی آسانی سے آپ بری الذمہ بھی نہیں ہو سکتیں ہم نے اسے آپ کے ساتھ بھیجا تھا اور اب صورت حال یہ ہے کہ اس کا کہیں اتہ پتہ نہیں اور موبائل بھی آف ہے۔“ فاریہ نے بھی انہی کو موردِ الزام ٹھہرایا تو وہ دونوں ماں بیٹی غصے میں آگئیں۔ دونوں طرف سے تند و تیز مکالموں کا تبادلہ جاری تھا۔

زنیرہ کو منظرِ عام پر آنے کے لیے اپنی تمام تر ہمت مجتمع کرنا پڑی۔ اس کے لاؤنج کے سرے پر نمودار ہوتے ہی ایک دم خاموشی چھا گئی۔

”یہ لیں۔ آگئی آپ کی بچی!“ کامران کی امی نے طنزاً کہا۔ عافیہ بیگم بے اختیار اس کی طرف بڑھیں۔

”کہاں تھیں تم زنیرہ! پتہ ہے سب کس قدر پریشان ہو رہے تھے۔“ وہ خاموش رہی۔ ایک دل ہی تھا جو با آوازِ بلند خوف سے دھک دھک کر رہا تھا۔

”پوچھ لیں اس سے ہم نے تو اسے گاڑی ہی میں بیٹھنے کو بھیجا تھا۔“ نازیہ نے تلخی سے کہا۔

”کہاں تھیں تم....؟“ فاریہ نے سختی سے پوچھا۔ اسے بگڑتی صورتِ حال کا ادراک ہو رہا تھا۔

”وہ.... میں پلازہ سے نکلی تو مجھے گاڑی نظر ہی نہیں آئی۔ میں واپس گئی تو یہ لوگ بھی نہیں ملیں۔ میں کتنی دیر وہاں ڈھونڈتی رہی۔“ تھوک نگلتے ہوئے اس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

”اور تمہارا موبائل....؟“ عافیہ بیگم نے اس کی ہوائیاں اڑتی شکل کو بغور دیکھا۔

”وہ اس کی بیٹری آف ہو گئی ہے۔ آئم سوری۔“ وہ باری باری سب کی شکلیں دیکھ رہی تھی۔

”میرے خیال میں ہم چلتے ہیں۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔“ نازیہ نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

”سوری نازیہ بیٹا! بس جذبات میں آکر میں کچھ الٹا سیدھا کہہ گئی۔“

عافیہ بیگم کو سمدھیانے کا خیال آیا تھا۔

”کچھ نہیں“ آپ کافی کچھ الٹا سیدھا کہہ گئی ہیں۔“

نازیہ نے انہیں جتایا۔ تو وہ شرمندہ سی ہو گئیں۔

”چوئیشن ہی ایسی تھی بیٹا! ورنہ ایسے رشتے تو باہمی اعتماد کی بنیاد پر ہی طے ہوتے ہیں۔“ فاریہ کی نگاہ سپاٹ چہرہ لیے کھڑی زنیرہ پر تھی۔ اسے بات کچھ اور ہی لگ رہی تھی۔

”بہرحال۔ اب کافی دیر ہو گئی ہے۔ ہم چلتے ہیں۔ پھر ملاقات ہو گی۔ ابھی تو ٹینشن سے ویسے بھی طبیعت بگڑی ہوئی ہے۔“

کامران کی امی کا موڈ بھی کچھ خاص اچھا نہ تھا۔ عافیہ بیگم اور فاریہ ان کے آگے بچھ بچھ گئیں مگر فی الحال وہ رکنے کے موڈ میں قطعاً ”نہ“ تھیں۔ کھڑے کھڑے ہی رخصت ہو گئیں۔

عافیہ بیگم نے گہری سانس بھری۔

”کہاں گئی تھیں تم....؟“ فاریہ نے شکی انداز میں پوچھا تو عافیہ بیگم بھی چونکیں۔

”سیدھی گھر آرہی ہوں۔ کہیں جانا ہوتا تو کیا واپس آتی؟“ اس نے الٹا پوچھا وہ اب مطمئن تھی۔

”مجھے پتا تھا تمہاری بے وقوفی کوئی نہ کوئی رنگ ضرور دکھائے گی۔ اتنی بڑی گاڑی نظر نہیں آئی تمہیں۔ لے کے ہماری بھی عزت خوار کر دی۔ میں تو ان پر چڑھ دوڑی تھی.... سمجھ میں نہیں آرہا اب کیا بنے گا۔ وہ دونوں تو بڑی ناراض گئی ہیں۔“

”میرا تو کوئی قصور نہیں اور یہ کوئی اتنی بڑی بات بھی نہیں کہ اس کا ایشو بنایا جائے، جو ہو گا دیکھا جائے گا۔“

وہ لاپروائی سے کہتی اپنے کمرے میں چلی آئی۔

مگر مستقبل اس کے سامنے سوالیہ نشان کی مانند تھا۔ آج اسجد کا رویہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ اس کے انداز میں وہ شدت وہ تڑپ مفقود تھی، جو جدائی کے خیال سے ہونی چاہیے تھی۔

اسے یاد آیا پنڈی رہائش کے دوران وہ کیسے پل پل اس کا خیال رکھتا تھا۔ اس کی باتیں اس کے انداز اس کی محبت....

یونہی تو وہ زنیرہ کے دل و دماغ میں نہیں سما گیا تھا۔

مگر اب....؟ زنیرہ کو رونا آگیا۔

اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ اسجد کا رویہ تو ایسا تھا جیسے کہہ رہا ہو کہ ”جان بچی سو لاکھوں پائے“ کتنے آرام سے اس نے کہہ دیا تھا کہ اب جو بھی کرنا ہے تم ہی کو کرنا ہے۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ زنیرہ اس معاملے میں اتنی ہی بے بس ہے جتنا کہ وہ خود۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن عاصم چلا آیا۔

عافیہ بیگم یوں لاپروا تھیں جیسے کچھ معاملات ہوئے ہی نہ ہوں۔

”آپ زینی کے ساتھ اچھا نہیں کر رہیں۔“ وہ تو یوں بھی ماں کے سامنے بول لیا کرتا تھا شادی کے بعد تو اور بھی منہ پھٹ ہو گیا تھا۔ بقول عافیہ بیگم کے۔

”تم نے بہت اچھا کیا ہے سب کے ساتھ۔ جو اس کی حمایت کا جھنڈا اٹھا کے چلے آئے ہو۔“ وہ تنک کر بولیں۔

”آپ کی ناراضی مجھ سے تھی۔ اسجد اور زنیرہ کی زندگی کیوں برباد کر رہی ہیں؟“ وہ چپ گیا۔

”یہ سب تمہاری دادی کی پڑھائی پٹیاں ہیں۔ تمہیں تو لے ہی گئیں۔ بیٹی کو بھی اسی کھائی میں پھینک دوں۔“

وہ تنفر سے بولیں تو وہ چلّا اٹھا۔

”وہ بھی یہی آپ ہی کر رہی ہیں۔ جانتی کیا ہیں آپ کامران رضا اور اس کے خاندان کے بارے میں۔ بس ضد میں آکر جو پہلا رشتہ ملا اس کو ہاں کر کے زنیرہ کو ٹھکانے لگانا چاہ رہی ہیں۔“

”چلاؤ مت۔ یہ تمہاری دادی کا گھر نہیں ہے۔“ وہ ناگواری سے بولیں۔

”ہو بھی نہیں سکتا۔ وہاں ہر کسی کو جائز بات کہنے کا حق ہے، چاہے کتنی بھی اونچی آواز ہو۔“ وہ تلخی سے بولا۔

”تو جاؤ۔ رہو وہاں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ۔ یہاں کیا ڈراما کرنے آئے ہو۔“ انہوں نے بےزاری سے کہا۔

عاصم نے تاسف سے ماں کو دیکھا۔

ساری عمر جنہوں نے فقط اپنے آپ ہی کو دیکھا تھا۔ اپنے جذبات و احساسات اور مفادات کو ہمیشہ دوسروں کے جذبات پر فوقیت دی تھی۔

وہ ان لوگوں میں سے تھیں جو زندگی کی بساط پر اپنی ترجیحات ہمیشہ سیٹ کر کے رکھتے ہیں اور کسی کو اجازت نہیں دیتے کہ ان کے مہروں کو ادھر اُدھر کرے۔

مگر یہاں بے جان مہرے کی نہیں بلکہ زنیرہ کی زندگی کا سوال تھا۔ جسے وہ کسی طور برباد نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔

”جس شخص کو آپ نے زینی کے لیے چنا ہے وہ اچھی شہرت نہیں رکھتا۔ جلد بازی مت کریں۔ آپ اسجد سے اس کی شادی مت کریں مگر کم از کم اسے یوں کھائی میں تو نہ دھکیلیں۔“ وہ بے حد تلخی سے کہہ رہا تھا۔

عافیہ بیگم نے ہاتھ ہلا کر گویا مکھی اڑائی پھر حقارت سے بولیں۔

”جانتی ہوں میں۔ ارے سب کے سینوں پہ سانپ لوٹ گئے ہوں گے۔ یوں چٹکیوں میں (انہوں نے چٹکی بجا کے دکھائی) اچھا رشتہ جو مل گیا۔ تماشا دیکھنے کی حسرت رکھنے والوں کے منہ پر ہی جوتی پڑی ہے۔“

”لاحول ولا....“ ان کے اتنے غرور و تنفر پر عاصم سر جھٹک کر رہ گیا۔ غرضیکہ لمبی بحث، جھگڑا، چیخنا چلانا۔ کچھ بھی عافیہ بیگم کو اپنے ارادے سے ایک انچ بھی نہ ہلا سکا تھا۔

”بہت پچھتائیں گی آپ....“

”ارے چل، ماں کو دھمکاتا ہے خبیث! جو تُو کر کے گیا ہے وہ بھی دیکھ چکی ہوں میں۔ بالشت بھر کی چھوکری انگلیوں پہ نچا رہی ہے تجھے۔“ وہ برشتہ ہوئی تھیں۔

ناچار عاصم کو واپس لوٹنا پڑا۔

اسجد کے گھر والوں نے شبیر احمد کی بہتیری منت سماجت کی مگر ان کی نہ کوہاں میں نہ بدل سکے۔

بارات دیے گئے وقت پر ہی ان کے دروازے پر آئی تھی۔

☼ ☼ ☼
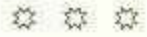
"ارے بچے تو کچھ کرتا کیوں نہیں۔ اتنے آرام سے تیار ہو رہا ہے جیسے بڑی خوشی کی شادی میں شرکت کے لیے جا رہا ہے۔"

دادی اماں کو اسجد کے ہیرو بن کے پچویشن کو نہ بدلنے پر بڑا رنج تھا۔ اب بھی اسے ٹوکے بغیر نہ رہ سکیں۔

"ہاں تو شادی کا مطلب ہی خوشی ہوتا ہے۔ جا کے پرسہ تو دینے سے رہے۔" وہ لاپروائی سے بولا۔

"نہ تو وہاں جا کے دل دکھانے سے کیا فائدہ۔"

وہ کسی طور شادی میں شریک ہونے کو راضی نہ تھیں۔ بھلا وہ زینیہ کو دیکھ پاتیں...... مگر عافیہ بیگم یہاں بھی دل دکھانے سے باز نہ آئی تھیں۔ انہیں بمعہ اہل و عیال شادی پہ انوائٹ کیا گیا تھا اور اسجد نے اس دعوت نامے کا یوں خیر مقدم کیا تھا گویا اپنی ہی شادی کا کارڈ ہو۔ بلکہ بارات میں شرکت کے لیے اس نے اپنا شاندار سا سوٹ بھی بنوایا تھا۔

اس کی پراسرار سی سرگرمیاں گھر میں کسی کو ہضم نہ ہو رہی تھیں۔ وہ اور عاصم گزشتہ ہفتے کتنی ہی بار شہر سے باہر گئے تھے۔ نجانے کیا کرتے پھر رہے تھے۔ سب گھر والوں کو شادی میں شرکت کا سختی سے آرڈر تھا۔ ادھر عاصم بھی مطمئن تھا۔ زینیہ کی شادی کی خبر سن کر اس پر جو بے چینی طاری تھی اب اس کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا تھا۔ واللہ عالم......

☼ ☼ ☼

مقررہ روز وہ بارات کی آمد سے کافی پہلے پہنچ گئے۔ اسجد کے سمجھانے پر سب ہی بڑی مروّت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

"رشتہ ٹوٹنے سے رشتے تو ختم نہیں ہو گئے نا اور جب میں نے ہر بات خدا پہ چھوڑ دی ہے تو آپ بھی اس کی رضا میں راضی ہو جائیں۔"

اسجد نے کہا تھا اور سبھی نے دیکھا وہ کتنے وقار اور برداشت کے ساتھ شادی میں شریک ہوا تھا...... وائٹ امبر ائیڈ ڈینیوی بلیو پرنس سوٹ میں اس کی وجاہت قابل دید تھی۔ وہ سلام کرکے حسب عادت عافیہ بیگم کے آگے پیار لینے کے لیے جھکا تو ایک لمحے کو تو وہ بھی پچھتاووں میں گھرنے لگیں۔

ایک تو ڈاکٹر اوپر سے لاکھوں میں ایک۔

چلو خیر۔ ڈاکٹر نہ سہی پروفیسر ہی سہی۔ ہزاروں میں ایک تو کامران بھی ہے۔ انہوں نے جلد ہی خود کو اس پچھتاوے کی گرفت سے نکال لیا تھا اندر ہی اندر وہ ان سب کی برداشت اور ہمت پر حیران بھی تھیں جو انہوں نے اس شادی میں شرکت کرکے دکھائی تھی۔ دیکھنے والے، دوست رشتہ دار بھی انگشت بدنداں تھے۔ ایسی رشتہ داری نبھانا تو ان لوگوں سے سیکھنا پڑے گا اور ادھر رات مہندی کے فنکشن میں رو رو کر اپنی حالت خراب کر لینے والی زینیہ پر دلہن بننے کے بعد جیسے چپ طاری ہو گئی تھی۔

اس نے اسجد کے ہر خیال کو خدا حافظ کہہ دیا تھا۔ بے ایمان بن کے کسی کے نکاح میں جانا اسے قبول نہ تھا۔

مگر دل تھا کہ ایک چپ سی طاری تھی، دماغ تھا کہ ہزاروں سوچیں اور کسی ایک پر مرتکز رہنے کی سکت نہ تھی۔

وہ جو ابھی تک خدا سے لڑتی آ رہی تھی۔ اس سے شاکی تھی خفا تھی اب مَن گئی۔

"میں تیری رضا میں راضی ہوئی میرے پروردگار! تُو نے بہتر کے بدلے بہترین کا وعدہ کیا ہے تو یقیناً "میرے لیے اس نئی زندگی میں بہتری ہوگی۔ میں جس کے قابل ہوں مجھے اسی کا نصیب بنائے گا۔ مجھے تجھ سے کوئی شکوہ نہیں۔ ہر زمین ایڑیاں رگڑنے کے لیے نہیں ہوتی کیونکہ ہر زمین کے نیچے آب زم زم نہیں ہوتا۔ اسی طرح ہر ضد کا انجام خواہش کا پورا ہو جانا نہیں ہوتا

یہ میں نے جان لیا ہے۔"

اور پھر بارات آ گئی۔ پندرہ بیس لوگوں پر مشتمل مختصر سی بارات کا شایان شان طریقے سے استقبال کیا گیا تھا۔

اسجد نے نگاہوں ہی نگاہوں میں عاصم سے استفسار کیا تو وہ فوراً ہی موبائل سے کوئی نمبر ملانے لگا اور پھر کچھ دیر بات چیت کرنے کے بعد اسے انگوٹھا دکھا کر سب سیٹ ہے کا اشارہ کیا تو وہ مطمئن سا اپنی پریشان فیملی کے ساتھ جا بیٹھا۔ نمرہ اور احمر بھی سوگوار سے بیٹھے تھے۔ بلکہ نمرہ تو وقفے وقفے سے اپنی آنکھوں کی نمی خشک کر رہی تھی۔ اس کی ہمت نہ ہوئی تھی کہ جا کے زینیہ کو دلہن بنا ہی دیکھ لیتی۔

"ہم اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر پائے......" وہ آزردہ تھی اور پھر نکاح سے کچھ دیر پہلے وہ واقعہ رونما ہو گیا جو صرف ٹی وی نیوز ہی میں دیکھنے کو ملتا تھا۔

دولہا یعنی کامران رضا کی دوسری بیوی اپنے بھائیوں بھابیوں اور ماں کے ساتھ وہاں آن پہنچی۔ ساتھ میں اس کے دو بچے کامران کی ہاں میں ہاں ملانے کے رنگ تو پید کے ہی تھے خود دولہا میاں کی شکل دیکھنے والی تھی۔ تو تکار گالی گلوچ...... غرضیکہ سب کو خوب ہی ڈراما دیکھنے کو ملا اور اس کے بعد سب عورتوں نے مل کے دولہا کی جو ٹھکائی کی وہ تو یاد رہنے والی تھی۔

تیسری شادی کی خواہش میں آنے والا دولہا اپنی دوسری بیوی اور اس کے گھر والوں سے مار کھا کر ان کے آگے لگ کے میرج ہال سے چلا گیا...... عافیہ بیگم ششدر تھیں تو شبیر احمد پر بھی بجلی گری تھی۔ ان کی عزت مٹی میں مل گئی تھی۔

عافیہ بیگم کا سارا غرور و طنطنہ خدا نے ایک ہی پل میں مٹی میں ملا دیا تھا۔ ان کی بساط الٹ گئی تھی۔ ان کو شرمات دینے والی ذات بہت طاقتور تھی۔

☼ ☼ ☼

فاریہ زرد پڑتی رنگت لیے گرتی پڑتی برائیڈل روم میں آئی وہ دلہن بنی زینیہ کو چھوڑ کر "دولہا" دیکھنے گئی

تھی۔ مگر اب واپس آ کر وہاں کے تھڈے، ٹھکے اور لاتوں کی تفصیل بتانے کی ہمت کہاں سے لاتی۔ زنیرہ کے آگے رو ہی تو پڑی۔

"دولہا بھاگ گیا ہے زینی!" اور زنیرہ نے اسے یوں دیکھا جیسے بات سمجھی نہ ہو۔

"کامران شادی شدہ نکلا..... بلکہ یہ تیسری شادی تھی۔ پہلی بیوی کو طلاق دے چکا ہے۔ دوسری بیوی اور اس کے گھر والے اسے مار پیٹ کے لے گئے ہیں۔" زنیرہ ساکت بیٹھی تھی۔

اس قدر ذلت..... باہر کی دنیا میں جو تماشا ہوا تھا وہ اسی کے نام کا تھا۔

"یا خدا..! کون سا گناہ؟ میرے ربّ۔ ایسی کڑی آزمائش۔" اس نے کرب سے آنکھیں موند لیں۔

فاریہ اسے خود سے لپٹا کر رونے لگی۔

اس کے ساتھ واقعی بہت برا ہو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس پورے ہال میں جب یہ تماشا ہوا تو فقط دو نفوس ایسے تھے جو پاؤں پسارے کرسیوں پر براجمان سینے پہ بازو لپیٹے بیٹھے تماشا دیکھتے رہے..... اسجد اور عاصم۔ باقی سب ہی گھر والے ہی افتاں و خیزاں معاملے کی تحقیق کے لیے بھاگے تھے۔

اور اب جبکہ شبیر احمد کا اونچا شملہ مٹی میں رُل رہا تھا تو انہیں سب سے پہلے گلے سے لگانے اور ان کی ہمت بندھانے والے چچا جان تھے۔

عافیہ بیگم تو شرم سے مرجانے کو تھیں۔ روئے چلی جا رہی تھیں۔ بیٹی کی بربادی کا خوب احساس ہو رہا تھا۔

"ایک بارات ہم بھی لائے ہیں شبیر احمد! کیا بیٹی کو ہمارے ساتھ رخصت نہ کرو گے؟"

دادی اماں کو تو یوں بھی اپنی سی کرنے کی عادت تھی' بڑے فخر اور مان کے ساتھ بیٹے سے کہا تو وہ ماں سے لپٹ کر رو دیے۔

عافیہ بیگم کا غرور منہ کے بل گرا تھا۔ کیا اس سارے تماشے کے دوران انہوں نے کئی رشتہ داروں کے ہونٹوں پر دھیمی مسکراہٹیں نہ دیکھی تھیں؟

وہ کیونکر نہ موم ہوتیں چچی جان کے سامنے بلکہ انہیں تو انہوں نے سینے سے لگا کر عزت دی۔

"جو تماشا ہو چکا اسے بھول جاؤ۔ جو گھر کی باتیں ہیں انہیں باہر نکلنے کا موقع مت دو۔ بڑے فخر کے ساتھ بچی کو رخصت کرو۔" دادی اماں نے نصیحت کی تو عافیہ بیگم کو پہلی بار ان کی نصیحت بری نہیں لگی۔

☼ ☼ ☼

وہ بدک اٹھی۔
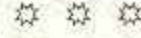
نکاح خواں اور گواہ اندر تشریف لے آئے تھے۔

"کون؟"

اور اسجد کا نام سن کر وہ ساکت رہ گئی۔ (تو قربانی کا بکرا...)

اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ ایجاب و قبول کے مراحل طے ہوئے' نکاح نامے پہ دستخط کیے اور اپنا آپ اسجد کے نام کر دیا..... مگر اس طرح سے۔

"مجھے معاف کر دینا زینی! میں بہت بری ماں ہوں بلکہ بری عورت کہو۔ تب ہی تو کسی بھی رشتے کو اچھے سے نہیں نباہ سکی۔"

رخصتی کے وقت عافیہ بیگم اسے گلے سے لگا کے معافی مانگتے ہوئے رو پڑیں تو اس کے بھی ضبط کا ہر بندھن ٹوٹ گیا۔

"اتنا اچھا فیصلہ ہو گیا' اس کا مطلب یہی ہے کہ خدا نے ہمیں معاف کر دیا ہے' تبھی تو کھائی میں گرنے سے بچا لیا۔"

شبیر احمد زندگی میں پہلی بار اتنے عاجز دکھائی دیے تھے۔

"خدا کا شکر ہے یار! دوسری پارٹی ٹائم پہ پہنچ گئی میں تو ڈر ہی رہا تھا۔"

عاصم اسجد کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔

"ابے سالے! میں تیرا بینڈ بجا دیتا اگر آج میرا بینڈ نہ بجتا تو۔" وہ زیر لب مسکرا رہا تھا۔

نمرہ خوش تھی' احمر شاد اور قاسم کی خوشی کا تو کوئی

ٹھکانہ ہی نہ تھا۔

یہ سب عاصم اور اسجد ہی کی انویسٹی گیشن اور پھر پلاننگ کا نتیجہ تھا۔ کامران کی دوسری بیوی اور گھر والوں کو ان ٹائم بلا کر سارا معاملہ ختم کرا دیا۔

وہ چاہتے تو ایک آدھ دن پہلے بھی کامران کی پول کھول سکتے تھے مگر امید واثق تھی کہ عافیہ بیگم' زنیرہ کے لیے کوئی اور رشتہ ڈھونڈنے نکل پڑتیں۔ کیونکہ چور چوری سے جاتا ہے ہیرا پھیری سے نہیں۔

مگر یوں ان ٹائم وہ جانتے تھے' اسجد ہی فرسٹ چوائس ہو گا اس لیے مجبوراً" کامران کی بیوی کو عین بارات والے دن کا ٹائم دینا پڑا۔ جس کا کلائمکس بہت خوب ہوا تھا۔

تین گھنٹوں کے مسلسل سفر کے بعد وہ لوگ پنڈی پہنچے تو رات کے تین بج رہے تھے..... نیند اور تھکاوٹ سے سب کا برا حال' مگر خوشی' ہر تکلیف پہ حاوی ہو رہی تھی۔

عاصم اور اس کی فیملی وہیں رہ گئے تھے اور گھر والوں کے ساتھ ہی اب ولیمے میں شرکت کے لیے آتے جو آرام و سکون کے ساتھ دو دن بعد منعقد کیا جانا طے پایا تھا۔

عافیہ بیگم نے کھلے دل اور کھلے بازوؤں کے ساتھ بیٹے' بہو اور پوتوں کا استقبال کیا تھا۔

اسجد کمرے میں داخل ہوا۔ ہینڈ لاک دبا کر پلٹا تو ٹھٹک سا گیا۔ وہ بیڈ کی بجائے کرسی پر براجمان تھی۔ اسے دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

سرخ زرتار لہنگے میں وہ بے حد حسین دلہن بنی تھی مگر سینے پہ بازو لپیٹے خفا اور ناراض۔

وہ مسکرایا۔ مگر ادھر وہی تیوری پہ بل۔

اسجد نے بازو وا کر دیے۔

مگر وہ کوئی فلم کی ہیروئن نہیں تھی کہ بھاگ کے سینے سے لگ جاتی اور دی اینڈ ہو جاتا۔

"یہ سب کیا ڈراما ہے؟"

وہ تلخی سے بولی تو گہری سانس بھر کے اسجد نے بازو نیچے کیے اور چند قدموں کا فاصلہ طے کر کے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"مجھے شک تھا کہ تم گولڈن نائٹ کو یونہی ضائع کرو گی مسز تکیر!"

"مجھے صرف سچ جاننا ہے۔" وہ بضد تھی۔

"سچ بتاؤں..... ؟ مجھے تمہارے ہونٹوں کا خم بہت اچھا لگتا ہے۔"

وہ سرگوشی میں کہتا اس کی طرف جھکا تو وہ برافروختہ سی پیچھے ہٹی۔ اسجد نے اس کی چوڑیوں بھری کلائی تھام لی۔

"یہ سب اللہ کی مرضی ہے زینی! تم میرے لیے اور میں تمہارے لیے تھا۔ پھر ہم کسی اور کا نصیب کیسے بن سکتے تھے..... ہوں؟" بڑی سہولت سے اسے بانہوں کے گھیرے میں لیتے ہوئے وہ نرمی سے بولا تو مارے تشکر کے زنیرہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

"میں نے سوچا گھر والوں نے آپ کو قربانی کا بکرا بنا ڈالا۔"

"شاباش! میں اسپیشل سوٹ بنوا کے اسی موقع کے لیے بن کے گیا تھا۔ مگر تمہیں میرے متعلق کبھی کوئی اچھا خیال آیا تھا جو اب آتا۔" وہ کراہا۔

"اور اگر وہ شادی شدہ نہ ہوتا تو پھر کیا ہوتا.....؟" وہ اس کی بانہوں کے گھیرے میں بھی پریشان تھی۔ اسجد نے اسے اپنے سامنے کیا۔

"شش۔" اس کے ہونٹوں پہ انگشت شہادت رکھی۔

"یہ خدا کے فیصلے ہیں زینی جان! اور وہ جو چاہتا ہے ویسے ہی ہو جاتا ہے۔ اگر تم میرا نصیب نہ ہوتیں تو میں کوئی بھی حربہ آزما لیتا ناکام ہی رہتا۔"

"تھینک گاڈ!" وہ بھیگتی آنکھوں سمیت ہنس دی تو اسجد نے دلچسپی سے دھوپ چھاؤں کا یہ منظر دیکھا۔

"ہاں۔ تھینکس ٹو گاڈ! اور اب تو.....؟"

اس نے شرارت سے کہتے ہوئے بازو کھولے تو وہ شرماتی لجاتی ہوئی اس کی پناہوں میں آ گئی۔

وہ خدا کی رضا میں راضی ہوئی تو خدا نے اپنی رضا کو اس کی رضا بنا ڈالا تھا۔ اس کی چاہتوں کے پھول راہ کی دھول بننے سے بچ گئے تھے۔

☼

نعیمہ ناز سلطان

بھاپ اڑاتا بلیک کافی کا مگ چند لمحے پہلے ہی بیوی میز پر رکھ کر گئی تھی۔ دسمبر کے آخیر سرد دن چل رہے تھے۔ کھلی ہوئی کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا پردے سے اٹکھیلیاں کرتا ہوا بلا اجازت اچانک ہی یوں کمرے میں داخل ہوا جیسے آج سے ٹھیک پندرہ برس پہلے مریم اس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی۔ خوب صورت اور طرحدار مریم۔

دسمبر کی ایک بھیگتی شام تھی جب اس نے مریم سے اظہار محبت کیا تھا۔ بالکنی میں کھڑے وہ دونوں برستی بوندوں کا نظارہ کر رہے تھے۔ ہوا میں ٹھنڈک بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں گھسائے اس نے بغور مریم کو دیکھا تھا۔ جس کی رنگت آج اور بھی گلابی لگ رہی تھی۔ بھیگتی گلابی شام نے اس کی رنگت اور آنکھوں کی لو اور بھی روشن اور چمکدار بنادی تھیں۔ سیدھی مانگ بنا کر اس نے اپنے بال سمیٹے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں گلاب کی وہ بھیگی کلی تھی جو عفان نے اسے کچھ دیر پہلے دی تھی۔ اپنی مومی انگلیوں میں اس کلی کو تھامے وہ بڑی محویت سے بارش کا نظارہ کر رہی تھی۔

"مریم! مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔" عفان اچانک ہی بولا تھا۔

"جانتی ہوں۔" مریم نے چند لمحوں بعد بڑے سکون سے جواب دیا تھا۔

"تم کیسے.... تمہیں کیسے معلوم؟" وہ حیران ہوتے ہوئے ہکلایا۔

"تمہاری آنکھوں سے بے وقوف!" مریم کھلکھلائی اور بارش کے جلترنگ اس کی ہنسی میں بجنے لگے۔

"میری آنکھوں میں کیا ہے؟" عفان نے واقعی بے وقوفوں کی طرح ہی اس سے سوال کیا تھا۔

"میری تصویر۔" مریم نے مسکراتے ہوئے اپنی ہتھیلی بالکنی کی گرل سے آگے کی اور اسے بارش کے قطروں سے بھرنے لگی۔

"پھر؟" اس نے امید بھری نگاہوں سے مریم کو دیکھا۔

"پھر یہ کہ اپنی تصویر ان آنکھوں میں سجی مجھے اچھی لگتی ہے۔ بدھو کہیں کے۔"

مریم نے شرارت سے ہتھیلیوں کے کٹورے میں جمع پانی اس کے چہرے پر پھینکا اور اپنی ہنسی کے جلترنگ بجاتی ہوئی بھاگ کھڑی ہوئی۔

"آپ نے ابھی تک کافی نہیں پی؟ ٹھنڈی ہو گئی۔" حنا مگ لینے اندر آئی تو حیرانی سے کہنے لگی۔

عفان چونک پڑا اور مگ اٹھالیا۔

"ابھی پی لیتا ہوں۔" اس نے ٹھنڈی ہو کر بد مزہ ہو جانے والی کافی کا گھونٹ بھرا۔

"لائیں' یہ مجھے دے دیں۔ میں گرم کافی لا دیتی ہوں۔" حنا نے ہمیشہ کی طرح ایک وفا شعار اور خیال رکھنے والی بیوی کا کردار ادا کرتے ہوئے اس کے ہاتھ سے مگ لے لیا۔

"یہ کھڑکی کیوں کھولی ہے۔ پورا کمرہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" سرد ہوا کا جھونکا آیا تو حنا جھرجھری لیتے ہوئے کھڑکی کی طرف بڑھ گئی۔ کھڑکی بند کر کے اس نے پردہ برابر کیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ مگر جاتے جاتے وہ عفان کے لیے یادوں کا ایک دریچہ ضرور کھول گئی تھی۔

عفان کے بڑے بھائی عثمان کی شادی تھی اور مریم تو جیسے گھر کی فرد ہی ہوئی تھی۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ لوگ اس گھر میں کرائے دار ہیں' ہر روز وہ اک نئے روپ میں جلوہ گر ہوتی اور عفان کے دل کا قرار لوٹ لے جاتی۔ ولیمہ والے دن بھی موتیا رنگ میں ملبوس' بالوں

اور کلائیوں میں پھول سجائے وہ موتیے کے پھول کی مانند ہی نرم و نازک سی مہک رہی تھی۔

ان دنوں دل کا عالم ہی کچھ اور تھا۔ دل تھا کہ کوئی پرندہ جو آسمان کی وسعتوں میں پرواز کر رہا تھا' اپنی ہی ترنگ میں اوپر ہی اوپر اڑتا چلا جا رہا تھا۔

آنکھیں تھیں کہ خوابوں کا ایک جہاں اپنے اندر آباد کیے ہر وقت جگمگ جگمگ کرتی رہتی تھیں۔ مریم کو دیکھنے کے اور بات کرنے کے وہ بہانے ڈھونڈتا تھا۔

ان دنوں ہر صبح بڑی خوب صورت اور ہر شام بے حد حسین لگتی تھی۔ بس ایک ہی مشغلہ تھا خواب دیکھنا اور ان خوابوں کو مریم کو سنانا' جنہیں اپنی خوب صورت مسکراہٹ کے ساتھ وہ بڑی محویت سے سنتی تھی۔

حنا کافی کا مگ دوبارہ لے آئی تھی۔ عفان کے خیالات کی رو ٹوٹ گئی۔

"اب ٹھنڈی مت کیجیے گا!" اس نے تنبیہہ کی۔

"ہوں!" عفان نے گرم گرم کافی کا مگ ہونٹوں سے لگایا۔

"یہ عورت بھی کیا مخلوق ہے؟" وہ سوچنے لگا۔

اپنی بیوی سے اس کے تعلقات بس سرسری ہی تھے۔ جیسے ٹرین کے ڈبے میں بیٹھے دو اجنبی مسافر جو راستے کی مسافت کو پاٹنے کے لیے اور وقت گزاری کے لیے ایک دوسرے سے وقتی دوستانہ قائم کر لیتے ہیں اور منزل آتے ہی الگ ہو جاتے ہیں۔ عفان کا رویہ بیوی کے ساتھ برا نہیں تھا مگر مثالی بھی نہیں تھا۔ اس کی طرف سے وہ محبت اور گرمجوشی مفقود تھی جو اس رشتے کی متقاضی تھی۔ بس یہ ہے کہ بیوی بچوں کی ضرورتیں وہ ساری پوری کرتا تھا اور شاید محبت بیوی کی ضرورت نہیں تھی جسے وہ پوری کرتا'

بے چاری حنا ہی ان ان دیکھے اور غیر محسوس فاصلوں اور سرد مہری کو پاٹنے کی کوششوں میں لگی رہتی۔ کبھی کبھی عفان کو خود پر ندامت بھی ہوتی ایک بے لوث اور بے غرض محبت پر اس عورت کا حق بنتا تھا جو اس کے تین بچوں کی ماں اور اس کی بیوی تھی بہترین ماں اور بہترین بیوی مگر وہ اس دل کا کیا کرتا جو اب بھی مریم کے لیے ہی دھڑکتا تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور دراز کھول کر ڈائری باہر نکالی۔

انہی محبت بھرے دنوں میں جب 31 دسمبر کی شب آئی۔ عفان کی نوکری نئی نئی لگی تھی اوپر سے رات کی ڈیوٹی' کوشش کے باوجود بھی وہ مریم کو نئے سال کی مبارک باد نہ دے سکا۔ صبح ڈیوٹی سے واپس آیا تب بھی مریم سے اکیلے ملنے کا موقع نہیں ملا دن میں وہ تھکا ہارا' سو گیا شام میں پھر ڈیوٹی۔ 2 جنوری کی صبح جیسے ہی وہ گیٹ سے اندر داخل ہوا سیڑھیوں کے پاس مریم اس کی منتظر تھی۔

"یہ تمہارے لیے ہے۔" مریم نے ایک گفٹ پیک اس کی طرف بڑھایا اور جلدی سے اندر چلی گئی۔

عفان سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر آیا اور سیدھا اپنے کمرے میں آگیا۔ امی ابھی سو رہی تھیں اور ابو اور بھائی جان ڈیوٹی پر جا چکے تھے۔

عفان نے پیکٹ کھولا' نئے سال کی ایک خوب صورت سی ڈائری۔

اس نے صفحہ کھولا پہلے صفحے پر لکھا تھا۔

"اداس کر گئی پھر سے جنوری اب کے۔"

آج اتنے سالوں بعد بھی وہ ان ہی لفظوں کے حصار میں تھا' اسی محبت بھرے شکوے نے اسے اپنے گھیرے میں لیا ہوا تھا جس کا اظہار مریم نے اس سے کیا تھا۔

عفان بنا پلک جھپکے ان ہی لفظوں کو پڑھ رہا تھا۔ دسمبر کے آخیر دنوں میں اس کی یادوں کی لو بہت تیز ہو جاتی تھی۔

"جانے وہ کہاں ہوگی' کیسی ہوگی' کس حال میں ہوگی؟" عفان تلخ کافی کے گھونٹ بھرتا رہا اور سوچتا رہا۔

اس کی سرتوڑ کوششوں کے باوجود بھی مریم سے اس کی شادی نہ ہو سکی' امی بالکل راضی نہیں تھیں۔

"پھپھو کی مجبوری ہے' اور خاندان بھی پتہ نہیں کیسا ہے۔ مجھے تو اچھے نہیں لگتے یہ لوگ' بس ٹھیک ہیں کرائے دار ہیں اس سے آگے رشتے داریاں بڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

امی نے عفان کی خواہش سن کر تبصرہ کیا تھا پھر بیٹے کی ضد سے مجبور ہو کر انہوں نے مریم کے لیے رشتہ دیا مگر وہاں سے انکار ہو گیا۔ وہ لوگ برادری سے باہر رشتہ نہیں کرتے تھے اور ویسے بھی مریم کا رشتہ اس کے خاندان میں ہی ہو رہا تھا۔ پھر چند دنوں میں ہی انہوں نے گھر بھی خالی کر دیا اور کہیں اور چلے گئے۔

عفان کی دنیا اندھیر ہو گئی تھی پہلی محبت کا نشہ اور اس کی ناکامی کا داغ بڑا گہرا ہوتا ہے۔ مہینوں لگے اس کو سنبھلتے سنبھلتے' مریم کو ڈھونڈنے اور پانے کی تمام تر کوششیں ناکام ہو گئیں اور اس کی زندگی میں حنا آگئی۔ زندگی میں تو آگئی مگر دل میں؟ دل میں تو وہی دشمن جاں بڑی شان سے براجمان تھی۔ بیتے ہوئے لمحوں کی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی اس کو اس طرح یاد تھیں جیسے کل ہی کی بات ہو۔ عفان نے جب پہلی بار اسے سرخ دہکتا گلاب دیا اور کہا کہ یہ محبت کی علامت ہے۔ اس وقت مریم کا چہرہ خود ایک کھلا گلاب بن گیا تھا۔ اس کے لرزتے ہونٹ اور اٹھتی گرتی پلکیں' کچھ گھبرایا کچھ شرمایا سا وجود سب کچھ آج بھی اس کے دل پر نقش تھا۔ آنکھ کے پردے پر اب بھی وہ منظر ویسا ہی تازہ تھا۔

"منیرہ خالہ کے گھر جانا ہے اگلے ہفتے۔" حنا نے کھڑے کھڑے اسے یاد دلایا۔

"ہاں!" عفان نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلایا۔

"کیا دینا ہے؟ میرا مطلب ہے کتنی رقم؟" حنا نے پوچھا۔ عفان کے خالہ زاد بھائی کی شادی تھی۔

"جو بھی دے دو یار' تمہاری مرضی۔" عفان ایک دم ہی کچھ بے زار سا ہو گیا' ایک تو دسمبر کی ان آخیر سرد راتوں میں درد کی چبھن میں کچھ اور اضافہ ہو جاتا مگر اس درد میں ایک میٹھی میٹھی سی کسک بھی تھی۔

"اچھا!" حنا نے ایک گہری سانس لی۔ وہ اتنے سالوں میں شوہر کے مزاج کے سبھی موسموں سے آشنا ہو گئی تھی' عفان کی خاموشی اور بے زاری محسوس کر کے وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

31 دسمبر کی رات ہمیشہ کی طرح تقریباً ساری دنیا میں ہی ہنگامہ خیز تھی۔ ایک دنیا نئے سال کی آمد کا جشن منا رہی تھی اور عفان آج کی رات یادوں کے چراغ جلائے بیٹھا تھا۔ ان چراغوں کی لو آج اور دنوں کی نسبت بہت بلند تھی کہ پرانے سال کی گزری ساعتیں اور آنے والے نئے سال کے یہی لمحات تھے جب مریم اس کی زندگی سے نکل کے اسے درد کے ایک نئے جہاں میں چھوڑ گئی تھی وہ ہر سال کی طرح اس سال کی اخیر رات میں بھی انہی لمحوں میں کھویا رہنا چاہتا تھا مگر اس دنیا میں رہتے ہوئے اپنی ایک الگ دنیا میں رہنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ عفان آج کے دن ہمیشہ کی طرح مریم کی محبت اور یادوں کا میلہ نہیں سجا سکتا تھا' آج منیرہ خالہ کے بیٹے کی بارات تھی اور کل نئے سال کے پہلے دن ولیمہ تھا' دونوں تقاریب میں عفان کی شرکت معہ اہل و عیال لازمی تھی۔

"ٹائی تو بڑی خوب صورت ہے۔" ریشمی چوڑیوں بھرا ریشم سا ہاتھ اس کی ٹائی کو تھامے ہوا تھا۔

"باندھنے والے بھی تو خوب صورت ہیں۔" عفان کے لبوں پہ شرارت چمکی۔

"دینے والے زیادہ خوب صورت ہیں۔" مریم کے انداز میں تفاخر تھا۔ یہ ٹائی اسی نے عفان کو گفٹ کی تھی۔

عفان کے پاس اور باقی چیزیں اور یادوں کی طرح یہ ٹائی بھی آج تک محفوظ تھی جب بھی وہ یہ ٹائی لگاتا' وہ کومل لمس اسے اپنے گھیرے میں لے لیتا' آج بھی یہ ٹائی استعمال کرتے ہوئے اسے شدت کے ساتھ مریم یاد آگئی تھی۔

شادی کی تقریب ویسی ہی تھی جیسی کہ عموماً یہ تقاریب ہوتی ہیں۔ رنگ' روشنی' خوشبو اور مسکراہٹیں۔ عفان بھی ایک بناوٹی مسکراہٹ کے ساتھ محفل میں شریک تھا' کم سے کم آج کی رات تو وہ اپنی اور مریم کی یادوں کے ساتھ اکیلا ہی رہنا چاہتا تھا مگر اس وقت تو دنیا داری نبھانی تھی' وہ یونہی بے مقصد کھڑا تھا جب کسی کی مدھم ہنسی سن کر اسے بے اختیار(؟)

مریم یاد آگئی۔ کھلتے شگوفے جیسی مہکتی، خوشبودار ہنسی اب تک اس کے کانوں میں رس گھولتی تھی۔

"کاش وہ مجھے مل جاتی۔" ایک حسرت بھری آہ دل کی گہرائیوں سے نکلی تھی اور شاید وقت قبولیت تھا کہ قریب سے گزرتے ایک چہرے میں اسے مریم کی بے پناہ شباہت محسوس ہوئی اور خود کو روکتے روکتے بھی اس کے لبوں سے بے اختیار وہی نام نکلا۔

"مریم!"

گزرنے والی ہستی اک دم چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"تم، آ، آپ مریم ہیں نا؟" عفان کی زبان لڑکھڑا گئی۔

"جی ہاں مگر آپ ۔۔۔؟" وہ شناسا چہرہ تذبذب کا شکار نظر آیا۔

مریم سراپا سوال تھی اور عفان مجسم حیرت۔

"مجھے پہچانا نہیں؟" اس کے لہجے میں سوال نہیں دکھ اور بے یقینی تھی۔

"میں عفان ہوں۔" مریم کی اجنبیت بھری خاموشی پر وہ تڑپ کر بولا تھا۔

"عفان!" مریم نے اس کا نام دہرایا۔

"آپ شاید ہمارے کوئی سے مالک مکان رہے ہوں گے۔ دراصل ہم نے کرائے کے مکانوں میں ہی عمر گزاری ہے، بہت عرصے بعد کوئی ملنے والا اک دم سے ذہن میں نہیں آتا۔" مریم بے حد تکلف سے بول رہی تھی اور عفان بے حد تکلیف سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"اچھا، میں چلوں، دراصل میں اپنے بیٹے کے لیے پانی لینے آئی تھی۔" وہ اسی طرح اجنبیت چہرے پر سجائے آگے بڑھ گئی۔

نہ جی بھر کے دیکھا نہ کچھ بات کی
بڑی آرزو تھی ملاقات کی

"مجھے اس ملاقات کی اتنی خواہش کیوں تھی، میں کیا کہنا چاہتا تھا کیا سننا چاہتا تھا؟"

عفان وہیں کھڑے کھڑے حیرت سے سوچ رہا تھا۔

"کیا پچھلے پندرہ برسوں سے میں واقعی محبت کا شکار تھا یا وہ سب میرے وہم و گمان تھے۔" وہ اپنے خوابوں کے قلعے کو بڑی بے بسی کے ساتھ مسمار ہوتا دیکھ رہا تھا۔

"تو تم نے کیا سوچا تھا؟ مریم کبھی زندگی میں ملی تو ان یادوں اور محبت کا اعادہ کرے گی جو کرب اور بے چینیاں تمہاری زندگی کا حصہ رہیں انہیں خود اپنے حوالے سے بھی بیان کرے گی؟"

اس کے اندر سے کوئی چپکے سے بولا اور پہلی بار اس آواز کے جواب میں اس کا دل خاموش رہا۔

عمر کا ایک خوب صورت اور طویل حصہ اس نے ایک سراب کے پیچھے بھاگنے میں ضائع کر دیا تھا۔

"کیا تلافی کی کوئی صورت ہے؟" حسرت زدہ دل پشیمانی سے کہہ رہا تھا۔

"آپ کھانا نہیں کھا رہے؟" وہ ارد گرد سے بے خبر اپنی سوچوں میں الجھا ہوا تھا جب اس کی بیوی قریب آ کر اس سے مخاطب ہوئی۔

اور شام ڈھلے ہی سہی بھٹکا ہوا مسافر گھر پہنچ جائے تو اس کی طمانیت اور مکینوں کی خوشی کا اندازہ کون لگا سکتا ہے۔

"آپ بیٹھ جائیں میں آپ کے لیے کھانا لاتی ہوں۔"

حنا ہمیشہ سے ہی اس کا بے حد خیال رکھتی تھی۔ عفان اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا جو اس کے دل کے قریب آ رہی تھی اور دل کے پچھلے مکین نے اپنا اسباب سمیٹ کر گھر خالی کرنے کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ آخر وہ اس گھر کی مستقل مکین تو تھی نہیں بلکہ کرائے دار ہی تھی۔

سعدیہ عزیز آفریدی

محبت سورج کی پہلی کرن

مکمل ناول

ہر شخص یہی سمجھتا ہے اگر زندگی کو کوئی چیز یکسر بدل سکتی ہے تو وہ زندگی ہے کیونکہ زندگی ہر لمحہ ارتقاء پذیر رہتی ہے مگر جب ہم زندگی جینا شروع کرتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے موت بھی ایک چیز ہے جو زندگی کو سب سے زیادہ بدل سکتی ہے اتنی تیزی سے اور اتنے حتمی انداز میں کہ انسان چاہ کر بھی پہلے جیسا نہیں ہو سکتا اور پھر کچھ اور وقت گزرتا ہے تو اس کے دل پر الہام اترتا ہے کہ زندگی کا ایک تیسرا پہلو بھی ہے اور وہ ہے عالم برزخ، جس میں انسان اٹک جائے تو نہ جینے والوں کے ساتھ ہوتا ہے نہ مرنے والوں کے ساتھ مگر یہ عالم برزخ کی کیفیت بھی زندگی کو ہر کونے سے بدل ڈالتی ہے اور زندگی کا یہ دائرہ کہیں سے بھی کہیں تک نکلنے نہیں دیتا۔

اس لمحے اسے بھی ایسا لگ رہا تھا وہ عالم برزخ میں لٹکا دی گئی ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی تو اس نے اپنے دل کے اندر اسے ایک جذبہ کھوج نکالا تھا اور بہت سارے خواب دیکھے تھے اور ابھی اچانک سارے خواب جیسے کسی زلزلے نے ہلا کر رکھ دیے تھے زندگی جب ہاتھوں سے سرک رہی ہو تو پتا چلتا ہے کیا کیا کچھ ہے، جو ہم چھوڑے جا رہے ہیں۔ کسی کی باتیں گلابی شامیں، خواب بھری آنکھیں اور کسی کے ساتھ گزارے جانے والے لمحوں کی حسرت مگر زندگی کو ان ساری باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

"میرا دل چاہتا ہے میں تمہارے ساتھ بہت سارا

وقت گزاروں۔۔۔" یہ جملہ کل ہی تو مونس شہباز نے اس کی سماعتوں میں انڈیلا تھا اور آج اتنا اچانک۔

"میرے مولا رحم رحم۔۔۔" اس نے آنکھیں خوف سے بند کر کے کھولی تھیں اور اپنے کپکپاتے وجود کو اس منظر میں پھر سے شامل کیا تھا۔

"مام! مجھے برین ٹیومر ہے۔" پانچ فٹ گیارہ انچ کا متناسب وجود' بڑی بڑی گہری آنکھیں' متناسب ہونٹ اور ان پر ہلکی ہلکی مونچھیں۔ یہ سچ جھوٹ جیسا تھا اور اس نے سو بار سوچا تھا وہ جھوٹ بول رہا ہے بھلا اتنے ایکٹو بندے کو ایسی بیماری کیسے ہو سکتی ہے' یہ شخص جسے میں نے اس اجنبی ماحول میں چپکے چپکے اپنائیت سے زندگی ایک بار پھر سے جینا سکھائی تھی' وہ خود کیسے زندگی سے دور جانے کے قصے گھڑ رہا تھا۔

"ماما! آپ نے سنا۔ مجھے کیا بیماری ہے۔" سامیہ حسام الدین دھڑکتے دل کے ساتھ ایپرن سے ہاتھ صاف کرتی اس گھر کے کچن سے باہر آگئی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی سرد مزاج سی اس کی ممانی کا اس خبر پر کیا ردعمل ہو سکتا تھا اور اس کی ممانی اسی محویت سے چینل دیکھ رہی تھیں وہ ان کے اور ٹی وی کے درمیان آگیا تھا۔

"تین دن بعد میرا آپریشن ہے۔ ڈاکٹرز کا خیال ہے میرے زندہ رہنے کا صرف دس فیصد چانس ہے۔" ممانی زینب نے پہلی بار نظریں اٹھا کر دیکھا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے ان کے چہرے کا رنگ اڑا تھا۔

"تمہیں ایسا کیا لگا کہ تم میرے لیے زندہ بھی ہو۔" ایسا جملہ' مونس شہباز کا رنگ یک دم سے پیلا پڑ گیا تھا۔

"مام! آپ کو مجھ سے محبت کیوں نہیں ہوتی۔؟" سامیہ حسام الدین سرک کر اس کے قریب آگئی تھی اسے لگ رہا تھا وہ اس وقت بالکل اکیلا پڑ گیا ہے اور ممانی نے ٹی وی بند کر کے اسے دیکھ کر کہا تھا۔

"اس سوال کا تم مجھ سے بہتر جواب دے سکتے ہو کہ مجھے تم سے محبت کیوں نہیں ہو سکی۔"

"میں نہیں جان سکا مام! میں نے تو ہمیشہ ہر چیز سے آپ کو اوّلیت دی ہے جو آپ چاہتی تھیں میں نے ہمیشہ وہی کیا پھر کیوں نہیں ہوا دل آپ کا میرے حق میں۔"

"میں ظفر کی موت کبھی نہیں بھول سکتی۔"

"وہ صرف حادثہ تھا مام!" وہ بے قراری سے ممانی زینب کے قریب ہو گیا۔

"وہ حادثہ نہیں تمہاری بے وقوفی تھی اور تمہاری بے وقوفی کی سزا ہماری ساری زندگی پر محیط ہو گئی ہے' میرے سارے خواب بکھر کر رہ گئے۔"

"مام۔۔۔۔۔" وہ شخص بے قراری سے ممانی زینب کو تک رہا تھا۔

"تم مجھے مت ستاؤ اور جاؤ اپنے دوستوں کے پاس جو تمہیں ہر چیز سے زیادہ عزیز ہیں۔"

وہ جو صوفے کے پاس بے چارگی سے بیٹھا تھا یک دم کھڑا ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ کمرے میں کھڑی تھی اور وہ اپنے سر درد کی وجہ سے بے حال بیڈ پر بیٹھا تھا۔

"یہ سب کیسے ہوا؟"

"جب انسان زندگی کے میدان میں اترتا ہے تو صرف رشتے اور محبت ہی اس کا حوصلہ اور ہمت ہوتے ہیں مگر یہ میرے پاس کبھی نہیں تھے میں اپنے وجود کی جنگ اتنے برس تک لڑ سکا یہ ہی بہت تھا سامیہ۔"

"آپ کو ایسا کیوں لگتا ہے آپ ہار گئے ہیں۔"

اس نے پورے چار سال چھ ماہ بعد اس شخص کے کندھے پر ہاتھ دھرا تھا۔

اور اس نے پلٹ کر اسے دیکھا تھا "پلیز سامیہ! ایسا مت کرو میں اکیلا جانا چاہتا ہوں مجھے اپنی یادیں دے کر درماندہ مت کرو۔"

"سامیہ حسام الدین' مونس شہباز کو دیکھتی رہ گئی تھی' اس نے تو صرف احساس دوستی سے اسے پکارا تھا اس کے لہجے میں یہ محبت کہاں سے لپٹ آئی تھی' یہ محبت جسے وہ گہرے پاتال میں دھکیل آئی تھی اور اسے لگتا تھا اگر زندگی میں پھر کبھی کسی نے پوچھا "محبت کیا ہے" تو شاید وہ صرف خاموشی کے سوا کچھ نہ کہہ سکے گی مگر یہ محبت اس کی پوروں سے برقی لہر بن کر اس کے وجود میں کیوں سرائیت کر رہی تھی۔

کیا واقعی وہ اس سے محبت کرنے لگی تھی؟

"آپ کی دوا کہاں ہے؟" وہ اس کے بیڈ کی سائیڈ درازوں میں اس کی دوا ڈھونڈ رہی تھی۔

"یہ ٹیبلٹس بہت ہائی پوٹینسی کے ہیں۔ ایک گلاس دودھ لادو گی؟" اس نے اپنے کمرے کی الماری سے اپنی دوائیں نکالی تھیں اور وہ آندھی طوفان کی طرح کچن میں جا کر دودھ گرم کرنے لگی تھی۔ مگر دودھ کھولانے کے بعد ٹھنڈا کرنا کارِ دشوار تھا اسے وہ دن یاد آ گئے تھے جب بھابھی جی چھ ماہ کے بچے کو چھوڑ کر جاب پر جانے لگی تھیں اور اس بچے کو سنبھالنے کے لیے وہ اسی طرح دودھ کو گرم کر کے ٹھنڈا کرتی تھی' وہ ایک کپ سے گرم دودھ اوچھالی سے دوسرے کپ میں ڈال رہی تھی۔

"سامیہ۔" اس کی کراہتی آواز پر دودھ دوسرے کپ میں ڈالتے ہوئے اس کا ہاتھ بہک گیا تھا' ہاتھ کی اوپری جلد سرخ ہو گئی تھی اس نے پروا کیے بغیر دودھ کپ میں ڈالا تھا اور تیزی سے اس کے کمرے میں پہنچی تھی۔

وہ اب لیٹا ہوا تھا اس نے کپ کی گرمائش سے اندازہ کیا۔ دودھ اب بھی گرم تھا۔

"آپ اسے پی لیں گے۔؟" مونس نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا تھا۔

بے وقت اٹھا تھا پھر ٹیبلٹ اسی دودھ سے نگلی تھیں۔

"سوری! میں نے بہت کوشش کی مگر اتنی جلدی ٹھنڈا نہیں کر پائی اسے۔"

وہ ہلکا سا مسکرایا تھا۔ "کمال ہے سامیہ! مجھے لوگ اسکیوزز نہیں دیتے۔ نظر انداز کرنے کے لیے' بے عزت کرنے کے لیے اور آپ صرف دودھ ٹھنڈا نہ کر پانے پر معذرت کرنے بیٹھ گئیں۔ ادھر دیکھیے میری ساری روح آبلہ در آبلہ ہے۔ میں زندگی کو فیس کر رہا ہوں نا تو یہ ہلکی سی جلن گرمائش میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔"

"آپ کو یہ کس بے وقوف نے کہا کہ آپ کو یہ بیماری ہے۔" اس نے جان کر نام نہیں لیا' ساری بیماری کی سنگینی جیسے خود پینے کی کوشش کی اور وہ ہنس پڑا۔

"کیا اسے پتا ہے' وہ قہقہہ لگا کر ہنستے ہوئے، بہت اچھا لگتا ہے۔"

اس نے سوچا اور وہ کراہ کر پھر سے تکیے پر سر ڈال کر لیٹ گیا تھا۔

"جو چیز استعمال نہیں ہو گی اسے فنگس تو لگے گا نا بقول پاپا کے مجھے زندگی گزارنے کی سمجھ نہیں میں ہمیشہ اپ ڈیٹ قسم کی فیلنگز کی بات کرتا ہوں مجھے دونوں ہاتھوں سے زندگی کمانی نہیں آتی تو اچھا ہے میرے ساتھ جو ہوا سو ہونا ہی چاہیے تھا۔"

"آپ اتنا فضول کیسے سوچ لیتے ہیں۔؟"

اس کے ہونٹ ہلکا سا مسکرائے تھے "دیکھ لیجیے آپ کو بھی ایک شکایت ہو ہی گئی مجھ سے۔"

"یہ شکایت نہیں بہت معصوم سا دفاع ہے آپ کی ذات کے لیے میرا۔"

"یہ آپ کو میری ذات کیوں یاد آ گئی چار سال چھ ماہ میں شاید پہلی بار اتنی بے تکلفی سے ہم بات کر رہے ہیں۔"

"وہ بس ویسے ہی۔" اس نے سر جھکایا تھا۔

اور مونس شہباز نے دھیرے سے کہا تھا۔

"آپ کو لگتا ہو گا۔ اسے اس کے گھر والے منہ نہیں لگاتے تو آپ کو کیا ضرورت ہے توجہ صرف کرنے کی' شاید میں ٹھیک طرح سے آپ کی جگہ بھی تو نہیں بنا سکا یہاں۔" برملا شکوہ تھا اور شاید مونس شہباز نے پہلی بار کسی سے شکوہ کیا تھا اتنا اپنا بن کر۔

"کیا واقعی آپ کو لگا میں نے آپ کو قابل توجہ نہیں جانا۔" اس نے پتا نہیں کیوں جواب شکوہ کیا اتنے دنوں کا ابال وہ سمیٹ نہیں پائی تھی۔ اس خبر کے آگے اور مونس اس کی کیفیت پر مسکرانے لگا تھا۔

"چلیں میری بیماری کسی کام تو آئی۔ آپ کے شکوے گلے اور مجھ سے ناراضی ختم تو ہوئی' مجھے بھی احساس ہوا کہ کوئی تو مجھ پہ دل سے روئے گا۔"

"آپ فضول نہ بولیں۔ کچھ نہیں ہوا آپ کو' سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ہاں شاید واقعی سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ تکیے پر سر ڈال کر لیٹ گیا تھا۔

اور سامیہ حسام الدین نے اسے پھر متوجہ کیا تھا۔

"کیا واقعی آپ کو لگا مجھے آپ کی پروا نہیں ہے؟"

وہ مسکرانے لگا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا اس کے گھر کی ہر چیز اگر ترتیب میں تھی تو وہ اسی لڑکی کے مرہون منت تھی۔ اس دیار غیر میں اگر کوئی تھا' جو اس کا اس گھر کے کسی نہ کسی کونے میں انتظار کرتا رہتا تھا تو وہ یہ لڑکی ہی تو تھی سامیہ حسام الدین جو دیکھنے میں کہیں سے قابل توجہ نہیں لگتی تھی اور وہ چیز تھی بھی کہاں وہ تو ایک بہت خاص انسان تھی ـــ جسے اس کے دل نے پہلی بار دیکھ کر ہی اپنا مان لیا تھا۔

"آپ سو جائیں میں اب ٹھیک ہوں سامیہ! درد میں کافی کمی ہے۔"

"آپ واقعی ٹھیک ہیں نا۔" وہ ہراساں ہو گئی تھی۔

"جی میں واقعی ٹھیک ہوں۔ آپ سو جائیں ملتے ہیں نا انشاء اللہ!" سامیہ اٹھ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

سامیہ حسام الدین کے پہلے قدم اور پہلی آمد اور اپنی زندگی میں یاد آ کر رہ گئی تھی' جب یہ لڑکی اس کے پاپا کے ساتھ کھڑی تھی اور اس کی امی اپنی دیورانی سے چلا چلا کر بات کر رہی تھیں۔

"عجیب لوگ ہیں تمہیں' تین بھائیوں کے ہوتے ہوئے ایک بہن نہیں سنبھال سکتے۔ اماں جی کیا مریں ہمارے لیے تو زندگی ہی عذاب کر دی ہے' اب کسی لڑکی کی ذمہ داری لینا آسان ہے کیا' پردیس میں لڑکی اگر آنکھیں چار کر لے' ہمارے کہنے سننے میں نہ رہے تو ہم تو مفت میں بدنام ہو جائیں گے نا صفیہ! یہ غریب رشتہ دار بھی بس جان کا عذاب ہوتے ہیں کاش ہم بھی گوروں کی طرح اپنے رشتوں سے مکر سکتے مگر بہن مشکل یہ ہے کہ ہمارا خون چاہ کر بھی سفید نہیں ہو سکتا اللہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم بھی تو قرابت داری نبھانا سکھاتا ہے۔"

اور اس کی آنکھیں کیسے ندی کی باڑ توڑ کر بہنے کو بے تاب ہو اٹھی تھیں۔

اس دن وہ گھر میں تھا آج یونیورسٹی سے چھٹی کی تھی۔

"یہ سامیہ حسام الدین ہیں آپ کی کزن۔"

"مونس شہباز کو پتا تھا یا یہ اطلاع اسے نہیں ملی تھی' ارم اور ساری توجہ کے مرکز عمر شہباز کو دے رہے تھے' مگر اس نے یہ اطلاع پہلے سے نوٹ کر لی تھی اور آج یہ لڑکی اس طرح اس کے سامنے' بہت ان کے جذبوں کو بست آن کے انداز میں سمیٹے بیٹھی تھی۔

"مجھے وہ دن نہیں بھولتا' جب تم یہاں آئی تھیں۔"

اس نے سوچنے کی اداکاری کی حالانکہ اسے وہ دن آج بھی پورے سیاق و سباق سے یاد تھا۔ گلابی رنگ کے سوٹ میں اس کا رنگ گہرا لگ رہا تھا۔ یہ دادی کی پسند تھی اور یہاں آنے کے لیے یہی واحد سوٹ نیا سلا ہوا تھا سو اس نے نہا کر پہن لیا تھا مگر یہاں گلابی گلابی رنگتیں اسے خوامخواہ کنفیوز کر رہی تھیں۔

وہ سانولی سلونی تھی مگر یہاں وہ کالی لگ رہی تھی اس نے ڈرتے ڈرتے ارم سے ہاتھ ملایا۔ اس کی مخملیں جلد نے اس کے ہاتھ کی سنولاہٹ پر مسکراہٹ اچھالی ایسا لگا تھا اسے' ورنہ سامنے کھڑی لڑکی کے چہرے پر نہ بےزاری تھی' نہ گرم جوشی وہ صرف اپنے پاپا کی وجہ سے اس محبت پریڈ میں شامل کھڑی تھی' ممانی زینب کی صفیہ مامی سے کی جانے والی باتوں کو غور سے سن کر اپنے وجود کا اہمیت کا اندازہ ہو گیا تھا سامیہ حسام الدین کو۔

"مجھوس۔" وہ صوفے پر بیٹھی تھی جب ایک مسکراتے چہرے نے دل سے اس کو روحانی طور پر گلے لگایا' اس کے چہرے کی مسکراہٹ بہت جان دار تھی بہت دوستانہ سی۔

"آج آپ گھر میں کیسے پائے جاتے ہیں۔" کالج بوائے عمر شہباز نے طنز کیا۔

اور وہ مسکرایا۔

"جہاں اچھے اور خوبصورت لوگوں کے ملنے کا موقع ہو میں اپنی مصروفیت میں سے وقت نکال ہی لیتا ہوں کل ذکر سنا تھا کہ کوئی جھونکا بہار کا آنے والا ہے میں نے سوچا ہم بھی تو ملیں پاکستان کی اس دلاری سامیہ حسام الدین سے۔"

وہ اس وقت تینوں ہی تھے اس لیے وہ کھل کر بول رہا تھا اور سامیہ حسام الدین خاموشی سے اس کے ہونٹوں کی جنبش کو دیکھ رہی تھی۔

"آپ بالکل بڑے بھیا کی طرح بولتے ہیں۔"

عمر شہباز اور ارم ہنسنے لگے اور مونس شہباز جھینپ گیا۔

"آپ نے تو بھیا کا پروگرام ہی سبوتاژ کر دیا۔"

"مطلب عمر بھائی۔" وہ کسمسائی اور وہ مسکرانے لگا۔

"بکواس کرتا ہے یونہی آپ ساتھ رہیں گی تو آپ کو پتا چلے گا کہ اس گھر میں اگر کوئی بے کار کی باتیں نان اسٹاپ گھڑ سکتا ہے جھوٹ کی طرح تو وہ ہمارا عمر شہباز ہے۔"

"پلیز مونس بھائی۔" عمر شہباز نے آنکھیں دکھائیں اور وہ سہمنے کی اداکاری کرنے لگا۔ اسے یک دم لگا وہ اپنے ماضی میں چلی گئی ہے۔

وہ بڑے بھیا اور عاصمہ ایسے ہی تو باتوں کے چرخے گھماتے تھے کہ کبھی کبھی رات سے صبح کر جاتے تھے۔

"آپ گونگی ہیں یا چپ کا روزہ رکھا ہے۔" مونس نے ہنس کر کہا اور تب وہ مسکرائی تھی۔

"میں بہت کم بولتی ہوں۔ ہاں آپ مجھے ایک اچھا سامع سمجھ سکتے ہیں۔"

"پھر میرے لیے ایک اچھی خبر ہے۔ مجھے بولنے کا بہت شوق ہے۔" وہ قریب آ بیٹھا تھا' وہ سکڑی سمٹی بیٹھی تھی مگر اس کا دوستانہ رویہ اسے تسلی دے رہا تھا۔

"ماموں جان کہاں گئے ہیں۔" بہت ہلکی نم آواز بر آمد ہوئی حلق سے پتا نہیں اسے بار بار رونا کیوں آ رہا تھا۔

مونس اسے دیکھے جا رہا تھا۔ عمر اور ارم جا چکے تھے وہ قطعی مونس کے رحم و کرم پر تھی۔

"آپ اتنا کیوں گھبرا رہی ہیں سامیہ! میں کوئی شیطان نہیں ہوں۔"

"مگر ماموں۔" وہ بس اتنا کہہ سکی' تب مونس شہباز نے اس کا سامان اٹھایا تھا "یہ آپ کے ماموں کا گھر

ہے یہاں آپ کو رہنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا میرا۔" وہ اٹھی بھی مگر زینب ممانی کے تیور دیکھ کر وہ پھر سے ڈر گئی تھی۔

"اگر میرے اختیار میں ہو تو میں کبھی بھی تمہیں یہاں رہنے کا حق نہ دوں ہر لمحے ایک اذیت ہوتی ہے مجھے، تمہیں دیکھ کر میرا دل چاہتا ہے میں تمہارا ہاتھ پکڑوں اور ہر رشتے ہر محبت سے آزاد کر دوں۔"

مونس شہباز مسکرایا تھا پھر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا تھا۔

"اور میں چاہتا ہوں میں ہمیشہ اس محبت پلس اذیت میں قید رہوں۔ میں آپ سے دور نہیں رہنا چاہتا ماما!"

"اور مجھے تمہارے ساتھ رہنا دشوار لگتا ہے۔" انہوں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔

"چلیں، ناپسندیدہ ہی سہی میرے لیے یہی کافی ہے کہ میری ذات آپ کے لیے آپ کی ذات میرے لیے ضروری ہے، تھی اور رہے گی۔"

وہ زرد چہرے سے ماں بیٹے کی اس گفتگو کو دیکھ رہی تھی تب اس نے مڑ کے کہا تھا۔

"سامیہ چلیے میں آپ کو آپ کا کمرہ دکھا دوں۔"

"یہ کوئی گیسٹ ہاؤس نہیں ہے کہ میں اسے الگ کمرہ دوں۔" اس کے ہاتھ ٹھنڈے پڑ گئے تھے اور مونس کا چہرہ پھیکا۔

"ماما! میں اپنا کمرہ انہیں دے دوں گا۔ سارا دن تو میں باہر رہتا ہوں، سونا ہو گا تو کہیں بھی لیٹ کر سو جاؤں گا میرے نخرے نہیں ہیں۔"

"تو اس کے نخرے بہت ہیں، کبھی اپنے گھر میں بھی الگ کمرے میں سوئی ہے یہ، مجھے اتنے مزاج پسند نہیں۔"

"میں نے تو کچھ نہیں کہا ممانی! آپ جہاں کہیں گی، میں وہاں رہ لوں گی۔" میری آواز نے اس کے زندہ ہونے کا پتا دیا، ورنہ مونس نے کوئی دل تھا جو اندر مرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ اس کا پوری طرح ساتھ دینا چاہتا تھا مگر وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی وجہ سے ماں بیٹے میں کوئی جنگ چھڑ جائے۔ "وہاں انیکسی میں گل کے ساتھ رہ لو۔"

"ماما، گل شادی شدہ ہے۔" وہ حیران ہو گیا تھا اس فیصلے پر، لیکن زینب ممانی دو ٹوک لہجے میں بولی تھیں "انیکسی میں چار کمرے ہیں دو گل کے پاس ہے۔ وہ خالی ہی پڑے رہتے ہیں۔ یہ ان میں سے کسی ایک کمرے میں شفٹ ہونا چاہے تو ہو سکتی ہے باقی اس کی مرضی ہے صرف شہباز ہی اس کے اکیلے ماموں نہیں ہیں۔" اس جملے پر اس کی روح فنا ہونے لگی تھی باقی دونوں ممانیاں زینب ممانی سے کہیں زیادہ جلاد تھیں ایک کو تو وہ پاکستان میں چھوڑ کر آ گئی تھی اور ایک یہاں ہی رہتی تھیں ممانیاں اذیت پسند، ذلیل کرنے میں ماہر۔

وہ اپنا سوٹ کیس گھسیٹتی ہوئی پارک سے گزر کر انیکسی کے سامنے کھڑی تھی۔

سامنے کھڑی عورت اسے کینہ توز نظروں سے دیکھ رہی تھی "تمہارا پاکستان میں کوئی نہیں تھا کہ جو یہاں چلی آئی ہو۔" اسے عجیب سے لگا تھا وہ ملازم ہو کر اس سے مالک کے لہجے میں بول رہی تھی بند دروازے کے تالے کو اس نے ناپسندیدگی سے کھولا تھا۔ "جب سے تمہارے آنے کا مالکن نے سنا ہے تب سے زرد کر رہی ہیں، میں بھی سوچتی تھی۔ ایسی کون لڑکی ہے جسے بیگم صاحب اتنا ناپسند کرتی ہیں کہ سمندر میں پھینک دینے کی بات کرتی ہیں تم اتنی بری تو نہیں ہو۔"

"تو کیا تمہیں اچھی لگ رہی ہوں۔" وہ بے حس بن کر ان سارے جملوں کی تلخی کو پی گئی اور وہ غور سے اسے دیکھنے لگی پھر نرمی سے بولی۔

"دیکھنے سے تو بہت اچھی لگتی ہو۔ باقی کوئی کسی کے اندر تو نہیں اتر سکتا۔"

"واقعی کسی کے اندر بہت اترنا بھی نہیں چاہیے کبھی کبھی چھوٹی چھوٹی باتیں بہت بڑی بڑی تکلیفیں بن جایا کرتی ہیں۔"

وہ کم فہمی سے کندھے اچکا کر کمرے کی چیزوں پر ڈھکی چادریں اتارتے اسے دیکھنے لگی۔ "تمہاری کوئی مدد کروں؟"

وہ مڑی پھر مسکرا کر بولی "میں اس وقت تمہارے ساتھ تمہارے برابر کھڑی ہوں، تمہیں یہاں ملازمت کرتے سات برس ہو گئے ہیں اور میں آج ہی کی رنگروٹ بھرتی ہوئی ہوں مجھے تم سے ہی سیکھنا ہے ملازم مالک کبھی نہیں ہوتا گل!"

"آپ بہت سمجھ دار لگتی ہیں۔" سامیہ حسام الدین ہنس پڑی تھی، پتا نہیں خود پر یا زندگی پر پھر دھیمے لہجے میں بولی تھی۔

"کوئی سمجھ دار نہیں ہوتا، زندگی خود سکھا دیتی ہے اور جسے زندگی سکھاتی ہے، بہت سفاکی سے سکھاتی ہے وہ ساری عمر نہیں بھولتا۔"

"جی صحیح کہا آپ نے۔" وہ "تو" والے تیور لے کر کھڑی تھی اور یک دم سے "آپ" کے باعزت خطاب سے نواز رہی تھی مگر وہ ان باتوں پر زیادہ تر دھیان نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس لیے خاموشی سے اس کمرے کو سمیٹ رہی تھی مگر وہ بتا رہی تھی فرنیچر سے اپنی مرضی سے چیزوں کی ترتیب بدل رہی تھی یہاں تک کہ کمرے کی گرد جھاڑتی تو وہ خود بھی گرد گرد تھی اور اسی وقت گل اس کے لیے ٹرے میں کھانا لے کر آ گئی تھی مگر یہ وہ کھانا نہیں تھا جس کی مہک انیکسی کے کچن میں پھیلی ہوئی تھی۔

"زینب ممانی نے بھیجا ہے۔" وہ بیسن پر ہاتھ منہ دھوتے ہوئے بولی پھر الگنی سے تولیہ اتار رہی تھی کہ اس کی خاموشی پر پلٹ کر دیکھا۔

"آپ نے کچھ بولا نہیں گل۔؟"

وہ اس کی خاموشی کو معنی پہنانے لگی تھی، تب اچانک مونس شہباز کمرے میں داخل ہوا تھا اور اسے پتا چلا تھا یہ صرف مونس شہباز کا جذبہ خیر سگالی تھا ورنہ زینب ممانی کے لیے اس کی اہمیت ملازمہ کے برابر یا شاید اس سے کئی درجے کم تھی کیونکہ گل کے پاس ان کے گھر میں نوکری کرنے کا سات سالہ تجربہ تھا جب کہ وہ آج ہی آئی تھی۔

"گل! یہ آپ کھا لیں مجھے سی فوڈ کی عادت نہیں۔ آپ نے جو دال بنائی ہے۔ وہ لا دیں پلیز۔"

مونس اسے دلچسپ نظروں سے دیکھتا رہا۔ گل کھانا اور سلاد ساتھ لائی تھی۔

"سلاد نہیں، ایک پیاز ملے گی؟ مجھے صرف پیاز کے ساتھ ہی دال اچھی لگتی ہے۔"

گل بھی تھکی ہوئی تھی مگر وہ پھر بھی اٹھنے کے پوز میں تھی کہ مونس کچن سے پیاز، پلیٹ اور چھری لے آیا تھا۔ گل اور وہ منع کرتی رہ گئیں مگر مونس شہباز پیاز کاٹنے لگا تھا یہ اور بات کہ اس کی دھواں دار برستی آنکھوں نے سامیہ کو شرمندہ کر دیا تھا۔

"آپ نے ناحق تکلیف کی مونس صاحب۔" وہ کھانا کھاتے ہوئے نرمی سے بولی اور اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دے پاتا۔ زینب ممانی سامنے آ کھڑی ہوئی تھیں۔

"تمہیں انیکسی میں بھیجنے کا مطلب تھا کہ تمہیں اپنی اوقات یاد رہے۔"

انہیں ارم نے کچن سے کھانے کی ٹرے لے جاتے مونس کی بابت بتا دیا تھا۔ تب ہی وہ تن فن کرتی یہاں آئی تھیں مگر سامیہ کو دال سے روٹی کھاتے دیکھ کر ان کا موڈ خراب ہو گیا وہ تو بہت سارا غصہ کرنے کا سوچ کر آئی تھیں اور واپس پلٹ جانا ان کے مزاج کے خلاف تھا اس لیے پھر بھی اپنے غصے کی دھاک بٹھانے کو ایک جملہ کہہ دینا ضروری سمجھا تھا اور وہ سامیہ حسام الدین تھی یک دم اٹھ کر ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔

"آپ نے جس طرح محبت سے مجھے اس بے دیاری میں اپنائیت، محبت اور سلوک سے اپنے گھر میں پناہ دی ہے یہ میرے لیے اعزاز کی بات ہے ممانی! میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی اور کوشش کروں گی کہ یہ بار آپ پر بہت دیر تک برقرار نہ رہے۔"

مٹھاس میں کھٹاس کا مزا۔ مونس شہباز کے اندر کئی قہقہے ابل کر اپنی موت آپ مر گئے تھے اور زینب ممانی کا منہ اتنا سا نکل آیا تھا اور سامیہ حسام الدین تھی کہ اب ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مزید مٹھاس سے بولی

تھی۔

"مجھے اپنی اوقات، اپنا حسب نسب کبھی نہیں بھولتا زینب ممانی! میں کہیں سے بھی کہیں چلی جاؤں نہیں بھول سکتی کہ میرے ابا کے مرنے کے بعد اگر کسی نے میری اماں کی مدد کی تھی تو وہ صرف آپ اور شہباز ماموں ہی تھے، میں بھی نہیں بھول سکتی کہ میرا ہاتھ ہمیشہ لینے والا ہاتھ رہا ہے اور آپ کا ہاتھ ہمیشہ دینے والا ہاتھ رہا ہے۔"

بات سنجیدگی کی طرف چلی گئی تھی اس بار مونس کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا اس نے کہا تھا۔

"پاپا نے جو کیا وہ آپ کا حق تھا سامیہ!"

"اس کی ماما نے کینہ توز نظروں سے مونس شہباز کو گھورا تھا۔

"کسی کا کسی پہ کوئی حق نہیں ہوتا مونس صاحب! یہ تو آپ کے دل کی نرمی، آپ کے اندر کی اچھائی ہے جو آپ کسی رشتے کو عزت و توقیر دیتے ہو۔ اس رشتے کو زندگی کی طرح نبھاتے چلے جاتے ہو بھلے وہ رشتہ آپ کے لیے کتنا ہی باعث تکلیف رہا ہو۔" وہ تلخی کی حد تک سچائی پسند لڑکی تھی۔ اور تب اچانک اس کے دل نے سامیہ حسام الدین کو کچھ سیڑھیاں اور اپنے دل میں اترتے محسوس کیا تھا۔ زینب ممانی بدمزہ ہو کر جا چکی تھیں اور مونس شہباز اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"آپ مما کو غلط مت سمجھیے گا بس غصے کی تیز ہیں دل کی بہت اچھی ہیں وہ۔"

"مالک کا مزاج تیز ہو یا بہت تیز۔ ملازم کا کام سر جھکا کر سننا ہوتا ہے مونس صاحب۔"

مونس شہباز کو لگا وہ ایک منٹ کے ہزاروں حصے میں اس سے بہت دور جا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ مالک اور ملازم کا رشتہ۔ اس کے دل میں اس کی آنکھ کا دکھ پھانس کی طرح چبھنے لگا تھا، ایک لڑکی اس کے دل کے کونے میں کھڑی باتوں کی بارش میں بھیگنے لگی تھی۔

"آپ ہماری کزن ہیں۔ ملازمہ نہیں۔ سامیہ آپ اپنے دل کو منفی رخ کی طرف مت لے جائیں۔ اس گھر پر جتنا حق میرا ارم اور عمر کا ہے۔ اتنا ہی آپ کا ہے

"آخر کو آپ کے پاپا نے اس کامیابی کی بنیاد میں اپنے خواب دبائے تھے۔"

"آپ تو دل رکھنے میں مبالغہ آرائی میں حد سے ہی گزر جاتے ہیں مونس صاحب!" وہ ہنسی تھی مگر مونس کو لگا وہ رو پڑی تھی۔

"آپ آرام کریں۔ ہم کل ملیں گے۔"

"جی ضرور۔" وہ سرہلا کر ٹرے کچن میں رکھنے چلی گئی تھی اور مونس شہباز نے اس کی پشت کو دیکھا تھا اور محسوس کیا تھا کہ کوئی ناراض سا دل تھا جو زندگی کے سورج کی طرف پشت کرکے کھڑا ہو گیا تھا وہ گہرے اور لمبے سائے گننے لگا تھا۔

مگر اسے اس گہرے لمبے سایوں سے نکال کر زندگی سے متعارف کروانا تھا۔ وہ عزم کرکے لوٹا تھا۔

☼ ☼ ☼

غیر متوقع ماما کو اپنے کمرے میں پا کر حیران رہ گیا تھا۔

"تم آخر میرے مخالف چلنے کو ہی سب کچھ کیوں سمجھتے ہو۔"

"ماما میں آپ کے مخالف کبھی نہیں چلا ہوں۔ میں تو صرف اسے تسلی اور ڈھارس دیے گیا تھا کہ وہ خود کو اکیلا نہ سمجھے۔"

"وہ تمہاری ذمہ داری نہیں ہے۔ نہ ہی وہ کوئی چھوٹی سی بچی ہے، بائیس تیئیس برس کی لڑکی ہے، ہم صرف کچھ عرصے اسے یہاں رکھیں گے اور پھر کہیں نہ کہیں اس کی شادی کرا کے اس عذاب سے چھٹکارا پانے کی کوشش کریں گے۔ اس لیے تمہیں سمجھانے آئی ہوں کہ اس سے زیادہ میل ملاپ بڑھانے کی ضرورت نہیں۔ تمہیں ہر ایک سے انوالو ہونے کی جو بری عادت ہے اس سے جان جاتی ہے میری۔"

وہ سر جھکا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ "محبت کرنا کیا میری عادت ہے ماما! کسی کا خیال رکھنا، پروا کرنا جب کہ وہ ہمارا اپنا ہو۔"

"تمہیں تو دنیا کا ہر شخص اپنا ہی لگتا ہے پاکستان

میں بھی یہی حالت تھی اور اب یہاں آکر ہر پاکستانی تمہیں اپنا بھائی بہن لگتا ہے۔ تم نے اس بے وقوفی میں جتنا پیسہ ضائع کیا ہے۔ اس سے کئی بزنس شروع ہو سکتے تھے۔"

"بزنس ہی سب کچھ نہیں ہوتا ماما! انسانیت بھی کوئی چیز ہے پھر آپ جانتی ہیں جب میں کسی پاکستانی کو مجبور اور بے بس دیکھ کر اس کی مدد سے نہیں چوکتا تو میں سامیہ سے کیسے دور رہ سکتا ہوں، وہ تو ہماری پھوپھو کی بیٹی ہے۔ پاپا کے لیے اگر کسی نے قربانیاں دی ہیں تو وہ پھوپھو جان ہی تھیں۔ آپ کو یاد ہے جب پاپا کے بزنس میں نقصان ہوا تھا، ہمارا گھر بک گیا تھا ہم انگلش اسکول سے ایک دم سے گورنمنٹ اسکول میں کھڑے کر دیے گئے تھے تو پھوپھو جان ہی تھیں، جنہوں نے اپنا زیور بیچ کر پاپا کو نئے سرے سے کاروبار کے لیے پیسہ دیا تھا پھر جب پاپا کو انگلینڈ آنے کے لیے سرمایہ کم پڑ رہا تھا تب بھی انہوں نے سامیہ کے جہیز کے لیے انکل کی فکس ڈپازٹ میں رکھی ہوئی رقم کو نکال کر پاپا کا مسئلہ حل کیا تھا اور اب اگر آج ہم اس مقام پر ہیں تو یہ سب اسی لڑکی کے نصیب کا ہے۔"

وہ کہتے کہتے مڑا، ماما وہاں تھیں ہی نہیں۔

"پتا نہیں ماما! آپ کو ہر اس شخص سے کیوں چڑ ہو جاتی ہے جو آپ کا خیر خواہ، آپ کا سچا دوست ہوتا ہے۔"

☼ ☼ ☼

وہ بیڈ پر آکر بیٹھا تھا پھر سونے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اس کا دروازہ بجا۔

"اندر آجایئے۔ پلیز دروازہ کھلا ہے۔"

اس نے کتاب ہاتھ سے رکھ دی تھی اور پانچ سیکنڈ بعد پاپا کھڑے تھے ان کا چہرہ اچھے تاثرات نہیں رکھتا تھا۔

"جی پاپا خیریت۔؟" وہ یک دم کھڑا ہو گیا تھا۔

اور پاپا اس کے کمرے کے صوفے پر بیٹھ گئے تھے پھر آہستگی سے بولے "میں سمجھتا تھا آپ میرے بچوں

میں سب سے سمجھ دار بچے ہیں مگر کیا آپ کو پتا ہے آپ کی زبان کی تیزی کی وجہ سے آپ کی ماما کے دل کے زخموں میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔"

مونس کا چہرہ اتر گیا۔ "میں نے انہیں کچھ بھی نہیں کہا پاپا آپ کو پتا ہے میں ہمیشہ چپ رہتا ہوں۔"

"ہاں مگر جب بھی آپ بولتے ہو، بہت سارے چہروں پر زخم اور تکلیف چھوڑ جاتے ہو۔"

"ماما نے کیا شکایت کی میری؟"

"وہ آپ کی ماما ہیں، وہ شکایت کیوں لگائیں گی۔ آپ اپنی ماما کو اپنا دشمن کیوں سمجھتے ہیں۔ وہ آپ کی سگی ماما ہیں اگر آپ کو کچھ کہتی ہیں کچھ سمجھاتی ہیں تو آپ کے بھلے کے لیے کہتی ہیں نا مگر آپ ان کی ہر بات کو غلط کیوں لے جاتے ہیں۔ آپ نے اپنی ماما سے یہ کیوں کہا کہ سامیہ کے نام پر ڈپازٹ کیے پیسوں سے میں یہاں انگلینڈ آیا تھا آپ کو یہ بات کیسے پتا چلی؟"

"دادا جان سے سنی تھی۔ ایک بار وہ آنٹی صفیہ کے لیے۔ بہت پریشان ہو رہے تھے۔"

پاپا نے اسے نظروں میں رکھ کر ایک گہری سانس لی تھی۔

"کچھ چیزیں ساری عمر نظروں سے اوجھل رہیں یہی اچھا ہے، آپ کو پتا ہے آپ کی ماما کی انا کتنی توانا ہے، ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی دوسرے بھائیوں کے پکے ہوئے کھانوں کی ڈش میں سے ایک چمچہ نہیں لیتی تھیں جب تک دوسری بھابھیاں منتیں کرکے ان کی پلیٹ میں سالن نہ ڈال دیتیں پھر ان کے لیے یہ بات کتنی سوہان روح ہو گی کہ وہ جو لائف اسٹائل جی رہی ہیں، اس کے لیے بنیاد سامیہ کے پیسوں سے رکھی گئی ہے۔ آپ کو پتا ہے آپ نے جلد بازی میں اس بچی کے لیے زندگی اور مشکل کر دی ہے۔ اب آپ کی ماما بلاوجہ اسے اٹھتے بیٹھتے باتیں سنانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیں گی۔"

"میں تو صرف یہ چاہتا تھا، ماما اس بے دیار لڑکی کی قدر کرنے لگیں۔"

پاپا نے گہرا سانس لیا تھا، کچھ نہیں بولے تھے۔

"مجھے لگتا تھا میں اس لڑکی کو لایا ہوں تو وہ اپنے سلیقے اور محبت سے آپ کی ماما کا دل جیت لے گی پھر آہستہ آہستہ میں اس کے لیے حالات سازگار دیکھ کر آپ کے لیے مانگ لوں گا مگر آپ نے سارا کام خراب کردیا ہے۔ میرا۔"

مونس شہباز نے ہولے سے پپا کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

"سوری پاپا مجھے نہیں پتا تھا۔ آپ اتنی گہری نظر رکھتے ہیں اور اتنی طویل پلاننگ کرتے ہیں۔ مجھے تو ہمیشہ سے لگتا ہے کہ آپ کے لیے۔"

وہ کہتے کہتے چپ ہوا اور پاپا تھکے تھکے انداز میں مسکرائے۔

"ہاں تمہیں تو یہی لگتا ہوگا تمہارے پاپا صرف پیسے کو سب کچھ سمجھتے ہیں' ان کے لیے رشتے' ان کی اہمیت' انہیں نبھانا سب بے معنی سا ہے۔"

"نہیں پاپا ایسی بات نہیں ہے۔" مونس شہباز نے آواز اور دھیمی کرلی تھی پاپا نے سر اٹھا کر کہا۔

"نہیں بات یہی ہے تم ہی نہیں گھر کے ہر شخص کو ایسا ہی لگتا ہے کہ میرے لیے پیسہ' دولت ہی سب کچھ ہے مجھے نہ کسی کی ضرورت ہے' نہ کسی کی کمی محسوس ہوتی ہے' امی اور ابا جان اور بہنوں کو بھی مجھ سے یہی شکایت تھی کہ میں نے صرف دولت کے پیچھے ہی دوڑ لگائی ہے' میں نے کبھی ان کی کسی خوشی میں شرکت نہیں کی اور اپنے دکھ میں انہوں نے جان کر مجھے شریک نہیں کیا کہ میرے لیے یہ سب ضروری نہیں ہے پھر آپ کی ماما کا رویہ میرے لیے ہر جگہ سوالیہ نشان بنا رہا۔"

"آپ ماما کے لیے اتنا حساس بھی تو رہتے ہیں پاپا! وہ کچھ بھی غلط کریں' صحیح کریں سچ کہیں' جھوٹ کہیں آپ ہر اس بات پر آمنا صدقنا کہتے ہیں تب ہی آپ سے منسوب لوگوں کی توجہ آپ کے لیے سوالیہ نشان بنی رہتی ہے۔"

پاپا نے سر اٹھا کے بے چارگی سے اسے دیکھا۔

"پتا نہیں میں جب بھی اسے روتے دیکھتا ہوں' میرے اندر طوفان آجاتے ہیں' میں پاگل ہوجاتا ہوں پھر میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں کیا نہیں کروں۔"

"پاپا! آپ کی یہ حساسیت پہلے تو اتنی شدید نہیں تھی ظفر بھائی کی زندگی میں تو میں نے گھر میں لڑائی جھگڑوں کے علاوہ کچھ نہیں دیکھا تھا۔ آپ ایک دوسرے سے عاجز تھے ایک دوسرے کی شکل نہیں دیکھنا چاہتے تھے اور آپ ایک دوسرے کو طلاق دینے والے تھے۔"

پاپا کو جیسے کرنٹ لگا تھا۔ رنگ اڑ گیا تھا ان کا۔ وہ اس کی طرف مڑے تھے۔

مونس کو لگا وہ جان کر "اسموگ اسکرین" درمیان میں لائے تھے' تاکہ وہ ان کے چہرے کے ٹھیک تاثرات نہ دیکھ سکے۔

"تمہیں یہ کس نے بتایا تھا کہ ہم میں علیحدگی ہونے والی تھی۔"

اس نے بہت تھکے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

"ظفر بھائی نے بتایا تھا' اس دن آپ دونوں میں روز سے زیادہ جھگڑے ہوئے تھے۔ ظفر بھائی مجھے اپنے قریب بٹھائے میتھس کے سوال حل کروا رہے تھے اور میں بار بار غلطی کررہا تھا۔ وہ مجھے ڈانٹ رہے تھے کہ میں ان کی بات کیوں نہیں سمجھ رہا میں آپ کی چیخ پکار سے ڈر رہا تھا۔ میں رونے لگا تھا۔ تب ظفر بھائی نے مجھے اپنے سینے سے لگالیا تھا اور بولے تھے۔

"تم بہت بہادر بچے ہو اور بہادر لوگ ہر طرح کے حالات کے لیے تیار رہتے ہیں۔"

"میں نے کہا کیسے حالات؟"

تو بہت اذیت بھرے لہجے میں بولے تھے "شاید ہمارے ماما' پاپا بہت دیر تک ساتھ نہ رہیں' ہوسکتا ہے وہ الگ ہوجائیں' مگر میں تیار ہوں اس چویشن کے لیے' بلکہ پہلے سے زیادہ پرسکون ہوکر پڑھائی کرسکوں گا' پھر یہ ہنگامہ' لڑائی نہیں ہوگی۔ ہمیں دونوں میں سے کسی ایک کو چننا پڑے گا۔ میں پاپا کا نام ریفر کروں گا' مگر کچھ عرصے کے لیے جب میں معاشی طور پر مضبوط ہوجاؤں گا تو میں ان سے بھی الگ ہوجاؤں گا اور تمہیں بھی اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

"ظفر' دادا' دادی اور چاچو؟" میں نے اگلا سوال کیا اور انہوں نے دکھ سے کہا۔

"کوئی نہیں ہے ہمارا' اپنے ذہن کو پہلے سے تیار کرلو۔ ہر رشتہ پاپا سے ہے' جب پاپا ان کے لیے کچھ نہیں ہیں اور وہ پاپا کے لیے کچھ نہیں ہیں تو بہتر ہے ہم خود کو ابھی سے اکیلا ہونے کا عادی کرلیں اور اپنی زندگی کی ایک نئی شروعات کریں' جہاں صرف تم میرے لیے اور میں تمہارے لیے ہوں اور باقی کچھ نہیں ہے' کیا تمہیں دادی کا رویہ ٹھیک لگتا ہے؟ وہ پاپا سے ہر شکوہ شکایت کا بدلہ مجھے جس طرح اگنور کرکے لیتی ہیں' مجھے نہیں اچھا لگتا' میری توجہ اور محبت کو بھی جب وہ غلط سمجھتی ہیں تو میرا دل چاہتا ہے میں یہ گھر چھوڑ دوں۔"

"وہ یہ سب کہتا تھا تم سے اور میں سمجھتا تھا وہ میرا عاشق زار ہے۔ اسے میرے بغیر نیند آتی ہے نا کھانا کھایا جاتا ہے' وہ راتوں کو جس طرح میرا انتظار کرتا تھا' ایسا انتظار تو کبھی زینب نے نہیں کیا تھا میرا اور آج مجھے اتنے سالوں بعد پتا چل رہا ہے کہ وہ مجھ سے نفرت کرتا تھا۔"

پاپا کے چہرے کا ہر رنگ جیسے آہستہ آہستہ مرنے لگا تھا۔ وہ اٹھ کر ان کے قریب آگیا تھا۔

"وہ جذباتی تھے پاپا! آپ تو جانتے ہیں' آپ مجھ سے بھی اس لیے ہی تو ڈرتے ہیں کہ میں بھی صرف جذبات کو اہمیت دیتا ہوں' حقیقت پسندی نہیں ہے مجھ میں۔"

پاپا کچھ نہیں بولے تھے' خاموشی سے مونس شہباز کو دیکھتے رہے تھے پھر نرمی سے بولے تھے۔

"کیا آپ اپنی ماما سے سوری کرلیں گے مونس! یہ درخواست ہے حکم نہیں۔"

"پاپا! ایسے تو نہ کہیں۔ آپ کو حکم دینے کا اختیار ہے مجھ پر۔" اس نے پاپا کے ہاتھ کو چوما تھا اور پاپا پشت موڑ کر چلے گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

وہ ماما کے کمرے میں گیا تھا' ان کی بڑی بڑی غلافی آنکھیں رو رو کر سوج گئی تھیں۔

"کیا کررہی ہیں ماما؟" ماما نے اسے دیکھ کر خواہ مخواہ اپنی الماری کھول لی تھی' اپنے تہہ کیے کپڑوں کو پھر سے تہہ کرنے لگیں۔

"ماما ادھر دیکھیں نا میری طرف۔" اس نے ماما کو کندھے سے تھاما تھا اور وہ بپھر گئی تھیں۔ "چھوڑ دو مجھے مونس! مجھے نہ تم سے بات کرنی ہے نا مجھے تمہاری طرف دیکھنا ہے۔"

"میں اتنا برا بھی نہیں ہوں ماما! ادھر دیکھیں تو' لڑکیاں تو آپ کے بیٹے پر سو جان سے فدا ہیں اور آپ ہیں کہ اپنے بیٹے کو لفٹ ہی نہیں کراتیں۔"

"تمہیں پتا ہے مجھے تم سے بات کرنے میں بھی انٹرسٹ نہیں رہا ہے۔" انہوں نے اس کے ہاتھ جھٹک دیے۔

"کیوں نہیں ہے آپ کو مجھ میں انٹرسٹ۔ میں آپ ہی کی اولاد ہوں مام!" وہ کہنے کچھ آیا تو کسی اور معاملے میں الجھ گیا تھا۔

"یہ بہت بڑی غلطی ہے ہماری کہ تم ہماری اولاد ہو۔" اتنا سخت کمنٹ سن کر وہ گھرے سے بیٹھ گیا تھا۔

"اگر میں آپ سے کبھی دور چلا جاؤں تو آپ کو شاید اتنی بھی کمی محسوس نہیں ہوگی جتنی یہ کرسٹل کے واز کو اگر آپ کے روم میں ڈائریکشن بدل کر رکھ دیا جائے تو آپ کو یہ بدلاؤ محسوس ہوگا۔"

"میرے پاس فضول باتوں کا جواب نہیں۔ ناولز کم سے کم پڑھا کرو۔ یہ جذباتی باتیں کتابوں میں اچھی لگتی ہیں۔"

"اوکے مام! میں آپ سے کتابی باتیں نہیں کروں گا' لیکن پلیز میں چاہوں گا کہ آپ کے آنسو جو میری وجہ سے نکلے ہیں' ان پر مجھے آپ معاف کردیں۔"

"میرے آنسو تمہارے لیے کب سے اہمیت رکھنے لگے ہیں؟" وہ الماری بند کرچکی تھیں اور اب اس کی طرف متوجہ تھیں۔

"آپ کے آنسو میرے لیے ہمیشہ سے اہم ہیں مام!

میں کوشش کرتا ہوں‘ میری وجہ سے آپ کو کبھی کوئی دکھ نہ پہنچے۔“

”ظفر کی موت کے باوجود تمہیں ایسا لگتا ہے کہ میرے آنسوؤں کا سبب تم نہیں ہو۔“

”ماما! آپ بھول کیوں نہیں جاتی ہیں اس بات کو‘ وہ ایک حادثہ تھا ماما۔“

”کیا میں کچھ دیر سکون سے اکیلی بیٹھ سکتی ہوں۔“ انہوں نے ایک دم سے ہی اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکال دیا تھا۔ لفظی طور پر ہی سہی مگر اسے ایسے ہی لگا تھا کہ اس کی ماں نے اسے ایک دم سے اپنی ممتا کے حصار سے باہر نکال دیا ہو‘ اور یہ دوری یہ اس کی ذات کا انکار ہمیشہ سے اسے ماما کی طرف سے ملا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ برسوں سے ماما کے اس اظہار ناراضی کو سہتا آرہا تھا۔ مگر آج بہت سوا درد ہوا تھا۔ وہ کمرے سے باہر آگیا تھا۔ پھر وہ گارڈن میں بیٹھا تھا‘ جب کوئی اس کے قریب آگیا تھا۔

”کافی۔۔۔“ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ یہ سامیہ حسام الدین تھی۔ اس نے کافی کا کپ تھام لیا تھا۔ ”آپ کو بھی کافی کی عادت ہے۔“

”اور کس کو ہے؟“ وہ اس کے برابر بینچ پر بیٹھ گئی تھی۔

”مجھے ہے‘ پاپا کو ہے‘ ظفر بھائی کو تھی۔“ اس نے گھونٹ بھرا اور ایک دم سے اسے لگا‘ کافی کا گھونٹ بہت زہریلا ہو گیا ہے‘ اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا اور وہ اس کی کیفیت سے بے نیاز آہستگی سے بولی تھی۔

”جب ظفر بھائی کا حادثہ ہوا‘ میں خالہ کے گھر تھی‘ بہت چھوٹی تھی‘ مگر میں نے سنا تھا‘ سرمد بھائی بھاگے ہوئے آئے تھے اور بہت بے قراری سے بولے تھے۔ امی ظفر چلا گیا۔ امی ظفر کی ڈیتھ ہو گئی۔“ خالہ اس وقت سالن میں نمک ڈال رہی تھیں اور ان کے ہاتھ سے نمک کی بوتل چھوٹ کر پتیلی میں گر گئی تھی اور میں نے اس لمحے سوچا تھا‘ ظفر بھائی کے ساتھ کچھ بہت برا ہوا ہے۔ مجھے ظفر بھائی اس لمحے ان چاکلیٹ کی وجہ سے زیادہ یاد آئے تھے‘ جو وہ ہر سنڈے کو میرے لیے لایا کرتے تھے۔ مجھے تو چاکلیٹ اور ان کی بائیک پر گھومنا ہی یاد آیا تھا‘ پھر جب پہلی بار میں نے انہیں خاموش لیٹے دیکھا تو مجھے حیرت ہوئی تھی۔

”اٹھیں نا ظفر بھائی۔ میں نے اٹھانے کی کوشش کی تھی اور وہاں سب کے رونے دھونے میں تیزی آگئی تھی۔“

”انہیں کیا ہو گیا ہے؟“ میں نے امی سے پوچھا تھا وہ اور شدت سے رونے لگی تھیں۔

”آپ کے ظفر بھائی کو جانے کی جلدی تھی‘ وہ چلے گئے ہیں‘ ملک عدم۔“ پاپا نے کہا تھا۔ اس روز میں نے سوچا تھا۔ ”وہ بہت اچھی جگہ چلے گئے ہیں۔ انہیں گھومنے کا شوق بھی تو بہت ہے‘ فرانس‘ مصر جیسا کوئی ملک ہو گا‘ مگر وہ تو کہتے تھے سویٹ ڈول‘ تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گا‘ جہاں بھی جاؤں گا۔ مگر وہ اکیلے چلے گئے تھے‘ مگر یہ ملک عدم کیسا ملک تھا کہ ظفر بھائی کہیں نظر ہی نہ آرہے تھے‘ مگر سب رو رہے تھے‘ وہ چلے گئے ہیں‘ شاید کوئی جادو نگری تھی وہ۔ میں بہت عرصے تک یہی سمجھتی رہی‘ پھر جب ظفر بھائی کو دوبارہ کبھی نہ دیکھ کر میں نے پاپا سے پوچھا تو انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ جو لوگ مر جاتے ہیں وہ اللہ کے پاس چلے جاتے ہیں‘ ملک عدم وہی راستہ ہے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا اور ظفر بھائی بھی کبھی واپس نہیں آئیں گے۔ اس دن میں سارا دن اور ساری رات روتی رہی تھی۔ اس دن مجھے پتا چلا تھا موت کیا ہوتی ہے۔ کسی کا چلے جانا کیا ہوتا ہے۔“

اس نے کہہ کر سر اٹھایا تھا اور مونس شہباز کی آنکھیں سمندر ہونے کے باوجود نہیں روئی تھیں۔

”تم نے اتنی تفصیل سے بتایا ہے کہ مجھے ہر منظر ایسا لگتا ہے جیسے ابھی ابھی یکدم سانس روکے کھڑا تھا اور ایک دم سے گہری سانس لے کر جینے لگا ہے۔“

”وہ دن میں نہیں بھول سکتا‘ چاہوں بھی تو نہیں‘ ظفر بھائی زندگی سے جا کر بھی میری زندگی میں آج بھی زندہ ہیں‘ مجھے ان کے ساتھ رہنا اور جینا اچھا لگتا ہے۔ پتا نہیں آپ یقین کریں گی یا نہیں‘ لیکن میں نے ہمیشہ وہ ہی خواب جینے کی کوشش کی ہے‘ جو بھی ان کے خواب تھے۔ آپ کو پتا ہے سامیہ! جب ظفر بھائی شاعری کی کوئی کتاب پڑھتے تھے تو مجھے وہ سب سے زیادہ برے لگتے تھے‘ میں جان جان کر اس لمحے اپنے اسکول کا ہوم ورک لے بیٹھتا‘ وہ مجھے سوال سمجھاتے رہتے‘ ریڈنگ کرنے کو کہتے اور میں کند ذہن بن جاتا۔ وہ کتاب رکھ کر میرے پاس اٹھ کر آتے اور مجھے ان کی اس توجہ میں رہنا بہت اچھا لگتا‘ جب وہ کتاب رکھ دیتے تو مجھے ان کی ہر بتائی ہوئی بات آسان لگتی۔ شروع شروع میں ظفر بھائی میری یہ چالاکی نہیں سمجھتے تھے مگر جب سمجھے تھے تو بہت ہنسے تھے۔

”کتنا پاگل ہے مونس تو۔“ انہوں نے ایک بار میرا چہرہ ہاتھوں میں لے کر کہا تھا اور میں نے کہا تھا۔

”وہ تو ہوں آپ کے پیچھے۔“

”کتنی توجہ چاہیے تجھے میری؟“ وہ اس دن یکدم بولے تھے اور میں نے ان کی گود میں سر رکھ دیا تھا اور بہت دل سے کہا تھا۔

”مجھے ہر چیز سے زیادہ آپ کی محبت چاہیے‘ میرا دل چاہتا ہے آپ میری ایک ایک بات پر نظر رکھیں‘ مجھے ہر وہ دن اچھا لگتا ہے‘ جو آپ مجھے سوتے سے جگانے آتے ہیں‘ جب ماما کے نہ ہونے پر آپ میرے لیے آملیٹ بناتے ہیں‘ میرا دل چاہتا ہے میں آپ کے ہاتھ چوم لوں۔ آپ مجھے ماما لگتے ہیں۔“ اور ظفر بھائی ایک دم سے کھلکھلا اٹھے تھے۔

”بہت پیار کرتا ہے مجھ سے؟“

”بہت زیادہ بھائی۔“ میں نے جذب سے کہا تھا اور انہوں نے ایک دم سے مجھے دیکھ کر کہا تھا۔ ”اگر کسی دن تجھ سے دور ہو جاؤں تو کیا کرو گے؟“ میں ان کے سینے سے اور چمٹ گیا تھا۔

”میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گا بھائی! میں آپ کے بغیر ایک قدم نہیں چل سکتا‘ مگر نو برس کے مونس کو نہیں پتا تھا کچھ عرصے بعد وہ اپنی ضد کے ساتھ اکیلا کھڑا ہو گا سامیہ! آپ نہیں جانتیں میں نے ہر قدم پر ٹھوکریں کھائی ہیں۔ تب کہیں ظفر بھائی کے بغیر چلنا سیکھا ہے۔ اور پھر پتا نہیں مجھ میں کیسے ظفر بھائی کی پسند و ناپسند میرا مزاج بن گیا‘ ایک بار ظفر بھائی نے کہا تھا۔“

”جو باتیں تم کرتے ہو اتنی سی عمر میں‘ وہ ہی تو شاعری ہے‘ وہ ہی تو جذبہ ہے‘ وہ ہی تو محبت ہے اور تمہیں محبت کی بات کرنا آتی ہے تو محبت کی بات پڑھنے سے کیوں چڑ ہے؟“

”میں ابھی بہت چھوٹا ہوں بھائی۔“ میں نے جان چھڑائی تھی اور انہوں نے کہا تھا۔

”میں چھوٹی کلاس میں تھا جب غالب کو پڑھنا شروع کیا تھا‘ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا‘ میں اردو کی لغت پاپا کی لائبریری سے چرا کر چپکے چپکے شعروں کے مطلب دیکھا کرتا تھا‘ مجھے تب بھی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا اور یہ ہی نہ سمجھ میں آنا میری ضد بن گیا۔ میں چیزوں سے‘ حالات سے چڑ کر کبھی نہیں بھاگا‘ مجھے حالات کو اپنے حق میں کرنے کا حوصلہ ہے اور شوق بھی‘ تب مجھے لگا تھا میں جس کی محبت کی قسم کھا سکتا ہوں‘ وہ بہت مضبوط اور کبھی نہ مٹنے والا حصار ہے‘ مگر سامیہ! ہم جن لوگوں کے لیے سوچتے ہیں‘ وہ ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں گے‘ وہ پتا نہیں اچانک ہاتھوں سے ریشمی ڈور کی طرح کیسے پھسل جاتے ہیں۔“

سامیہ نے ہولے سے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تھا اور خاموشی کی زبان میں کہا تھا۔ ”میں آپ کے ساتھ ہوں مونس!“

اور اس نے بہت آہستگی سے کہا تھا۔ ”کوئی ایسا وعدہ مت کیجیے گا‘ جو آپ نبھا نہ سکیں۔“

”میں بہت کم وعدے کرتی ہوں اور مونس! جو کم وعدے کرتے ہیں‘ وہ ہمیشہ سچا وعدہ کرتے ہیں۔“ اس نے بڑے دل سے کہا‘ مگر دوسرا دن اس کے لیے اور پھر بہت سارے دن مل کر اس کے وعدے سے بچھڑنے کا راستہ بن گئے تھے۔

"نہیں، ورنہ اگر تمہیں مونس کے اردگرد بھی دیکھا تو میں ساری رعایت، ساری مصلحت بھول کر تمہیں واپس پاکستان بھیج دوں گی۔"

"پاکستان ..." اس نے زیر لب بہت بے چارگی سے اس ملک کا نام لیا تھا جہاں وہ پلی بڑھی تھی، جہاں ساری عمر سچائی سے محبت کی تھی، محبت اوڑھی تھی، محبت ہی تھی اور پھر وہ ہی پاکستان تھا، جہاں اس نے اپنے اندر سے محبت دفن کی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ کچن میں مصروف تھی، ملازمہ کے ساتھ مل کر۔ مگر خاموشیاں اس کے ہم قدم چل رہی تھیں۔

اس کے قدموں میں صرف بے چارگی تھی اور پیروں کی ریکھاؤں میں جلاوطنی کا دکھ۔

"آپ بیگم صاحب کی سگی بھانجی ہیں؟" اس نے پلیٹ کو خشک کرتے کرتے پوچھا۔

"نہیں میں ان کی سگی بھانجی نہیں، رشتے کی بھانجی ہوں۔" اس نے جھوٹ بول کر اپنا بھرم رکھنے کی معصوم سی کوشش کی اور گل اس کو حیرت سے دیکھنے لگی۔

"میں صاحب کے پاس پندرہ سال سے ملازم ہوں۔ بیگم صاحب کو میرے کام کی عادت ہے، تب ہی وہ جب یہاں آئیں تو انہوں نے مجھے دو سال کے اندر اندر میرے شوہر کے ساتھ بلوالیا تھا اور گھر کی تصویروں میں، میں نے اکثر آپ کو بیگم صاحب کی فیملی کے ساتھ دیکھا ہے، جب بڑی بی بی، صاحب، بیگم صاحب کے گھر آیا کرتیں تو وہ آپ کا نام لے کر ہر وقت آپ کو یاد کیا کرتی تھیں، بتایا کرتی تھیں کہ آپ ان کا کیسا خیال رکھا کرتی تھیں۔"

"بہت محبتی تھیں اگر وہ مجھے اپنی اولاد جیسا سمجھتی تھیں۔" وہ اس حوالے سے صاف مکر گئی، اس لیے نہیں کہ زینب ممانی کا رویہ اس کے ساتھ برا تھا، بلکہ اس لیے کہ گل یہ نہ سمجھے کہ ان کے گھر کے لوگ اپنے غریب قرابت داروں سے اتنا ناروا سلوک کرتے ہیں، اس گھر کے لوگ جہاں دادی بیگم کی تربیت اور محبت نے کئی گھروں کے اندھیرے گھر میں سکون و آشتی کے دیے جلائے تھے، وہ اس وقت بھی صرف دادی کا بھرم اور مان نہیں ٹوٹتے دیکھ سکتی تھی۔

"پتا نہیں جی۔ مجھے تو یاد پڑتا ہے صاحب نے کہا تھا، آپ ان کی سگی بہن کی بیٹی ہیں۔"

"کہہ دیا ہوگا ماموں جان کو یوں بھی دل رکھنے کا بڑا شوق ہے نا۔" وہ پلیٹیں ریک میں رکھ کر کچن سمیٹ کر زینب ممانی کے پاس ڈرائنگ روم میں آگئی تھی۔

"کوئی اور کام تو نہیں ہے ممانی؟"

"ہاں یہ دو، تین ساڑھیاں ہیں استری کر کے میری وارڈروب میں رکھو پھر سونے چلی جانا۔"

ایک پرسکون نیند، پتا نہیں کتنے سالوں سے وہ ٹھیک طرح سے سو نہیں پائی ہے، اس نے اندازہ لگانے کی کوشش کی مگر جلتی آنکھوں نے اس کے اس حساب کا ساتھ نہیں دیا تھا۔

استری کرنا بہت مشکل کام لگتا تھا اسے، مگر اسے یہ بھی مشکل کام کرنا پڑتا تھا، مگر ساڑھی استری کرنا مشکل ترین کام تھا، وہ بھی زینب ممانی کی ساڑھی، جو نقص نکالتی تھیں، ٹھیک ہے استری کے باوجود، وہ تیسری ساڑھی کو پھیلا رہی تھی کہ اچانک کمرے میں مونس شہباز داخل ہوا تھا، اس کے ہاتھ میں برگر تھا۔

"تم نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا نا؟"

اس نے مڑ کر بے بسی سے دیکھا تھا۔ "نہیں، یہاں سے نمٹوں گی تب ہی کھانا کھاؤں گی جاکر۔"

"اس وقت رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔ تو یہ ہے سامیہ! آپ بھی نا اور یہ ماما بھی کتنی ظالم ہو جاتی ہیں کبھی کبھی۔"

"ارے انہوں نے کچھ نہیں کہا تھا۔ میں خود زبردستی یہ ساڑھیاں اٹھا کے لائی تھی۔"

"اچھا چلیں، آجائیں، ایک پاکستانی ریسٹورنٹ سے لایا ہوں، پودینے کی چٹنی کے ساتھ، کیچپ مجھے پسند نہیں ہے اس لیے نہیں ڈالا ہے، اس برگر میں۔"

"مگر مجھے کام کرنا ہے۔" وہ للچائی ہوئی نظر سے برگر کو دیکھ کر بولی۔

اور وہ ہنس پڑا، "آجائیں ماما اس وقت سونے کے لیے لیٹ چکی ہوں گی، آپ کھائیں، قسم سے پاکستان یاد آکر رہ جائے گا۔ سچ پوچھیں مجھے ان فائیو اسٹار شاپ کے مقابلے میں برگر ٹائم کے ٹھیلوں سے برگر لے کر کھانے کا شوق رہا ہے۔"

سامیہ کو ہنسی آگئی تھی، اس شخص کی تمنائیں اور پسند و ناپسند کتنی عام سی تھیں۔

"ہاتھ دھولوں۔" وہ منمنائی۔ اور وہ نفی میں سر ہلا کر بولا تھا۔

"ایسے ہی آجاؤ، ہاتھ دھونے باہر جاؤ گی تو پکڑی جاؤ گی اور پھر شیر کی اولادیں منہ ہاتھ کب سے دھونے لگیں۔"

بے ساختہ قہقہہ ابل پڑا تھا، وہ پلیٹ میں پودینے کی چٹنی سے برگر لگا کر کھانے لگی تھی، بھوک میں تو سوکھی روٹی بھی اچھی لگتی ہے یہ تو پھر برگر تھا، کسی زمانے میں اسے بھی برگر کھانا کتنا پسند تھا، مگر ایک ٹیس سی دل میں اٹھ کر رہ گئی مگر اس کا آخری بائٹ تھا کہ اچانک دروازہ کھلا اور بیٹھے ہوئے وہ دونوں ہق دق رہ گئے۔

"یہ سب میرے گھر میں نہیں چلے گا بی بی! بہت سنی ہیں میں نے تمہاری کہانیاں۔"

وہ شرم سے پانی پانی ہوگئی، تب مونس شہباز کھڑا ہو گیا۔

"آپ کو سامیہ پر اعتبار نہیں، مگر میں تو آپ کا ہی بیٹا ہوں نا۔"

"ہاں تب ہی میں نے تمہارا ہر روپ دیکھا ہوا ہے۔"

"میں ماسک لگا کر نہیں گھومتا مام! جیسا اندر سے ہوں ویسا ہی باہر سے ہوں۔"

"خوش فہمی ہے تمہاری، ورنہ دنیا میں اگر مجھے کسی پر اعتبار نہیں ہے تو وہ تم ہو۔"

"آخر میں نے ایسا کیا کر دیا ہے مام! کہ آپ مجھ پر ہمیشہ بے اعتبار رہی ہیں۔"

"کیا یہ بھی تمہیں بتانا پڑے گا، مسز ساحرہ کی بیٹی کی داستان لوگ ابھی نہیں بھولے۔"

"مگر وہ بات کلیئر ہو گئی تھی کہ ان کی بیٹی نے جھوٹ کیوں بولا تھا، جب ایرک نے خود اسے بلیک میل کر کر کے تھک گیا تو تنگ آکر سب کے سامنے کسی راز کی طرح فاش کر دیا تھا، آپ کی سو کالڈ کٹی پارٹی بہت یادگار تھی مام۔"

"تم اپنی غلطی سے توجہ ہٹانے کی کوشش مت کرو۔"

"مام! ہم برگر کھا رہے تھے اور بس۔ سامیہ کو بھوک لگ رہی تھی شدید۔"

"آخاہ! تو اب یہ الزام بھی سر تھوپو گی لڑکی کہ زینب ممانی تمہیں بھوکا رکھتی ہیں۔"

"نہیں تو زینب ممانی، میں ایسا کیوں کہوں گی، میرے لیے تو آپ فرشتہ ہیں۔"

"ہاں فرشتہ سب کے سامنے، ورنہ تمہارا دل جو مجھے ظالم، جلاد سمجھتا ہے، میں اچھی طرح سمجھتی ہوں یہ بات۔"

"پتا نہیں زینب ممانی آپ کا دل میری طرف سے کیوں صاف نہیں ہوتا، حالانکہ میں اسی طرح چلنے کی کوشش کرتی ہوں، جیسا آپ کو پسند ہے۔"

"لوگوں کو پرکھنے کا میرا الگ انداز ہے اور میں اس میں کسی کی ڈکٹیشن قبول نہیں کرتی، میرا دل کہتا ہے تم مجھے کہیں نہ کہیں دھوکا دو گی، تم اس گھر کی خیر خواہ نہیں ہو یہ میری رائے ہے۔"

"میں مانتی ہوں زینب ممانی! لیکن آپ یہ تو سوچیں میں آپ کو دھوکا کیوں دوں گی، کس کے لیے دوں گی، میں یہاں جلاوطن ہوں زینب ممانی! مجھے میرے گھر میں کوئی پسند کرتا ہے نہ مجھے اپنے ساتھ رکھنا پسند کرتا ہے، شہباز ماموں کا تو احسان ہے کہ وہ مجھے ایک بری زندگی سے بچا کے لے آئے، ممانی قسم سے میں چاہوں بھی تو آپ کے سامنے سر اٹھا کر آپ کو دیکھ نہیں سکتی، میں اپنی ساری کشتیاں جلا کر یہاں آئی ہوں، آپ ہی بتائیے پھر میں اپنی پناہ گاہ کو خود اپنے ہاتھ

سے کیوں اجاڑوں گی؟ جب سے زندگی نے حق اختیار چھینا ہے، تب سے زندگی خاموشی اور سر جھکانے کا نام ہے میرے لیے۔"

"بس، بس میرے سامنے یہ کتابی باتیں مت کیا کرو، مجھے زہر لگتی ہیں ایسی باتیں۔"

"مگر آپ کو ظفر بھائی کی یہ کتابی باتیں کبھی بری نہیں لگی تھیں مام۔" اس نے سوچا کہ وہ کچھ نہ بولے اور واقعی اس نے اس بار بھی تلخی بھرا جملہ ہی کہا تھا۔

"ظفر تمہاری طرح تکلیفوں کی نمائش نہیں کرتا تھا، میرے اس بچے میں بہت ٹھہراؤ تھا، بہت کچھ ضبط کر لینے کا حوصلہ تھا، وہ تمہاری طرح اتھلا نہیں تھا کہ پھانس بھی چبھی تو ساری دنیا کو اپنے گرد تماشا کھڑا کرلو۔"

"میں ایسا ہوں مام؟" مونس شہباز کی آواز ایک دم مری سی لگی تھی۔

"میرا دل چاہتا تھا کبھی آپ صرف آپ مجھ پر رائے دیں، میرے ظاہر اور میرے باطن میں جھانک کر مجھے دریافت کریں مگر مجھے آج پتا چلا ہے میں آپ کے لیے ایک ٹھوکر پڑا ہوا پتھر ہوں، بس ایسا پتھر جس پہ نہ آپ توجہ دے سکتی ہیں، نہ توڑ سکتی ہیں، کیونکہ اگر میں ٹوٹ گیا تو آپ کے لفظوں اور آپ کی نفرت کا زہر کون پیے گا۔"

ماما نے نفرت سے اس کی طرف سے پشت موڑ لی تھی۔

☼ ☼ ☼

دوسری صبح بہت ہنگامہ خیز تھی۔

"یا تو اس لڑکی کو پاکستان بھیجیں یا پھر اس کو جلد سے جلد شادی کرکے اس گھر سے دفعان کریں۔" ان کا لہجہ بہت تیز، بہت سخت تھا، مگر شہباز صاحب سر جھکائے کسی بہت گہری سوچ میں گم تھے۔

"میں آپ سے کچھ کہہ رہی ہوں شہباز!" انہوں نے اس بار ان کا شانہ ہلایا اور وہ جھرجھری لے کر ان کی طرف خالی آنکھوں سے دیکھنے لگے۔

"زینب! اگر آپ کسی سے دل کی گہرائی سے محبت کرتے ہو، مگر آپ کو پتا چلے کہ آپ سے وہ شدید نفرت کرتا تھا، اتنی نفرت کہ اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ آپ کو کب کا چھوڑ کے جا چکا ہوتا، ہم جسے محبت کا بندھن سمجھتے ہوں وہ صرف مجبوری کا ساتھ ہو تو کیسا لگتا ہے؟"

زینب شہباز نے انہیں حیرت سے دیکھا تھا۔

"آپ کس کی بات کر رہے ہیں شہباز؟"

"ایک ناول پڑھ رہا تھا کل عجیب سی کہانی تھی، دل پر بوجھ بڑھا گئی۔"

زینب یک دم ان کے پاس آکر کھڑی ہو گئیں۔ "یہ آپ کب سے ان خرافات میں پڑ گئے کہانیاں، ناول یہ تو بے کار لوگوں کے کام ہیں۔"

"ہاں مجھے پہلے یہ ہی لگتا تھا کہ ناول اور کہانیاں لکھنا، پڑھنا بے کار کا کام ہے، مگر کل پتا نہیں مجھے کیوں لگا کہ یہ سب کہانیاں ہمارے اندر سے جنم لیتی ہیں، ہماری طرح کے لوگ کہیں نہ کہیں وہ زندگی جی رہے ہوتے ہیں جنہیں لفظوں میں لکھاری ترتیب دے رہے ہوتے ہیں۔"

"آپ مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے۔ آپ تو بہت مضبوط اعصاب رکھتے تھے۔"

"مضبوط اعصاب۔" وہ خود پر طنزیہ ہنسے تھے وہ تو دو رشتوں کے پاٹوں میں پس گئے تھے، تب ہی انہوں نے اپنے اعصاب کو آہستہ آہستہ بے حسی کی سمت موڑ دیا تھا تاکہ وہ دونوں فریقین کی دہائی کا استقامت سے مقابلہ کر سکیں، ورنہ شروع شروع میں وہ اماں کی شکایت پر زینب شہباز سے بدسلوکی کر ڈالتے تھے اور کبھی بیوی کے کہنے پر ماں سے جھڑپ کرنے جا پہنچتے تھے۔ بہت سال تک یہ ہی چکر چلتا رہا، مگر ظفر کے زندگی سے چلے جانے کے بعد ان میں ایک بہت بڑی تبدیلی آئی تھی، انہیں لگا تھا وہ مکمل طور پر خالی ہو گئے ہیں۔ انہیں لگا تھا کوئی جیسے ان کی عمر بھر کی کمائی چھین کر لے گیا ہے، وہ چیخ سکتے تھے، نہ رو سکتے تھے اور تب انہیں لگا کہ ان کے اندر آنسو گلیشئر بن کر جم گئے

تھے۔

اور اتنے برسوں بعد زینب کہہ رہی تھیں، وہ بہت مضبوط اعصاب کے مالک ہیں۔

زینب شہباز ابھی تک ان کی طرف متوجہ تھیں اور شہباز صاحب یک دم ان کے سامنے سے اٹھ کر باہر چلے گئے تھے، پھر دو ہفتے بعد کی بات تھی، انہوں نے اپنا سوٹ کیس پیک کرنا شروع کر دیا تھا۔

"کہاں جا رہے ہیں آپ؟"

"پاکستان؟" بہت عجیب دکھ کی طرح لفظ ادا ہوا تھا۔

"کیوں جا رہے ہیں؟" زینب نے حیرت سے انہیں دیکھا اور پھر پوچھا۔ مگر انہوں نے کچھ نہیں کہا، پھر وہ ڈرائیور کے ساتھ ایئرپورٹ پہنچے تھے اور اپنے سامنے مونس کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔

"تم یہاں کیوں؟"

"پتا نہیں، مگر مجھے لگا تھا آپ کو رخصت کرتے وقت اپنی محبت کا سندیسہ اور سوغات آپ کے ہاتھ ضرور بھیجنا چاہیے تھا۔ ظفر بھائی کو پتا نہیں میں یاد ہوں گا کہ نہیں، لیکن جب آپ ان سے ملیں تو ضرور کہیے گا کہ مونس کو ایک لمحے کے لیے بھی وہ نہیں بھولے ہیں، ہمیشہ میں نے ان کو اتنا یاد کیا ہے جتنا شاید خود کو بھی یاد نہ رکھا ہو۔"

"تمہیں کیسے پتا میں پاکستان کیوں جا رہا ہوں؟"

"ظفر بھائی کہتے تھے، محبت میں کہے بغیر ایک دل دوسرے دل کی سمجھ لیتے ہیں اور مجھے گمان ہے مجھے آپ سے بہت محبت ہے پاپا۔"

شہباز صاحب کی آنکھیں نم ہونے لگی تھیں اور وہ نم آلود شام تھی، جب وہ کراچی اپنے گھر آئے تھے۔ اماں جان کو ان کی آمد سوکھے دھانوں پر پڑنے والی بارش جیسی محسوس ہوئی تھی۔ وہ بھی اماں کے گلے سے لگ کر ایسے روئے تھے کہ جیسے پہلی بار بچھڑ کر ملے ہوں۔

"اماں! کیا آپ کا دل گزرے سالوں کی بے رخی پر مجھے معاف کر سکے گا؟"

اماں نے ایک لفظ کہے بغیر انہیں اپنے سینے سے لگا لیا تھا اور وہ بھیگی ہوئی شام کی طرح گھر میں سوگوار بیٹھے تھے، اماں نے انہیں کسی کم سن بچے کی طرح سمیٹ رکھا تھا۔ مگر ان کی آنکھوں کی نمی۔

"کیوں واپس آیا ہے شہباز؟ تجھے پتا ہے، پہلے میں تیرے اپنے آپ سے جدا ہونے سے بہت ڈرتی تھی۔ مجھے لگتا تھا تم جو میری پہلی اولاد ہو، اگر تم مجھ سے دور چلے گئے تو میرے سارے بچوں کے درمیان جو ایک کشش کا دائرہ ہے وہ دائرہ ٹوٹ جائے گا اور میں اپنے سارے بچوں کے درمیان یہ مقناطیسی کشش برقرار رکھنا چاہتی تھی، مگر جس دن میں نے ظفر کا خاموش وجود گھر میں اترتے دیکھا، اس دن مجھے لگا تمہیں اب پاکستان میں نہیں رہنا چاہیے۔ مجھے لگا ظفر کے وجود کی ساری خاموشیاں تمہارے اندر سما کر تمہیں دیمک لگا دیں گی۔ تم دور چلے جاؤ گے، اس غم کے راستے سے تو خوشیوں کی طرف تمہارے قدم تیز رفتاری سے بڑھتے چلے جائیں گے۔ اس لیے میں نے تمہاری جدائی سہہ لی۔"

"کیا سوچ رہے ہو شہباز؟" کسی نے ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر متوجہ کیا، یک دم جیسے وہ اماں کی گود سے تلخی کی حد تک چلچلاتی ہوئی سچائی میں لا کھڑے کر دیے گئے۔

وہ اماں کے کمرے میں اکیلے بیٹھے ماضی کی کسی شام کے لفظوں سے دل کو ڈھارس دے رہے تھے۔ مگر شازیہ آپا جو ان کی خالہ زاد تھیں اور ان سے آٹھ برس بڑی تھیں، انہوں نے ڈھارس کا یہ کندھا یک دم چھین لیا تھا۔

"اماں نے جاتے وقت کیا کہا تھا؟" کئی برس سے وہ جب بھی فون پر بات کرتے ایک یہ ہی سوال کرتے آ رہے تھے اور آج وہ شازیہ آپا کے بالکل سامنے آکر کھڑے تھے اور ایک بار پھر یہ ہی سوال کر رہے تھے۔

"وہ تمہیں آخری بار دیکھنا چاہتی تھیں، وہ تم سے بہت محبت کرتی تھیں۔"

"مگر مجھے کیوں لگتا ہے، وہ مجھے آخری بار نہیں

دیکھنا چاہتی ہوں گی۔" آخر انھیں مجھ سے ملا ہی کیا تھا' میں کبھی ایک اچھا بیٹا نہیں ثابت ہو سکا۔"

"تم نے اس گھر کے لیے بہت کچھ کیا ہے' جو تم اچھا کر سکتے تھے' وہ تم نے کیا۔"

شازیہ آپا نے انھیں تسلی دی' مگر وہ کیسے مان لیتے کہ جب بھی اماں ان کے خواب میں آئیں' ہمیشہ منہ موڑے خفا خفا سی نظر آئیں' وہ ہمیشہ ان سے باتیں کرتے' مگر وہ چپ چاپ خاموش کھڑی رہتیں اور ظفر چپکے سے آکر ان کے کان میں کہتا۔

"دادو ناراض ہیں' پہلے مجھ سے بھی ناراض تھیں' مگر میں نے تو منا لیا' آپ بھی منالیں۔"

"کیا سوچنے لگے پھر۔" شازیہ آپا نے کندھے پر ہاتھ رکھا اور وہ تھم کر لائے۔

"ظفر کہتا ہے میں اماں کو مناؤں' شازی آپا! کیسے مناؤں' کیا مر جاؤں۔ تو اماں مان جائیں گی۔" شازیہ آپا رونے لگی تھیں۔

"ظفر بہت پیارا بچہ تھا' وہ کبھی کسی کو اتنا مایوس نہیں کرتا تھا۔ یہ صرف تمہارا وہم ہے۔ کہ اماں ناراض ہیں' اسی لیے تمہیں ایسے خواب نظر آتے ہیں' یہ تمہارے اندر کا گلٹ ہے شہباز! ورنہ ایسا کچھ نہیں ہے۔"

"مگر شازی آپا! میں جب آپ کی آنکھوں میں دیکھتا ہوں' مجھے آپ کی آنکھوں میں اماں روتے ہوئے کیوں نظر آتی ہیں' میں جب ان کے پاس آیا تھا' انہوں نے مجھے ایک لفظ بھی نہیں کہا' ناراض تھیں تو غصے ہی میں دھتکار دیتیں' اجنبی کی طرح جو وہ رخصت ہوئیں یوں بھی کوئی جاتا ہے شازی آپا؟"

وہ پتا نہیں کس دکھ کو چھپانے کے لیے کتنے پرانے دکھوں کو یاد کر رہے تھے' شازی آپا ان کے پاس آکر بیٹھ گئی تھیں۔

"وہ خفا نہیں تھیں۔ آخری وقت تک تمہارا انتظار کرتی رہیں' ساری اولادیں ان کے پاس تھیں' مگر انھیں صرف تمہارا انتظار شہباز! میں نے کئی بار تمہیں فون کیا' مگر تمہارا موبائل رومنگ پر تھا اور زینب نے جتنی بار فون اٹھایا' اس نے یہ ہی کہا کہ تم بہت ضروری میٹنگز کی وجہ سے انگلینڈ سے باہر ہو۔ میں مایوس ہو گئی تھی' جب اشعر بھائی کا بیٹا اچانک تم سے امریکہ میں ملا۔ اس نے تمہیں خالہ کی اطلاع دی' قصور تمہارا نہیں تھا شہباز! بس قسمت میں خالہ اور تمہاری آخری ملاقات نہیں لکھی تھی۔"

"ایسا کیوں ہوتا ہے شازی آپا! کہ ہم جن سے زندگی جینا سیکھتے ہیں' جن کے لیے سب سے زیادہ حساس ہوتے ہیں' قسمت جاتے سے ہمارے اور ان کے بیچ اتنی خاموشیاں بھر دیتی ہے کہ ہم چاہ کر بھی اس خاموشی کے دل میں حرارت بن کر نہیں دوڑ پاتے' میں نے کتنا کہا اماں! میں ہوں شہباز! آپ کا شہباز' مگر اماں نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ میرا ایک آنسو ان کا دل پگھلا دیا کرتا تھا' مگر اس دن میں سمندروں رویا تھا' مگر اماں کا دل نہیں پگھلا تھا۔ پتا نہیں کیا خرابی ہے مجھ میں کہ مجھے چھوڑتے ہوئے نہ اماں کا دل پسیجا تھا نہ ظفر کا۔"

وہ اماں کی آرام کرسی کے پاس بیٹھے تھے' بے حال بے کس سے۔ شازیہ آپا کو ان پر بے طرح ترس آیا تھا' تب ہی انھوں نے اماں کی طرح انھیں اپنے سینے سے لگا لیا تھا' وہ روئے جا رہے تھے' یہاں تک کہ پھر وہ خود ہی چپ ہوئے تھے اور اٹھ کر ظفر کے کمرے میں آگئے تھے۔ ظفر کی کتابیں' لکھنے کی میز' ہر چیز ویسی تھی۔ شازیہ آپا روزانہ اس کمرے کی ایسے ہی صفائی کرواتی تھیں' جیسے وہ ابھی کہیں سے آجائے گا اور نئے سرے سے زندگی جینا شروع کر دے گا۔

انھوں نے ہر چیز کو چھو کر ظفر کے نہ ہونے کو محسوس کیا۔ وہ بہت خاموشی سے اس کی دراز میں رکھی تصویریں لے کر بیٹھ گئے تھے۔ ہر تصویر میں وہ' ظفر' مونس اور زینب تھے۔

انھوں نے آنکھیں بند کی تھیں۔ "تمہیں سب سے زیادہ کس سے محبت ہے' مجھ سے یا اپنی ماما سے؟" ظفر کی چمکتی آنکھیں ان پر جم گئی تھیں۔

"مونس سے۔ مجھے سب سے زیادہ مونس سے محبت ہے پاپا!" وہ جان کر سلو بچا گیا تھا۔ دونوں ہی اس کی جان تھے' سو کسی ایک کو رد کرنا' کسی ایک کو منتخب کرنا مشکل تھا۔ مگر انھیں پتا نہیں کیا سوجھی تھی' اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کے کہا تھا۔

"بولو نا میں یا ماما؟"

ظفر کا شوخ چہرہ مرجھا گیا تھا۔ "میرے لیے ہر رشتہ بہت ضروری ہے پاپا! لیکن اگر دونوں میں سے کسی ایک کو چننا پڑے تو وہ آپ دونوں میں سے کوئی نہیں ہوگا' کیونکہ پھر میں جینا ہی نہیں چاہوں گا۔ میری زندگی کی تصویر میں سارے رنگ آپ دونوں سے ہیں پاپا اور اس تصویر کا سب سے شوخ کھلکھلاتا رنگ میرا مونس ہے۔"

شہباز اپنے نویں جماعت کے اسٹوڈنٹ بیٹے کو دیکھتے رہ گئے تھے۔

پھر اس دن ان کا اور زینب کا بہت زبردست جھگڑا ہوا تھا اور اس دن وہ ہر حد پھلانگ گئی تھیں' تب ہی در گزر کر جانے کے بجائے وہ زینب سے لڑ پڑے تھے۔ اپنی اماں کی اس درجہ بے عزتی کو وہ سہہ نہیں پائے تھے اور پھر ایک طویل جھگڑے کے بعد اس دن بنا سوچے سمجھے انھوں نے اپنے ایک دوست وکیل کو فون کیا اور طلاق کے کاغذات بنانے کا کام سونپا تھا۔ وہ یہ بھول گئے تھے کہ بیڈ کے دوسری طرف ذرا سا مونس بھی بیٹھا ہے۔ وہ باہر نکل گئے تھے۔ زینب ناراض ہو کر اپنے گھر چلی گئی تھیں۔ اماں انھیں بہو کو منا کر گھر لانے کا کہہ رہی تھیں۔ مگر وہ غلطی پر نہیں تھے' اس لیے تنے کھڑے تھے۔

پھر اچانک یہ دوسرا دن تھا جب ظفر ان کے کمرے میں آیا تھا۔ "مونس کو دیکھا ہے پاپا؟" وہ آفس کی فائلیں پھیلائے بیٹھے تھے' چونک گئے تھے۔ "کیا مطلب' ابھی رابعہ کے ساتھ تھا وہ۔"

"مگر رابعہ پھوپھو تو کہہ رہی تھیں وہ آپ کے پاس جانے کا کہہ کر ان کے کمرے سے نکلا تھا۔"

وہ یک دم کھڑے ہو گئے اور تیزی سے سیڑھیاں اترے تھے۔ "آپ نے مونس کو دیکھا ہے اماں؟"

وہ اماں کے کمرے تک پہنچے تھے اور ظفر اس وقت تک اسے ڈھونڈنے گھر سے باہر نکل گیا تھا۔

وہ گھر کے ارد گرد اسے ڈھونڈ رہے تھے' پھر آدھے گھنٹے بعد کی بات تھی' انہیں مونس اسپتال کی لابی میں ملا تھا' وہ ایک بالکل انجان شخص کے ساتھ کھڑا تھا۔

"جی میں ہی ہوں شہباز۔" وہ آگے بڑھے تھے اور ان کا جسم اذیت ناک خبر سن کر سن ہو گیا تھا۔

"ظفر!" ایک دکھ کی طرح یہ نام ان کی زبان پر آکر ٹھہر گیا تھا۔

"ایک گاڑی نے ہٹ کیا آپ کے بیٹے کو' وہ اس وقت اس بچے کے پیچھے بھاگا تھا۔ وہ جتنا تیزی سے اس کی طرف دوڑ رہا تھا' اتنی تیزی سے یہ بچہ ان سے دور بھاگ رہا تھا' پھر میں نے دیکھا ایک گاڑی اس بچے کو کچلنے والی تھی کہ اس نے اس بچے کو گاڑی کے سامنے سے ہٹا لیا' مگر وہ خود نہیں بچ سکا۔ بہت زور سے گاڑی نے اچھال کر نیچے پٹخا تھا اس بچے کو میں ہی اسے اسپتال لایا ہوں' ورنہ تو لوگ بس تماشا دیکھتے کھڑے ہوئے تھے۔"

شہباز آئی سی یو کے سامنے کھڑے ہو گئے تھے' وہ دماغی چوٹ کی وجہ سے بے ہوش تھا۔ مونس ان کا کوٹ تھام کر کھڑا تھا۔

"میں نے کچھ نہیں کیا پاپا! میں تو ماما کو ڈھونڈنے نکلا تھا۔ ایک بار چاچو مجھے اپنے ساتھ نانی کے گھر لے گئے تھے۔ مجھے لگا تھا میں خود نانی گھر جا سکتا ہوں' مگر مجھے راستہ یاد نہیں آ رہا تھا' پھر جب میں سڑک کراس کرنے والا تھا اچانک مجھے ظفر بھائی کی آواز سنائی دی۔ وہ زور سے چیخے تھے "مونس یہ غلط کر رہے ہو' رکو میں آ رہا ہوں۔"

میں نے پلٹ کر دیکھا اور پہلی بار مجھے ظفر بھائی سے ڈر لگا۔ میں نے سب کی ڈانٹ اور مار کھائی ہے' مگر ظفر بھائی۔۔۔

مجھے ڈر لگا پاپا! میں اور تیزی سے بھاگنے لگا' مجھے لگا میں نانی گھر پہنچ گیا تو پھر ظفر بھائی غصہ نہیں کر سکیں گے' پھر بس اچانک یہ سب' پاپا میں بے قصور ہوں۔

شہباز صاحب نے اس کی کہانی نہیں سنی تھی' وہ خاموشی سے آئی سی یو میں داخل ہوئے تھے اور روم میں داخل ہونے سے پہلے انہوں نے دو فون کیے تھے۔ ایک دوست کو طلاق کے کاغذات نہ بنانے کے لیے اور ایک فون زینب کے لیے۔

"ہمارا بیٹا اسپتال میں ہے' کیا آپ اب بھی ناراض ہیں؟"

"کون؟" زینب کی بے قرار آواز پر ان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"ظفر۔ زینب آو نا پلیز' آکر اپنے بیٹے سے کہو وہ ہمیں چھوڑ کر نہ جائے' ہمارے سارے خواب اس سے وابستہ ہیں' اگر اسے کچھ ہو گیا تو تمہاری اور میری آنکھیں تو بنجر ہو جائیں گی نا۔" زینب جھگڑا بھلا کر فوراً" اسپتال پہنچی تھیں۔ ظفر نے تیسرے دن آنکھیں کھولی تھیں' مگر اس نے صرف مونس کو پکارا تھا۔ ڈاکٹر کی خصوصی اجازت کے بعد مونس آئی سی یو میں داخل ہوا تھا۔

"خدا کا شکر ہے' تم ٹھیک ہو۔" ظفر نے اس کا ہاتھ چھوا تھا۔ مونس نے ہمیشہ کی طرح اس کی پیشانی چومی اور بس جیسے بلیک وارنٹ کے قیدی کی سزا پوری ہو گئی تھی' کمرے میں ساری مشینیں ایک دم سے شور مچانے لگی تھیں' ڈاکٹرز یک دم روم میں داخل ہوئے تھے اور اسے باہر نکال دیا گیا تھا' مگر باہر کی فضا بہت ناسازگار تھی۔

ماما کی سرخ انگارہ آنکھیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ "اگر آج میرے ظفر کو کچھ ہوا تو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔" پاپا انہیں ساری بات بتا چکے تھے' تب ہی وہ یک دم سہم کر اپنے پاپا کے پیچھے چھپنے لگا تھا۔

پھر پندرہ منٹ بعد ڈاکٹر باہر آیا۔ "آئی ایم ساری سر!" شہباز صاحب یک دم زمین پر بیٹھ گئے تھے اور زینب دیوانوں کی طرح چیخنے لگی تھیں۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے' وہ میرا بیٹا ہے' وہ میرا ظفر ہے' میرے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتا۔ مجھے کیسے چھوڑ کے جا سکتا ہے' ڈاکٹر آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔"

وہ ڈاکٹر سے لڑ رہی تھیں اور شہباز سے چھوٹے عباس نے گھر فون کر دیا تھا' وہ ڈیڈ باڈی کو لے کر جانے کے انتظامات میں لگے ہوئے تھے۔ مظفر بھائی' شہباز کے بہنوئی شہباز کو اپنی گاڑی میں بٹھا کر لے گئے تھے۔ عباس' زینب اور مونس کے ساتھ ڈیڈ باڈی گھر لائے تھے۔

"ظفر!" وہ یک دم سسک اٹھے تھے۔

اور ایک نوعمر تلخ آواز گونجی تھی۔ "ظفر مرا نہیں ہے' اسے قتل کیا گیا ہے' آپ دونوں نے مل کر مارا ہے اسے۔ دن رات کے جھگڑے' ہنگاموں سے تنگ آکر اس نے زندگی اور موت میں سے موت کو قبول کیا' یہ حادثہ نہیں خودکشی ہے ماموں! وہ میرا دوست تھا' ہر روز جب بھی آپ کا مامی سے جھگڑا ہوتا' وہ میرے پاس آکر یہ ہی کہتا۔ میں اس زندگی سے تنگ آگیا ہوں۔ میں مر جانا چاہتا ہوں۔ دیکھ لینا کسی دن برداشت اور صبر کا دامن چھوٹ گیا تو میں خودکشی کر لوں گا۔ ٹوٹے ہوئے گھر کی وراثت اسے قبول نہیں تھی اور ماموں آپ نے اسے واقعی مار دیا۔"

"آفاق! بکواس بند کرو' یہ ساری باتیں پھر بھی ہو سکتی ہیں۔" عالیہ آپا اپنے بیٹے کو چپ کرانے کو چیخی تھیں اور سیکنڈ ایر کے آفاق مصطفیٰ نے چھوٹی ٹیبل کو لات ماری تھی۔

"میرے چپ ہونے سے حقیقت نہیں بدلے گی ماما! میرے دوست کو شہباز ماموں اور مامی نے ہی قتل کیا ہے۔"

وہ لوٹ گیا تھا اور وہ ظفر کے چالیسویں والے دن بہت چپکے سے گھر سے نکلے تھے اور آفاق مصطفیٰ کے کمرے میں داخل ہوئے تھے' وہ انہیں دیکھ کر یک دم تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ظفر کی موت والے دن جو کچھ کہا تھا جو کچھ ہوا تھا' وہ اس کے اندر کا ہیجان جذباتیت تھی۔ اسے خود پتا نہیں تھا وہ کیا کہہ رہا تھا' مگر جب بعد میں اس کی ماما نے اسے بتایا تو وہ چپ رہ گیا تھا' تب سے اب تک ظفر کی موت پر اس نے خاموشی کی ایک چادر تان لی تھی۔

اور آج شہباز ماموں کو دیکھ کر اس کی جان آنکھوں میں کھنچ آئی تھی' وہ اپنے کیے پر نادم اور شرمندہ تھا' زندگی اگر اس کے دوست پر آسان نہیں تھی تو اسے یہ حق کب پہنچتا تھا کہ وہ اس کی موت کو بھی اتنے مشکل زاویہ پر لا کر چھوڑ دیتا۔ وہ جس سوال بھری زندگی سے بھاگتا آیا تھا وہی سوال اس نے اس کی موت کے سرہانے رکھ دیے تھے۔

ظفر کی موت خودکشی تھی کہ حادثہ۔

اور آج وہ ہر روز کے اپنے اندر کے سوال کو لے کر اس کے سامنے بیٹھے تھے۔

"مجھے بتاؤ' وہ ہمارے بارے میں تم سے کس طرح کہتا تھا۔ اس کے لہجے میں۔۔۔ کیا ہوتا تھا' جب وہ میرے حوالے سے بات کرتا تھا۔"

"صرف محبت' وہ آپ سے اور زینب ممانی سے بہت محبت کرتا تھا ماموں۔"

شہباز ساکت اس کپکپاتے سچ اور جھوٹ کے درمیان لٹکتے پورے کو اٹھائے بغیر واپس چلے گئے تھے اور آج اتنے سالوں بعد مونس کی باتیں پھر سے انہیں اس دکھ میں گھسیٹ لائی تھیں کہ وہ اپنے آراستہ پیراستہ گھر سے کسی جوگی کا چہرہ لے کر اس ملک میں واپس لوٹ آئے تھے۔ دوسری صبح رات سے بھی زیادہ اداس تھی' وہ اپنے بھانجے کے گھر بہت خاموشی سے چل پڑے تھے' آفاق اب دو بچوں کا باپ اور ایک کامیاب بزنس مین تھا۔

مگر شہباز ماموں کو دیکھ کر وہ آج بھی کنفیوز ہو کر کھڑا ہو گیا تھا' اس نے سگریٹ بجھا دی تھی اور اپنے اردگرد کے دھوئیں کو ایئر فریشنر سے ختم کرنے کی تگ و دو میں تھا۔

جب انہوں نے اس کا ہاتھ ہولے سے تھاما تھا۔

"تمہیں ظفر کبھی یاد آیا پھر؟" آفاق مصطفیٰ کی آنکھوں میں غم تیرنے لگا تھا۔ "میں اسے کبھی نہیں بھول پایا شہباز ماموں! اس کی ناگہاں موت نے مجھ سے میرا دوست ہی نہیں میرے اندر کا انا پرست مرد بھی مار دیا تھا' میں نے اس کی دکھ بھری موت کی وجہ سے اپنے بچوں کے لیے ہمیشہ ماحول کو سازگار بنائے رکھا' رضیہ مزاج کی بہت تیز ہے' مگر میں اپنے بچوں کے لیے ہمیشہ اس کی باتوں کو درگزر کر دیتا ہوں' لوگ کہتے ہیں میں بے حس ہوں' مگر زندگی کو آسان بنانے کے لیے کبھی کبھی بے حس ہونا بھی پڑتا ہے' اپنے آپ سے لڑ کر کچھ چہروں کی خوشی کے لیے خود کو فنا کرنا ہی پڑتا ہے' تب ہی محبت کامیاب ہوتی ہے۔"

شہباز صاحب کی آنکھوں کا خالی پن یک دم کسی فقیر کی طرح ان کے برابر میں آن بیٹھا تھا۔

"ظفر کو مجھ سے نفرت تھی نا؟"

آفاق مصطفیٰ کی سانس تیز تیز چلنے لگی تھی' پھر اس نے ٹھہر کے کہا تھا۔ "نہیں تو ماموں وہ تو آپ دونوں سے اتنی محبت کرتا تھا کہ اسے لٹریچر میں دلچسپی تھی مگر وہ آپ کی خواہش پر سائنس پڑھ رہا تھا۔"

"ہم نے اس کے خوابوں میں یہاں بھی ڈنڈی مار دی تھی اس نے کبھی نہیں بتایا تھا کہ اسے لٹریچر پسند ہے ورنہ میں کبھی اسے سائنس میں جانے کی صلاح نہ دیتا۔ میں ان والدین کی طرح نہیں تھا جو اپنے خواب اپنے بچوں کی آنکھوں میں ٹھونستے ہیں بے دردی سے یہاں تک کہ جب تک وہ خواب تعبیر پاتے ہیں' تب تک ان کے بچے جینا بھول کر خود کو ایک مشین سمجھنے لگتے ہیں جس کے پروگرامر ان کے ماں باپ ہوتے ہیں۔"

"وہ یہی کہتا تھا کہ آپ اتنے سویٹ ہیں کہ کبھی اس پر اپنی سوچ کا وزن نہیں ڈالیں گے لیکن اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ ویسا ہی بنے اسی راستے پر چلے جس راستے پر آپ نے اپنے خواب بوئے تھے۔"

شہباز صاحب کی آنکھوں میں برسوں پرانے ساون نے دستک دی تھی اور دکھ کی دھوپ سے ان کی روح جل رہی تھی۔ دھوپ میں بارش کی بوندوں کی حدت سے ان سے سانس لینا دشوار لگ رہا تھا تب ہی انہوں نے پوچھا تھا۔

"تم نے کہا تھا یہ حادثہ نہیں خودکشی ہے ایسا کیوں

کہا تھا؟"

"وہ میری بے وقوفی تھی ماموں! ورنہ یہ صرف حادثہ تھا ظفر جیسا انسان خودکشی نہیں کرتا۔" آفاق مصطفیٰ نے نم آلود لہجے میں کہا تھا شہباز صاحب نے اس کی بات پر اس بار یقین نہیں کیا تھا۔

"مجھے بتاؤ۔ میں جاننا چاہتا ہوں۔ آفاق! کیا ہوا تھا۔ اس دن۔ اس دن سے پہلے جو تم یہ کہنے پر مجبور ہوئے۔"

"وہ بہت دل گرفتہ تھا اس نے مجھے فون کیا تھا اس نے بتایا تھا کہ آپ اس کی ماما کو طلاق دے رہے ہیں اور وہ یہ نہیں برداشت کر سکتا۔ وہ کہہ رہا تھا' وہ مر کر آپ کو ایک ساتھ جڑے رہنے کا موقع دینا چاہتا ہے" میں فون بند کر کے اس کے پیچھے آیا تھا اور اس وقت آیا تھا' جب وہ سلیپنگ پلز نگل رہا تھا میں نے اس کے ہاتھ کو جھٹکا دیا تھا۔ وہ چیخ رہا تھا۔ "مجھے مر جانے دیں۔ آفاق بھائی" اور میں اسے گلے سے لگائے روئے جا رہا تھا۔ وہ رات میں نے نانی کے گھر میں گزاری تھی۔ اس دن بھی مامی آپ سے لڑ کر گھر گئی ہوئی تھیں۔ موٹس سو رہا تھا۔ آپ گھر نہیں لوٹے تھے اور وہ تنہا تھا۔ میں نے اس کی تنہائی کو اپنی باتوں سے دور کر دیا تھا۔ بہت سے واقعات سے قرآن و حدیث سے اسے اس عمل سے باز رہنے کی تلقین کی تھی پھر وہ وعدہ کر کے سو گیا تھا۔ دو دن بعد یہ حادثہ ہوا تو مجھے لگا وہ اپنا وعدہ نباہ نہیں سکا اس لیے اس کی میت پر وہ سب کچھ کہہ گیا لیکن ماموں جان آج سوچتا ہوں تو مجھے اس کی ایک عادت بہت یاد آتی ہے۔ کہ وہ وعدے بہت کم کرتا تھا کیونکہ وہ وعدے نبھاتا تھا۔"

شہباز صاحب سر ہلا کر چپ ہو گئے تھے پھر خاموشی سے اٹھے تھے۔ ظفر اور اماں ابا کی قبروں پر فاتحہ پڑھ کر اپنا سامان باندھنے لگے تھے۔

"بس جا رہے ہو شہباز؟" شازیہ آپا نے حسرت سے پوچھا تھا۔

اور کپڑے رکھتے رکھتے یکدم مڑے تھے۔

"ہم سمجھتے ہیں گھر کو بہترین اعلا چیزوں سے بھر دیں' آراستہ پیراستہ گھر میں رہیں آسائشات کو ضرورت کا نام دے کر زندگی سے بھاگ کر پیسے کی دوڑ میں شامل ہو جائیں تو بہت سالوں بعد کھلتا ہے۔ بہت عالی شان گھر خالی رہ گئے ہیں اور وہاں صرف اپنی مادیت کے ساتھ تنہا کھڑے ہیں۔ اس گھر میں دنیا کی ہر چیز موجود ہے' مگر اس گھر میں تنہائی زندگی سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اماں نے "آپا صفیہ' ظفر' عمارہ کوئی بھی نہیں ہے جنہیں میں چھو سکوں' پا سکوں میں اماں اور زینب میں توازن نہیں رکھ پایا شازی آپا! مجھے پتا ہے اماں کو مجھ سے بہت سے گلے تھے' انہیں لگتا تھا میں ان کی نہیں سنتا زینب کی زیادہ سنتا ہوں اور وہ ٹھیک سمجھتی تھیں۔ میں صرف اچھا شوہر بننا چاہتا تھا اور اچھا بیٹا بننا؟ مجھے لگتا تھا۔ میں اگر برا بیٹا ہوں۔ تب بھی اماں کے لیے وہی شہباز رہوں گا۔ لیکن اگر میں برا شوہر ثابت ہوا تو میرا گھر اور بچے سب رُل جائیں گے۔ اس لیے میں کمپرومائز کرتا رہ گیا۔ یہاں تک کہ ظفر کی موت کے بعد وہ جو ایک ہلکا سا احتجاج کا عنصر بچا تھا مجھ میں وہ بھی ختم ہو گیا اور پھر سب ہی کچھ ختم ہو گیا شازی آپا! میں تو کہیں کا نہیں رہا۔"

"نہیں شہباز! تم نے اپنے گھر کو بچانے کے لیے جو کیا۔ اماں بھی جانتی تھیں۔ صفیہ بھی تم سے ہمدردی رکھتی تھیں میں نے ان کے آخری وقت میں تمہارا نام لے کر کہا تھا انہوں نے' آپ کی کوتاہی معاف کی تھی وہ جو دنیا میں کانٹا چبھنے پر آپ کے لیے تڑپ اٹھتی تھیں کیسے ممکن تھا کہ آخرت کے لیے آپ کو مورد الزام لوگوں میں کھڑا ہوتے دیکھ سکیں۔"

شہباز پھر بہت مدھم لہجے میں بولے تھے۔

"لوگ کہتے ہیں اہرام مصر انہیں متوجہ کرتا ہے کچھ لوگوں کے لیے وہ عبرت' کچھ کے لیے فینٹسی اور کچھ کے لیے جستجو' سب اس کی مسٹری کی طرف دوڑتے ہیں کہ وہاں کیسے لوگ رہتے تھے مگر ہم جن کے ساتھ رہتے ہیں۔ انہیں پتا نہیں کیوں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ انہیں توجہ نہیں دیتے اور خاک اڑاتے ویرانوں میں دوڑ جاتے ہیں شازی آپا! پتا نہیں ہم سب کے بعد

اس گھر میں کوئی دیا جلانے والا ہو گا بھی یا یہ عالی شان گھر کسی اہرام مصر کی خاموشی جیسا اجاڑپن اور حسرت لے کر تنہا کھڑا رہے گا۔"

"ایسا نہیں ہو گا شہباز! یہاں خالہ نے محبت بانٹی' محبت بچی تھی اور محبت تقسیم کرنے والے لوگ بھی ویران ہوتے ہیں نہ ان کے گھر اجاڑ ہوتے ہیں۔"

شہباز ایک خوش گمانی کا شگن لے کر واپس لوٹ گئے تھے اور اپنی ایک ایک روداد ڈائری میں لکھی تھی یہی ڈائری موٹس کی ٹیبل پر پڑی تھی جسے پچھلے ہفتے ہی اس نے پاپا کے اسٹڈی روم سے چرا کر پڑھی تھی۔

وہ پندرہ بیس دن اس کے لیے اذیت بھرے تھے۔ ماما اپنی ہر پرابلم کی وجہ اسے ہی سمجھتی تھیں اور وہ جو سامیہ کے لیے کچھ اچھا کرنا چاہتا تھا' ماما اس کے خلاف اتنا سخت ایکشن لیتی تھیں کہ اس کے لیے زندگی گھر کے بجائے گھر سے باہر رہ گئی تھی عمر اور ارم' ماما کے رویے کی وجہ سے اس سے دور رہتے تھے وہ اگر ان کے لیے ظفر جیسا بھائی بننا بھی چاہتا تو وہ ان کے رویے ناکام کر دیتے یہی وجہ تھی اس کے ارد گرد تنہائی کا ایک طویل صحرا تھا اور اس لمحے اس صحرا میں وہ تنہا بیٹھا تھا ظفر بھائی کی تصویر اس کے سائیڈ ٹیبل پر رکھی ہوئی تھی جس طرح ایک بچے کو ماں کی گود یاد آتی ہے اسے ظفر بھائی یاد آ رہے تھے۔

"کاش! اس دن آپ نہیں میں زندگی ہار جاتا' کم از کم ماما مجھے دل سے روتیں۔ اب میں زندگی کے اس کنارے پر کھڑا ہوں' کوئی بھی لمحہ مجھے زندگی کے اس پار لے جا سکتا ہے مگر ظفر بھائی کی موت سے زیادہ تلخی ہے میرے لیے' کہ مجھے یہاں کوئی ایک لمحے کے لیے نہ روئے گا' اور بھول جائے گا' بس میرا کمرہ کبھی کبھی مجھے اپنے اکیلے پن سے گھبرا کر یاد کیا کرے گا۔"

اس کی آنکھ کا نم چہرے پر پھیل گیا تھا۔ پھر وہ کچھ اور سوچنا چاہتا تھا کہ اچانک اس کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔

"ماما! کیا آپ کے دل میں' میری ذرا سی گنجائش ہے۔" اس کا دل زور زور سے دھڑکا تھا جب اچانک زینب شہباز نے ڈائری پر جھپٹا مارا تھا۔

"تمہاری یہ جرأت کہ تم چیزیں بغیر پوچھے اٹھا لیتے ہو۔"

"اخلاق سے تمہارا تو دور کا بھی تعلق نہیں' تمہیں پتا ہے پچھلے ایک ہفتے سے تمہارے پاپا اپنی یہ ڈائری ڈھونڈ رہے ہیں۔ ہر روز مجھ سے پوچھتے ہیں ملی اس کی گمشدگی سے اتنا اداس اور پریشان میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا' تمہیں کسی کی تکلیف کا بھی احساس نہیں ہوتا ہے۔"

"آپ کا صرف ایک پرابلم ہے ماما! آپ کو پرانی چیزوں کو اہتمام کر کے سنبھال کر رکھنے کی عادت ہے' اس ڈائری کے لیے آپ جتنا مجھ سے لڑ رہی ہیں کبھی اپنی ضد اپنی انا اپنی خود پسندی سے لڑا تیں تو شاید ہمارے گھر کا دن ایک طلوع ہوتے سورج کی کرن جیسا ہوتا' ہم الگ الگ زندگی سے ہارے ہوئے لوگوں کی طرح نہیں جیتے بلکہ واقعی زندگی جیتے۔"

اس نے تھوڑا سا توقف کیا پھر اسی ٹون میں بولا۔

"مگر آپ کو قبروں پر دیے جلانے کی ایسی عادت ہے کہ زندگی کبھی آپ سے چاہے بھی تو دوستی نہ کر پائے مجھے پتا ہے میں ابھی آپ کو یاد نہیں آؤں گا مگر جب مٹی میں مٹی ہو کر مل جاؤں گا تو آپ مجھے بھی ظفر بھائی کی طرح یاد کیا کریں گی' رویا کریں گی آپ کو اداسی اور دکھ سے لگاؤ ہے ورنہ زندگی اتنی بے رنگ نہ ہوتی۔"

زینب شہباز نے غصے سے اسے دیکھا تھا۔ "مجھے نہیں پتا تھا کہ تم اتنے بدتمیز ہو گئے ہو تمہارے پاپا کو تمہارے بارے میں نئے سرے سے بریف کرنا پڑے گا مجھے۔" اس نے کچھ نہیں کہا تھا اور لائٹ آف کر کے لیٹ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

زینب شہباز ڈائری کمرے میں اٹھا لائی تھیں پھر جیسے جیسے وہ صفحے الٹتی گئیں' ان کی ذات کے سارے پتھر ایک ایک کر کے اپنی جگہ چھوڑنے لگے تھے' وہ تو بہت مضبوط تعمیر تھیں زندگی میں کہیں بھی کسی مقام پر

انہوں نے ہار نہیں مانی تھی۔ ہر جگہ شہباز صاحب جھکے تھے اور وہ ہر بار اپنی جیت کو پہلے سے زیادہ مستحکم کرکے لوٹی تھیں' زندگی میں اگر واقعی کسی دکھ کو دل میں جگہ دی تو وہ ان کا لاڈلا بیٹا تھا مگر آج کھلا تھا۔ وہ اس بیٹے کے سامنے کتنی بڑی لوزر تھیں۔ انہیں آج اپنی ماں بہت یاد آئی تھیں۔ جنہوں نے انہیں جب بھی کوئی سبق دینے کی کوشش کی تب انہوں نے اپنے لفظوں سے ان کو رد کردیا تھا اپنی بے بسی کے ایسے نقشے کھینچے تھے کہ وہ نہ چاہتے ہوئے انہیں سپورٹ کرنے پر مجبور ہوگئی تھیں۔ "لڑکی کو گھر سے سپورٹ ملے تو وہ اپنا گھر کبھی نہیں بناتی شہباز بہت سنجیدہ اور نفیس انسان ہے اپنی زینب میں صبر حوصلہ اور برداشت نہیں ہے راحت صاحب۔"

اماں کے یہ الفاظ وہ ایک نہیں کئی بار ٹریک قسم کے دوروں میں دوہرا چکی تھیں اس سے قبل انہیں اپنی غلطی کا احساس نہ ہوا تھا۔ اتنی سچی اور خالص نفرت کا پڑھ کر ان کی چیخیں نکل گئی تھیں۔

"ظفر" وہ زمین پر بیٹھی آج سر پر ہاتھ رکھ کر رو رہی تھیں۔

عمر اور ارم کہیں گئے ہوئے تھے۔ شہباز صاحب آفس میں تھے صرف مونس ہی تھا جو اٹھ کر ان تک آیا تھا۔

"آپ نے کیوں پڑھی یہ ڈائری آپ کو نہیں پڑھنا چاہیے تھی ماما۔" اس نے انہیں بازوؤں میں بھرا تھا اور وہ ذہنی طور پر اتنی ابتری کا شکار تھیں کہ انہوں نے اس کے ہاتھ نہیں جھٹکے تھے۔

"ماما آپ بیڈ پر بیٹھیں میں آپ کے لیے پانی لاتا ہوں۔" انہوں نے اسے جانے نہیں دیا تھا ہاتھ تھام لیا تھا پھر ٹوٹے لہجے میں بولی تھیں۔

"کیا واقعی ظفر مجھ سے نفرت کرتا تھا اتنی نفرت کے زندگی کو گنوا دینا چاہتا تھا۔؟"

خالی آنکھیں اس پر جمی تھیں تب ہی اس نے ان کا سر اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔ "نہیں ماما! ظفر بھائی کو کسی سے بھی نفرت نہیں تھی ان کے دوست اور سارے کزنز سے پوچھ لیں انہوں نے کسی ایک سے بھی کبھی نفرت نہیں کی۔ وہ صرف محبت کی مٹی سے گوندھ کر بنائے گئے تھے انہیں صرف محبت کرنا آتی تھی۔ وہ سب کے ساتھ یکساں دل سے ملتے تھے ماما! وہ سب جذباتی باتیں تھیں ایسی باتیں تو میں بھی اکثر کر جاتا ہوں مگر تمام تر نفرت کے باوجود آپ کا دل جانتا ہے میں آپ سے کتنی محبت کرتا ہوں' مری زندگی میں آپ اور پاپا کے سوا ہے ہی کیا جیسے ظفر بھائی کے لیے آپ پاپا اور میرے سوا کچھ نہیں تھا۔"

وہ کچھ نہیں بولی تھیں سر تکیے پر رکھ کر لیٹ گئی تھیں۔ وہ انہیں تنہا رہنے کا موقع دینا چاہتا تھا سو آہستگی سے ان کے کمرے سے باہر آگیا تھا اور زینب شہباز کے سرہانے جیسے اماں آکر بیٹھ گئی تھیں۔

"مت لڑا کر اپنے شوہر سے' اتنا تو خیال رکھتا ہے تیرا۔"

اور ان کی جوانی ان کے بڑھاپے سے لڑ پڑی تھی۔ "کب رکھتے ہیں وہ میرا خیال آج تک ایک بھی سکھ نہیں ملا مجھے ان سے۔" اماں نے کانوں کو ہاتھ لگائے تھے۔

"توبہ کر زینب! ناشکری نہ کیا کر اللہ کو یہ سب پسند نہیں' میرے آقا کا فرمان ہے عورتیں اسی لیے جہنم میں جائیں گی کہ جب تک سکھ ملتے ہیں تو خوش رہتی ہیں ایک بھی تکلیف شوہر سے ملتی ہے تو کہتی ہیں ہمیں آج تک کوئی سکھ نہیں ملا تم سے تو تو قرآن پڑھی ہوئی ہے۔ پھر جہالت کی باتیں کیوں کرتی ہے۔ شہباز بہت پیارا انسان ہے گھر میں ترتیب و توازن چاہتا ہے اس پر گھر میں بڑا ہونے کی وجہ سے بڑی ذمہ داریاں ہیں اس لیے تجھے وقت نہیں دے پاتا مگر جب فارغ ہوتا ہے تو اڑ کر تیرے اور بچوں کے پاس ہی آتا ہے۔ پھر تو کیوں شکوے لے کر بیٹھ جاتی ہے' جو مرد دھوکے باز ہوتا ہے نا وہ آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات نہیں کرتا کیا کبھی شہباز نے تجھ سے منہ موڑ کر اپنی مصروفیات گنوائی ہیں؟"

زینب شہباز نے سر جھکا لیا پھر سر اٹھایا تو وہی یقین

تھا۔

"نہیں پتا ہے میں غصے کی تیز ہوں تو وہ اپنا غصہ ختم نہیں کرسکتے۔"

"مرد غصہ کبھی ختم نہیں کرتا۔ عورت کو ہی دھیما ہونا ہے۔ وہ تیرے گھر نہیں آیا تو اس کے گھر گئی ہے پھر کبھی ظفر اور مونس کو دیکھا ہے ہر وقت کتنے سہمے ہوئے ڈرے ہوئے رہتے ہیں۔" اماں نے نئے سرے سے سمجھایا مگر وہ۔

"ظفر سمجھ دار بچہ ہے دیکھنا وہ چند سال بعد اتنا مضبوط سہارا ہوگا میرا کہ پھر شہباز چاہیں بھی تو مجھ سے تیز آواز میں بات نہیں کرسکیں گے۔"

"ماں باپ اور بیٹے کو ایک دوسرے کے مخالف کھڑا کرے گی تو بھی تیرا ہی گھر برباد ہوگا' دونوں میں سے کسی ایک کو چننا آسان نہیں' اور جب محبت رشتوں کے بیچ رہ جائے تو ہی گھر بنتا ہے زینب۔" اماں کہہ کر چلی گئیں اور شام کو زینب کی بھابھی سمجھانے آگئی تھیں۔

"تمہیں پتا ہے ماں باپ کی لڑائی سے بچوں پر کتنا برا اثر پڑتا ہے ان کی شخصیت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوجاتی ہے ایسے بچے جن کو والدین کی طرف سے مضبوط سپورٹ نہیں حاصل ہوتی وہ اپنی بقا کی جنگ کے لیے پھر ہر غلط اور صحیح کو اپنی زندگی میں اپلائی کرتے ہیں وہ ڈاکو بھی ہوسکتے ہیں اور معاشرے کے سب سے کرپٹ انسان بھی۔"

"بھابھی پلیز فضول باتیں مت کریں مجھ سے کیا میں نہیں جانتی کہ آپ اور بھائی کتنا لڑتے ہیں۔" وہ غصے میں ہر حد پھلانگ جاتی تھیں انہوں نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہم لڑتے ہیں مگر بچوں کے سامنے کبھی نہیں لڑتے ہماری لڑائی بیڈ روم کے اندر ہوتی ہے۔ باہر ہم ایک دوسرے کو عزت دیتے ہیں اور بچے ہم سے ہی سیکھتے ہیں۔"

وہ منہ پھیر کر ٹی وی آن کرکے بیٹھ گئی تھیں تب بھابھی نے اپنی زندگی کا کٹھن کام کیا تھا ان کا ہاتھ تھام کر ان کی ساری بدتمیزی پر اسی نرمی سے کہا تھا۔

"مونس کتنا چھوٹا ہے مگر تم نے دیکھا ہے وہ رویوں میں سے پیار' نفرت اور بے توجہی کو کتنی جلدی مارک کرنے لگا ہے اگر ایسا ہی رہا تو زینب یہ بچے اپنی عمر سے بہت پہلے کم سنی کی عمر پھلانگ جائیں گے اور ایسے بچے جو کم سنی سے یکدم عمر رسیدگی میں چلے جاتے ہیں' ان کی زندگی میں سب کچھ ہو تب بھی زندگی کی بے رنگی' تلخی ختم نہیں ہوتی۔ اکیلا پن' غیر محفوظ ہونے کا احساس انہیں دل سے ہنسنے نہیں دیتا' کیا تم چاہتی ہو تم ایسے بچوں کی ماں کہلاؤ؟"

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا' ان کے اور بھابھی کے درمیان خاموش چپ آکر بیٹھ گئی تھی اور اتنے سالوں بعد یہ خاموشی لفظ بنی تھی تو کتنا زہر تھا اس کے لہجے میں۔ انہوں نے ڈائری شہباز صاحب کے اسٹڈی روم میں رکھ دی تھی اور خاموشی سے بستر پر آکر لیٹ گئی تھیں۔ آنسو تھے کہ رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

"تمہیں وقت گزرنے کے بعد ہی کیوں عقل آتی ہے زینب۔" بڑے بھیا کا افسوس ان کے ارد گرد بکھرنے لگا۔ انہوں نے کتنی محنت اور کتنی جدوجہد کے بعد شہباز کی زندگی پر تصرف حاصل کیا تھا۔ ایسا تصرف کہ وہ ان کی آنکھوں سے دیکھتے تھے ان کی کہی سنتے تھے مگر اس ڈائری کے ہر لفظ میں موجود تاسف نے انہیں آسمان سے زمین پر پٹخ دیا تھا' صرف اپنا گھر بچانے کے لیے وہ زینب شہباز کو برداشت کرتے آئے تھے۔

اور وہ ظفر اس میں تو ان کی جان بند تھی مگر وہ بھی اپنی ماں کو ناکام لوگوں کی صف میں لے جاکر کھڑا کرچکا تھا اور ایک یہ مونس ہے یہ بھی پتا نہیں کیا سوچتا ہے میرے بارے میں۔

آج پہلی بار ان کے دل یہ بات آئی تھی کہ وہ جانیں کہ مونس ان کے بارے میں کیا سوچتا ہے۔

وہ لیٹے سے اٹھ کر یکدم بیٹھ گئی تھیں اور انہیں لگا تھا ان کی ساس ان کے سامنے آکھڑی ہوئی ہیں۔

"کیا ملا زینب تمہیں ایسا کر کے؟ بیٹا چھین لیا تھا تو بھی دل نے کوئی دہائی نہیں دی' کیا ہو تا اگر جاتے سے میں اپنے بیٹے سے دو گھڑی بات کر لیتی"' وہ ایک خاموش بے ضرر عورت تھیں' وہ خود سے مکالمہ کر رہی تھیں۔ اب وہ اپنی تین جوان اولادوں کا دکھ دل میں محسوس کر رہی تھیں۔ "تم نے اپنے جوان بیٹے کی موت کا دکھ سہا مگر پھر بھی تمہارا دل نرم نہ ہوا سخت ہو کر پتھر ہو گیا۔ ایک عورت پتھر کیسے ہو سکتی ہے؟ زینب عورت کے دل کو تو خدا نے گداز اور نرم بنایا مگر تم نے اچھا نہیں کیا۔" انہوں نے کمرے کی لائٹ آن کر دی تھی۔

اندر کا ڈر تھا نہیں باہر آ کر کیوں بیٹھ گیا تھا شاید جذباتی طور پر آج سے پہلے وہ اتنی کمزور نہیں پڑی تھیں کیونکہ وہ بزعم خود اپنے شوہر کی محبوب بیوی اور ظفر کی محبت کرنے والی ماں تھیں مگر آج یکدم کسی نے ان کے ہاتھ سے سب کچھ چھین لیا تھا وہ کمزور اور کنگال کھڑی تھیں۔

بیڈ پر تکیہ کمر کے پیچھے رکھے وہ بالکل بے جان بیٹھی تھیں۔

"ماما! آپ کیسا فیل کر رہی ہیں میں نے پاپا کو فون کیا تھا مگر ان کا نمبر بزی جا رہا ہے وہ آفس میں ہیں ابھی تک۔"

"مونس دوبارہ کیوں آیا تھا' کیا وہ ان کی کم مائیگی ان کے دکھ کا تماشا دیکھنے آیا تھا کہ ایک دم سے آسمان سے زمین پر گرنے سے کیسی تکلیف ہوتی ہے۔"

پتا نہیں مونس سے وہ کوئی اچھی سوچ کیوں وابستہ نہیں کر پاتی تھیں' حالانکہ ان کی باقی اولادوں میں وہ ان کا سب سے فرماں بردار بیٹا تھا۔

آج پہلی بار انہوں نے اس کا چہرہ بغور دیکھا تھا۔

"ماما! میں فضہ آنٹی کو بلاؤں وہ آپ کو بہت اچھے سے سمجھتی ہیں۔"

اس نے زینب شہباز کا سیل فون اٹھایا تھا اور وہ اس کی بے قراری دیکھ رہی تھیں' رات کے بارہ بجے ان کا شوہر آفس میں اپنی فائلوں کے ساتھ گم تھا۔ ان کا عزیز بیٹا دوستوں میں موج مستی کے لیے نکلا ہوا تھا ارم کے دوست کی دو دن بعد شادی تھی اور وہ اس کے گھر ٹھہرنے گئی تھی اور ان کے لیے وہی تھا جو پریشان کھڑا تھا۔

وہ ایک ایسا بچہ تھا جس کو انہیں یاد نہیں پڑتا کبھی نرمی سے دیکھا ہو یا ممتا سے چھوا ہو۔

"مونس آپ کو مجھ سے بھی زیادہ چاہتا ہے ماما۔"

ایک بار ظفر نے اپنے ناز اٹھاتی ہوئی ماں کو جتاتے ہوئے عجیب سے لہجے میں کہا تھا' تب انہوں نے اتنے غور سے پردے کو تھامے کھڑے مونس کو نہیں دیکھا تھا' مگر کیا واقعی وہ ہمیشہ سے ظفر کے ہوتے ہوئے مونس کو اہمیت نہیں دیتی تھیں' کئی واقعات ایک ساتھ یاد آ گئے تھے ہر واقعہ میں مونس شہباز اکیلا کھڑا تھا' اور اس کی زبان پر حرف احتجاج تک نہ ہوتا تھا پہلے ظفر کی وجہ سے وہ اس کی طرف متوجہ نہ ہو سکیں اور ظفر کی موت کے بعد وہ خود بخود ان کی زندگی کے کینوس سے صاف ہو گیا تھا۔

"ماما مجھے خبر ہے تین دن بعد میرا آپریشن ہے۔" کئی مہینے پہلے کی بات یکدم انہیں پھر سے یاد آ گئی تھی۔ "یہ شخص ایک وہم ایک خوش گمان خیال کا دامن تھامے کھڑا تھا۔ اگر کوئی اجنبی ہوتا تو کیا ان کا دل نہ کھینچتا پھر یہ تو ان کے اپنے وجود کا حصہ تھا مگر اتنے سالوں کی جو خاموشی اور لفظوں کی تلخی ان کی طرف سے اس رشتے میں گھل چکی تھی وہ کیسے اسے مٹھاس میں بدلتیں۔

"فضہ آنٹی کا نمبر بند ہے ماما۔" وہ ان کی سوچوں سے دور اب بھی صرف ان کے لیے ہراساں تھا۔

"مونس! بہت وقت سے انہوں نے کہا۔

اس نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ اتنی محبت سے کب ان لبوں نے اسے پکارا تھا۔

"خیریت ہے ماما۔"

"تم جا کر سو جاؤ۔ میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔" وہ یکدم ٹھہر گئی تھیں۔

اس کے لہجے نے انہیں سمجھا دیا تھا اگر وہ کمزور بن کر اس کے سامنے آئیں گی تو وہ کہیں اتنے برسوں کی تلخی کا بدلہ ان کی انسلٹ کر کے نہ لے اور آج رات وہ وہ اتنے قریب ترین رشتوں کے ان پر کیے گئے کمنٹ کو سہہ نہیں پا رہی تھیں۔

"تمہارے سر میں بہت درد ہے؟" انہوں نے نرمی سے کہا وہ ابھی تک خاموش کھڑا تھا' ان کے کہنے کے باوجود اپنی جگہ سے ہلا نہیں تھا اور ان کا دل اس درجہ توجہ پر پھر سے ممتا سے بھر آیا تھا۔

ممتا کا گوشہ تو شاید شروع سے تھا' ظفر کی موت سے پہلے بھی ظفر کی موت کے بعد بھی مگر لفظوں میں بس سفاکی در آئی تھی پتا نہیں کیوں شاید وہ اس طرح احتجاج نہیں کرتا تھا جس طرح کے احتجاج سے کوئی وجود اپنے ہونے کا یقین دلا سکتا تھا۔

"پہلے بہت تھا ماما! مگر ابھی میڈیسن لی ہے تب کہیں تھوڑا درد کم ہے۔"

"تو ادھر بیٹھو۔" انہوں نے دل میں کہا زبان سے نہیں اور وہ مایوس سا ہو گیا' اسے لگا تھا کوئی ذرا سا وہ بچہ محبت کا اس کے لیے کھلا تھا مگر ماما کا رویہ ابہام پیدا کر رہا تھا۔

اس نے زینب شہباز کو سلیپنگ پلز دی تھی پھر ہولے سے ان کے رویے سے بے نیاز ہو کر ان کی پیشانی چوم کر بولا تھا۔

"اب بھول جائیں ماما! آپ پاپا کے لیے اچھی وائف اور ظفر بھائی کے لیے بہت محبت کرنے والی ماں ہیں۔"

"اور تمہاری۔ تمہاری کیسی ماں ہوں میں۔؟" ان کا دل چاہا۔ وہ یکدم اس کا ہاتھ تھام کے پوچھیں مگر تھکا ہوا دماغ جانے کب نیند کی وادی میں اتر گیا تھا' پھر صبح جب ان کی آنکھ کھلی تو شہباز پہلے سے جاگے ہوئے تھے ٹی وی دیکھنے کے ساتھ ساتھ چائے پی رہے تھے۔

"آ جاؤ۔ بہت مزے کا پروگرام چل رہا ہے' پاکستانی رسم و رواج شادی بیاہ کے گیت کی تفہیم کے ساتھ دکھا رہے ہیں۔ ایک ہفتے پہلے ہی تم مونس کی شادی کی بات کر رہی تھیں ناں۔"

وہ سست قدموں سے چلتے ہوئے ان کے برابر صوفے پر آ کر بیٹھ گئی تھیں اور ان کا سویا جاگا دماغ حیران تھا' انہوں نے اتنی کدورت کے باوجود مونس کی زندگی کے بارے میں کب اور کیسے سوچ لیا تھا۔

"تمہاری آنکھیں اتنی سرخ کیوں ہو رہی ہیں زینب؟" اور زینب شہباز پھر سے آنسوؤں میں بھیگ بھیگ گئی تھیں۔

"ظفر یاد آ رہا تھا پھر؟" شہباز صاحب نے اندازہ لگایا اور وہ خاموشی سے ان کے کندھے سے ٹک کر ہولے سے سر ہلا کر رہ گئیں؟

اور شہباز صاحب نے انہیں دیکھ کر نرمی سے کہا۔

"اسے تم یا میں بھلا ہی کب پائے ہیں کہ وہ ہمیں یاد آئے وہ تو ہر لمحہ ہمارے اندر ہمارے ساتھ جیتا ہے زینب۔"

اور جب وہ یہ سب کہہ رہے تب مونس یکدم ایک بیگ کاندھے پر ڈال کر ان کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

"کیا آپ میرے ساتھ چلیں گے پاپا۔؟"

"کہاں جانا ہے وہ بھی اتنی صبح صبح؟" وہ حیران ہوئے۔

اور مونس بہت مدھم ہو کر بولا۔

"تین دن بعد میری سرجری ہے برین ٹیومر کی وجہ سے۔"

شہباز صاحب کے ہاتھ سے کپ چھوٹ گیا تھا اور زینب شہباز نے اس خبر کو ایسے سنا وہ جیسے پہلی بار سن رہی ہوں۔

"تم نے ایک مرتی ہوئی ماں سے اس کے بیٹے کو ملنے نہیں دیا' دیکھ لینا وقت تمہیں اس عمل کی کتنی سخت سزا دے گا۔ اتنا کٹھور تو کوئی سفاک قاتل بھی نہیں ہوتا جتنی تم ہو زینب!"

کبھی شازیہ آپا کے کہے لفظوں نے ان کے اندر بھنور ڈال دیے۔

"یہ سزا ہے کہ ایک بیٹا چاہتے ہوئے اپنی مرتی ہوئی ماں سے نہیں مل سکا اور میں اس شخص کے سامنے ہوں یہ جو میرا بیٹا ہے میرے وجود کا حصہ ہے میں چاہ کر بھی اس کا ہاتھ تھام کر یہ نہیں کہہ سکتی مت جاؤ۔ میں

تم سے ایک ماں کی طرح ہی شدت سے محبت کرتی ہوں۔"

"ایک ماں دوسری ماں کو بددعا نہیں دے سکتی۔" ان کا دل کرلایا تھا اور شہباز صاحب نے ان کا بازو بھینچ کر پھر سے کہا تھا۔

"زینب! تم نے سنا مونس کیا کہہ رہا ہے؟"

اور مونس شہباز نے دکھ سے کہا تھا "وہ جانتی ہیں پاپا! مگر انہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا" میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ آپ کو بھی کوئی فرق پڑتا ہے کہ نہیں 'اس لیے ایک دوست کو بھی اسٹینڈ بائی پر رکھا ہے' پہلے میرا ارادہ تھا وہ ہی مجھے ہسپتال لے جائے مگر پھر میں نے سوچا میں آپ کو بھی اطلاع کردوں کیونکہ آپ کو مجھ سے ویسے ہی شکایتیں ہیں کہ میں اپنی مرضی بہت کرتا ہوں۔"

لمحہ بھر کو رکا پھر بولا۔" سامیہ میرے ساتھ ہے اگر میں آپریشن ٹیبل سے واپس زندہ نہ آسکا تو اس کو میں نے اپنی تدفین کا اختیار بھی دے رکھا ہے آپ چاہیں تو شریک ہوجایئے گا" ورنہ کوئی مسئلہ نہیں۔ اکیلا جینے والا انسان اکیلا مر بھی سکتا ہے کیونکہ اکیلے پن کا دکھ تو صرف زندگی تک کا ہوتا ہے ناپاپا۔"

شہباز صاحب یکدم اٹھ کر اس کے قریب آگئے تھے پھر بہت خفگی سے بولے۔

"مونس! تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے' تمہیں کس نے کہا۔ مجھے تم سے محبت نہیں۔"

"مجھے آپ نے یہ احساس کب دلایا تھا پاپا کہ آپ میرے بھی ہیں مجھے تو لگتا تھا آپ صرف عمر' ارم کے پاپا ہیں' اسکول ہو یا زندگی ہر جگہ میں اکیلا چلا ہوں یا صرف ظفر بھائی کی محبت تھی جس نے مجھے تھامے رکھا ورنہ کتنی بار زندگی کی تلخی کو ایک ہی گھونٹ میں پی جانے کو دل کرتا تھا آپ کو پتا ہے میری دراز میں سلیپنگ پلز' ریوالور اور زہر ہر وقت موجود رہتا تھا۔ مگر میں زندگی پر اور زندگی بنانے والے کی محبت پر اندھا یقین رکھتا تھا۔ اس لیے آج تک حرام موت مرنے کی کوشش نہیں کی مجھے لگتا تھا کبھی تو زندگی میری کتاب میں محبت کا باب رقم کرے گی کبھی تو میں بھی آپ کو یاد آؤں گا مگر اتنے برسوں بعد مجھ پر کھلا ہے محبت میرے لیے نہیں بنائی گئی۔"

شہباز صاحب نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا "بدگمانی مت کرو' تم جانتے ہو تمہارا دل بھی جانتا ہے مجھے تم سے کتنی محبت ہے مونس۔"

مونس نے چونک کر شہباز کی صاحب طرف دیکھا تھا یہی جملہ اس نے ہام سے کہا تھا۔ اس کے پاپا اس کی طرح سوچا کرتے تھے۔

"ہم جو سوچتے ہیں ایک دوسرے کے لیے' وہ ہم کہتے کیوں نہیں پاپا۔ ہم انتظار کرتے کرتے خود بھی تشنہ کام رہتے ہیں کسی اور کو بھی تشنہ کام مار دیتے ہیں۔"

پاپا نے کچھ نہیں کہا تھا اور اسے خود سے لپٹا لیا تھا اور زینب شہباز یکدم اٹھ کر کہیں اندر گم ہوگئی تھیں۔

"ماما آخری بار بھی مجھے پیار نہیں کریں گی پاپا؟"

"آخری بار کیوں' بہت پیار کریں گی ہم نے کبھو نہیں سوچنا ہے مونس۔"

پاپا اسے لے گئے تھے اور وہ فون پر شازیہ آپا سے معافیاں مانگ رہی تھیں۔

"ماں! مجھے بددعا نہیں دے سکتیں۔ کہہ دیں نا شازیہ آپا! وہ میرا مونس آج اس کا آپریشن ہے۔ برین ٹیومر ہے اسے' دور میں جاہ کر بھی اسے اپنے سینے سے لگا کر اس کو اپنی ممتا کا حوصلہ نہیں دے سکی 'ماں تو بہت محبت کرنے والی روح تھیں نا پھر مجھے کیوں بددعا دی۔"

شازیہ آپا اطلاع پاکر ہراساں ہوگئی تھیں۔

"کوئی ماں دوسری ماں کو بددعا نہیں دے سکتی تم گھبراؤ مت۔ یہاں ہیں نا اتنے سارے لوگ اس کے لیے دعا کرنے والے تم بھول جاؤ پرانی باتیں' نئی طرح سے جینا شروع کرو' جاؤ اسے گلے لگا کر کہو۔ تم اس سے کتنا محبت کرتی ہو' وہ تمہیں چھوڑ کر نہیں جاسکے گا۔ تمہاری محبت کی کشش اسے جانے ہی نہیں دے گی۔ زینب دیر مت کرو۔ فوراً جاؤ اس کے پاس۔"

انہوں نے فون رکھا تھا اور جھپکے سے سیڑھیاں اترنے لگی تھیں۔

کار شہباز صاحب ڈرائیو کررہے تھے ان کا رخ ہسپتال کی طرف تھا اور وہ تھا ہر چیز کو پہلی بار کی طرح دیکھ کر آخری بار کی طرح وداع کررہا تھا "ہم زندگی میں جب تک جیتے ہیں ہمیں لگتا ہے ہم جیتے رہیں گے' سو ہمیں ہر چیز بے معنی لگتی ہے لیکن ہمیں پتا چل جائے زندگی ہمارے ہاتھوں سے پھسل رہی ہے' ریت کے ذروں کی طرح چھن رہی ہے' آخری کمائی کی طرح تو ہمیں زندگی کی ہر بات میں ایک نئی بات لگتی ہے۔ سو ہم ہوا' زندگی ہر چیز خود سے باتیں کرتی محسوس ہوتی ہے نا پاپا۔"

"ایسے مت بولو تمہیں زندگی کا یہ معرکہ سامیہ کے لیے سر کرنا ہے مونس! کل میں آفس میں نہیں تھا زینب کی اکلوتی واحد دوست فضہ کے پاس گیا تھا جس کی باتوں پر وہ آنکھ بند کرکے یقین کرتی ہے۔ جانتے ہو اس کی بات۔ دنیا میں بس یہی ایک ہے جس کے پاس تمہاری ماما کو سرنڈر کروانے کا ہنر موجود ہے' تمہاری ماما تمہاری شادی کا تذکرہ بہت بار کرچکی تھیں۔ سو میں اسے یہی سمجھانے گیا تھا کہ وہ کس طرح زینب کو اس معاملے میں سامیہ کے نام پر ٹریپ کرسکتی ہے۔"

"کس طرح ٹریپ کرسکتی ہیں ماما کو وہ۔" اس نے یونہی پوچھا۔

اور پاپا مسکرائے۔

"یہ بہت خفیہ ہے' یہ نہیں بتایا جاسکتا تم بس آم کھاؤ پیڑ مت گنو' سامیہ سے شادی کرو اور اپنی زندگی مزے سے گزارو۔"

"شادی اور زندگی۔" وہ حسرت زدہ ہوا اور پاپا نے اسے گھور کے دیکھا مگر مونس عام سی بات کی طرح ایک بہت خاص بات سن کر خوش نہ ہوسکا وہ سامیہ کو کوئی عہد کوئی خوش گمانی نہیں دینا چاہتا تھا۔

اس لڑکی کے کتنے برس اس گھر میں گزرے تھے ایک ملازمہ کی طرح اس لڑکی کے پاس کوئی خواب زندہ نہیں تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا وہ اس کی ہتھیلی پر کوئی امید کا جگنو رکھتا۔

"عمر اور ارم سے ملنا تھا مجھے مگر میں انہیں نہیں مل پایا۔"

"میں نے کہہ دیا ہے وہ ہسپتال ہی آجائیں گے۔" پاپا نے کہا اور اس کی آنکھوں کا خالی پن دیکھ کر کرلائے۔

"سچ پوچھو تو ان دونوں بچوں کا کوئی قصور نہیں ہے۔ میری بے توجہی اور تمہاری ماما کی ہر وقت تم سے انسلٹنگ رویے نے انہیں کبھی تمہارے قریب نہیں آنے دیا۔ محبت تو وہ بھی کرتے ہیں مگر وہ جذباتی طور پر تم سے اتنا اٹیچ نہیں اور یہ بات تم اچھی طرح جانتے ہو' میں جب پاکستان گیا تھا مجھے لگتا تھا میں سب کچھ ٹھیک لوں گا لیکن واپس آیا تو زندگی نے ویسے ہی ہاتھ باندھے رکھے۔ تمہیں جب بھی دیکھتا تھا مجھے ظفر یاد آجاتا تھا اور میں تمہارے قریب آتے آتے رہ جاتا تھا' تب بہت عرصے بعد میں نے سوچا میں نہ سہی سامیہ اگر تمہاری زندگی میں آجائے تو تمہاری زندگی کی ہر کمی دور ہوسکتی ہے۔"

"کیا کسی ایک رشتے میں اتنی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ ہر رشتے کا نعم البدل بن سکے؟" ایک نیا سوال' پاپا نے ہار کر سر جھکا لیا تھا۔

"میں اور زینب لوزر ہیں۔ ہم نہ اچھے میاں بیوی بن سکے نہ اچھے بیٹا بہو کے کردار نباہ سکے نہ اچھے ماں باپ بن سکے' ہاں دنیا کے لیے محبت گنوا کر بیسٹ کپل کا تمغہ ضرور حاصل کرچکے ہیں مگر محبت گنوا کر کچھ اور رہ جاتا ہے زندگی میں کہ ہم جی سکیں۔"

وہ پتا نہیں سوال کررہے تھے یا جواب دے رہے تھے مگر یہ تھا کہ اس کے ہسپتال میں ایڈمٹ ہونے کے پندرہ بیس منٹ بعد ہی ارم اور عمر اس کے قریب بیٹھے تھے' ہونق پریشان عمر آپریشن کی تفصیلات لے کر آیا تھا اور جی جان سے دہل گیا تھا۔

"میں آپ کے قریب نہیں تھا مگر یہ سچ نہیں ہے کہ مجھے آپ سے محبت نہیں ہے' بس حالات زندگی

نے ایک دائرہ بنا دیا تھا۔ بھائی سو میں اس دائرے کو توڑ نہیں سکا نہ ہی کبھی آپ نے ہی ہاتھ بڑھا کر اس رشتے کو نئے سرے سے جینے کی کوشش کی پھر ماں کی آپ سے نفرت 'پاپا کی بے توجہی میرا دل بس ان ہی الجھاؤں کی وجہ سے آپ کے قریب نہ آسکا۔" مونس نے اس کا چہرہ دیکھا۔ ساری رات جاگنے کی وجہ سے آنکھیں سرخ تھیں دونوں ہی سو نہیں سکے تھے مگر اس کے لیے یہاں بیٹھے تھے کاش وہ بہت پہلے اس محبت کو پکار لیتا۔

تاسف سا دل میں اٹھا اور اس نے عمر کے ہاتھ تھام کر کہا۔

"پرانی باتیں جانے دو۔ ہم اب تو ساتھ ہیں بس یہ یاد رکھو۔"

عمر اور ارم سرہلا کر ہلکے سے انداز میں ہنس پڑے پھر وہ دونوں پاپا کے پاس اٹھ کر گئے تھے جب اسے تنہائی میسر آگئی 'مام اس کے قریب بیٹھی تھیں اتنے قریب کہ وہ چاہتا تو انہیں چھو سکتا تھا انھوں نے اسے ڈھیر سارا پیار کیا تھا۔

"تم جانتے ہو نا ظفر کو ہارنا بالکل پسند نہیں تھا۔"

اس نے مام کی آنکھ کا آنسو انگلی کی پور پر لیا تھا اور دھیرے سے مسکرایا تھا پھر مدھم سا بولا تھا۔

"مجھے زندگی پر' زندگی کی سخاوت پر اور محبت پر پورا یقین ہے مام! اگر آپ یہ بھی کہتیں مونس مر جاؤ مت جیو میں تمہیں جی بھر کر ظفر کی طرح رونا چاہتی ہوں تو میں ایک لمحہ نہیں لگاتا اور مر جاتا مام۔" اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔

"ظفر کو کھو دیا ہے میں نے مگر مونس میں تمہیں نہیں کھونا چاہتی۔" اس بار مونس کو حیرت ہوئی تھی اس بار ماما کا لمس اسے اپنے ہاتھوں پر جیتا جاگتا محسوس ہوا تھا۔

"تو یہ کوئی خیال نہیں تھا۔"

ماما اس کے پاس صرف اس کے لیے ہراساں بیٹھی تھیں۔

صرف اس پر اپنی ممتا لٹا رہی تھیں۔

"ماما۔" اس نے اس بار بنا جھجکے ماما کو چھو کر دیکھا تھا۔

"میں نے جو کیا بہت برا کیا مگر اب تم میرے ساتھ برا مت کرنا' مجھ سے بدلہ لینے کے لیے مجھے چھوڑ کر مت جانا مونس! میں بدلنا چاہتی ہوں میں تمہارے حصے کا سارا پیار تمہیں دینا چاہتی ہوں کیا تم مجھے میری غلطیوں پر معاف نہیں کرسکتے؟"

"ایسے مت بولیں مام! آپ کی کوئی غلطی نہیں یہ تو بس قسمت میں لکھا تھا' جو میں نے سہا بس ہر دکھ ہر تکلیف آج باطل ہوئی کہ آج میری ماں نے مجھے دل سے قبول کیا۔"

وہ ہنس پڑا تھا اس نے سامیہ کو شیشے کے پار سے دیکھا اور اپنی مایوسی کے ان لمحوں کو یاد کیا جو یہاں آکر اس پر طاری ہوئے تھے اس نے آنکھ بند کرلی۔

"کچھ لوگ ہاتھ خالی کیوں رہ جاتے ہیں۔" اس نے پاپا سے پوچھا تھا مگر پاپا ڈاکٹر کو دیکھ کر ہم سے ملنے اٹھ گئے تھے اور اس کا جواب سامیہ نے دیا تھا۔

"ہمارے ہاتھ خالی اس لیے رہتے ہیں تاکہ ہمیں صبر کرنا آئے ہمیں صبر کرنا آئے گا تو ہمیں خوشی پوری طرح خوش کرے گی' بظاہر جو ہاتھ خالی دکھائی دیتے ہیں اگر وہ ہاتھ لوگوں میں محبت تسلی اور دلاسا بانٹنا جانتے ہیں تو وہ ہاتھ کبھی خالی نہیں ہوتے۔ ایک غریب الدیار لڑکی سے پوچھیے آپ کا ساتھ اس کے لیے ہفت اقلیم کی دولت سے کم تو نہیں تھا۔" اس لمحے سامیہ نے اس کے دونوں ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے تھے اور سوال کیا تھا۔

"کیا یہ اب بھی آپ کو خالی لگتے ہیں مونس؟"

وہ کچھ نہیں بول پایا تھا اور اس نے کہا تھا۔ "زندگی ایک بار ملتی ہے یہ ختم بھی ایک بار ہی ہوتی ہے سو ہم پہلی اور آخری بار کے درمیان کا سفر لاحاصل کیوں گزاریں ادھر دیکھیں کہ ہمیں جس جذبے نے ایک دوسرے سے ملایا۔ وہ ہمدردی انسیت ہو یا محبت 'یہ طے ہے ہمیں اب کوئی خوف ایک دوسرے سے جدا نہیں کرسکتا زندگی اور زندگی کا ہر راستہ مجھے صرف آپ کے ساتھ طے کرنا ہے' آپ کے ساتھ چلتے ہوئے جینا پسند ہے۔" اس نے سر جھکا لیا تھا اور سامیہ پھر سے بولی تھی۔

"آپ لوٹ کر آئیں گے نا؟"

"دیکھیے زندگی نے ہمیں کبھی پسندیدہ منظر نامے میں پینٹ نہیں کیا نہ میری خواب دیکھنے والی کسی شہزادے کے سپنے بننے کی الھڑ عمر ہے نا ہی آپ کے لیے محبت سویٹ سکسٹین کا کوئی ترانہ ہے' ہمیں زندگی نے ایک نامحسوس دکھ سے ملایا ہے اور جبران کہتا ہے جو دل کسی دکھ کی وجہ سے یکجا ہوں وہ کبھی نہیں بچھڑتے۔"

اس نے سرہلا کر سامیہ کا ہاتھ ہولے سے دبا کر چھوڑ دیا تھا اور سامیہ حسام الدین کی آنکھوں میں بجھتے ستارے جگمگانے لگے تھے۔

"ظفر بھائی کی طرح آپ بھی بہت کم وعدے کرتے ہیں کیونکہ آپ وعدہ نبھانا جانتے ہیں۔"

"کیا سوچنے لگے؟" ماما نے مدھم سا پکارا اور وہ مسکرا دیا۔

"کبھی میرے ہاتھ بالکل خالی تھے مگر زندگی میں صبر کرنے کی عادت نے مجھے اس خوشی کو محسوس کرنے کا ایسا ہنر بخشا ہے مام کہ میں یقین رکھتا ہوں کے آپ سب کی محبتیں مجھے کبھی ہارنے نہیں دیں گی۔ میرے ایک ہاتھ میں سامیہ کی محبت ہے۔ امنگ کی طرح ایک ہاتھ میں آپ کی چاہت' آخرت اور دنیا دونوں کو سنوار دینے والے اسم اعظم کی طرح اور دل میں بابا' عمر' ارم اور ظفر بھائی کی محبت حوصلے کی طرح موجزن ہے۔ مجھے زندگی کی سخاوت پر اور محبت پر آج ہی یقین آیا ہے محبت کی آنکھوں سے ابھرنے والی صبح کیسے ممکن ہے کہ مجھے اندھیروں میں ڈوب جانے دے گی' مجھے یقین ہے میں نہیں مر سکتا مام! کیونکہ میں نے آج ہی جینا سیکھا ہے آج ہی محبت کی مدھ کو چکھا ہے اور میں محبت کی اس حیات نو کو پوری طرح دل سے محسوس کرنے کا تمنائی ہوں۔"

زینب نے مونس شہباز کی پیشانی چوم کر اسے زندگی کی دعا دی تھی اور سامیہ' عمر' ارم' شہباز صاحب اس دعا پر آمین کہتے اس کے اردگرد موجود تھے۔

محبتوں کا یہ حصار جدائی توڑنا بھی چاہتی تو محبت کا خدا ایسا کبھی نہ ہونے دیتا کہ محبت اگر امید اور حیات نو نہیں تو پھر کچھ بھی نہیں۔

☆

نایاب جیلانی

قیمتی سا ہے

شام کا سہانا سماں تھا۔ صبح ہونے والی بارش نے ہر شے کو نکھار بخش دیا تھا۔ وہ موسم کی دلفریبی کو انجوائے کرتی ببل گم چباتی تیز قدموں سے چل رہی تھی۔ وہ جلد از جلد گھر پہنچنا چاہتی تھی' جہاں اس کی پیاری نانا اس کے انتظار میں سخت جھنجلائی ہوئی تھیں۔

مارکیٹ سے خریدا ہوا سامان اس کے دائیں ہاتھ میں تھا۔ بریڈ' انڈے اور کوکیز وغیرہ۔ ایک ڈبہ مینگو بنانا جیلی کا بھی تھا۔ وہ ناشتے میں جیلی بریڈ کے ساتھ شوق سے لیتی تھی اور اسے کھانے پینے کا بہت شوق تھا۔ وہ کھاتی تھی اور بے تحاشا کھاتی تھی' جس طرح

مکمل ناول

بے تحاشا پڑھنے کا شوق اسے وراثت میں ملا تھا۔ اس طرح کھانے کا شوق بھی وراثتی تھا۔ نانا اور اور متین پکانے میں ماہر تھے اور وہ کھانے میں۔

"ولنشیا" میں نانا نے جب گھر لیا تو فریا نے خوب واویلا مچایا تھا۔ ڈیفنس سے اٹھ کر ولنشیا میں شفٹنگ کی کم از کم فریا کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ جس قدر بلند اور عالی شان اس ایریے کی عمارتیں تھیں اتنے ہی بلند اور پتھریلے لوگوں کے رویے تھے' سرد اور اجنبی۔ فریا تو یہاں آکر خوب بدمزہ ہوئی تھی۔ ابھی پچھلے دنوں جاگنگ کے دوران اس نے ایک آنٹی کو ہیلو بولا تو وہ اسے نہ جانے کیوں گھورنے لگی تھیں۔ پھر بغیر کچھ کہے پارک کی طرف چل دیں۔ فریا نے اس تجربے سے لطف اندوز ہونے کے بعد تعلقات بنانے سے توبہ کر لی تھی۔

ایل بلاک سے مارکیٹ کا فاصلہ تو اتنا نہیں تھا۔ تاہم فریا جان بوجھ کر لمبا راؤنڈ لے کر آئی تھی اور اس تھکا دینے والی راؤنڈ کی وجہ یہ قیامت کا موسم تھا۔ موسم کی خوب صورتی انجوائے کرتے اور گنگناتے ہوئے فرسٹ ٹرن لینے کے بعد ایک دم وہ ٹھٹک کر رک گئی تھی' ہری چمکیلی' خوشنما پھولوں سے ڈھکی بیلوں والی اس کے گھر کی بیرونی دیوار سے آگے بنے فٹ پاتھ پر ایک طرف رکھے پتھریلے بینچ پر بیٹھا وہ کوئی انسانی وجود ہی تھا۔ سسکیوں کی وقفے وقفے سے آتی آواز اور اس کا ہلتا وجود دیکھ کر فریا کا شک یقین میں بدل

گیا تھا وہ جو کوئی بھی تھا گھٹنوں پر سر جھکائے یقیناً" رو رہا تھا۔ مگر وہ تھا کون؟ فریا کا فطری تجسس عود کر آیا۔ وہ دو قدم کا فاصلہ مٹاتے اس کے قریب چلی آئی۔

"ہیلو مین!" فریا نے گلا کھنکار کے اسے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا تھا۔ اتنا اندازہ تو اسے ہو چکا تھا کہ مقابل صنفِ مخالف میں سے ہے۔

"تم رو رہے ہو؟" وہ اسے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتی تھی۔ مگر دوسری طرف ہنوز خاموشی تھی۔ فرق صرف اتنا پڑا تھا کہ سسکیوں کی آواز آنا فوراً" بند ہو چکی تھی۔

"تم کون ہو؟" فریا نے ہمت نہیں ہاری تھی۔

"ادھر دیکھو پلیز!" اب فریا نے چٹکی بجا کر مصنوعی التجا کی تھی۔

"ارے۔ کچھ تو بولو کم از کم سر تو اوپر اٹھاؤ۔" فریا کو غصہ آ گیا۔ "تم کہیں ڈیف تو نہیں۔" وہ ایک دم اچھل کر دور ہٹی۔

"گونگے بہرے؟ کچھ تو بولو۔" وہ سخت جھنجلائی۔

"اف گونگے بہرے بولتے سنتے کہاں ہیں؟" فریا نے اپنا ماتھا پیٹا۔ "مگر غوں غاں تو کر سکتا ہے۔" وہ زیرِ لب بڑبڑائی۔

"اے مسٹر! کیا تکلیف ہے' کیوں رو رہے ہو؟" اب کے سارا لحاظ بالائے طاق رکھ کے وہ غصے سے دہاڑی۔

"آپ کو کیا تکلیف ہے؟" گونگے کو زبان لگ گئی تھی۔ گھٹنے پر سر جھکائے ہنوز اسی پوزیشن میں بیٹھے ہوئے بھرائی سی آواز سنائی دی تھی۔

"شکر ہے بولے تو سہی۔" فریا نے گہرا پُرسکون سانس خارج کیا۔ "مجھے کوئی تکلیف نہیں' خدانخواستہ صرف اتنا پوچھ رہی ہوں' یہاں کیوں بیٹھے ہو۔"

"آپ سے مطلب؟" کافی ناراضی سے روٹھے روٹھے انداز میں کہا گیا تھا۔ فریا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"تم ہمارے گھر کے سامنے ہمارے ہی بینچ پر بیٹھے ہوئے کوئی چور اچکے بھی ہو سکتے ہو۔ اٹھو یہاں سے۔"

"یہ آپ کا گھر ہے اور یہ بینچ بھی' آئم سوری۔" گھٹنوں سے سر اٹھا لیا گیا تھا۔ گہری سبز سوچتی سوچتی آنکھوں میں ابھی تک ڈھیروں نمی چمک رہی تھی۔

"آر یو فارنر؟" فریا کا لہجہ اور انداز دونوں بدل گئے تھے۔ شہد رنگ بالوں والے سر سے کیپ اتر چکی تھی۔ مغربی نین نقوش اسٹریٹ لائٹس کی روشنیوں میں واضح ہوتے چلے گئے تھے۔

سرخ ہونٹوں کے کونے کچلتا وہ اجنبی لڑکا ایک دم کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے کھڑے ہوتے ہی فریا کو اس کے طویل قامت ہونے کا اندازہ ہوا۔ فریا اس کے سامنے بونی سی لگنے لگی تھی۔

"تو۔" اپنی شرٹ کی آستینوں سے چہرہ صاف کرتے ہوئے وہ رخ موڑ گیا تھا۔

"شکل سے تو فارنر لگتے ہو' خیر۔" فریا ہونٹ سکیڑے بغور اسے دیکھنے لگی تھی۔ وہ بیس سال کا نوجوان تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ آنسوؤں سے بھیگا چہرہ' فریا نے اندازہ لگایا۔ وہ اس سے تو دو ڈھائی سال چھوٹا ہی تھا' سو اسی لیے اس نے اپنے لہجے میں کچھ رعب سمویا۔

"تم رو رہے تھے مگر کیوں؟ اتنے بڑے ہو کر روتے ہو؟"

"رونا کیا صرف بچوں کا ہی حق ہے' کیا آپ نہیں روتیں۔" بہت شستہ اردو میں بغیر اس کی طرف دیکھے پوچھا گیا تھا۔ ساتھ وہ جانے کے لیے مڑنے لگا تھا۔ مگر فریا بھی کمال پھرتی سے اس کے سامنے آ گئی۔

"ایسے تو تمہیں جانے نہیں دوں گی۔"

"کیوں؟ کھانا کھلانا ہے کیا؟ آپ کو کیسے خبر ہوئی کہ میں صبح سے بھوکا ہوں۔" اس تمام عرصے میں شاید وہ خود کو سنبھال چکا تھا' تب ہی کافی اعتماد سے پوچھنے لگا۔

"کھانا بھی کھلا سکتی ہوں۔" فریا اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اپنے ازلی بااعتماد انداز میں بولی۔ "مگر پہلے رونے کی وجہ تو بتاؤ۔"

"پہلے کھانا کھلا دیں۔۔۔ وجہ بعد میں پوچھیے گا۔" وہ اس سے بھی زیادہ بولڈ تھا۔ تاہم فریا نے غور کیا' اس کے چہرے پر سادگی اور معصومیت تھی۔ وہ عیار یا مکار تو نہیں لگتا تھا۔ مگر اس طرح کسی پر اعتبار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ وہ سوچ میں گم ہو گئی تھی۔

"میں نے آپ کو مشکل میں پھنسا دیا ہے' چلتا ہوں' یہاں بغیر پرمیشن کے بیٹھ گیا تھا۔ ایکچولی! میں شدید ڈپریسڈ تھا' سو کچھ پتا نہیں چلا' سوری اگین۔" وہ پلٹنے لگا تھا' جب فریا نے پھر سے بازو آگے کر کے اس کا راستہ روکا۔

"رکو تو۔ کھانا کھائے بغیر چلے جاؤ گے' اور نہ جانے گھر جا کر تمہیں کھانا ملے گا بھی یا نہیں' اور پتا نہیں تمہیں کتنی دور جانا ہے۔" فریا فراٹے سے بول رہی تھی۔ وہ رک گیا تھا' ٹھٹکا بھی تھا اور پھر نم سی آنکھوں سے مسکرا دیا۔

"کھانا گھر جا کے نہیں ملے گا' اتنا مجھے یقین ہے' مجھے بہت دور نہیں جانا' یہ سامنے میرا گھر ہے۔" وہ بیرونی گیٹ کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ چار مرلے وسیع و عریض عالی شان سی کوٹھی اس بلاک کے سب ہی گھروں میں الگ نظر آتی تھی۔

"صبح سے بھوکے ہو' کیا رات بھی فاقے کے ساتھ گزاری ہے۔" فریا سنجیدگی سے بولی۔

"مجھے فاقوں کی عادت ہے۔" وہ بھی سنجیدگی کے ساتھ مسکرایا۔

"آج میرے توسط سے تمہیں فاقہ نہیں کرنا پڑے گا۔" فریا نے بیل پر ہاتھ رکھ دیا تھا' جبکہ رویا رویا سادہ لڑکا سچ گھبرا گیا۔

"آپ۔۔۔ آپ کیا کر رہی ہیں؟"

"مائی سویٹ نیم فریا خلیق۔" اس نے پلٹ کر جواب دیا تھا۔ "اپنا نام بتاؤ؟" آواز میں بلا کا رعب تھا۔ اجنبی اور بھی گھبرایا۔ چونکہ گیٹ کھل چکا تھا اور فریا خود پیچھے ہٹے اور اسے اندر جانے کا اشارہ کر رہی تھی' وہ گھبرا تا نہ تو اور کیا کرتا۔

"ام بھی چکو' مجھے خود بہت شدید بھوک لگ رہی ہے۔" فریا اسے اپنی جگہ پر جمے دیکھ کر بے صبری سے بولی۔ وہ اسے بازو سے پکڑ کر اندر لے آئی۔ جوں ہی وہ دونوں لاؤنج کا داخلی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے نتا کی خفا خفا سی آواز سنائی دی۔

"فری! کہاں رہ گئی تھیں تم' فکر کے مارے میرا برا حال تھا' میں تو۔۔۔" فری کے ساتھ کھڑے نوجوان کو دیکھ کر نتا ایک دم خاموش ہو گئی تھیں۔

"یہ کون ہے؟" ان کی سوالیہ نگاہیں فریا پر جمی ہوئی تھیں۔

"مائی نیو فرینڈ۔" نتا کے ساتھ ساتھ وہ بھی حیران تھا' بلکہ شاکڈ تھا۔

"اپنا نام تو بتاؤ۔" فریا نے ساتھ کھڑے مجسمے کو زور سے ٹہوکا دیا۔

"محمد حمزہ۔"

"اوہ!" نتا کے ساتھ فریا بھی پُرسکون ہو گئی تھی' کیونکہ وہ اسے غیر مسلم سمجھ رہی تھیں۔

"اس کی طبیعت ٹھیک ہے؟" نتا حمزہ کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔ اس کی سوجی آنکھیں اور سرخ تپا تپا سا چہرہ کچھ اور کہانی سنا رہا تھا۔

"طبیعت تو اس کی ٹھیک ہے' البتہ ہم دونوں کو سخت بھوک لگی ہے۔ آپ کھانا تو لگوائیں۔" فریا ڈائننگ روم کی طرف بڑھ گئی تھیں۔

"کھانا تو بنگالی جی کب کا لگا چکے ہیں۔" نتا سنبھل کر مسکرائیں۔ "یہ بھوک کی اور نیند کی بہت کچی ہے۔" اب وہ حمزہ کو بتا رہی تھیں۔

"حمزہ! یہ مٹن اور آلو پالک ٹرائی کرو نا! اچھا یہ گولا کباب تو چکھو۔ اور اس اچاری ہانڈی کا تو سواد ہی الگ ہے۔ یار! یہ ڈش نگٹز وہ چائنیز رائس مائی فیورٹ ڈشز۔ تم نے چاول کیوں اتنے کم لیے ہیں اور لو نا یار! کھاؤ اور کھاتے جاؤ' ہم کھانے کے لیے دنیا میں آئے ہیں۔"

جب تک ڈنر چلتا رہا تھا فریا کی زبان بھی اسی رفتار سے چلتی رہی۔ حمزہ بوکھلایا بوکھلایا سا اسے بولتا دیکھتا رہا۔ وہ حیران تھا۔ یہ لڑکی کیا چیز تھی۔ ابھی وہ تنہا باہر بیٹھا رو رہا تھا اور اب اس لڑکی کے برابر بیٹھا مسکرا رہا

تھا۔ نتا کی مزاحیہ باتیں، متین (شیف) کے چٹکلے اور فریا کی بے ساختہ ہنسی۔ "زندگی میں ہنسا اور مسکرایا بھی جاتا ہے۔" وہ اس گھر میں صرف دو لوگوں کی موجودگی میں حیران حیران سا سوچ رہا تھا۔ وہ زبردستی اسے گرین ٹی پلا کر گیٹ تک چھوڑنے آئی تھی۔

"دوست! زندگی میں بہت سے غم اور صدمات کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ دکھوں پر بزدل روتے ہیں۔ خوشی کو ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ تم نے کبھی ایسی کوشش کی؟ اگر نہیں کی تو اب ضرور کرنا او کے گڈ بائے۔" وہ مسکرا رہی تھی۔ بے حد اجلی شفاف اور کھلی کھلی سی بے ریا مسکراہٹ۔ وہ دم بخود کھڑا تھا۔ اور اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ زمین اپنے مرکز سے ہٹ رہی ہے۔ نہیں زمین تو وہیں تھی۔ ستاروں سے سجا آسمان بھی پہلے کی طرح روشن تھا۔ بدلا تو کچھ بھی نہیں تھا۔ زندگی رواں دواں تھی۔ سانس پہلے کی طرح چل رہی تھی۔ ہاں! یک چیز کے بدلاؤ نے محمد حمزہ کو ٹھٹکا دیا تھا۔ سینے میں پھڑکتا دل۔ یوں لگ رہا تھا پورے وجود کی ہر رگ میں دھڑک رہا ہے۔

"یہ میرے دل کو کیا ہوا ہے؟" وہ سوچ رہا تھا اور لب کچھ اور فریاد کر رہے تھے۔

"گڈ بائے ضرور کہیں مگر ہمیشہ کے لیے نہیں۔ میں... میں کیا پھر... ملنے کی امید رکھوں؟"

"کس سے ملنے کی امید؟" وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے پوچھ رہی تھی۔

"اس لڑکی سے جس کی آنکھیں ستاروں کی طرح چمکتی ہیں۔"

☼ ☼ ☼

بارش میں بھیگنا اسے شروع سے پسند تھا۔ نتا کے منع کرنے کے باوجود وہ صبح سے برستی بارش میں بھیگنے کا مزہ لے رہی تھی۔ متین کو پکوڑے بنانے اور سوجی کا حلوہ تیار کرنے کا آرڈر دے رکھا تھا۔ نتا چاہتی تھیں وہ کم از کم ایک ابلا انڈہ کھالے۔ جبکہ فریا نے نتا کو تسلی دی تھی کہ وہ اطمینان رکھیں۔ پکوڑے اور حلوہ کھانے کے بعد وہ چائے اور دو عدد بوائلڈ ایگ کھانے کا ارادہ رکھتی ہے۔

نتا اون سلائیوں کے ساتھ الجھ رہی تھیں۔ فریا چہکتے ہوئے ٹیرس پر پہنچ گئی۔ فریا کے ممی ڈیڈی باہر ہوتے تھے۔ بہت بچپن میں نتا نے اسے گود لے لیا تھا۔ اسے بھی نتا کے علاوہ کسی اور سے انسیت نہیں رہی تھی۔ اس سے چھوٹا بھائی تھا۔ جو ممی ڈیڈی کے ساتھ رہتا تھا۔ دو تین سال بعد ممی اور بھائی چکر لگاتے تھے۔

نتا نے ڈیفنس والا گھر بیچا تو فریا حیران رہ گئی۔ پہلے پہل بہت غصہ بھی کیا۔ مگر کچھ عرصہ بعد اسے گھر بیچنے کی وجہ سمجھ میں آگئی تھی۔ اس کے اکلوتے ماموں کو کچھ رقم کی ضرورت تھی۔ سو نتا نے وہ گھر بیچ کر نسبتاً چھوٹا اور سستا گھر لے لیا تھا۔ فریا کو بہت غصہ آیا پھر وہ ماموں کی مجبوری اور نتا کی محبت کو سمجھ گئی تھی۔ ماموں مع فیملی کے دبئی مقیم تھے۔ انہیں ممی کی طرح خاص خاص تہواروں پر بھی آنے کی فرصت نہیں تھی۔

فریا نے ابھی حال ہی میں اپنا ماسٹرز مکمل کیا تھا۔ ان دنوں وہ جاب بھی کرنا چاہتی تھی، مگر نتا کو اس کا جاب کرنا بالکل پسند نہیں تھا۔ پڑھائی میں وہ بہت اچھی تھی۔ اس کا شمار ہمیشہ سے ذہین اسٹوڈنٹس میں رہا تھا۔ اسی لیے اپنی کلاس فیلوز اور دیگر کزنز جو کبھی اس کی ہم جماعت تھیں۔ ان سب کو پیچھے چھوڑ چکی تھی اور نتا فخریہ کہا کرتی تھیں کہ۔

"ذہانت تو فری نے مجھ سے وراثت میں لی ہے۔ اس کے ساتھ کی تو بی ایس سی اور بی اے میں اٹکی ہوئی ہیں۔"

"فری! کپڑے چینج کرلو، یہ سرما کی بارش ہے ٹھنڈ میں مرنا ہے کیا..." نتا نے اون کے گولے کو اٹھا کر لپیٹنا شروع کر دیا۔ وہ شاید نئے سویٹر کا ڈیزائن بنا چکی تھیں۔

"تو کیا ہوگا؟" فری نے لاپروائی سے سر جھٹکا۔ پانی کی ننھی بوندیں بالوں سے ٹپکنے لگی تھیں۔

"بیمار پڑ جاؤ گی۔" نتا نے خفگی سے کہا۔ "اٹھو بھی چکو۔"

"پہلے سوجی کا حلوہ تو کھالوں، اور پکوڑے ود ناریل کی چٹنی۔" فریا نے چٹخارہ لیا۔

"کچھ بھی نہیں ملے گا، جب تک آپ نتا جی کی بات نہیں مانیں گی۔" متین (بنگالی جی) کفگیر لہراتے کچن سے برآمد ہوئے۔

"یہ زیادتی ہے۔" فریا ٹھنک کر رہ گئی۔

"آپ ہمارا بات نہیں مانتیں۔ نتا جی کا بات نہیں مانتیں۔ کھانا تو بالکل نہیں ملے گا۔" متین جسے فریا بنگالی جی کہا کرتی تھی۔ اپنا حکم صادر فرما کر کچن میں غروب ہوگئے تھے۔ فریا چینج کرکے آئی تھی نتا کسی سے باتوں میں مصروف تھیں۔

"نتا! کون آیا ہے؟" وہ بالوں کو تولیے میں لپیٹے ٹھٹھرتی ہوئی لاؤنج میں داخل ہوئی تھی۔

"تم..." فریا، وقاص کو دیکھ کر ٹھٹک کر رک گئی۔

وقاص مسکراتا ہوا اٹھا ہوا۔

"مجھے دیکھ کر تم فریز کیوں ہوگئی ہو؟"

"وشٹ اپ۔" وہ دوسرے ہی پل ہنستے ہوئے وقاص کے قریب آئی۔ "کہاں دفعان ہوگئے تھے۔" اس نے وقاص کے بازو پر دھموکا جڑا۔

"کویت... پھوپھو کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔" وقاص نے نتا سے دعائیں کرتے ہوئے بتایا۔

"اور تم سے اچھا کردار شاید پھوپھو کو نہیں ملنا تھا مسٹر بین!" فریا نے ہنس کر کہا۔

"پھر کہا مجھے مسٹر بین۔ نتا! سمجھالیں اپنی اس ہری مرچ جیسی نواسی کو، میں مسٹر بین کی طرح مخبوط الحواس ہوں۔" وقاص عادت کے مطابق فوراً بھنا اٹھا۔ مسٹر بین کا طعنہ تو اسے کرنٹ کی طرح لگتا تھا۔

"مسٹر بین مخبوط الحواس ہیں۔ تم تو بہت کھلی ہو۔ میں اپنے فیورٹ کامیڈین کا ٹائٹل تمہیں دے رہی ہوں۔ خود کو خوش قسمت تصور کرو، تم مسٹر بین جونیئر ہو۔" فریا مسلسل وقاص کو چڑا رہی تھی۔

"وسوئی بھینس! ابھی خود کو آئینے میں دیکھنا غور سے۔ بگ باس کی ڈولی جیسی ہو جاؤ گی، اگر اسی رفتار

سے کھاتی رہیں۔"

بنگالی جی چائے کی لوازمات سے بھری ٹرالی گھسیٹ کر لائے تھے اور فریا نے جھٹ پٹ پکوڑوں سے بھری ڈش اٹھالی تھی اور اب وہ چٹنی میں ڈبو ڈبو کر پکوڑے کھا رہی تھی۔

وقاص نے سوجی کے حلوے کو چکھا۔

"بنگالی جی سے کیا کیا بنواتی رہتی ہو۔ یہ دیسی گھی کے تڑکے کھا کھا کر موٹی! پھٹ جاؤ گی۔" وقاص نے بلوریں سی پیالی ٹرالی میں رکھ کے چائے کا کپ اٹھالیا۔

"مسٹر بین! میری صحت کو دیکھ کر مت جلا کرو۔ یہ بتاؤ میری جاب کا کیا بنا؟" فریا اب حلوے سے بھرپور انصاف کر رہی تھی۔

"اس قدر اتاولی مت ہو۔ ورنہ میرے آفس میں ایک ویکنسی تو ہے۔" وقاص نے آنکھوں میں شرارت بھر کے کہا۔

"کمینے! میرے بارے میں تم نے ایک دفعہ بھی نہیں سوچا۔" فریا کو شدید صدمے نے گھیرا۔

"یہ چائے کا ایک اور کپ پی لینے دو' پھر بتاتا ہوں۔" وقاص بڑے بڑے سپ لیتا گھڑی کی طرف دیکھتا ہوا کھڑا ہو گیا تھا۔ کپ ابھی بھی اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ آخری بڑا سا گھونٹ لے کر ہاتھ ہلاتا دروازے کی طرف بڑھا۔

"چپڑاسی کی ویکنسی خالی ہے۔ کام بھی مشکل نہیں' تمہارے لیے اس سے اچھی جاب کوئی اور مجھے نہیں ملے گی۔"

"بدتمیز' واہیات آدمی! چائے بھی پی گئے۔ سینڈوچ اور یہ میرے نگٹس بھی کھا گئے۔"

اپنا کوٹ لہراتا وہ فریا کو جوتا اٹھاتے دیکھ کر بھاگ گیا تھا' جبکہ اندر آتی ثنا سر پکڑ کر صوفے پر بیٹھ گئی تھیں۔

"اتنے دنوں بعد بچہ آیا تھا' کھانا کھائے بغیر چلا گیا۔ ویسے تو راہ چلتے اجنبیوں کو بھی اٹھا لاتی ہو اور وقاص کو سوکھے منہ بھیج دیا۔"

"اتنا کچھ تو چٹ کر گیا ہے' ابھی بے چارہ بچہ سوکھے منہ گیا ہے۔" فریا ثنا کو وقاص کی ہمدردی میں مبتلا دیکھ ہی نہیں سکتی تھی۔ "اور یہ کس اجنبی راہ چلتے کو اٹھا کر گھر لائی ہوں؟"

"کیا بھلا سا نام تھا اس بچے کا؟" ثنا سوچ میں پڑ گئیں۔

"حمزہ۔ محمد حمزہ۔" فریا کی یادداشت کے خانے سے یہ نام نکل چکا تھا۔ تاہم ثنا کے یاد دلانے پر وہ جھٹ سے بولی۔

"ہاں۔۔۔ حمزہ۔" ثنا سر ہلانے لگیں۔ "فری! یہ تمہیں کہاں ملا تھا۔ کون ہے یہ؟ کس فیملی سے ہے؟ بیٹا! ایک بات جو میں تمہیں ہر دفعہ سمجھاتی ہوں کہ ہر ایک پر اعتبار نہیں کر لیتے۔ "ولنشیا" ہمارے لیے نئی ہے۔ اس سوسائٹی میں ہم ابھی نئے ہیں۔ کچھ اندازہ بھی نہیں کہ ارد گرد کے لوگ کیسے ہیں؟ ایسے تو بھروسہ نہیں کر لیتے۔"

ثنا اس دن بھی حمزہ کے جانے کے بعد اس کی اچھی خاصی کلاس لیتی رہی تھیں۔

"حمزہ سے پھر سامنا نہیں ہوا۔ یہ سامنے ہی تو اس کا گھر ہے۔" ثنا کرید رہی تھیں۔

"نہ۔۔۔" فریا اب ٹی وی کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔

"تم خود پتا کر لیتیں۔" انہوں نے سرسری سے انداز میں کہا۔

"ثنا! یہ آپ کہہ رہی ہیں۔" فریا نے ٹی وی پر سے نظریں ہٹا کر ثنا کی طرف دیکھا۔ "ایک مسٹر پڑوسی نے ابھی تک جان نہیں چھوڑی۔ مزید کسی اور پڑوسی سے میں روابط نہیں بڑھا سکتی۔"

وہ وقاص کا حوالہ دے رہی تھی۔ اڑتیس سال ثنا کی اور وقاص لوگوں کی فیملی پڑوسی رہے تھے۔ وقاص ان کی پھوپھو کا بیٹا تھا۔ اس کی فیملی انگلینڈ چلی گئی تھی۔ کچھ عرصہ بعد ثنا بھی یہاں شفٹ ہو گئی تھیں۔ وقاص کو یورپ سیٹل ہونا پسند نہیں تھا۔ یہاں اس کی جاب بہت اچھی تھی اور وہ ہمیشہ پاکستان میں ہی رہنا چاہتا تھا۔ ثنا کو وقاص سے خصوصی انسیت تھی۔

"فری! تم نے پوچھا نہیں حمزہ کیوں ڈپریسڈ تھا؟"

"اوف ثنا! مجھے کیا ضرورت پڑی تھی پوچھنے کی۔ ویسے بھی میں نے کافی احمقانہ حرکت کی تھی۔ اسے گھر نہیں لانا چاہیے تھا۔ مگر نہ جانے کیوں جب اس نے مجھے بتایا کہ وہ بھوکا ہے تو مجھے ترس آ گیا۔ ہمارے گھر میں نعمتوں کے انبار لگے تھے اور ایک ہمارا بے چارہ پڑوسی خالی پیٹ رو رہا تھا ثنا! نہیں وہ بھوک کی وجہ سے تو نہیں رو رہا تھا۔" وہ ہمیشہ کی طرح چٹکیوں میں بات کو اڑا رہی تھی۔

"وہ بچہ نہیں' جو بھوک کی وجہ سے بلبلا رہا تھا۔ بات کچھ اور لگتی ہے۔" ثنا کا انداز پُرسوچ تھا۔ فریا کی کلاس لینے کے بعد وہ بڑے دل گرفتہ انداز میں کہنے لگی تھیں۔

"تم نے اچھا کیا فری! حمزہ کو لے آئیں' ورنہ یہ گلٹ تو لازمی رہنا تھا۔" یہ اس وقت کی بات تھی جب فریا' حمزہ کو سی آف گیٹ تک کرنے کے بعد آئی تھی اور ثنا نے اسے ڈانٹنے کے بعد کہا تھا۔

"بے چارا بچہ! کتنی پیاری صورت ہے اس کی۔" بہت دن بعد ثنا کو بے چارہ بچہ یاد آ ہی گیا تھا۔ فریا بور ہو رہی تھی۔ ٹی وی پر بھی کچھ خاص پروگرام نہیں آ رہا تھا۔

✿ ✿ ✿

"ہیلو میم!" وہ جو زور و شور سے بیرونی چھوٹے سے لان کے پودوں کی کانٹ چھانٹ میں مصروف تھی۔ اس مردانہ آواز پر چونک کر سیدھی ہوئی۔

"تم۔۔۔" وہ اسے پہلی نظر میں پہچان چکی تھی۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی تو وہ فریا کو اسی جگہ ملا تھا۔ حمزہ اس کے حافظے میں نہ چاہنے کے باوجود بھی محفوظ تھا۔ اور ایک دو دن سے تو چپکے چپکے دل میں یہ خواہش انگڑائیاں لے کر جاگ رہی تھی کہ کیوں نا حمزہ کی خیریت ہی معلوم کر لی جائے۔ ثنا نے بھی اس سے ایک' دو مرتبہ کہا تھا۔ شاید ان کے ذہن میں بھی حمزہ کا رونا محفوظ تھا۔

"مجھے دیکھ کر آپ شاکڈ کیوں رہ گئی ہیں؟" وہ اس کے قریب ہی گھاس پر چوکڑا مار کر بیٹھ گیا۔

"تو ایسی کوئی بات نہیں' ابھی میں تمہارے بارے میں سوچ رہی تھی کہ تم۔"

"ارے' میں کیا اتنی اہم شخصیت ہوں کہ آپ میرے بارے میں سوچ رہی تھیں۔" حمزہ کا چہرہ برقی قمقموں کی طرح جگمگانے لگا۔

"نہیں۔۔۔ نہیں۔" وہ ایک دم گھبرا گیا۔

"تم مجھے فریا کہہ سکتے ہو۔ ویسے کیا ایج ہے تمہاری؟"

"کچھ دن پہلے میری بیسویں سالگرہ تھی۔" نہ جانے کیوں حمزہ کا چہرہ اک پل کے لیے تاریک ہو گیا تھا۔

"میں تم سے دو سال بڑی ہوں' مگر فرینڈشپ تو ہو سکتی ہے۔" فریا اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے بولی۔

"تم ایک اچھی اور سچی خاتون ہو' مجھ سے دو سال چھوٹی ہی لگتی ہو' تو کیا آج سے فرینڈز!" حمزہ نے اپنا دایاں ہاتھ فریا کے سامنے پھیلا دیا۔

"آف کورس فرینڈز!" فریا مٹی سے لتھڑے ہوئے ہاتھ اپنی شرٹ سے رگڑتے ہوئے پرجوش سی بولی۔

"اتنے دن کہاں رہے؟" وہ حمزہ کے لیے ایک چیئر گھسیٹ کر لے آئی تھی۔

"میں اس بینچ پر بیٹھوں گا۔" حمزہ گھاس سے اٹھ کر بینچ کی طرف بڑھ گیا تھا۔ "کیا یہ بینچ میرے لیے بنوایا تھا؟"

"مجھے الہام ہو گیا تھا کہ "ولنشیا" میں ایک بانگڑو سے ملاقات ہوگی۔ اور وہ ایک بینچ پر بیٹھا مجھے ملے گا' سو اسی لیے۔" وہ بالوں سے کیچر اتار کر مزے سے بولی۔ "تم نے بتایا نہیں اتنے دن کہاں رہے؟"

"ایک سوچ میں گم رہا ہوں' تم بھی سوچی تو نہیں۔"

"ایک سوچ میں تم دس دن سے گم رہے ہو۔ مجھے تو اسی بات پر بے تحاشا ہنسی آ رہی ہے۔ تم مسٹر بین جونیئر (وقاص) سے کم نہیں ہو۔" وہ ہنس ہنس کر بے حال ہو گئی۔

"مجھے پتا تھا تم ہنسوگی۔" حمزہ بغیر برا مانے خود بھی مسکرا دیا۔ "تم بہت ہنستی ہو فریا! اس دن بھی تمہارے گھر سے آنے کے بعد میں یہی سوچتا رہا تھا کہ کسی کی ہنسی اتنی زندگی سے بھرپور بھی ہو سکتی ہے اور کوئی تم جیسا احمق بھی اس تیز رفتار دور میں موجود ہے۔"

"جسٹ شٹ اپ حمزہ! تم نے مجھے احمق کہا۔" وہ عادت کے مطابق چلا اٹھی۔

"تم احمق ہی نہیں بہت انوسینٹ بھی ہو۔ یاد ہے میں نے تم سے کہا کہ میں صبح سے بھوکا ہوں اور یہ میں نے اس لیے کہا تھا کہ تم کچھ کوکیز کے پیکٹ اور انڈے مجھے دے دو۔ جو میں تمہارے ہاتھ میں دیکھ چکا تھا۔ اور میرا خیال تھا کہ تم مجھے کچھ پیسے بھی دے دوگی۔ تاکہ میں کچھ پیٹ پوجا کرلوں۔ مگر میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ تم مجھے اپنے گھر لے جاؤ گی اور مجھے کھانا کھلانے کی آفر کردوگی۔ میں شاکڈ رہ گیا تھا۔ آج کے دور میں لوگ سگے رشتہ داروں کو بغیر انویسٹی گیشن کے اندر نہیں گھساتے، میرا حیران ہونا فطری تھا۔ تاہم تم سے اور نانا سے مل کر میرے اندر کی تشنگی اور بڑھ گئی ہے فریا!"

"تم چاہتے تھے کہ میں کچھ انڈے اور کوکیز کے پیکٹ کے ساتھ کچھ روپے بھی تمہیں دے دیتی۔" فریا ایک دم گویا فریز ہو گئی تھی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ سامنے بیٹھا یہ لڑکا سچا ہے یا جھوٹا۔ مگر ایک چیز کا یقین تو اسے آہی گیا تھا کہ سادگی اور معصومیت ہر کسی کو دھوکا دے سکتی ہے۔ اگر اسے اچھے طریقے سے خود پر طاری کرلیا جائے۔

"مجھے اس دن ذرہ بھر بھوک نہیں لگی تھی۔ لگ ہی نہیں سکتی تھی۔ چند ٹکڑوں کے عوض بے عزتی کروانے کے بعد ہر اس شخص کی بھوک پیاس اور نیند تک اڑ جاتی ہے، جو عزتِ نفس رکھتا ہے۔" حمزہ نیلے آکاش کی طرف دیکھتے ہوئے ان لمحوں میں گویا وہاں موجود ہی نہیں تھا۔ فریا چونک گئی تھی۔

"ہم فرینڈز ہیں، اور فرینڈشپ کے آغاز میں، میں تمہیں اپنے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔ تمہارے بارے میں تو میں جان ہی چکا ہوں۔ تم بہت ذہین ہو، بہت اچھی کوکنگ کرتی ہو، پیکنگ میں بھی ماہر ہو۔ ماسٹرز کرچکی ہو، ایک اچھا اکیڈمک ریکارڈ رکھتی ہو، ممی ڈیڈی ابراڈ میں ہوتے ہیں۔ تم بچپن سے ہی نانا کے ساتھ رہتی ہو۔ ولنشیا میں گھر لیے تم لوگوں کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔" حمزہ اسے مزید حیران کرنے پر تلا ہوا تھا۔ تاہم فریا کا ذہن ابھی تک کوکیز اور انڈوں میں ہی اٹکا ہوا تھا۔

"میں ایک درمیانے درجے سے بھی ذرا کم اسٹوڈنٹ رہا ہوں۔ پڑھنا نہ تو میرا شوق تھا، نہ مجبوری۔ میرا دل پڑھائی میں نہیں لگتا تھا۔ اب تم پوچھو گی کہ میرا دل کس چیز میں لگتا تھا، میرا دل رویوں، احساسات، نفرتوں اور محبتوں میں ہی الجھا رہا ہے۔ ٹھہرو میں کچھ اور پیچھے ماضی کی طرف جاتا ہوں۔ مگر اس سے بھی پہلے تمہیں بتادوں کہ میں محمد حمزہ ہوں۔ یہ سب سے بڑا سچ ہے اور اس سے بڑے سچ تمہیں آگے چل کر بتاؤں گا۔

یہ بات تمہارے لیے شاکڈ ہو گی کہ یہ سامنے وسیع و عریض عالی شان گھر میرا نہیں ہے۔ بلکہ میں تو اس گھر میں معمولی سا تنخواہ دار ملازم ہوں۔ اوپر کے کاموں اور سودا سلف لانے کے لیے مجھے اپائنٹ کیا گیا تھا۔ مگر اس گھر کی ایک چڑچڑی ملازمہ، جس کا کچن پر مکمل راج ہے، زبردستی مجھے شیف بنانا چاہتی ہے۔ تم حیران مت ہو فریا! میں تمہیں بتاتا ہوں محمد حمزہ کون ہے۔" فریا واقعی اس انکشاف پر دنگ رہ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"میں نے ہوش سنبھالا تو خود کو اندرونِ شہر کی غلیظ گلیوں میں پایا۔ گندگی کے ڈھیر پر اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ کھیلنے والا محمد حمزہ روتھ رچرڈ کا بیٹا تھا۔ میری ماں کا تعلق انگلینڈ سے ہے۔ میرے ابو کا تعلق ایک لوئر مڈل کلاس فیملی سے تھا۔ میری دادی ایک معمولی سی مڈوائف تھیں۔ جو اپنے ایریے کے علاوہ بھی جہاں جہاں زچہ بچہ کی بھنک پاتی فوراً دوڑ لگا دیتی۔ اس علاقے کی

واحد مشہور اور نامی گرامی دائی تھیں جو ناجائز کیس نمٹانے میں بھی ماہر تھیں اور اس معاملے میں خاص شہرت رکھتی تھی۔

جہالت، غربت اور بھوک نے جس گھر میں بسیرا کر رکھا تھا۔ ایسے چھوٹے اور بیچ گھرانے میں میرے ابو تنویر اسرار جیسے بچوں کو پیدا نہیں ہونا چاہیے، جن میں ہمت، لگن اور کچھ کر دکھانے کا جذبہ، جنون کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔

وہ اپنے ماحول سے الرجک تھے۔ وہ لاکھوں لوگوں کی بھیڑ میں اپنا ایک الگ مقام بنانا چاہتے تھے اور اس کے لیے چاہیے تھی بے تحاشا محنت، ان تھک کوشش اور ایک طویل تھکا دینے والا سفر۔ مگر جنون اور جستجو نے کبھی میرے ابو کو مایوس نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے خاندان کے پہلے تعلیم یافتہ فرد تھے، جنہوں نے یونیورسٹی لیول تک تعلیم حاصل کی تھی۔

یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں انگلینڈ کا ویزا مل گیا۔ نہ جانے کس کس سے قرض اور ادھار پکڑ کے بہت سے خواب لیے تنویر اسرار انگلینڈ چلے گئے۔ ان کے ویزے کی مدت مختصر تھی اور انہیں جو کچھ بھی کرنا تھا ان چند مہینوں میں ہی کرنا تھا۔ چھوٹی موٹی نوکری کی تلاش کے ساتھ ساتھ انہیں کسی سہارے کی بھی ضرورت تھی اور یہ سہارا روتھ رچرڈ کی صورت میں انہیں میسر آہی گیا۔ روتھ تیسرے درجے کی معمولی سی نرس تھی۔ اچھی صورت کی وجہ سے اوپر والی آمدنی کے ذریعے بخوبی گزر بسر ہو رہی تھی۔ نہ جانے کیسے میرے ابو کی ملاقات روتھ سے ہوئی۔ روتھ، ابو سے خاصی متاثر ہو چکی تھی اور ابو کے آفر کرنے پر وہ ان سے پیپر میرج کے لیے رضامند ہو گئی۔ رقم وغیرہ کے معاملات بھی طے پا گئے تھے۔ ابو روزانہ کتنے پونڈز روتھ کو دیا کریں گے، یہ سب تو طے تھا۔

ابو کو روتھ کے توسط سے نیشنلٹی تو مل چکی تھی۔ مگر کچھ ٹیکس ادا کرنے کے چکر میں ابو ابھی کچھ بھی سیونگ نہیں کرسکے تھے۔

پاکستان میں پیسہ بھجوانا تو دور کی بات تھی۔ ابو خود بہت مشکل سے گزارا کر رہے تھے۔ جن لوگوں سے قرض لے رکھا تھا۔ وہ سب دادی کا ناک میں دم کیے ہوئے تھے۔ دادی خود فاقوں سے عاجز آچکی تھیں۔ گھر کا چولہا پہروں ٹھنڈا رہتا۔ دو، دو دن کچھ کھانے کو نہ ملتا۔ ایسی صورت حال میں اگر ایک، تین سال کے بچے کی ذمہ داری بھی آن پڑے تو گھر کے سربراہ کی کیا حالت ہوگی۔

یہ بچہ میں تھا محمد حمزہ۔ جس کی ماں اسے جنم دے کر باپ کے دروازے پر پھینک گئی تھی۔ روتھ ایسے کنگلے پاکستانی سے اکتا چکی تھی۔ ابو نے کچھ عرصہ تو مجھے اپنے پاس رکھا مگر پولیس کی مہربانی نے مجھے میرے باپ سے دور کردیا۔ بلاشبہ میرا باپ محبت کرنے والا بہت اچھا باپ تھا، مگر ابو کو غلط فہمی کی بنا پر جیل ہوگئی۔ ابو کی خواہش کے مطابق ان کے اسٹور کے مالک نے مجھے پاکستان ابو کی فیملی کے پاس بھجوا دیا اور میری زندگی کے تلخ ترین دور کا آغاز ہو گیا۔

میں نے بھوک کا مزہ چکھا۔ میں نے نفرت اور ذلت سے لطف اٹھایا۔ چاچا، پھوپھی اور دادی، ان تینوں لوگوں کے پاس میرے لیے کچھ نہیں تھا۔ نہ محبت، نہ توجہ، نہ وقت۔ میں نے اس گھر میں دادی کی گالیوں، کوسنوں اور طعنوں کے درمیان بچپن گزارا۔ میرے ابو کے علاوہ دو لوگ اور پڑھنے کے شوقین تھے۔ پھوپھو اور چاچا۔ کتابوں کے شیدائی، کتابی کیڑے، رات دن کتابوں میں سر گھسائے رکھتے۔

چاچا بھی کبھی ترنگ میں آکے کہتے۔ "بھا تنویر کی طرح بڑا آدمی بننا چاہتا ہوں۔"

دادی کو چاچا اور پھوپھو کا پڑھنا بھی سخت ناپسند تھا۔ چاچا بہت اچھے تھے۔ تاہم پھوپھو سخت بد مزاج تھیں۔ ہر وقت اپنے آپ میں مگن رہتیں۔ پھوپھو کا شمار حسین لڑکیوں میں ہوتا تھا۔ اسی حساب سے ان کے خواب بھی اونچے تھے۔

ان تینوں بہن بھائیوں میں ایک چیز مشترک تھی اور وہ چیز تھی اس ماحول سے فرار۔ ابو تو فرار حاصل کرچکے تھے۔ باقی دو پیچھے بھی اڑنے کو بے تاب تھے۔

چاچا کو مجھ سے کچھ نہ کچھ محبت ضرور تھی۔ دادی کو جب بھی میرے لیے ڈنڈا اٹھاتے دیکھتے فوراً "میری ڈھال بن جاتے۔ اسکول میں چاچا کی مہربانی سے مجھے داخلہ مل ہی گیا تھا۔ اور اس کے بعد اڑنے والے پنچھی اپنی اڑان بھر کے دور بہت دور ــ چلے گئے۔

چاچا کو اسکالر شپ مل گیا۔ پوپھو بھی من پسند ڈگری حاصل کر چکی تھیں۔ رحیماں دائی ـ قابلیت کے معاملے میں تو خوش قسمت تھی۔ مگر اپنی اولاد سے عمر بھر فیض نہیں پایا۔

سننے میں آیا تھا' چاچا نے بھی اپنی کلاس فیلو سے شادی کر لی تھی' اور وہ ملک سے باہر چلے گئے۔ جانے سے پہلے گھڑی بھر کے لیے دادی سے ملنے کے لیے آئے تھے۔ آخری مرتبہ مجھے بھینچ بھینچ کر ملتے ہوئے چاچا نے کہا۔ "حامے! زندگی میں ہمت اور لگن کو ہمراہ رکھنا اور روشنیاں اپنی طرف بلا میں تو اندھیرے پیچھے چھوڑ کر اندھا دھند بھاگ لینا۔ ہم نے نام اور مقام کے لیے بہت محنت کی ہے اور اب اس محنت سے لطف اٹھانے کا وقت آیا ہے۔"

میں کہنا چاہتا تھا' تھا تو آپ کچھ بھی نہیں تھے۔ آپ کے پیچھے بھی تو وہ مشقت کی چکی پیسنے والے ہاتھ تھے۔ مگر میں کچھ بھی نہیں کہہ سکا۔

چاچا چلے گئے اور میں خالی خالی نظروں سے چاچا کو جاتا دیکھتا رہا۔ چاچا نے اپنی بیوی سے دادی کو ملوانا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔ دادی جو ایک بدنام سی مڈوائف تھیں ان کا حوالہ شاید دادی کی اولاد کے لیے شرم ناک تھا۔ مگر جو بھی تھا دادی ان کی ماں تو تھیں۔ چاچا کے اس طرح چلے جانے کا سارا عتاب بھی مجھ غریب پر نازل ہوا۔ دادی نے جوتی اٹھا کر جی بھر کے مجھے مارنے کے بعد دل کی ساری بھڑاس نکالی۔ ان کے خیال میں منحوس اور نجس تھا میں۔ میرا بخت سیاہ تھا اور اس کی سیاہی دادی کے گھر پر سایہ فگن تھی۔

چاچا چلے گئے تو ایک روز اسپتال میں مقیم پھوپھو بھی ایسی غائب ہوئیں کہ سالوں ان کا نشان نہ ملا۔ دادی رو دھو کر بیٹی پر فاتحہ پڑھنے کے بعد پھر سے اپنے مشغلے میں مصروف ہو گئیں۔ مگر پھوپھو کے غم نے دادی کو ایسی دیمک لگائی کہ پھر وہ صرف چند سال ہی جی سکی تھیں۔ پھوپھی بھی میری آمد سے پہلے ہی چاچا کی طرح دوران تعلیم چپکے چپکے گھر بسا چکی تھی۔ مرنے سے پہلے دادی نے مجھ سے وعدہ لیا۔ حامے! وعدہ کرتا مجھ سے 'میری بیلی کو ضرور ڈھونڈے گا۔" میں نے روتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ دادی میرے حامی بھرنے پر خوش ہوئی یا نہیں' مگر میرا دل ضرور مطمئن ہو گیا۔ دادی نے اپنی زندگی کی آخری رات مجھے جی بھر کے پیار کیا۔

دادی نے کہا۔ "حامے! تو میرا اصل سود تھا اور میں کھوٹ کے پیچھے رلتی رہی تو میرا تھا' تجھے مٹی میں رول دیا اور جو کھوٹ کا مال تھا اسے پارس کر دیا۔ ہا' میں نے برا کیا' اور میری کوکھ سے جنے بچوں نے میرے ساتھ برا کیا۔" دادی کو آخری عمر میں بہت سے پچھتاووں نے گھیر لیا تھا۔ عمر کی پونجی لٹنے کے قریب ہو تو آنکھیں چوپٹ ہو ہی جاتی ہیں۔ دادی مر گئیں' مجھے معلوم تھا دادی کے مرنے کے بعد میرے لیے دنیا میں کوئی اماں نہیں رہے گی۔ میری زندگی کا دور سراغ ترین دور شروع ہو گیا۔

پیٹ کے دوزخ کو بجھانے کے لیے مجھے مزدوری کرنا پڑی۔ اینٹیں اور پتھر ڈھوئے۔ بجری اور گارا اٹھایا۔ بھوک میرے جسم سے ساری توانائی کھینچ لیا کرتی تھی اور میں بجری کی ڈھیریوں پر بے دم ہو کر اونگھنے لگتا تھا۔

دس ماہ خوار ہونے کے بعد مجھے پتا چلا کہ میرا باپ پاکستان آچکا ہے۔ یہ خبر مردہ تن میں جان ڈالنے کے لیے کافی تھی۔

ابو مجھے لینے کے لیے آئے تھے۔ وہ بہت کمزور اور بوڑھے ہو چکے تھے۔ وہ بیمار تھے اور انہیں شاید میرے سہارے کی ضرورت تھی۔

میں ابو کے ساتھ انگلینڈ آ گیا۔ یہ ایک نئی دنیا تھی۔ طلسماتی دنیا تھی۔ مجھے لگتا تھا میں کسی جادو نگری میں آ گیا ہوں۔ میں کانچ کے اس شہر ہوشربا اس جگر جگر جگمگاتی دنیا کے حسن سے دم بخود تھا۔ میری آنکھوں نے حسن فطرت کے کئی نظارے دیکھے۔ میرا دل نہ جانے کس احساس تلے دبا اچانک بجھ گیا تھا۔ ابو نے مجھے میری جائے پیدائش دکھائی۔ ایک معمولی سا کلینک تھا جس میں محمد حمزہ نے آنکھیں کھولی تھیں۔ پھر ابو نے مجھے وہ مکان دکھایا تھا جس میں وہ میری ماں کے ہمراہ چند سال قیام پذیر رہے تھے۔ ابو آہستہ آہستہ ایک ایک منظر سے پردہ ہٹا رہے تھے۔ یہ مکان بہت مختصر اور غلیظ علاقے میں تھا۔ مجھے اپنے گھر کی گلیاں اور بازار یاد آ گئے تھے۔

تو کیا میرے ابو اس دنیا کی تمنا لیے پردیس کی صعوبتیں جھیلتے رہے ہیں۔ اسی لائف اسٹائل کی آرزو کی تھی انہوں نے؟ خواب کے اس سفر نے انہیں آخر دیا ہی کیا۔ جو کچھ وہ پیچھے چھوڑ کر آئے تھے۔ وہ ہی کچھ تو انہیں یہاں آ کر ملا تھا تو پھر عمر گنوانے میں کیا نفع ملا انہیں۔

میری بچی سوچیں سفر در سفر کر رہی تھیں۔ ٹیکسی کی رفتار کے ساتھ ساتھ میرا ذہن بھی فل اسپیڈ میں بھاگ رہا تھا۔

ٹیکسی کو بریک لگے۔ جس طرح ٹیکسی ایک جھٹکے کے ساتھ رکی تھی' اسی طرح میرا ذہن بھی جھٹکا کھا کر رُک گیا۔ میری آنکھوں نے ایک اور منظر دیکھا۔ روشن اور چمکتا دمکتا منظر۔

ابو میرا ہاتھ تھامے اس وسیع و عریض گھر کے انٹرس ڈور کو کھول کر مجھے اندر لے آئے۔

"حامے! یہ تیرا گھر ہے۔" اب وہ مجھے خود میں سمو کے بہت محبت سے کہہ رہے تھے۔ وہ جانتے تھے میں گھبرا رہا ہوں۔ وہ میری گھبراہٹ دور کرنے کے لیے ہلکی پھلکی باتیں کرنے لگے تھے۔

"ابو! یہ میرا گھر ہے۔ یہ ہمارا گھر ہے۔" میں کنفیوژ تھا۔ میرے دل کی دھڑکن بے قابو تھی۔ لکڑی کی چھت والا یہ گھر باہر سے جتنا شان دار تھا اندر سے دگنا شان دار۔ مجھے لگا میں بھی خواب ہی دیکھ رہا ہوں۔ یہ خواب کس قدر خوب صورت تھا اگر سلامت رہتا۔ اس خواب کو ایک چنگھاڑتی آواز نے چھناکے سے توڑ ڈالا۔ میرے سامنے ایک بوڑھی عورت کھڑی تھی۔ بے حد ماڈرن سی بوڑھی عورت' جس کے چہرے پر لاتعداد جھریاں تھیں۔ اس کے ہاتھ چہرے سے بھی زیادہ بدصورت تھے۔ جھریوں سے اَٹے۔ وہ مجھ پر اور ابو پر برابر چلا رہی تھی۔ اس نے ابو کو بہت غلیظ غلیظ گالیاں دیں۔ مجھے بس لمحہ ہی لگا تھا اپنے شان دار سے ابو کے چہرے پر لکھی تحریر کو پڑھنے میں۔ ابو اس عمر میں کیوں اس قدر شکستہ اور بیمار بیمار رہنے لگے تھے۔ میں سمجھ چکا تھا۔ اور جب بات سمجھ میں آگئی تو میرا سر اور شانے بھی ابو کی طرح جھک گئے۔

"عزت اور محبت میرے نصیب میں نہیں۔ یہ دونوں چیزیں مجھے کبھی میسر نہیں آسکتیں۔"

میں ہر خواہش اور ہر خواب پر دل ہی دل میں فاتحہ پڑھنے لگا تھا۔ خوابوں پر فاتحہ پڑھنا آسان نہیں ہوتا۔ مگر میں نے اپنے دل کو کچل کر ایسا کیا۔ مجھے یقین تھا سامنے کھڑا میرا باپ بھی ماضی میں یہ عمل دہرا چکا ہے۔ وہ بھی اپنے خوابوں اور تمناؤں کو دفنا چکے تھے۔ میں نے بھی بالکل ایسا ہی کیا۔

میں اپنے باپ کی طرح اس گھر میں تیسرے درجے کا رہائشی تھا اور اس شہر میں اپنی پہچان بنانے کی بھلا مجھے ضرورت ہی کیا تھی۔ میں نے خود کو تیسرے درجے کا شہری اور آخری درجے کا رہائشی سمجھ لیا تھا۔ مان لیا تھا اور اس پر صبر کر لیا۔

"جانتی ہو فریا! وہ بوڑھی عورت کون تھی؟ میرے باپ کی دوسری بیوی۔" فریا اس کے چند پل خاموش رہنے پر سخت بے چینی محسوس کر رہی تھی اور جب اس نے دوبارہ بولنا شروع کیا تو وہ پہلے کی طرح بہت توجہ سے سننے لگی۔

"لیڈی نینی کے ساتھ رہنا کسی عذاب سے کم نہ تھا۔ وہ بے تحاشا جھگڑالو عورت تھی۔ چیخنے پر آتی تو پورا دن چیختی رہتی۔ میں اور ابو سارا دن اس کی ذاتی بیکری میں کولہو کے بیل کی طرح جتے رہتے تھے۔ ابو کی

صحت کو دیکھتے ہوئے میں ابو کو زیادہ کام نہیں کرنے دیتا تھا۔ وہ بہت جلد تھک جاتے تھے۔ انہیں پھیپھڑوں میں پس کا مسئلہ تھا۔ وہ ریگولر میڈیسن لیتے تھے۔ اگر دوائی نہ کھاتے تو ان میں چلنے پھرنے کی سکت بھی نہ رہتی۔

ابو چاہتے تھے میں کالج میں ایڈمیشن لوں۔ وہ مجھے اعلا تعلیم دلوانا چاہتے تھے۔ مگر لیڈی 'نینی' نے میری پڑھائی کا سن کر ایک طوفان کھڑا کردیا۔ اور کالج میں تو نہیں البتہ مجھے ایک انسٹی ٹیوٹ میں انگریزی سیکھنے کے لیے ایڈمیشن دلوایا گیا۔ تین مہینے کا یہ کورس مکمل ہوا تو ڈرائیونگ لائسنس کے لیے کتابچے پڑھنے شروع کردیے۔ لیڈی نینی نے مجھے اپنا ذاتی ملازم سمجھ رکھا تھا۔ گھر آنے کے بعد بھی اسے ہزاروں کام یاد آجاتے تھے' جو نہ جانے میرے آنے سے پہلے کون کرتا تھا۔

تین سال اس نے مجھے ذلیل کیا اور ابو بے بسی سے تماشا دیکھتے رہتے۔ ایک دن میرے ضبط کے ٹانکے ادھڑے تو ابو تحمل سے مجھے سمجھانے لگے۔

"ہم اپنے قدم جمالو یہاں جامی! میں کچھ سرمایہ تمہیں دوں گا۔ میرا دل ہے' تم اپنا اسٹور اسٹیبلش کرلو۔" ابو نے میرے حوالے سے بھی کئی خواب دیکھ رکھے تھے' جو ہمیشہ ادھورے ہی رہے۔

"ابو اگر آپ پاکستان میں رہتے' وہاں جاب کررہے ہوتے۔ تو ہمارا بھی ایک گھر ہوتا۔ بہت زیادہ نہ سہی ہم اچھی زندگی ضرور گزارتے۔ متوازن ماحول ہوتا' میرے اور بہن' بھائی ہوتے' ابو آپ نے کبھی نہیں سوچا کہ آپ نے یہاں آکر بہت غلط کیا ہے اور دادی سے بہت سال رابطہ نہ رکھ کے اس سے بھی زیادہ غلط اور برا۔"

"بہت دفعہ سوچا ہے' مگر اب کیا ہوسکتا ہے' جامی! تم نہیں جانتے' میں نے وقت کو اپنے اوپر کس قدر تنگ دیکھا ہے۔" وہ نہ بھی بتاتے تو ان کے مشقت بھرے سفر کی گواہ ان کی تھکی تھکی آنکھیں تھیں۔

پھر ایک روز ابو کو نہ جانے کیا سوجھی۔ وہ لیڈی نینی کو بتائے بغیر مجھے لیے ایک دوسرے شہر آگئے۔ حالانکہ ابو تو شاید سانس بھی لیڈی سے پوچھ کر لیتے تھے۔ مجھے ہمیشہ افسوس رہا ہے کہ میں اتنا بزدل کیوں رہا ہوں اور ابو بے چارے بیویوں کے معاملے میں انتہائی بدقسمت۔

یہ شہر بھی میرے لیے نیا تھا اور مجھے کچھ دیر تک علم نہیں تھا کہ ابو مجھے کس سے ملوانے کے لیے لائے ہیں۔

میں پہلی نظر میں چاچا کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ پہلے سے بھی کئی زیادہ گریس فل ہوچکے تھے۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ شان دار نظر آرہے تھے۔ وہ ایک اچھی خوشحال زندگی گزار رہے تھے۔ ان کے چہرے کی صحت مندی سے واضح تھا۔ وہ بہت اچھی جاب کررہے تھے۔

"شاہ جے! بتا یہ کون ہے؟" ابو' چاچا کو دیکھ کر ایک دم گویا توانا ہوگئے تھے۔ پردیس میں یہ اپنے کیا اہمیت رکھتے ہیں۔ کوئی ہم جیسے پردیسیوں سے پوچھتا۔

"یہ تو میرا جاما ہے' اتنا بڑا اور لمبا ہوگیا ہے' اسے کب لائے ہیں بھا تنویر!" چاچا نے مجھے خود میں بھینچ کر بے ساختہ کس جوش اور محبت سے کہا تھا' میرے انگ انگ نے محبت کی اس گرمی کو محسوس کیا تھا۔

"بھا تنویر! آپ جامے کو یہاں لے آئے۔ یہ ایک بہترین فیصلہ کیا ہے آپ نے۔ جامی کی زندگی بن جائے گی۔"

چاچا مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئے تھے۔ البتہ ان کی بیوی کاشفہ چاچی کافی نخوت سے ملی تھیں۔ مجھے محسوس ہوا تھا چاچی کو ہماری آمد گراں گزری ہے۔ ابو کا آنا بھی انہیں پسند نہیں آیا تھا اور یہ بات کچھ عرصے بعد مزید کھل گئی تھی کہ چاچی' چاچا کے رشتے داروں سے اچھا خاصا خار کھاتی ہیں۔ چاچا کے رشتے دار بھلا تھے ہی کتنے۔ واحد میرے ابو' مگر میں حیران رہ گیا تھا' جب چاچا نے ابو کو بتایا۔

"بیلی کی پروموشن ہوگئی ہے۔ اسے یہاں کی کمپنی میں جاب کرنے کا موقع ملا ہے۔ فرقان (بیلی کا میاں) بھی اپنے بڑے بھائی کے ہمراہ یہاں سیٹل ہوگیا ہے۔ بیٹیاں دونوں پڑھ رہی ہیں۔"

چاچا بڑی محبت سے بیلی پھوپھی کا ذکر کررہے تھے۔ میرا حیران ہونا فطری تھا۔ وقت شاید واقعی بدل گیا تھا۔ ہاسٹل سے غائب ہونے والی بہن کو بھائی کیسے سر آنکھوں پر بٹھا رہے تھے۔ ابو خود پھوپھی سے ملنے کو بے تاب تھے۔

میں نے محسوس کیا' چاچی کو پھوپھی کا ذکر ناگوار نہیں گزرا تھا۔ وہ پھوپھی کو اپنے گھر انوائٹ کرنے کا پروگرام بنا رہی تھیں۔ وہ پھوپھی کا ذکر بہت محبت سے کررہی تھیں۔

میں اور ابو ایک بھرپور دن گزارنے کے بعد واپس آگئے تھے۔ مگر گھر آنے پر ہمیں ایک طوفان کا سامنا کرنا تھا۔ اس بات سے میں اور ابو دونوں ناواقف تھے۔

لیڈی نینی نے مجھے اور ابو کو بے بھاؤ کی سنائیں۔ ہمیں غلیظ غلیظ گالیاں دیں۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا۔ ہم لیڈی نینی کے رویے بلکہ ہر طرح کے رویے کے عادی تھے۔ مگر اس نے ہمیں گھر سے نکال دیا۔ یہ ہمارے گمان میں بھی نہیں تھا۔

اس برفانی رات کو جو لہو تک کو منجمد کررہی تھی' کھلے آسمان تلے ہم دونوں بے آسرا کھڑے تھے۔ اپنی زندگی کے اس موڑ پر بھی میں حیران تھا' بے تحاشا حیران' مختصر یہ کہ میں اور ابو شاہ جے چاچا کے گھر چلے آئے۔ چاچا حسب معمول خوش ہوئے تھے بلکہ بے تحاشا خوش ہوئے تھے۔ مجھ پر تو نہ جانے کیوں انہیں بہت پیار آرہا تھا۔ وہ میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر نرمی سے دباتے۔

"جاما تو میرا بیٹا ہے۔"

"تو اسے سچ مچ اپنا بیٹا بنالے۔" ابو نے نہ جانے کس لہجے میں اور کس انداز میں بات کی تھی۔ میں سمجھ نہیں پایا تھا' البتہ چاچا خوب اچھی طرح سے سمجھ چکے تھے۔

"میں نے سچ مچ اسے اپنا بیٹا بنالیا۔" چاچا کی آنکھوں میں شوخی تھی۔

"تو سچ کہہ رہا ہے شاہ جے!" ابو کی آنکھیں ہنسنے لگیں۔

"بھا تنویر! تم بھی نا' جاما میرا بیٹا ہوا' میں نے کہہ دیا' آج سے تم اس کی فکر کرنا چھوڑ دو۔"

چاچی اور اپنے بیٹے سے فر فر انگریزی بولتے چاچا' ابو کے ساتھ اپنے پرانے لب و لہجے میں گفتگو کرتے تھے اور چاچی کو اس انداز پر آگ لگ جاتی تھی۔

وہ ہمارے درمیان نہیں بیٹھتی تھیں۔ انہیں اس جاہلانہ طرز گفتگو سے نفرت تھی۔ انہیں ہمارا اپنے گھر میں قیام بھی کھٹکتا تھا اور وہ اپنے دل کی بھڑاس چاچا کے آفس جانے کے بعد اچھی طرح سے نکال لیتی تھیں۔

"جاہلوں اور ان پڑھ لوگوں کی طرح چاچا مت کہا کرو' انکل بولا کرو' پینڈو' جنگلی' نہ جانے کہاں سے اٹھ کر آگئے۔"

"انکل تو کوئی بھی ہوسکتا ہے چاچی! چاچا بولنے سے رشتے کی وضاحت ہوتی ہے۔ مجھے دادی نے اسی طرح بولنا سکھایا ہے۔"

میرا بولنا تو چاچی کو اور بھی تپا ڈالتا تھا۔ کہاں کے جواب دینا' یہاں بھی میں تیسرے درجے کا رہائشی تھا۔ یعنی چاچی مجھ سے ایک میڈ والے تمام کام لینے کی کوشش کرتی تھیں اور میں صرف ابو کی خاطر سب کرنے پر مجبور تھا۔ وہ چاچا کے قریب رہنا چاہتے تھے۔ وہ پھوپھی سے بھی بڑے تپاک سے ملے تھے۔ پھوپھی بھی ابو سے مل کر خوب روتی رہی تھیں۔

ایک دن ابو نے میرے پوچھنے پر بتایا۔ "شاہ جے نے بیلی کا نکاح فرقان سے کروایا تھا۔ تب بیلی ابھی پڑھ رہی تھی۔" ابو نے سرسری سا بتایا تھا۔ تاہم میں کچھ عرصے بعد کچھ نہ کچھ تو جان ہی گیا تھا۔ یہ کہ نکاح کے بعد پھوپھی جب پریگننٹ ہوئیں تو ہاسٹل سے انہیں نکال دیا گیا تھا۔ اور یہ بات میری پیدائش سے بھی پہلے کی تھی اور میں چاچا سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اگر دادی کو اعتماد میں لے کر اتنا بڑا فیصلہ کیا جاتا تو اس میں کیا حرج تھا۔ مگر ایک تلخ حقیقت یہ بھی تھی کہ دادی کا حوالہ ان کے بچوں نے ہمیشہ اپنی خوشیوں اور کامیابیوں کی راہ

میں رکاوٹ سمجھا تھا۔ ظاہر ہے ایک مڈوائف کی بیٹی کو
فرقان کے گھر والے کبھی بیاہ کر نہ لے جاتے۔ اسی
طرح چاچا نے بھی اپنی محبت اور پسند کو حاصل کرنا تھا۔
کیا فرق پڑتا تھا کہ ماں کی خوشی کا احساس کیا تھا' یا نہیں
کیا تھا۔

پھوپھی بھی کتنا عرصہ دادی کی نظروں میں دھول
جھونکتی رہی تھیں۔ وہ جو چال ڈھال سے چہرے مہرے
سے جان جاتی تھیں کہ یہ عورت حاملہ ہے۔ اپنی بیٹی
کے انداز دیکھ کر قطعاً "نہ ٹھٹکیں۔ کتنی بڑی سزا
قدرت کی طرف سے انہیں ملی تھی۔ اللہ نے اگر کچھ
اختیار دے رکھا ہو اور اسے ناجائز طریقے سے استعمال
کیا جائے تو اس سے بڑا گناہ کیا ہو سکتا ہے۔ اپنے علم
اور ہنر کو غلط استعمال کرنا بھی گناہ ہوتا ہے۔ گناہ چھوٹا یا
بڑا نہیں ہوتا' بس گناہ ہوتا ہے۔

میرے حافظے میں کہیں کہیں دادی کا چھپ چھپ
کر رونا بھی محفوظ ہے۔ شاید وہ اپنی اولاد کی بغاوت کی بو
پا ہی چکی تھیں یا پھر جو بھی تھا اپنے گناہوں کا ادراک
پشیمانیوں کے عمیق گڑھے میں دھکیلتا ہے۔ محلے کی
کنواری لڑکیوں کے کیس لیتے ہوئے کبھی اپنے گھر کی
عزت کے بارے میں سوچا ہی نہ تھا۔

پھوپھی کے غائب ہونے کے بعد رحیماں دائی کی
بیٹی کے قصے گلی گلی اور بازار بازار چٹخارے لے کر
سنائے گئے تھے۔ مگر یہ کھیل تو پھوپھی نے شاید کالج کی
شروعات میں رچالیا تھا۔ مطلب نکاح کر لیا تھا۔

چاچی بھی شدید اسٹیٹس کانشس تھیں شاید۔
ظاہر ہے چاچا کے رشتے داروں میں ان کے دو بہن'
بھائی تھے۔ ابو تو چاچی کو ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے۔
البتہ اسمارٹ سی خوب صورت پھوپھی جو بلا کی خوش
لباس تھیں۔ چاچی کی پسندیدہ ہستیوں میں شامل
تھیں۔

میں کبھی کبھی حیران ہو کر سوچتا تھا' ابو کے علاوہ
رحیماں دائی کے دونوں بچے ہر لحاظ سے کامیاب
زندگی گزار رہے تھے۔ اگرچہ کچھ نہ کچھ کمی تو ضرور
ہوتی ہے۔

ہمارے پرانے محلے کے بعض راوی یوں بھی بیان
کرتے ہیں کہ دادی اپنی بیٹی کے طور طریقوں سے
اچھی طرح واقف تھیں اور وہ جانتی تھیں کہ پھوپھی
اپنی پسند سے نکاح کر رہی ہیں' جو بھی تھا' پچھتاوا ادھر
بھی تھا اور ادھر بھی۔

کچھ دن بعد لیڈی نینی ہمیں خود لینے آگئی تھیں۔
میں اور ابو دونوں ہی جانا نہیں چاہتے تھے' مگر جانا تو
ہمیں تھا ہی۔

ایک روز ابو نے مجھے بتایا کہ وہ چاچا کی بیٹی سے میری
بات پکی کر چکے ہیں۔ چاچا کی بھی مکمل رضامندی
شامل تھی جبکہ چاچی اور پھوپھی دونوں نے ایک
طوفان کھڑا کر دیا تھا۔ قصہ مختصر یہ طوفان مجھے دوبارہ
اپنے مرکز کی طرف لے آیا تھا۔ یعنی میں پاکستان آگیا۔
ٹھکانہ پہلے بھی میرے پاس نہیں تھا اور اب بھی۔

ایک پرانے جاننے والے کے توسط سے ایک اسکول
میں مجھے بہت مختصر تنخواہ پر فٹ بال کا ٹیچر رکھ لیا گیا تھا۔
روٹی کا سلسلہ تو چل پڑا تھا۔ تاہم رہنے کے لیے ایک
چھت کی ضرورت تھی۔ اخبار بینی کے شوق نے ٹھکانہ
بھی فراہم کر دیا۔

یزدانی فیملی کو اپنے بچوں کے لیے میرے جیسے لڑکے
کی ہی ضرورت تھی۔ یعنی بچوں سے متعلقہ اشیاء ہر روز
خرید کر لانے کی ذمہ داری میری تھی۔ علاوہ ازیں مجھے
بچوں کا ٹیوٹر بھی بنا دیا گیا۔ میڈم کو خبر ہوئی کہ میں اچھی
انگریزی بولتا ہوں' سو مجھے بچوں کو انگریزی سکھانے پر
مامور کر دیا گیا۔ پھر میڈم کو بچوں کے توسط سے پتا چلا کہ
میں فٹ بال کا بہترین کھلاڑی رہا ہوں۔ یہ ہوائی نہ
جانے کس دشمن نے اڑائی تھی۔ بہرحال ایک گھنٹہ
قریبی پارک میں بچوں کو فٹ بال کی پریکٹس بھی کروانا
پڑی۔

میڈم کو اندازہ تھا کہ میں اچھی ڈرائیونگ کر سکتا
ہوں۔ سو مجھے بچوں کا ڈرائیور بھی بننا پڑا۔ بچوں کو
اسکول پک اینڈ ڈراپ کی ذمہ داری بھی میرے ناتواں
کندھوں پر ڈال دی گئی۔ تابوت میں آخری کیل میڈم
کی نک چڑھی کوکنگ ایکسپرٹ مس مینا نے ٹھونک

دیا۔ بچوں کی فرمائش پر ایک دن کیک کیا بیک کر دیا تھا، مس ٹینا مجھے شیف بنانے پر تل گئی۔

مس ٹینا ویسے بھی مجھ غریب سے خار کھاتی تھی۔ اس روز معمولی سی جھڑپ کیا ہوئی مس ٹینا نے مجھ پر چوری کا الزام لگا دیا۔ میں ناشتے کے لوازمات لینے مارکیٹ گیا تھا، جب کسی نے میرا والٹ اڑا لیا۔ مگر مس ٹینا نے ماننے سے انکار کر دیا۔ خوامخواہ میری بے عزتی کی۔ مجھے خوب ذلیل کیا۔ مگر بھلا ہو میڈم کا، ان تک بات پہنچی اور میری خلاصی ہوئی۔

"اب تم بتاؤ کیا تم دوستی کے رشتے کو قائم رکھو گی۔ یہ سب جاننے کے بعد کہ میں کون ہوں۔" حمزہ نے اچانک ہی گفتگو کے سلسلے کو منقطع کر کے بے حد سنجیدہ بیٹھی فریا سے کہا۔

"بولو نا فریا!" فریا کی خاموشی نے حمزہ کو حد درجہ متوحش کر دیا۔

"کیا بولوں؟" بہت دیر بعد فریا نے کہا بھی تو کیا۔

"یہی کہ تمہیں ایک ڈرائیور، ایک ٹیوٹر اور ایک شیف سے دوستی منظور ہے۔" حمزہ کے چہرے پر خوف ناک قسم کی سنجیدگی طاری تھی۔

"بولو فریا۔" وہ بے انتہا بے قرار ہوا۔ "جواب دو خاموش کیوں ہو؟" گویا وہ رو دینے کو تھا اور اسی بے قراری کے عالم میں وہ گھٹنوں کے بل فریا کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

"کہا تو ہے یار! منظور ہے، منظور ہے، منظور ہے۔ کسی ایگری منٹ پر سائن کروانے ہیں کیا۔"

وہ ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی، جبکہ حمزہ کا کب کا رکا ہوا سانس ایک دم بحال ہو گیا۔ اس کے چہرے پر ناقابل فہم تاثرات ابھرے تھے۔ اگر فریا دھیان دیتی تو ضرور ٹھٹک جاتی۔ وہ فتح یابی کے احساس سے مسرور تھا، بے انتہا مسرور۔

☼ ☼ ☼

وہ فریا سے اتفاقاً ہر اس جگہ ٹکراتا رہا تھا، جہاں اس کی موجودگی کا اسے یقین ہوتا۔ مارکیٹ، پارک، کالونی کی سڑکوں پر۔ آئندہ آنے والے ان چار پانچ مہینوں میں اس نے فریا کے گرد ایسا دائرہ کھینچ کر اس میں محصور کر لیا تھا کہ وہ چاہ کر بھی اس دائرے سے نکل نہیں سکتی تھی۔ وہ اس دائرے سے نکلنا چاہتی نہیں تھی۔ وہ ایسی کوشش کرتی ہی کیوں؟ کیونکہ فریا عتیق ان دو سالوں میں محمد حمزہ کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔

وہ محمد حمزہ جو یزدانی ہاؤس کا ڈرائیور تھا۔

اک عام سا ٹیوٹر تھا۔

معمولی سا شیف تھا۔

فریا عتیق جو پاپا کی ذہین تھی۔ پوزیشن ہولڈر تھی۔ گولڈ میڈلسٹ تھی۔ بے حد عام سے محمد حمزہ کی محبت میں مبتلا ہو گئی تھی۔ جس کا اکیڈمک ریکارڈ صاف سلیٹ کی مانند تھا۔ جس کے ہر صفحے پر اس کی زندگی کے ذاتی تجربات درج تھے۔

جب وہ ٹیرس پر کھڑی ہوتی۔ سامنے والوں کے وسیع و عریض لان میں حمزہ جھنجلایا سا بچوں کے ساتھ دماغ کھپا رہا ہوتا۔

"بڑا شوق ہے ان کی ماں کو انگریزی داں بنانے کا۔ بولنا ابھی آتا نہیں۔ ڈھائی تین سال کے ان بچوں کو میں بھلا کیا سکھاؤں۔" وہ غصے سے بڑبڑاتا کچھ دیر بعد فریا کے روبرو ہوتا تھا۔

"ایک تو میڈم یزدانی نے ہر سائز کا بچہ پالا ہوا ہے۔ پورے نو بچے، لگتا ہے محکمہ منصوبہ بندی والوں کا زور بھی نچلے طبقے پر چلتا ہے۔" وہ سخت جھنجلایا ہوا تھا۔

"تم کوئی ڈھنگ کی جاب کیوں نہیں کرتے؟" فریا نے اور بھی اسے تپایا۔

"میں آکسفورڈ یونیورسٹی کا ڈگری ہولڈر ہوں نا! ڈھنگ کی جاب تو مجھے طشتری میں سجا کر پیش کر دی جائے گی۔" حمزہ نے خفگی سے کہا۔

"تم نے فیوچر کی کوئی پلاننگ کی ہے یا یوں ہی مسز یزدانی کا ڈرائیور بنے رہنا ہے۔" فریا نے کافی سنجیدگی سے کہا تھا۔

"یار! میں مسٹر یزدانی کو کافی آئیڈیلائز کرتا ہوں۔ فیوچر میں ان کی طرح فٹ بال کی ٹیم بناؤں گا۔" وہ مزے سے کینو چھیلتے ہوئے بولا۔ "میری فی الحال فیوچر پلاننگ یہیں تک ہے۔"

"فٹ بال کی اس ٹیم کو خوار کرنے کے لیے پیدا کرو گے۔ اپنے جیسا شیف اور ڈرائیور بناؤ گے انہیں۔" فریا نے اس کے کندھے پر دھموکا جڑا۔

"یہ تو ان کے نصیب ہوں گے۔ وہ جیسے بھی بن جائیں۔"

"فضول مت بکو میں سیریس ہوں۔"

"میں بھی نان اور چنے لگا کر آ رہا ہوں۔ نان سیریس نہیں ہوں۔" وہ آدھا کینو فریا کو زبردستی تھما کر لاپروائی سے بولا۔

"مجھے کینو پسند نہیں۔ تم جانتے ہو۔" وہ منہ بنا کر چھلے ہوئے کینو کو دیکھنے لگی۔

"شیئر تو کرنا ہے۔ چاہے وہ بوائلڈ ایگ ہو، بریڈ کا پیس ہو۔ آئس کریم کا کپ ہو۔ میرا دل ہو یا تمہارا دل۔" وہ سرسری انداز میں گہری باتیں کرنے کا عادی تھا۔

"میں سمجھی نہیں۔" فریا حیران ہوئی۔

"ڈیئر فری! اتنی چھوٹی اور عام سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی۔ میرے دل کا آدھا حصہ میرا اور آدھا تمہارا۔ اسی طرح تمہارا دل بھی آدھا تمہارا اور آدھا میرا او رئیلی سمپل۔"

وہ اپنا کینو کھا چکا تھا اور اب ایک ایک پھانک فریا کو زبردستی کھلا رہا تھا۔ حالانکہ وہ اس ہاف کینو کو دوسرے ہاتھ میں دبائے بیٹھی تھی اور حمزہ کو باتوں میں لگا رکھا تھا، تاکہ اس کا دھیان فریا کے ہاتھ کی طرف نہ جائے مگر وہ بھی تو حمزہ تھا۔ اور اس کی نظریں بھی فریا کے ہاتھ پر جمی ہوئی تھیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ فریا کو کینو سخت ناپسند تھے۔

"مگر آدھا دل ہی کیوں؟ پورا کیوں نہیں۔" اسے سخت اختلاف ہوا۔

"فری پیاری! تمہارے دماغ میں بھوسہ بھرا ہے۔ پورا دل مجھے دو گی تو تم دل کے بغیر زندہ کیسے رہو گی۔ آدھا دل تمہارے پاس رہے گا اور آدھا میرے پاس۔ دونوں کا کام چلتا رہے گا۔" وہ تیسری پھانک فریا کے منہ میں زبردستی ٹھونس کر بولا۔

"بس بھی کرو حمزہ! کھالو۔ اتنے کینو پسند ہیں تمہیں۔ جب بھی آتے ہو، ایک دو اٹھا لاتے ہو۔" فریا نے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیے۔

"یہ تو تمہیں کھانا ہی پڑے گا۔" وہ چوتھی پھانک اس کے منہ میں ڈالنا چاہتا تھا، جب فریا نے پاس رکھا چھلا ہوا کینو پورا اٹھا کر حمزہ کے منہ میں ٹھونس دیا اور خود بھاگ گئی تھی۔ جبکہ حمزہ کینو منہ سے نکال کر چیختا ہی رہ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"بہت دن ہو گئے ہیں مسٹر بین جونیئر کو نہیں دیکھا۔" وہ بڑے بڑے تھیلے اٹھائے ہانپ رہا تھا۔ فریا بھی اپنی مطلوبہ اشیاء اٹھائے اس کے پیچھے بھاگتی ہوئی آئی۔ اب وہ دونوں فٹ پاتھ پر رکھے بینچ پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے تھے، جب اچانک حمزہ کو وقاص کا خیال آیا۔

"وہ کوئی تمہاری طرح فارغ ہے۔ اتنی بڑی پوسٹ پر کام کر رہا ہے۔" فریا نے اپنے بالوں کو کیچر سے آزاد کیا۔

"تمہارا کزن کچھ زیادہ ادھر کے چکر نہیں لگاتا۔"

"چکر؟ وہ تو ہمارے یہاں آنے سے پہلے سارا دن ہمارے گھر میں رہا کرتا تھا۔" تھیلے میں سے دو چاکلیٹ نکالتے ہوئے فریا نے لاپروائی سے کہا۔

"اچھی پرسنالٹی ہے وقاص صاحب کی۔" حمزہ نے برا سا منہ بنا کر تعریفی جملے ادا کیے۔

"اچھی نہیں بہت اچھی۔"

"اب ایسا بھی شہزادہ گلفام نہیں۔"

"تم کیوں جیلس ہو رہے ہو؟" فریا نے اسے چڑایا۔

"ہونہہ، مجھے کیا ضرورت ہے جیلس ہونے کی؟"

"مجھے تو جلنے کی سخت بو آ رہی ہے۔" وہ ایک

چاکلیٹ کا ریپر پھاڑ کر حمزہ کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولی۔

"مس ٹینا کی ہانڈی جل رہی ہو گی یا بنگالی جی تمہاری دیسی ککڑ کا بھرتہ بنا چکے ہوں گے۔" حمزہ مزے سے بولا۔

"مجھے نا محترم وقاص صاحب کے تیور اچھے نہیں لگ رہے۔" حمزہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

"کوئی بھی بات سیدھے طریقے سے مت کرنا۔" فریا ناگواری سے بولی۔

"عنقریب یہ محترم اپنا پرپوزل تمہارے لیے بھجوا دیں گے۔ لکھوا لو مجھ سے۔"

"ہا۔ہا۔" فریا کا قہقہہ پھوٹ پڑا۔

"میں کچھ غلط نہیں بول رہا۔"

"تم کچھ اور نہیں بول سکتے۔" اس نے ناگواری سے ایک دھپ حمزہ کے کندھے پر لگائی۔

"کچھ اور..." وہ سوچ میں پڑ گیا۔ "ہاں۔ مس ٹینا کوس رہی ہو گی مجھے۔ یہ سارے مسالا جات لے کر جاؤں گا' تب ہی دھواں گوشت' بھگارے بینگن' کڑاہی اور نہ جانے کیا کیا فضول سا پکے گا۔"

"دھواں گوشت' یہ تو بڑی ٹیسٹی ڈش ہے۔ ساتھ اگر ویجی ٹیبل پلاؤ ہو تو واہ مزہ آجائے۔ اور بھگارے بینگن کا بھی اپنا ایک الگ سا ٹیسٹ ہے۔ ساتھ ٹماٹر اور ہری مرچ کی چٹنی کا ہونا بہت ضروری ہے اور..." فریا خوب چٹخارے لے رہی تھی' جب حمزہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

"بس کرو فری! تم تو لگتا ہے کھانے کے لیے جیتی ہو۔" حمزہ کو پہلی ملاقات اور فریا کے ساتھ پہلا دیسی ڈنر یاد آگیا تھا۔

"تو اور کیا۔" وہ مزے سے پاؤں جھلاتے ہوئے بولی۔

"اب ہمارے لیے جینا شروع کر دو۔" فرمائش کی گئی تھی۔ فریا نے ہنسنا شروع کر دیا۔

"تم چائے کی فرمائش کر رہے ہو نا۔ فریا! چائے پینا چھوڑ دو۔" فریا نے ہنسی روک کر کہا۔

"تو چھوڑ دو یار!" حمزہ نے دایاں ہاتھ دباتے ہوئے نیلے آسمان کی طرف دیکھا۔

"کیا چھوڑ دوں جینا...؟"

"جی نہیں۔" حمزہ نے دہل کر کہا۔ "میں چائے کی بات کر رہا ہوں۔ یہ بھی کوئی پینے والی چیز ہے۔"

"اور تم کافی پینا چھوڑ دو۔"

"کیا یاد کرو گی۔ لو آج سے میں کافی نہیں پیوں گا۔" حمزہ نے بلا کی سنجیدگی سے کہا۔

"تم کافی پینا چھوڑ دو گے؟ گاڑی پیٹرول کے بغیر نہیں چلتی اور تم کافی کے بغیر۔" فریا چیخ پڑی۔

"تم کہو گی تو نہیں پیوں گا۔ علاوہ ازیں دنیا کی کوئی طاقت مجھے کافی پینے سے نہیں روک سکتی۔"

"مسز یزدانی کو یہ دیسی بدیسی ڈرائیور خاصا مہنگا پڑا ہے۔ دن میں کئی کئی مرتبہ کافی پیتے ہو۔ بریک فاسٹ میں بریڈ' بنی اور فریش جوس لیتے ہو۔ لنچ میں ہری ہری سبزیاں کھلاتے ہو۔ ڈنر میں بھی ملٹی کنٹری ڈشز ہونی چاہئیں۔ واہ جی' ایسا ڈرائیور مسز یزدانی ہی افورڈ کر سکتی ہیں۔" فریا نے صاف مذاق اڑایا۔

"تجھ جیسا لائف ٹائم سروس دینے والا آل راؤنڈر ابھی پاکستان میں ملنا بہت مشکل ہے۔" فضول ہانکنے میں بھی اسے کمال حاصل تھا۔

"یہ بات تو ٹھیک کہی۔ بیک وقت بہت سے فائدے حاصل کر رہی ہیں میڈم تم سے۔" فریا نے اثبات میں سر ہلایا۔

"نتا آج کل کیا کر رہی ہیں؟" حمزہ نے گفتگو کا رخ بدل دیا۔

"تمہارے لیے لڑکیاں ڈھونڈ رہی ہیں۔" وہ جل کر بولی۔

"کیا؟" حمزہ دہل کر رہ گیا۔ "لڑکیاں؟ میں کسی فلم کا ڈائریکٹر نہیں ہوں۔ لڑکیوں کی اتنی کاسٹ کو میں کہاں کھپاؤں گا۔"

"فضول ہانکتے رہنا۔" فریا برا مان گئی۔ "نتا چاہتی ہیں۔ تم شادی کر لو۔ انہیں تمہاری تنہائی کا بہت خیال رہتا ہے۔ ان کا بس چلے نا تو دو منٹوں میں تمہیں گھر بار

والا بنا دیں۔"

"میں تو تنہائی کو ترستا ہوں۔ میڈم کے نو بجے مجھے کب "تنہا" رہنے دیتے ہیں۔ رات کے دو بجے بھی چھوٹے دونوں کو حمزہ بھائی کی یاد ستا رہی ہوتی ہے۔" حمزہ نے دہائی دی۔

"جب سے نتا نے خالہ خورشید کو بتایا ہے کہ لڑکا نیشنلٹی ہولڈر ہے' تب سے رشتوں کی لائن لگ گئی ہے۔"

"کیا سچ؟" مارے خوشی کے حمزہ کے ہاتھ سے چاکلیٹ گر گئی۔

"کب اوپشن لینا ہو گا۔"

"حمزہ! پٹو گے مجھ سے۔" فریا نے تھیلا اٹھا کر اس کے بازو پر دے مارا۔

"نتا خواہ مخواہ تردد کر رہی ہیں۔ لڑکی تو ان کے گھر میں موجود ہے۔" اس نے معنی خیزی سے آنکھیں پھیلائیں۔

"منہ دھو رکھو۔" وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے بولی۔

"صبح [illegible] رہا تھا۔ تازہ شیو بنائی ہے۔ آفٹر شیو لوشن کی خوشبو نہیں آرہی۔"

"یہ عمر تمہاری شادی کی نہیں ہے۔ بہت کچھ سیکھنے کی ہے۔ تمہاری ایج کے لڑکے فٹ بال کھیلتے ہیں۔ کرکٹ کے شیدائی ہوتے ہیں' اسپورٹس کے دیوانے ہوتے ہیں۔ پڑھتے ہیں۔ کچھ بننے کا' کچھ کر دکھانے کا جنون ہوتا ہے۔" فریا نے لگے ہاتھوں نصیحت کی پٹاری کھول لی۔

"نتا کو میرا ایک میسج پہنچا دینا۔"

"کیسا میسج؟" اسے پوچھنا ہی پڑا۔ "یہ کمبخت تجسس بھی نا!"

"یہی کہ میرے لیے لڑکیاں ڈھونڈنے کا تردد نہ کریں۔ میں آل ریڈی ان کی نواسی پر ڈورے ڈال چکا ہوں۔" اب وہ جینز کی پاکٹ سے خریدی ہوئی چیزوں کی لسٹ نکال کر دیکھ رہا تھا کہ کچھ رہ تو نہیں گیا۔ ورنہ پھر اسے مارکیٹ تک کی دوڑ لگانی پڑتی۔

"نتا بالکل نہیں مانیں گی' جب تک تم شیف بنے رہو گے۔"

"واہ کیوں نہیں مانیں گی۔ فیوچر میں ان کی نواسی کو نت نئے کھانے پکا پکا کر کھلاؤں گا۔ مجھ جیسا لڑکا ملنا بہت مشکل ہے۔"

"بہت خوش فہمی ہے۔" فریا نے مصنوعی تاسف کا اظہار کیا۔

"آپ جو بھی سمجھ لیں۔" وہ شانِ بے نیازی سے بولا۔ "او مائی گاڈ!" وہ فریا کی کلائی پر بندھی نفیس سی گھڑی پر ٹائم دیکھتا سر پر ہاتھ مار کے کھڑا ہو گیا۔

"کیا ہوا ہے؟"

"ڈیئر فری! تم بھی نا! اپنے ساتھ باندھ لیتی ہو۔ وہ مس ٹینا سی آئی ڈی کی پوری ٹیم لیے میرے پیچھے آجائے گی۔"

"اوف' مجھے بھی یاد نہیں رہا۔ بنگالی جی ویٹ کر رہے ہوں گے۔ میں یوگرٹ لے کر جاؤں گی تب ہی فروٹ سیلڈ بنے گا۔" فریا بھی حمزہ کے پیچھے بھاگی تھی۔

"ہائے! آہستہ چل نا!" وہ چیخ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"بنگالی جی! میرے اور حمزہ کے لیے کافی اور فری کے لیے چائے لے آئیے۔" نتا نے حمزہ کو دیکھ کر بشاشت سے کہا۔ آج وہ بہت دنوں بعد ادھر آیا تھا۔

"نتا جی! میں کافی نہیں پیوں گا۔"

"کیوں؟" نتا حیران ہوئیں۔ جبکہ فریا نے ہنسی چھپانے کے لیے منہ کے سامنے کشن کر لیا تھا۔

"کافی پر بین لگ چکا ہے۔"

"کس نے لگایا؟ کیا گورنمنٹ نے۔" نتا اور بھی حیران ہوئیں۔

"گورنمنٹ نے کبھی بین اٹھایا بھی ہے۔ محکمہ تعلیم پر تو کچھ زیادہ ہی بین لگا رہتا ہے۔ کیا ضرورت ہے قوم کو ایک اچھا استاد دینے کی۔" حمزہ سخت کبیدہ خاطر تھا۔

"یہ بات تو سو فیصد درست کہی ہے۔" فریا کو خود

جاب نہ ملنے کا قلق تھا۔

"تم کافی کیوں نہیں پیو گے؟" ثنا ابھی تک وہیں اٹکی تھیں۔

"فریا کو پسند نہیں۔"

"وہ تو مجھے پتا ہے۔" ثنا حیران ہوئیں۔ "یہ کبھی بھی کافی نہیں پی سکتی۔"

"فریا کو میرا کافی پینا پسند نہیں۔" حمزہ نے وضاحت کی۔

"تو بھلا یہ کیا بات ہوئی۔" ثنا نے ناگواری سے کہا۔ "یہ تو ایسے ہی کہتی رہتی ہے۔ تم کافی ضرور پیو۔" وہ خود کافی پینا پسند کرتی تھیں۔ "اگر کچھ چھوڑنا چاہتے ہو تو یہ شیف کی جاب چھوڑ دو۔ تم پر سوٹ نہیں کرتی۔" ثنا نے نرمی سے اپنی ناپسندیدگی واضح کی۔

"عنقریب ایسا ہی کروں گا۔" حمزہ کے تاثرات ناقابل فہم تھے۔

"کیا مطلب؟" فریا چونکی۔

"کچھ نہیں یار! ہمیشہ کی طرح وہ ٹال گیا تھا۔

"کبھی کبھی تم بہت پراسرار ہو جاتے ہو۔"

"مسٹر طلب مشکوک۔" حمزہ نے فریا کے منہ کی بات چھین لی تھی۔

"یس آف کورس۔"

"تمہارا کیا خیال ہے۔ اس پراسراریت کے پیچھے کوئی ریزن ہو سکتا ہے۔" حمزہ ہنستے ہوئے بہت گہرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔"

"سیاستدانوں والے جواب نہ دیا کرو۔" بنگالی جی سموسوں سے بھری پلیٹ فریا کو تھما گئے تھے ان کو آفر کرنے کے بعد خود کھانے میں مصروف ہو گئی تھی حمزہ اور ثنا دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا دیے۔

"جمہوریت کا یہی پیغام ہے" حمزہ نے طنزیہ کہا۔

"کون سا پیغام؟"

"وہ جو مجھے اور ثنا کو نظر آرہا ہے۔"

"آپ دونوں کو کیا نظر آرہا ہے۔" فریا نے ہونقوں کی طرح انہیں دیکھا۔

"یعنی ہمیں ایک ایک ننھی سی سموسی سے بہلا کر پوری پلیٹ اپنے سامنے رکھ کے خود کھانے میں جت گئی ہو۔ دراصل جمہوریت کا بھی یہی میسج رہا ہے۔" حمزہ نے مزید گل افشانی کی۔ "لوٹ مار چھین شادباد۔ مرکز حسین شادباد۔"

"مجھے نظر مت لگانا۔" فریا نے فوراً "پلیٹ سائیڈ پر کرلی تھی۔

"تمہیں نظر نہیں لگاؤں گا۔ بس یہ آٹھواں سموسہ مت کھانا۔"

"ہائے! تو میرا کھایا پیا گنے گا۔" وہ چیخی۔

"میری بھلا یہ مجال؟" اس نے فوراً "کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"اس کاؤنٹنگ کا کیا مقصد ہے؟" وہ لڑنے مرنے کو تیار ہو چکی تھی۔

"صرف یہ اندازہ لگا رہا تھا کہ اگر تم لیڈی نینی کی بیکری کا چارج سنبھال لو تو بیکری میں سیل کرنے کے لیے فوڈ پروڈکٹ میں کچھ نہیں بچے گا۔" حمزہ نے تھوڑے کا آخری سپ لے کر تاسف سے کہا۔

"اور لیڈی نینی میرا قیمہ بنا دے گی۔" وہ آخری سموسہ منہ میں رکھتے ہوئے مزے سے بولی۔

"اور میں اس قیمے سے کوفتے اور کباب بناؤں گا۔"

"ہائے! بہت زبان چلنے لگی ہے تمہاری۔"

"اچھی محبت کا اثر ہے۔" وہ برجستگی سے بولا۔

"بھول گئے ہو اپنا رونا دھونا۔ مس نینا سے بے عزتی کروا کے بینچ پر بیٹھے رو رہے تھے۔ اگر میں دیکھ نہ لیتی تو ساری رات بھوکے پیاسے کڑھتے رہنا تھا۔" فریا بھی جتانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔

"احسان عظیم ہے۔ کیسے اتاروں گا میں اس پہاڑ جتنے احسان کا بدلہ۔"

"اتار سکتے ہو۔" فریا نے ٹشو سے ہاتھ پونچھ کر مزے سے کہا۔

"وہ کیسے؟"

"مجھے لائبریری چھوڑ کر آؤ۔"

"کیا مطلب؟ ایک سموسہ کھلانے کے بعد اتنی بڑی سزا۔" حمزہ نے دہائی دی۔

"تم کو نہیں۔ مسز زیدانی کے ڈرائیور بنے رہتے ہو۔ سارے شہر میں لور لور پھرتی ہیں۔"

"مفت میں نہیں گھماتا۔" وہ جو گرز کے تسمے کستا ہوا کھڑا ہو گیا۔

"اتنے مہنگے جوتے اور کپڑے اور یہ سویٹر بھی امپورٹڈ لگ رہا ہے۔ شکل سے ڈرائیور لگتے نہیں ہو۔" فریا اپنا شولڈر بیگ چیک کرتے ہوئے بولی۔

"ابو نے لے کر دیے تھے۔ ورنہ میں خواب میں بھی انہیں خرید نہیں سکتا تھا۔" وہ صاف گو تھا اور اس کی صاف گوئی کی فریا دیوانی تھی۔

"تم جانتے ہو۔ مجھے تم میں کیا چیز ایسی دکھائی دی جو میں۔ میں نہیں رہی ہوں تم بن گئی ہوں۔ تمہارا دل بن گئی ہوں۔ جو اس سینے میں ہلچل مچا رہا ہے۔" فریا نے گاڑی کی چابی اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے دوسرے ہاتھ کی شہادت والی انگلی اس کے سینے پر رکھی۔

"کون سی چیز؟" کچھ پل کے لیے حمزہ فریز ہو گیا تھا۔

"تم سچے ہو۔ سچ بولتے ہو۔ مجھے صرف دو قسم کے لوگ بے حد پسند ہیں۔ ایک وہ جو سخت جان ہوتے ہیں۔ ہر قسم کی مشقت کرتے ہیں۔ محنت کرتے ہیں۔ محنت سے گھبراتے نہیں۔ بلکہ پہلا قدم اٹھا کر پہلی سیڑھی پر قدم رکھنے والے لوگ میرا آئیڈیل ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں۔ جو زندگی کی جدوجہد میں کبھی پیچھے نہیں رہتے۔ کسی شارٹ کٹ کی تلاش میں نہیں رہتے۔ مجھے ایسے لوگ ہی پسند ہیں، جو لوہا کوٹنے سے لے کر گارا ڈھونے تک ہر کام لگن اور شوق سے کرتے ہیں۔ شرم محسوس نہیں کرتے۔ ایسے لوگ تکبر سے پاک ہوتے ہیں۔ تم میں ان دونوں قسم کے لوگوں والی خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ ہمیں "سچ" بولتے رہنا ہے۔ محبت اور وفا میں بس یہی شرط لازم ہے۔"

"فری! کیا تم خود کار ڈرائیو کر کے لائبریری نہیں جا سکتیں۔" ایک دم حمزہ سر سے لے کر پیر تک منجمد ہو گیا تھا۔

"حمزہ! تم ٹھیک تو ہو نا!" فری اس کے رنگ بدلتے چہرے کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

"پلیز فری! نو کونسچن۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر نرمی سے کہا۔

"تم اندر چلو۔ مجھے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔"

"فری! پلیز میرا ہاتھ چھوڑ دو۔ میں چلتا ہوں۔" وہ نرمی سے فریا کے ہاتھ میں دبا اپنا ہاتھ چھڑوانے لگا۔

"مگر حمزہ!"

"نو اگر مگر... ہم شام کو ملیں گے۔ میں تمہیں شام کو لائبریری لے جاؤں گا۔ پلیز فری! مائنڈ مت کرنا۔" وہ تیز تیز قدم اٹھاتا بیرونی گیٹ عبور کر گیا تھا، جبکہ فریا حیران حیران سی برآمدے کی سیڑھیوں پر بے دم سی بیٹھ گئی۔

☆ ☆ ☆

"کیا ہوا تھا دوپہر کو۔ کیوں چلے گئے تھے اچانک؟" وہ اسے لائبریری لے جانے کے لیے آیا تھا۔ ایپرن باندھے۔ ہاتھوں پر نجانے کیسے کیسے مسالا جات لگے تھے۔ الجھے سلجھے بال۔ فریا نے غور کیا۔ اس تمام عرصے میں پہلی مرتبہ فریا نے اسے یوں سوچوں میں گم پریشان پریشان دیکھا تھا۔

"کیا ہوا تھا؟" وہ احتیاط سے ٹرن لے رہا تھا۔

"ہائے! اتنے انجان مت بنو۔" فریا خفا ہوئی۔ "مجھ سے شیئر نہیں کرنا چاہتے، حالانکہ دوستی کے ایگری منٹ پہ واضح حروف میں کیا لکھا تھا۔ ہاف کینو، ہاف ایگ، ہاف بریڈ، کہاں تو ہر چیز شیئر کرنے پر تلے ہوتے تھے۔"

"فری! تمہیں زردہ بنانا آتا ہے۔" وہ نجانے کس مشکل میں پھنسا ہوا تھا۔

"زردہ؟" فریا کو شدید غصہ آیا۔ "یہ بیچ میں زردہ

کہاں سے آگیا۔ میں تم سے کیا پوچھ رہی ہوں۔"

"بتاؤ نا فری!" وہ کافی ریش ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ شاید وہ بہت جلدی میں تھا۔

"گاڑی چلا رہے ہو یا جہاز؟"

"جہاز اڑاتے ہیں۔" وہ بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ "چلاتے نہیں۔"

"بتانے کا شکریہ۔" فریا جل کر بولی۔

"تم بھی مجھے زردہ کی ریسپی بتا کر شکریہ کا موقع دو۔" وہ شاید مسکرایا تھا۔

"مجھے نہیں بنانا آتا۔"

"میں بنگالی جی سے پوچھ لیتا تو بہتر تھا۔"

"تو پوچھ لیتے۔" وہ بے نیازی سے بولی۔ ناراضی صاف ظاہر تھی۔

"پلیز فری! بتا دو نا!" حمزہ نے خوشامدی مسکراہٹ لبوں پر سجا کے کہا۔

"یہ ننھی سی جان شکنجے میں پھنس گئی ہے، یہ سارا کیا دھرا میرا ہی ہے۔" وہ خود کو کوس رہا تھا۔

"ہوا کیا ہے؟" فریا زیادہ دیر بے نیاز بھی نہیں رہ سکتی تھی۔

"مس بینا ذفعان ہو گئی ہے۔"

"کہاں؟" فریا کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"کراچی۔ کسی اور جگہ سے آفر کیا ملی، محترمہ نے آنکھیں ماتھے پر رکھ لی تھیں۔ میڈم نے مجھے کچن میں کھپا دیا ہے۔" وہ سخت مشتعل تھا۔ "میڈم کی بچی نے مجھے پیدائشی خانساماں یا خاندانی نائی سمجھ رکھا ہے۔ نجانے کیسی کیسی ڈشز کے نام گنوا دیے ہیں۔ زردہ، کچنار گوشت، کریلے کی بھجیا۔ نجانے یہ کریلے کی بھجیا کیسے بنتی ہے۔"

"اف مائی گاڈ!" فریا ہنس ہنس کر بے حال ہو گئی۔

"اڑا لو مذاق۔" وہ بغیر برا مانے مزے سے بولا۔

"تمہارے اس مسئلے کا حل ہے میرے پاس۔" فریا نے چٹکی بجا کر سیل فون پر ایک نمبر پریس کیا۔

"کس سے بات کرنے لگی ہو۔" حمزہ نے حیرانی سے پوچھا۔

"شی۔" اس نے حمزہ کے لبوں پر انگلی رکھ کے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"اوہ۔" فریا بات کر چکی تو حمزہ نے اطمینان بھرا سانس خارج کیا۔

"آج تو بنگالی جی بنا دیں گے۔ آئندہ بھی اگر میڈم کی زبان تمہاری طرح چٹخارے لینے لگی تو پھر کیا کروں گا۔"

"پھر بھی بنگالی جی ہیں نا!"

"جیو فریا عتیق!" وہ مطلوبہ جگہ گاڑی پارک کر چکا تھا۔ "میں تمہارا ویٹ کروں یا جاؤں؟"

"میرے ساتھ اندر آجاؤ۔"

"پڑھے لکھے ادبی لوگوں میں میرے جیسے بے ادب کا کیا کام۔ چلتا ہوں، ایک گھنٹے بعد آؤں گا۔" وہ گاڑی ریورس کرنے لگا۔

"حمزہ! رکو تو۔ سنو تو۔ جاے او جاے!" وہ چیختی رہ گئی تھی مگر وہ حمزہ ہی کیا جو سن لیتا۔

اپنی مطلوبہ کتابوں کو دیکھ رہی تھی جب وقاص نے اسے دیکھا اور قریب چلا آیا۔ "تم یہاں؟ کیسے وقت نکالا ہے۔ تنہا نظر آرہی ہو؟ کیا وہ مسٹر شیف چلا گیا۔" وقاص نے چھوٹتے ہی کافی چبھتے لہجے میں پوچھا۔

"وقاص!" فریا نے کافی ناراضی سے اسے دیکھا "حمزہ کے بارے میں اس لہجے میں بات نہ کرو۔"

"کیوں؟" وقاص کی بھنویں تن گئیں۔ "پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ مسٹر شیف سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟"

"وہی جو تم سے ہے یعنی دوستی کا۔" فریا نے سپاٹ انداز میں کہا۔ "وہ بہت بے ضرر اور مخلص ہے۔"

"اچھا۔" وقاص نے طنزیہ انداز میں ہونٹ سکیڑے۔ "اس نے خلوص کے بڑے بڑے جوہر دکھائے ہیں۔ یا خلوص کی بوریاں بھر بھر کے لایا ہے لڑکے سے۔" وہ چبا چبا کر بولا۔

"پلیز وقاص! تمہاری حمزہ سے کوئی دشمنی ہے کیا؟"

"رقیب لگتا ہے مجھے۔" وہ جل بھن کر بولا۔
"رقیب کیا تمہارا کوئی دوست ہے؟" اس نے بلا کی معصومیت سے پوچھا۔
"میرا نہیں وہ تمہارا دوست ہے۔" وقاص نے دانت پیس ڈالا۔ "بیوقوف والا۔"
"حمزہ کی بات کر رہے ہو؟"
"جی ہاں۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر لائبریری سے باہر نکل آیا تھا۔
"میری کتابیں۔" فریا چیختی رہ گئی۔
وہ روڈ کراس کر کے ایک کیفے میں گھس آیا تھا۔ فریا بھی اس کے ساتھ گھسٹ رہی تھی۔
"یہاں کیوں لائے ہو؟" وہ ناراضی سے بولی۔
"تمہارے ساتھ چائے پینے کو دل چاہ رہا تھا۔" وقاص نے طنز کے تیر پھینکے۔ "بات کرنی ہے تم سے دوٹوک۔"
"یہ جو حمزہ ہے نا! مسٹر یزدانی کا شیف۔ ایک نمبر کا فراڈ ہے' لکھوا لو مجھ سے۔" وقاص حد درجہ سنجیدہ ہو گیا۔
"تم سے کس نے کہا؟"
"میں آنکھیں رکھتا ہوں۔ سوچنے کے لیے ایک عدد دماغ بھی ہے۔" وقاص نے ویٹر کو دو چائے لانے کا آرڈر دیا تھا۔
"کنجوس آدمی! میں شوارما کھاؤں گی۔ چائے تم خود پیو۔" فریا کی بھوک ایک دم بیدار ہو گئی۔ "چپس بھی منگواؤ۔" اس نے تحکم سے کہا۔
"اوکے جناب!" وقاص نے ویٹر کو پھر سے آواز دے کر آرڈر نوٹ کروایا۔
"تم حمزہ کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے۔" کچھ دیر بعد وہ شوارما کھاتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔
"کچھ نہیں بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ مجھ سے لکھوا لو یہ حمزہ نہ بے ضرر ہے نہ معصوم۔ اس کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ عجیب سی چمک ہوتی ہے اس کی آنکھوں میں۔ شکل سے ہی پراسرار لگتا ہے۔ تم نجانے کس دنیا میں رہتی ہو فریا!"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو۔" فریا بھی ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔
"بہت عظیم نقصان سے دوچار کرے گا تمہیں۔" وقاص نے سامنے رکھی چائے کی طرف دیکھا تک نہیں تھا۔
"کیسا نقصان؟ زیور چرائے گا؟ ڈاکہ ڈالے گا؟ کیا کرے گا وہ؟" فریا سخت مشتعل ہو گئی تھی۔ "تمہیں لگتا ہے۔ حمزہ اس طرح کر سکتا ہے؟"
"ہاں۔ ڈاکہ تو وہ ڈالے گا۔ لوٹے گا ضرور مگر تمہارے دل کو۔ مجھے سب نظر آ رہا ہے۔" وقاص نے لب کچل کر کہا۔
"تمہیں جو کچھ نظر آ رہا ہے اگر درست ہوا تو پھر۔" فریا کے چہرے پر ٹھٹکا دینے والی سنجیدگی پھیل گئی تھی۔
"تو پھر کیا؟" وقاص کا گویا میٹر گھوم گیا۔ "تم اپنے لیے اس معمولی سے شیف کو سلیکٹ کرو گی۔ جس کا کوئی فیوچر نہیں۔ کوئی اکیڈمک ریکارڈ نہیں' کوئی نام و نشان نہیں۔ حسب نسب نہیں۔ خاندان نہیں' حتیٰ کہ زندگی کی بنیادی ضروریات فراہم کرنے کے لیے پیسہ تک نہیں' افسوس ہو رہا ہے مجھے تمہارے انتخاب پر۔"
"اگر بات نکلی ہے تو میں وضاحت کر دیتی ہوں۔ یہ بات میں تم سے چند دن میں شیئر کرنے والی تھی وقاص!" فریا تذبذب کا شکار کچھ پل کے لیے خاموش رہی "مجھے اس معمولی سے محمد حمزہ سے محبت ہو گئی ہے۔ نجانے کب' کس لمحے؟ کس گھڑی؟ مگر میں خود کو اس معاملے میں بے بس پاتی ہوں۔" وہ ہونٹ کا کونا کچلتی دھیرے دھیرے کہتی چلی گئی۔
"فری! فری' تم سوچو' رہن سہن۔ طرز رہائش' کہیں بھی تو وہ تمہارے ہم پلہ نہیں کیا۔ کیا دیکھا ہے تم نے اس۔ امپچور سے لڑکے میں۔" وقاص گویا پھٹ پڑا۔
"اور فری! میری بات ذہن نشین کر لو' جو وہ نظر آتا ہے۔ وہ ہے نہیں' پر تمہیں چڑھا رکھی ہیں اس نے خود

پر۔"
"تم کہنا کیا چاہتے ہو۔" فریا نے بے بسی سے پوچھا۔
"اس نے تمہیں بتایا کہ وہ برطانوی نیشنلٹی ہولڈر ہے اور تم نے یقین کر لیا۔ ایسا کچھ بھی نہیں۔ اس کے پاس برطانیہ کا ویزا ہوتا تو اسے ایک دو ٹکے کی ملازمت کرنے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ چند ہزار کمانے کی بجائے پونڈز گنتا۔ احمق! وہ تمہیں بے وقوف بنا رہا ہے۔ سنا اور تمہیں تنہا جان کر کوئی بڑا چکر چلائے گا۔ پیسہ ہتھیائے گا یا تمہیں۔"
"بکواس مت کرو وقاص!" فریا کا چہرہ یک لخت رنگ بدل گیا۔
"حمزہ کے بارے میں تم بہت غلط سوچ رہے ہو۔ حمزہ ایسا نہیں' ہو ہی نہیں سکتا۔"
"تمہاری آنکھوں پر پٹی بندھ چکی ہے۔ نام نہاد محبت کی پٹی۔" وقاص نے بے بسی سے اپنی پیشانی پر مکا مارا۔ "ایک آخری بات سن لو۔ وہ ایک امپچور لڑکا ہے۔ تم سے دو برس چھوٹا۔ یاد رکھنا! ابھی وہ پانی پر کھڑا ہے۔ قدم جمانے کے لیے اسے سنگلاخ زمین چاہیے۔ تم اگر زمین کا ذرا سا حصہ اسے پیش کر دو گی تو وہ اپنے قدم مضبوطی سے جمالے گا اور پھر لمبی اڑان بھرے گا۔ اس طرح سے کہ پھر فریا ضیق ہاتھ ملتی رہ جائے گی۔ ایک اچھے دوست کا مخلصانہ مشورہ ہے۔ ابھی سے خود کو روک لو۔"
"میرے اچھے دوست شوارما کھلانے کا شکریہ۔" وہ سر جھٹک کر ماحول پر چھائی کثافت کا اثر زائل کرنے کی غرض سے بولی۔
"تمہارے شکریا کا شکریہ' اٹھو۔ تمہارا مسٹر شیف آ گیا ہے۔" وقاص گلاس ونڈو سے باہر دیکھتا ہوا کھڑا ہو گیا تھا۔
"ایک بات تو واضح ہو گئی۔ میں تمہاری زندگی اور دل میں کہیں نہیں۔" بل پے کرنے کے بعد وہ فریا کی طرف دیکھ کر پھیکے انداز میں مسکرایا۔ "بہرحال میری گڈ وشز اپنی سب سے اچھی دوست کے لیے۔ خدا

کرے' یہ دیسی انگریز تمہارے حق میں بہتر ثابت ہو۔"
وہ دونوں ایک ساتھ کیفے سے باہر آئے تھے۔ فریا نے غور نہیں کیا تھا ورنہ حمزہ کے ماتھے پر ناگوار سلوٹوں کو دیکھ کر ضرور ٹھٹک جاتی۔

☼ ☼ ☼

"میں تمہیں لائبریری میں چھوڑ کر گیا تھا۔ برآمد تم کیفے میں سے ہوئی ہو۔ وہ بھی وقاص کے ہمراہ۔" وہ ڈرائیونگ کرتے ہوئے عجیب انداز میں بول رہا تھا۔
"وقاص مجھے زبردستی لے گیا تھا۔" وہ اپنا بیگ کھنگالتے ہوئے لاپروائی سے بولی۔
"کیا کیا باتیں ہوئیں؟"
"تم ہی موضوع گفتگو رہے ہو۔" فریا نے مسکراہٹ دبا کر بتایا۔
"کیا کیا میری شان میں فرماتے رہے ہیں وقاص صاحب!" حمزہ کا انداز بھرپور طنز لیے ہوئے تھے۔
"بتاؤ نا!" اس نے اصرار کیا۔
"وقاص نے تمہیں پرپوز کیا ہوگا۔" اس نے قیاس آرائی کی۔
"وقاص کو مجھے پرپوز کرنے کے لیے کیفے لانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اپنا پرپوزل گھر بھجوا سکتا ہے۔"
"ہوں۔" حمزہ نے ہنکارا ابھرا۔ "تو پھر پورا ایک گھنٹہ وہ جھک مارتا رہا ہے۔ سیاست پر گفتگو کرتا رہا ہے۔ ملکی حالات کے بارے میں فکرمند تھا۔"
"ملکی حالات کے لیے نہیں میرے لیے فکرمند تھا۔" فریا نے بیگ کی زپ بند کر کے آہستگی سے بتایا۔
"اچھا۔" حمزہ کے چہرے پر تبسم پھیلا۔ "وہ کیسے....؟"
"وقاص سمجھتا ہے تم بہت بڑے فراڈیے ہو۔ میرے دل کو چرا لو گے۔"
"اسے بتا دینا تھا۔ میں آل ریڈی یہ کام کر چکا ہوں۔" وہ مسکرایا۔

"بتادیا ہے۔"

"او۔۔اب سمجھا۔" اس کی مسکراہٹ گہری ہوگئی تھی۔ "تب ہی میں کہوں' وقاص صاحب مجھے کھا جانے والی نظروں سے کیوں دیکھ رہے تھے۔"

وہ تاسف کا اظہار کر رہا تھا۔ فریا نے مزید بتایا۔

"کس بات پر؟" وہ حیران ہوا۔

"میرے انتخاب پر۔"

"امیزنگ۔" حمزہ نے گویا خوب لطف لیا۔ "پھر تم نے کیا کہا؟"

"یہی کہ مسٹر شیف مجھے ہر حال میں قبول ہے چاہے وہ انہیں دھوئے یا سریا کوٹے۔"

"اور۔" حمزہ نے گاڑی کی رفتار مزید آہستہ کرلی۔

"وقاص کہتا ہے۔ تم نے مجھ سے جھوٹ بولا ہے۔ تمہارا تعلق یو کے سے نہیں ہے۔ تم نے اپنے متعلق بودی داستان نشر کی ہے۔"

"وقاص کو سی آئی ڈی میں ہونا چاہیے تھا۔" حمزہ نے قہقہہ لگایا۔ "بہرحال ایک دوست اور کزن ہونے کے ناطے تمہارے لیے اس کی یہ فکر مندی قابل اعتراض نہیں ہے۔"

"ہائے! یہ گاڑی ہے۔ گدھا گاڑی نہیں۔ اسپیڈ بڑھاؤ۔ پوری رات یہ سڑک ہی روندنی ہے کیا؟" فریا نے ایک دھپ اس کے کندھے پر رسید کی۔

"اوہو سوری!" حمزہ نے مزید اسپیڈ کم کردی تھی۔

"ہائے!" فریا نے زوردار قسم کی گھوریوں سے اسے نوازا۔ حمزہ نے ڈرنے کی بھرپور ایکٹنگ کرتے ہوئے اسپیڈ بڑھادی تھی۔

"تم میرے ساتھ لنچ کروگی؟" گاڑی گیٹ میں اندر داخل ہورہی تھی۔

"مسز یزدانی کے گھر؟" وہ حیران ہوئی۔

"نہیں۔ کسی بھی ہوٹل میں۔"

"نیکی اور پوچھ پوچھ۔" وہ مسکرائی۔ "بائی دا وے! تم مجھے باقاعدہ پروپوز کرنے کا پروگرام تو نہیں بنا رہے۔"

"کچھ یہی سمجھ لو۔" حمزہ نے مبہم سے انداز میں کہا۔

"اچھا۔" فریا ہنستی چلی گئی۔ "اس کے لیے ہوٹل میں لنچ کرنا ضروری ہے؟"

"اتنا خاص ضروری بھی نہیں۔ وہ تو میں اس لیے کہہ رہا تھا کہ خالی خولی باتوں سے تم سیر کہاں ہوگی۔" وہ اس کے چٹورے پن سے اچھی طرح واقف تھا۔

"اور تم مجھ سے کون سے ڈائیلاگز بولو گے۔" فریا آنکھوں سے بہتا پانی پونچھتے ہوئے بولی۔

"ول یو میری می۔" وہ بھی بڑے بھرپور انداز میں کہہ رہا تھا۔

"اور میں کیا کہوں گی۔"

"یہ تو تم ہی بتا سکتی ہو۔" حمزہ نے کندھے اچکائے۔

"اگر انکار کروں؟"

"تو میں ٹیرس سے چھلانگ لگا کر خودکشی نہیں کروں گا۔" وہ اپنے بالوں میں انگلیاں چلا رہا تھا۔ "ویسے تم انکار کرنے کا حق محفوظ رکھتی ہو۔ جو میری فیلنگز ہیں کیا پتا تمہاری نہ ہوں۔"

"دیکھو نہیں۔" وہ خفا ہوئی۔ "انکار کی کوئی اور وجہ بھی ہوسکتی ہے۔"

"تمہارے جیسی عالم فاضل ویل آف ایجوکیٹڈ لڑکی میرے جیسے واجبی تعلیم یافتہ آدمی سے شادی کیسے کرے گی۔ بات تو سوچنے کی ہے۔"

"اس کے علاوہ کوئی اور ریزن؟" فریا اور بھی خفا ہوئی۔

"ایک وجہ تو روز روشن کی طرح عیاں ہے آئی ایم آ شیف۔" وہ سفاکی کی حد تک صاف گو تھا۔ "یہ حوالہ ایک آنرز فیملی کے لیے کوئی فخر کا باعث نہیں۔"

"فار گاڈ سیک ہائے! تم بھی نا ابدھو ہو ایک دم۔" وہ اس کے قریب چلی آئی۔ "میں ان ساری وجوہات پر لعنت بھیجتی ہوں۔ مجھے کمتر پروفیشن رکھنے والے لوگ برے نہیں لگتے۔ البتہ مجھے احساسِ کمتری کے مارے لوگ زہر سے برے لگتے ہیں۔"

"مگر ہمارے اس معاشرے میں ۔۔۔ جوتا گانٹھنے

والے موچی' کپڑے دھونے والے دھوبی اور برتن بنانے والے کمہاروں کو کسی خاص قدر اور عزت کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا' بجائے ایسے لوگوں میں رشتہ داری کرنا۔" وہ سسٹم کی ایک واضح خرابی پر تنقید کر رہا تھا۔

"مائی گاڈ! تم کون سا پیدائشی خانساماں ہو۔ یہ تو مجبوری نے اور وقت کی بے رحمی نے تمہیں شیف بنا دیا ہے۔"

"تم میرے بارے میں ہمیشہ نرم الفاظ استعمال کرتی ہو۔ اس لیے کہ تمہارے دل میں میرے لیے بہت جگہ ہے۔ تمہارے ارد گرد رہنے والے اتنے اعلا ظرف نہیں ہوں گے۔" وہ ایک اور حقیقت کو بے نقاب کر رہا تھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے۔ اگر میرا پرپوزل نتا کے سامنے پیش کیا جائے تو ان کا ردِعمل کیا ہوگا۔" وہ بہت غور سے فریا کے رنگ بدلتے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"تم تو سوچ میں پڑگئی ہو۔ سوال کیا بہت مشکل ہے فری؟" وہ چھیڑنے کے انداز میں مسکرایا۔ "چلو میں ہی جواب بھی دے دیتا ہوں۔ نتا انکار کردیں گی۔ کیا پتا ان کا رویہ کس قدر انسلٹنگ بھی ہو۔ مجھے کتنا برا بھلا کہیں۔"

"ایسا کچھ نہیں ہوگا۔" فریا نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بڑے مضبوط انداز میں کہا۔

"اب ضرور ہوگا' ہاں! اگر تم نتا کو مجبور کروگی تو انہیں ماننا ہی پڑے گا۔"

"تم منہ دھو رکھو۔ ایسے بھی شہزادہ گلفام نہیں ہو۔ تمہاری خاطر میں ہر محاذ پر جنگ کرتی پھروں گی۔" وہ جان بوجھ کر اس کو چڑا رہی تھی۔

"تم ایسا کروگی اور ضرور کروگی۔" حمزہ کے لہجے میں دو طرفہ محبت کا یقین بول رہا تھا۔

"اچھا۔ بڑا یقین ہے۔" فریا کچھ سنجیدہ ہوئی۔

"یقین تم پر نہیں۔ اپنے خالص جذبے پر ہے۔ اس لگن' ہمت اور استقلال پر ہے۔ میرے جیسے ثابت قدم اور اپنے ارادوں میں پختہ کم کم لوگ ہوتے ہیں۔ شرطیہ کہہ رہا ہوں۔" اس کے انداز ایک دفعہ پھر ناقابل فہم ہوگئے تھے۔

"تم بھی کبھی سچ مچ پر اسرار لگتے ہو۔" فریا نے جھرجھری لی۔

"اچھا" وہ مسکرایا تھا۔ گویا اس نے تسلیم کرلیا تھا کہ اس میں پر اسراریت کچھ نہ کچھ موجود ہے۔ "چلتا ہوں۔" وہ پلٹنے لگا۔

"بغیر کافی پیے۔" فریا گیٹ تک اس کے پیچھے آئی تھی۔

"تمہارے اور کافی کے بغیر جینے کا عادی تو ہونا پڑے گا۔" وہ گیٹ عبور کرتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ناراضی ممی ڈیڈی سے ہے اور بات تم مجھ سے نہیں کررہیں۔" حمزہ بچوں کو پارک لے کر آیا تھا۔ بچے کھیل کود میں مصروف تھے اور وہ دونوں واک کررہے تھے۔ آج موسم بھی بلا کا دلفریب تھا۔ "میری ممی ڈیڈی سے کوئی ناراضی نہیں۔"

"تو پھر کیا وجہ ہے؟ موڈ کیوں آف ہے۔"

"نتا چاہتی ہیں۔ میں وقاص سے شادی کرلوں۔ وہ میچور ہے' اسٹیبلش ہے۔ جبکہ تم۔۔۔" وہ بے بسی سے لب کچلنے لگی۔

"تمہاری نتا سے بات ہوئی۔" وہ ایک دم ٹھٹک گیا۔

"نتا کہتی ہیں۔ تم کسی بھی لحاظ سے میرے لیے پرفیکٹ نہیں۔ یاد رہے' یہ نتا کا خیال ہے۔"

"اور تم۔۔؟" حمزہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"میرے اقرار کی کیا ابھی ضرورت ہے۔" وہ اداسی سے پوچھنے لگی۔ "نتا کہتی ہیں۔ میں لاابالی ہوں۔ مجھ میں بچپنا ہے۔ میچورٹی کی کمی ہے۔ نتا کہتی ہیں' ڈگریاں لینے سے شعور ہاتھ نہیں آتا۔ عمر کی بتدریج منازل طے کرنے کے بعد ہی شعور اور میچورٹی حاصل ہوتی

ہے۔"

"ننا غلط کہتی ہیں۔ میں یہ نہیں کہوں گا۔ ان کا اپنا پوائنٹ آف ویو ہے۔" حمزہ نے کچھ دیر کی سوچ و بچار کے بعد کہنا شروع کیا۔

"لیکن شعور اور میچورٹی عمر کے محتاج نہیں ہوتے۔ جیسے علم ڈگریاں جمع کرنے سے نہیں ملتا۔ میں نے ایسے ایسے فصیح و بلیغ گفتگو کرنے والے لوگ دیکھے ہیں۔ جنہوں نے کسی درسگاہ سے کوئی بھی سبق نہیں لیا اور ان جیسا عالم فاضل یونیورسٹی آف امریکہ کا فارغ التحصیل بھی نہیں ہوگا اور رہی شعور، آگہی اور ادراک کی بات تو ذہن کی ایک خاص کھڑکی کھلنے کی دیر ہوتی ہے۔ بعض لوگ لڑکپن میں جوان اور جوانی میں بوڑھے ہو جاتے ہیں جیسے کہ میں۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں چالیس سال کا سفر طے کر چکا ہوں۔"

وہ فریا کے چہرے پر نظر جمائے کھڑا تھا۔ اور فریا دم بخود تھی۔ وہ ایسا ہی تھا۔ پل پل میں حیران کرنے والا۔

"زندگی کے اسباق بڑھتی عمر نہیں۔ بھاگتی دوڑتی گھڑی کی سوئیاں نہیں، بلکہ حالات بہت اچھی طرح سے پڑھاتے ہیں۔ سکھاتے ہیں۔ زندگی جینے کا ہنر کسی کسی کو آتا ہے۔ کم از کم مجھے اور میرے باپ کو تو کبھی نہیں آیا۔ جنہوں نے یہ ہنر پا لیا، وہ دوسروں کے خوابوں کو پیروں تلے روند کر زندگی کی دوڑ میں بہت آگے نکل گئے اور پیچھے رہ گئے۔ میرے باپ جیسے لوگ۔ جو ایک تیز رفتار معاشرے میں محنت اور مشقت کی چکی میں پسنے کے بعد بھی کئی صدیاں پیچھے تھے۔ ہے نا حیرت کی بات۔"

"حمزہ! تم کیا ہو؟ میں کبھی بھی تمہیں سمجھ نہیں سکی اور لگتا ہے کبھی سمجھ نہیں پاؤں گی۔" وہ سچ مچ سخت حیران تھی۔

"میں ریشم کا ایسا دھاگا ہوں، جسے جتنا سلجھاؤ گی اتنا ہی الجھے گا۔" حمزہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

"اچھا یہ بتاؤ۔ تم نے ننا کو کیا جواب دیا ہے۔"

"انکار۔ میں نے انکار کر دیا ہے۔" وہ مضبوط لہجے میں کہہ رہی تھی۔ "مجھ پر انکشاف کیا گیا ہے کہ وقاص سے میری بات کافی عرصے سے طے ہے۔ ایسا بھلا کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ویسے ایک لحاظ سے یہ پرپوزل تمہارے لیے بیسٹ ہے۔"

"حمزہ! خبردار جو فضول ہانکنے کی کوشش کی۔" اس نے وارننگ دی تھی۔

"ننا ٹھیک ہی کہتی ہیں۔" حمزہ نے تاسف سے کہا۔ "تم بلا کی جذباتی اور امیچور ہو۔" وہ سنجیدہ تھا۔

"اور تم خود کیا ہو؟" فریا نے تنک کر پوچھا۔

"مجھے تم اتنی آسانی سے سمجھ نہیں پاؤ گی۔" وہ سچ کہہ رہا تھا۔

"کبھی کبھی سوچتی ہوں۔ میں نے تم سے محبت کیوں کی؟"

"سوچنے کے لیے اچھا ٹاپک ڈھونڈا ہے۔ کافی بہتر وقت گزر جاتا ہوگا۔" وہ پھولوں کی باڑ سے ایک پھول توڑ لایا تھا۔

"اتنے پیارے پھول کو کیوں شاخ سے توڑا ہے۔" فری نے تاسف سے کہا۔ "اپنے مقام سے ہٹ کر تنہا اور ادھورا لگنے لگا ہے۔ پھول ہمیشہ شاخوں پر ہی اچھے لگتے ہیں۔" فریا کو تو گلدان میں تازہ پھول سجانا بھی ناپسند تھا۔

"مقلاسفر صاحبہ! آئی ایم سوری، آئندہ یہ گناہ عظیم نہیں کروں گا۔" حمزہ نے اس کے دونوں کانوں کو پکڑ لیا۔

"اٹس او کے، ہم نے تمہیں معاف کیا۔" وہ شان بے نیازی سے بولی۔

"اپنے ظرف کو ہمیشہ اسی طرح وسیع رکھیے گا۔" فرمائش کی گئی تھی۔ فریا نے آنکھیں پھیلا کر استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

"میری غلطیوں پر درگزر کرتی رہنا۔" اس نے وضاحت کی۔

"غلطی کرو گے تو معاف کر دوں گی۔ غلطیاں دہراؤ گے تو کبھی معاف نہیں کروں گی۔" اس نے وارننگ دی تھی۔

"تم بہت سادہ اور معصوم ہو فریا!"

"اور تم مجھے کافی چالاک لگتے ہو۔" فریا نے قہقہہ لگایا۔ حمزہ بھی مسکرا دیا تھا۔

"کبھی کبھی میں حیرانی سے سوچتا ہوں۔ میں اس بینچ پر بیٹھا تھا جب تم نے پہلی دفعہ مجھے دیکھا تھا اور ٹھہر گئی تھیں اور بھی بہت سے لوگوں کی طرح مجھے نظر انداز کر کے پاس سے گزر جاتیں تو ہم دونوں کبھی ایک دوسرے کے قریب نہیں آ سکتے تھے۔" وہ دونوں اپنی کالونی کی روڈ پر آ نکلے تھے۔

"مگر میں ٹھہرتی کیوں نا! مجھے تو اسی موڑ پر ٹھہرنا تھا۔ رکنا تھا۔" وہ خود بھی شاید پہلی ملاقات کو سوچنے لگی تھی۔

"فری! میں عنقریب ننا سے فائنل بات کرنے والا ہوں۔" حمزہ کے چہرے پر ایک دم کئی تاثرات ابھر آئے تھے۔

"اتنی جلدی؟ نہیں حامے! ابھی نہیں۔" وہ گویا چیخ پڑی۔

"میرے پاس وقت کم ہے فری! مجھے ان ہی دنوں میں ننا سے بات کرنا ہوگی۔ آئندہ کا لائحہ عمل تیار کرنا ہوگا۔" اس کی آواز سرگوشی نما تھی۔ فریا بمشکل ہی سن پائی۔

"تم کہاں جا رہے ہو؟" وہ ٹھٹک کر پوچھ رہی تھی۔

"فی الحال تو تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ تم کافی بناؤ گی۔ میں، بنگلی جی اور ننا پینے کی سعادت حاصل کریں گے۔" وہ بات کو بدل گیا تھا۔ فریا نے اس کا بازو پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا۔

"ابھی تم نے کیا کہا ہے حمزہ! تم کہاں جانے کی بات کر رہے ہو؟"

"میں بھلا کہاں جاؤں گا فری! یہ کیا بچپنا ہے۔" وہ نرمی سے اپنا بازو چھڑا کر بولا۔

"بھگوڑے! تم بھاگنا چاہتے ہو۔" وہ ایک دم تپ گئی۔

"تم سے بھاگ کر کہاں جاؤں گا بھلا۔" حمزہ اداسی سے مسکرا دیا۔

"حامی! تم مجھے بہلا نہیں سکتے۔" وہ ابھی تک شاکڈ تھی۔ گویا اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ حمزہ نے کہیں جانے کی بات کی ہے۔

"باپ رے! فی الحال تو میرا بازو چھوڑو مجھے پارک جانا ہے۔ ہائے میرے بچے!" مسز یزدانی کے گیٹ پر نگاہ کیا پڑی تھی۔ وہ بازو چھڑوا کر سرپٹ بھاگا۔

"تمہارے نہیں مسز یزدانی کے بچے۔" فریا وضاحت کرنا نہیں بھولی تھی۔ "حامے! تمہاری کافی۔" وہ چلا رہی تھی۔

"ادھار رہی۔" وہ بغیر پلٹے بولا تھا۔

"تم بھی نا محمد حمزہ! پتا نہیں کیا چیز ہو۔ میں تمہیں شاید کبھی بھی نہیں سمجھوں گی۔" فریا سر جھٹکتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"بنگلی جی! فریا کو ذرا باہر بھیجیے۔"
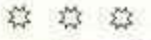
وہ گیٹ کا ذرا سا پٹ کھولے جھانکتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ بنگلی جی درختوں پر سے تازہ پھل اتار رہے تھے۔ ہاتھ میں پکڑی ٹوکری گھاس پر رکھے سہلاتے ہوئے اندر چلے گئے۔ کچھ دیر بعد وہ جو گزر کے جینز، شرٹ پہنے اندر سے آتی دکھائی دی تھی۔ وہ اسٹار کو گھسیٹا ہموار سڑک پر چلنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ بھی اس کے برابر چل رہی تھی۔

"کہیں جا رہی ہو۔؟"

"ہاں، مارکیٹ تک۔" وہ اپنا والٹ کھولے، پیسے چیک کر رہی تھی۔

"اگر کچھ منگوانا تھا تو مجھے بتا دیتیں۔ میں ابھی مارکیٹ سے آ رہا ہوں۔"

"تم نے سودا ڈھونے کے علاوہ گورنس والے کام بھی شروع کر دیے ہیں۔ اپنی، یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں۔" وہ اسٹار کو دیکھ کر چونکی تھی۔ پھر جھک کر بچے کو دیکھنے کے بعد کافی ناگواری سے بولی۔

"میں ایسا چیپ کام نہیں کر سکتا اور دیکھو، تمہاری خاطر میں کیا کیا کر رہا ہوں۔" وہ پہلے سے ہی کافی جلا بھنا

تھا۔ فریا کے جتلانے پر اسے چپ چڑھ گئی تھی۔

"میری خاطر؟ بچہ کسی کا ہے، خدمتیں کسی اور کی ہو رہی ہیں۔ اور احسان عظیم مجھ پر۔" وہ بھی بری طرح سے چڑ گئی۔ "اسے کیوں اٹھا کر لائے ہو۔"

"اس معصوم کی گورنس چھٹی پر ہے۔ بے چارہ باہر آنے کے لیے ہمک رہا تھا۔ مجھے خواہ مخواہ ترس آ گیا۔"

وہ منہ کے زاویے بگاڑے کہہ رہا تھا۔ جب بچے نے ایک دم چیخ مار کر رونا شروع کر دیا۔

"اف حمزہ! اسے چپ تو کرا دو۔" بچہ دھیرے دھیرے والیوم بلند کر رہا تھا۔

"ارے چپ کر جا یار!" حمزہ گھوم کر بچے کے سامنے آ گیا۔ "چپ کر جا، قحط زدہ افریقی بچے۔" وہ سوکھے سڑے سے کالے چہرے والے بچے کو پچکارتے ہوئے بولا۔ بچے نے اور بھی بھاں بھاں کر کے رونا شروع کر دیا تھا۔

"مائی گاڈ فری! یہ تو چپ نہیں کر رہا۔" حمزہ بچے کے مسلسل رونے پر بری طرح سے بوکھلا گیا۔

"اس کے منہ میں فیڈر ڈالو۔" فری بھی گھٹنوں کے بل جھک کر بچے کے رونے کی وجہ دریافت کرنے کی کوشش میں لگ گئی۔

"افریقی چائلڈ! فیڈر تو پی لے یار!" وہ زبردستی دودھ کی بوتل بچے کے منہ میں ٹھونس رہا تھا۔ "کھول منہ، لگاؤں گا دو جھانپڑ۔ میں کہہ رہا ہوں۔ کھول منہ کو۔"

"حمزہ! ایڈیٹ، بچے کو دودھ کی طلب نہیں۔ زبردستی مت کرو۔" فری نے گویا اپنا ماتھا پیٹ لیا تھا۔

"ٹافی لو گے یا چاکلیٹ؟" وہ اپنی جینز کی جیبیں ٹٹولنے لگا تھا۔ "کمال ہے یار! تیرے لیے تو نہ چاکلیٹ نکلی ہے نہ ٹافی۔"

"اسٹوپڈ! یہ ٹافی اور چاکلیٹ نہیں کھا سکتا۔" فریا کو بری طرح ہنسی آ گئی تھی۔ اسی پل ایک خاتون کے قریب سے گزری تھیں۔ بچے کے ساتھ انہیں ہلکان ہوتا دیکھ کر رک گئیں۔

"آج کل کی لڑکیوں کے کمال نخرے ہیں۔ بچہ رو رہا ہے اور ماں کو پروا ہی نہیں ہے۔"

"میرے لیے۔" فری حیران ہی تو رہ گئی۔ "میرے لیے نہیں، اپنے باپ کے لیے رو رہا ہے۔" فری کو بوکھلاتے ہوئے یہی جواز سوجھا تھا۔ وہ شاید اسے بچے کی ماں سمجھ رہی تھیں۔

"ہائے یہ کیسا زمانہ آ گیا! باپ سات فٹ دور کھڑا ہے۔ گویا اس نے بچے کو اٹھا لیا تو وہ ساتھ ہی چپک جائے گا۔"

"میں نہیں اسے اٹھا سکتا۔ ناک بہہ رہی ہے اس کی۔ کہاں پھنس گیا ہوں میں، اس چڑیا گھر میں۔" حمزہ نے گویا اپنے بال نوچ لیے تھے۔ "مجھے گورنس سمجھ لیا ہے، اس میڈم کی بچی نے۔ بس آج سے میرے صبر کی انتہا ہو گئی۔ کرتا ہوں اس پھولن دیوی سے دو ٹوک بات۔ حد ہوتی ہے ہر چیز کی۔"

"ایں۔ اسے کیا ہوا، یہ تو چپ کر گیا ہے فری!" بچہ خاموش ہو چکا تھا۔ حمزہ نے مارے مسرت کے بچے کو سجدہ کر کے دیکھا۔

"ارے یہ تو بچہ سو گیا ہے۔"

"اسے نیند آ رہی تھی۔ تب ہی بے چین تھا۔ چلو گھر چلتے ہیں۔" فریا پلٹنے لگی تھی۔

"تمہیں مارکیٹ نہیں جانا؟" وہ تذبذب کا شکار تھا۔

"پھر سہی، بچہ اپ سیٹ رہے گا۔ اسے بستر کی ضرورت ہے۔"

"وہ اسٹائل گھسیٹ رہی تھی۔ حمزہ نے بچہ اٹھا رکھا تھا۔ وہ دونوں اپنی ہی جھونک میں باتیں کرتے آ رہے تھے۔ مسز یزدانی گیٹ پر کھڑی تھیں۔ فریا انہیں دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ وہ بھی معنی خیزی سے مسکراتے ہوئے فریا کو بغور دیکھنے لگی تھیں۔

"پکڑیں اپنے افریقی شہزادے کو۔ بڑا ہو کر ایک عظیم ماڈل بنے گا۔ اس کے چہرے کی لک ہی کچھ ایسی ہے۔ راہ چلتے فقیر تک ٹھٹک جاتے ہیں۔" حمزہ بچے کو احتیاط سے مسز یزدانی کی گود میں منتقل کر چکا تھا۔

"تم سے تو بعد میں نمٹتی ہوں۔ ذرا فریا سے دو دو ہاتھ کر لوں۔" وہ بڑی بے تکلفی سے حمزہ کے سر پر چپت لگا کر کہہ رہی تھیں۔ فریا کو یہ بے تکلفی کچھ بھائی نہیں تھی۔

"تم بھی قسم توڑ ہی ڈالو۔ کبھی ہمارے گھر نہیں آئیں۔ یہ حاما تو نرا نکما ہے۔ اس نے کبھی تمہیں چائے یا لنچ پر نہیں بلایا۔ خود تو دن میں دس دس مرتبہ تمہارے گھر سے کھا پی کر آتا ہے۔" وہ بڑی محبت سے اصرار کر رہی تھیں۔

"طولی آپی! پھر سہی۔ ابھی مجھے کام ہے۔" وہ ٹال گئی تھی۔ ویسے بھی نتا کے علم میں لائے بغیر وہ کہیں آتی جاتی نہیں تھی۔

"میڈم! نہ اصرار کریں۔ اسے واقعی کچھ کام ہے۔" حمزہ کی آنکھیں شرارت سے چمک رہی تھیں۔

"تم آوارہ گرد! کہاں بچے کو لے کر چلے گئے تھے اس کے سونے کا ٹائم تھا۔" مسز یزدانی نے حمزہ کو بری طرح جھاڑ ڈالا۔ ان کا یہ شاہانہ انداز فریا کو حیران کر گیا تھا۔ اب وہ حمزہ کو بہت سخت لہجے میں سنائے جا رہی تھیں۔ فریا کا دل حمزہ کی پتلی حالت پر بھر آیا۔

"یہ امیر لوگ، ان کے مزاج سمجھنا بھی کہاں آسان ہے۔" گھر آ کر بھی وہ کئی لمحے کلستی رہی تھی۔

"نجانے اور کتنی دیر اسے باتیں سناتی رہیں گی۔ کیا ضرورت تھی اسے بچے کو بغیر بتائے باہر لے کر جانے کی۔" وہ محض سوچ کر رہ گئی۔

✡ ✡ ✡

پچھلے دو دن سے حمزہ غائب تھا۔ اب تو بنگالی جی اور نتا کو بھی تشویش ہو چلی تھی۔

"حمزہ کی خبر تو لو، بے چارا پردیسی تنہا بچہ، خدانخواستہ بیمار نہ پڑ گیا ہو۔" اس وقت وہ حمزہ کے لیے پریشان ہو رہی تھیں اور چند دن پہلے یہی حمزہ انہیں سخت برا لگنے لگا تھا۔

"نجانے یہ خانساماں کہاں سے اٹھ کر آ گیا ہے۔ میری نواسی بھی سدا کی احمق ہے۔ بھلا عمر بھر کے فیصلے جھٹ پٹ کیے جاتے ہیں۔ بغیر سوچ و بچار کے۔ میں ہرگز تمہاری شادی حمزہ سے نہیں کروں گی۔" وہ سخت جلال میں تھیں۔

"اور میں بھی آپ کو بتا چکی ہوں کہ شادی کروں گی تو صرف حمزہ سے، ورنہ تمام عمر یونہی بیٹھی رہوں گی۔" نجانے کس فلم کے ڈائیلاگ تھے جو مارے جذبات کے فریا کے لبوں سے برآمد ہوئے۔

"تمہاری ماں اور ماموں نے بھی یہی کیا تھا۔ تم سے اچھی امید کیا رکھوں۔" فریا جان گئی تھی۔ نتا نیم رضامند ہیں۔ صرف انہیں کچھ خدشات تھے۔ حمزہ کے فیوچر کے بارے میں پریشان تھیں۔ وہ فریا کو کیسے سمجھاتیں کہ بے شک حمزہ میں بہت سی خوبیاں تھیں۔ وہ سمجھ دار تھا، باشعور تھا، بااخلاق تھا، مگر شادی جیسے حساس اور نازک معاملات میں اور بھی بہت سی چیزوں کو دیکھا جاتا ہے۔

نرم سے نرم الفاظ میں بھی ان کے لیے یہ بہت تکلیف دہ بات تھی کہ ان کی نواسی ایک خانساماں سے محبت کرتی ہے۔ اس سے شادی کی خواہش مند ہے۔ وہ تو عمر میں بھی اس سے ڈیڑھ سال چھوٹا تھا۔ کیا وہ شادی شدہ زندگی کی ذمہ داریاں اٹھانے کا اہل تھا؟

وہ ان حقیقتوں سے فریا کو بھی روشناس کروا چکی تھیں۔

"میں جاب کر لوں گی۔" گویا اس نے سب کچھ طے کر رکھا تھا۔

"پھر بھی میں حمزہ کو چار پانچ سال کا وقت دوں گی۔ وہ اپنے قدم جمائے خود کو منوا کر ہمارے سامنے آئے۔ پھر میں بخوشی تمہیں حمزہ کے ساتھ رخصت کروں گی۔" وہ جان چکی تھیں کہ فریا اپنے قدم پیچھے کبھی نہیں ہٹائے گی۔ وہ ضدی تھی اور اپنی ضد ہمیشہ منوا کر دم لیتی تھی۔

وہ نتا سے پوچھ کر مسز یزدانی کی طرف آ گئی تھی۔ ادرگرد کے لوگوں سے ان کی جان پہچان نہ ہونے کے برابر تھی، تاہم مسز یزدانی کی نتا سے خاصی علیک سلیک ہو گئی تھی۔

چوکیدار نے اسے دیکھتے ساتھ ہی گیٹ کھول دیا تھا۔

"نجانے حمزہ کہاں ہوگا۔ یقیناً" کچن میں۔" وہ سوچتے ہوئے اندر داخل ہو گئی تھی۔ سامنے ایک ملازمہ اسی بچے کو شاید سیریلیک کھلا رہی تھی۔

"طوبیٰ باجی کہاں ہیں؟" فریا نے اسی ملازمہ سے پوچھا۔

"جی آپ کون؟" ملازمہ اس کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

"میں فریا ہوں۔ یہ سامنے ہمارا گھر ہے۔" وہ اردگرد پھیلی بے ترتیبی کو دیکھتے ہوئے بولی۔ بچوں نے ہر چیز تلپٹ کر رکھی تھی۔ اتنے ملازم تھے اور پھر بھی نفاست کا نام و نشان نہیں تھا۔

"اچھا۔ اچھا" تو آپ فریا بی بی ہیں۔ حمزہ بھائی جان کی دوست۔" ملازمہ نے بے ساختہ خوشی کا اظہار کیا۔

"حمزہ کہاں ہوگا؟"

"ان کی تو طبیعت رات سے خراب ہے۔ گلا دکھ رہا ہے۔ بخار ہے۔ ادھر راہداری میں پہلا کمرہ انہی کا ہے۔ بیگم صاحبہ بھی انہی کے کمرے میں ہیں۔" ملازمہ نے ہاتھ کے اشارے سے ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ فریا سنبھل کر چلتی ہوئی دروازے تک آئی۔ دستک دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔

"توبہ باجی 'خدارا' یہ ظلم مت کیجیے۔ میں یہ انڈے کی زردی والا دودھ نہیں پی سکتا۔"

"حمزہ یہ دودھ تم کو پینا ہی ہوگا۔ ٹھنڈ کا اثر ہے' منٹوں میں بھلے چنگے ہو جاؤ گے۔"

طوبیٰ بڑے لاڈ سے پچکار رہی تھیں ایک خانساماں کو۔ اپنے گھریلو ملازم کو۔ فریا گویا دم بخود رہ گئی۔

"ہائے کتنی بری اسمیل ہے۔ مجھے تو وومٹنگ ہونے لگی ہے۔" حمزہ ناک دبائے کہہ رہا تھا۔ اس کا گلا واقعی خراب تھا۔ آواز بے حد بھاری تھی۔ باجی نے زبردستی گلاس اس کے لبوں سے لگا دیا۔

"لڑکیوں کی طرح نخرے مت دکھاؤ۔ کیا تیرا مہینہ لگا ہے۔" حمزہ کو زور کا اچھو لگ گیا تھا۔ وہ کھانستے کھانستے دوہرا ہو گیا۔

"یہ کام آپ کو مبارک ہو۔ توبہ توبہ۔" اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ "حامد بھائی نے اور آپ نے جو فٹ بال کی ٹیم بنائی ہے نا! ریکارڈ بک میں آپ دونوں کا نام دے دوں گا۔" پلٹ کر گلاس رکھنے لگیں دروازے میں کھڑی فریا کو دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

"زہے نصیب! آج تو فریا آئی ہے۔ آؤنا' رک کیوں گئیں۔" وہ لبوں پر مسکان سجائے لپک جھپک اس تک آئی تھیں۔

"حمزہ کے لیے آئی ہو گی۔ ہم اتنے اہم کہاں؟" ان کے لب و لہجے میں شوخی نمایاں تھی۔ جبکہ حمزہ بھی حق دق اسے دیکھے جا رہا تھا۔ گویا اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ فریا مسز یزدانی کے گھر بھی آسکتی ہے۔

"فری! تم؟" حمزہ کو سچ مچ جھٹکا لگا۔

"کیا میں یہاں نہیں آسکتی۔ مسٹر شیف کی عیادت کرنے۔" وہ چبا چبا کر بول رہی تھی۔

"کون ہو تم حمزہ! کیا ہو تم؟ کتنے روپ ہیں تمہارے؟ کبھی پچ پر بیٹھے رو رہے ہوتے ہو۔ کبھی خانساماں بن کر سامنے آتے ہو۔ کبھی ڈرائیور کا روپ دھار لیتے ہو۔ کبھی ٹیوٹر بنے دکھائی دیتے ہو۔ اور کبھی بچوں کی آیا گیری کرنے لگتے ہو۔ اتنے ڈھونگ رچا رچا کر سامنے کیوں آتے ہو؟ آخر تم کون ہو؟ کیا کرنے آئے ہو یہاں؟ کیا کرنا چاہتے ہو؟ کون سا منصوبہ بنا رکھا ہے تم نے؟ کیوں جھوٹ بولا؟ کیوں غلط بیان جاری کرتے رہے کہ میں تنہا ہوں۔ معمولی سا مزدور ہوں۔ تم کون ہو حمزہ! بتاؤ تم کون ہو؟"

وہ گویا پھٹ پڑی تھی۔

"میں کون ہوں؟ ایک بیس سال کا گھاگ مرد۔ محمد حمزہ کون ہے؟ یہ تم اپنے ممی اور ڈیڈی سے پوچھ لینا۔ تیسرے سوال کا تیسرا اور آخری جواب۔" وہ لمحہ بھر کو رکا تھا۔ پھر اپنے گریبان سے اس کے دونوں ہاتھ چھڑوا کر بولا۔ "کیا لینے آیا ہوں؟ میں سمندروں اور سرحدوں کو پار کر کے کیوں آیا ہوں۔" وہ اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر سلگتے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"تمہارا دل لینے کے لیے آیا ہوں۔ ورنہ میرے لیے یہاں آخر رکھا ہی کیا ہے۔ ایک مری ہوئی دادی کی تربت کے سوا۔" اس کے لبوں سے انگارے چھوٹ رہے تھے۔ آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

"یہ دل میں نے لے لیا۔ اسے اپنی ذات کی قبر میں مقید کر لیا ہمیشہ کے لیے اس "قید" سے رہائی فریا عتیق کے دل کو نہیں ملے گی۔ کبھی نہیں۔ میں آج رات کی فلائٹ سے واپس جا رہا ہوں۔ میرے ساتھ تمہاری آنکھوں کے ادھورے خواب جائیں گے۔"

"حمزہ!" فریا کے قدموں کے نیچے سے گویا زمین سرک گئی تھی۔ سامنے کھڑا یہ لڑکا وہ محمد حمزہ تو نہیں نظر آ رہا تھا جسے فریا جانتی تھی۔

"کوئی سوال مت کرنا۔ تمہیں مجھ سے ایک جواب بھی نہیں ملے گا۔ یہ سوال اپنے باپ سے کرنا۔ اپنی ماں سے کرنا۔ محمد حمزہ کون ہے؟"

وہ اسے حق دق کھڑا چھوڑ کر باہر نکل گیا تھا جبکہ فریا ابھی تک وہیں مبہوت کھڑی تھی۔ ساکت' مبہوت' خاموش اور حیران۔ حمزہ جس خاموشی سے آیا تھا ایسے ہی چلا بھی گیا۔

★ ★ ★

کئی دن کے بعد اسے مسز یزدانی سے بات کرنے کا خیال آیا تھا اور دوسرے ہی لمحے وہ ان کے گھر پہنچ گئی تھی۔

مسز یزدانی کے کچن میں نیا خانساماں کھڑا تھا۔ نہ جانے کیوں فریا کی آنکھیں لبالب آنسوؤں سے بھر گئیں۔

"فریا! تم؟" وہ اسے دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔ "آؤنا' رک کیوں گئیں۔" ان کے لہجے میں محسوس کی جانے والی نرمی تھی۔

"نیا شیف ہے کیا؟" اس نے لب کچلتے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا۔

"اوپر کے کاموں کے لیے رکھا ہے۔ مگر اسے کھانا پکانا بھی آتا ہے۔ میرا مسئلہ حل ہو گیا۔" وہ سادگی سے بتانے لگیں۔

"حمزہ کے جانے کے بعد آپ کو کافی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔" وہ جو کچھ پوچھنا چاہ رہی تھی اس کے لیے ہمت بھی تو مجتمع کرنا تھی۔

"تو اور کیا' بچے بھی کتنے دن ڈسٹرب رہے ہیں۔ حمزہ سے بہت اٹیچ ہو گئے تھے۔ مجھے تو بالکل اپنے بڑے بیٹے ارسلان کی طرح عزیز ہو گیا تھا۔" وہ حمزہ کو یاد کر کے آب دیدہ ہو گئیں۔ "اتنا ہنس مکھ اور مخولیا تھا۔"

"طوبیٰ باجی! آپ جانتی تھیں کہ حمزہ کون ہے؟" اس نے پوچھ ہی لیا۔

"سچ پوچھو تو میں اسے پہلی دفعہ دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ اتنا تو تم جانتی ہو کہ حامد ملک سے باہر ہوتے ہیں۔ تو بچوں کے ساتھ اتنے بڑے گھر کی دیکھ ریکھ میری اکیلی جان سے تو نہیں ہو سکتی تھی۔ میں سخت پریشان تھی۔ حامد سے مشورہ کیا تو انہوں نے اخبار میں اشتہار دینے کی تجویز دی۔ مجھے کسی پھرتیلے لڑکے کی ضرورت تھی' جو کچن کے ساتھ ساتھ سودا سلف بھی لے آیا کرتا۔ مجھے حمزہ ہر لحاظ سے پسند آگیا۔ شائستہ مزاج' سلجھا ہوا' رکھ رکھاؤ والا لڑکا۔ میں سمجھ گئی تھی کہ ملک میں بے روزگاری کی وجہ سے یہ اچھے خواصے گھرانے کا لڑکا تیسرے درجے کی نوکری پر بھی رضامند ہے۔ مگر اس کی ڈیمانڈ سن کر میں حیران ہی تو رہ گئی تھی۔ اس نے کہا' مجھے ماہانہ تنخواہ آپ جو بھی دیں منظور ہے۔ مگر مجھے آپ کے گھر میں رہنے کے لیے کمرے کی ضرورت ہوگی۔ ہیٹر کی سردیوں میں خاص ضرورت نہیں۔ البتہ گرمیوں میں اے سی میں ضرور چلاؤں گا۔ خوراک میری سادہ سی ہے۔ البتہ کافی کا میں نشئی ہوں۔ دن میں کئی کئی دفعہ پیتا ہوں۔ کبھی کبھی رات کو بھی پیتا ہوں۔ میں ڈرائیونگ بھی کر لیتا ہوں۔ بچوں کو پک اینڈ ڈراپ کی ذمہ داری میری ہوئی۔ مارکیٹ سے سودا سلف بھی لایا کروں گا۔ آپ کے ڈرائیور کی تنخواہ بھی بچ گئی۔ ٹیوٹر کو بھی چھٹی کروا دیں۔ بچوں کو رات کے تین گھنٹے پڑھا دیا کروں گا۔"

میں اس کی ڈیمانڈ سن کر حیران رہ گئی تھی۔ حامد سے

مشورہ کیا تو وہ مان گئے۔ وہ احسن طریقے سے اپنی ذمہ داریاں سنبھال چکا تھا۔ البتہ اسے شیف بیٹا نے زبردستی بنا ڈالا تھا۔ وہ اسے کھانا پکانا سکھا رہی گئی تھی۔ جبکہ پکن کے کاموں سے وہ شدید الرجک تھا۔ اس کی عمر اتنی زیادہ نہیں تھی جتنی بڑی بڑی اور گہری باتیں وہ کرتا تھا۔ بہرحال مجھے تو اپنے گھر کے ہر ملازم سے انسیت تھی اور حمزہ سے تو خاص انسیت ہو گئی تھی۔ اللہ اسے لمبی عمر دے۔ اور وہ خوب کامیابیاں سمیٹے۔

ایک بر لش لڑکا دو سال تک میرے گھر شیف کے علاوہ دیگر امور حسن طریقے سے سنبھالے رہا ہے' کس لیے؟ کیوں؟ کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ ہر ذی شعور بندہ سوچے گا تو ضرور۔ میں بھی سوچتی رہی تھی۔ تب مجھ پر انکشاف ہوا۔ وجہ تو تم ہو' فریا عتیق! تمہارے لیے وہ خود کو بے کار کے ان مشغلوں میں ضائع کر رہا تھا۔ بہرحال میں اس کے بارے میں بس یہ ہی کچھ جانتی ہوں۔"

طوبیٰ باجی خاموش ہو گئی تھیں۔ فریا کی ابھی بہت ساری الجھنیں دور نہیں ہوئی تھیں۔ وہ گھر آئی تو ثنا کو اپنا منتظر پایا۔ وہ کافی پرجوش نظر آ رہی تھیں۔

"تمہارے ممی ڈیڈی آ رہے ہیں فری! ربی بھی آئے گی۔ ابھی وقاص کا فون آیا تھا۔ میرے خیال میں یہ سب کسی خاص مقصد کے لیے آ رہے ہیں۔" ان کے چہرے پر واضح خوشی تحریر تھی۔ حمزہ کے چلے جانے کی سب سے زیادہ خوشی ثنا اور وقاص کو ہی تو ہوئی تھی۔

"کیسا مقصد؟" اس نے ٹھٹک کر پوچھا۔

"تمہاری ماں نے وقاص کے ساتھ تمہاری بات پکی کر دی ہے۔" ثنا نے گویا دھماکہ کیا۔

"مگر مجھے وقاص تو کیا کسی سے بھی شادی نہیں کرنی۔ بتا چکی ہوں آپ کو۔" اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔

ثنا اور پھوپھو کے ساتھ ممی' ڈیڈی بھی اس سے ناراض ہو گئے تھے۔ مگر اس کا فیصلہ اٹل تھا۔

گزرتے وقت میں وقاص کی دھوم دھام سے شادی ہو گئی تھی۔

وقاص کی شادی کے لیے ممی اور ڈیڈی بھی آئے تھے۔ اس کی حیرت کی انتہا نہیں رہی تھی جب ممی اور ڈیڈی دونوں نے صاف انکار کر دیا کہ وہ حمزہ نام کے کسی لڑکے کو جانتے تک نہیں۔ فریا اور بھی الجھ گئی تھی۔

"تم فری سے ہی پوچھ لو۔ بھلے نام کا بچہ تھا۔ سعادت مند' نیک اور شریف۔" ثنا اس سے زیادہ اچھی تعریف اور کیا کرتیں۔ کم از کم بیٹی کو نواسی کی پسند کے متعلق تفصیلات بتانے کی ان میں جرأت نہیں تھی۔

"کرتا کیا ہے؟" ممی کی توپوں کا رخ اب فریا کی طرف تھا۔

"ہو کے چلا گیا ہے۔"

"پہلے کیا کرتا تھا؟ کیا ایجوکیشن ہے اس کی؟ کس فیملی سے ہے؟" ممی کی بھنویں تن گئی تھیں۔

"جو بنگالی جی کرتے ہیں' یہی کام کرتا تھا نا مسٹر حمزہ! تم کیا بتاؤ گی' سب جان گئی ہوں میں اپنی بیٹی کے انتخاب اور پسند کے متعلق۔" انہوں نے سخت تنفر کے عالم میں سر جھٹکا۔

"ممی! جی چاہتا ہے کہ طمانچے مار مار کے اس کا منہ لال کر دوں' اور یہ احمق' بے عقل' اتنا پڑھ لکھ کر گنوا دیا۔ شیم آن یو فری! ایک خانساماں سے محبت کر بیٹھیں۔ اپنا مقام دیکھو اور مقابل کے پروفیشن کو۔ مگر تمہارا بھی کیا قصور ہے' یہ سب کیا دھرا تو ممی! آپ کا ہے۔"

ممی اب ثنا سے دوبدو جھگڑنے لگی تھیں۔ ہمیشہ اسی طرح تو وہ کرتی تھیں۔ جب غصہ آتا' ثنا سمیت فری کی انسلٹ کر کے رکھ دیتی تھیں۔ بڑا مان تھا انہیں اپنی ذہانت پر اور دولت۔ ثنا پر بھی اسی بات کا احسان لادے رکھتی تھیں کہ آپ کو گھر لے کر دیا ہے۔ نوکر چاکر آپ کی چاکری کے لیے رکھے ہیں۔ تنخواہ چونکہ ممی دیتی تھیں۔ گھریلو اخراجات کے لیے بھی ممی پیسے بھجواتی تھیں' سو ثنا بے چاری کو دو پل میں دو کوڑی کا کر کے رکھ دیتیں۔ ساتھ ساتھ یہ بھی جتا دیتی تھیں کہ فرمان (فریا کے ماموں) کا حق تھا ماں کو سپورٹ کرتا۔

میں بیٹی ہو کر ماں کے اخراجات اٹھاتی ہوں۔

"یہ تربیت کی ہے آپ نے میری بیٹی کی۔" اب وہ چیخ چیخ کر کہہ رہی تھیں۔ ثنا کے چہرے پر سائے لہرانے لگے تھے۔

"پلیز ممی! ثنا سے اس لہجے میں بات مت کریں۔" فریا نے گویا التجا کی۔

"تم تو مجھ سے بات ہی مت کرو' سخت دل دکھایا ہے تم نے میرا۔" وہ مشتعل ہو کر اٹھ گئیں۔ "دیکھا ثنا! ذرا بھی آپ کا لحاظ نہیں کرتیں۔ تربیت ان کی بھی تو آپ نے ہی کی ہے۔" ممی کے جانے کے بعد وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

جانے سے پہلے ممی کا موڈ بہتر ہو گیا تھا۔

"ذرا یہ سنبھل جائے تو کسی اچھے پرپوزل کو اوکے کر دیجیے گا۔" وہ ثنا سے بار بار کہہ رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

پانچ سال گزر گئے تھے۔

وہ محبت کے اسی موڑ پر کھڑی تھی جس موڑ پر وہ اسے ہاتھ تھام کر لے آیا تھا۔ وہ اس کے دل کے خالی کشکول میں اپنی محبت کے دو سکے ان دو سالوں میں ڈال کر اسے نارسائیوں کے عذاب دے کر چلا گیا تھا۔ فریا عتیق کے پاس کچھ نہ تھا' اس کی یادوں کے سوا' وہ اپنے گھر کے بیرونی لان میں رکھے اس بینچ کو پہروں تکتی رہتی تھی' جہاں اس نے پہلی مرتبہ حمزہ کو بیٹھے دیکھا تھا۔ اور وہ نہ جانے کہاں تھا' کس دیس میں جا بسا تھا۔ کس نگر کا اس نے رخ کر لیا تھا۔ کس بستی میں بسیرا کر لیا تھا۔ کس جزیرے پر جا رکا تھا۔ نہ جانے کہاں ڈیرے لگا لیے تھے محمد حمزہ نے۔ اور فریا عتیق حیران ہو کر سوچتی تھی کہ اس دور میں بھی کوئی پہلی نظر کے عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے؟ مگر کچھ ایسے چہرے ہوتے ہیں جو متوجہ کر لیتے ہیں' تسخیر کر لیتے ہیں' وہ چہرہ بھی ایسا ہی تھا۔ وہ خود سے عہد کر کے آیا تھا کہ فریا شجاع عتیق کا دل چرائے گا۔ اور اس نے پہلی نظر میں اس کا دل چرا لیا۔

سڑک کے کنارے سرسبز گھاس سے سجے چھوٹے سے قطعہ میں رکھے پتھریلے بینچ پر بیٹھے اس یورپین نقوش رکھنے والے روتے لڑکے نے فریا عتیق کو متوجہ کیا تھا۔ اور جب وہ اس کے بارے میں جان گئی تب بھی اس کے دل نے محمد حمزہ کے لیے ہمیشہ محبت محسوس کی تھی۔ یہ جان کر بھی کہ وہ ایک معمولی سا گھریلو ملازم ہے' یہ دلوں کے معاملے سوچ سمجھ کے کہاں ہوتے ہیں۔

عجیب بات تو یہ تھی' فریا نے اس پردیسی کو ہر الزام سے بری کر دیا تھا۔ وہ محب کا درجہ رکھتی تھی۔ محبت کا ذائقہ اس کے دل نے چکھا تھا۔ پہل اسی نے کی تھی۔ حمزہ کے قریب وہ خود آئی تھی۔

وہ بدعہد نہیں تھا۔ حمزہ نے اس سے کوئی پیمان تو نہیں باندھے تھے۔ مگر نہ جانے فریا کو کیسا یقین تھا کہ محبت کے سفر میں وہ دونوں ساتھ ساتھ ہیں۔

وہ جھوٹا بھی نہیں تھا۔ اس نے جتنا کچھ اپنے بارے میں بتایا تھا' وہ بالکل سچ تھا۔

اس نے صرف ایک چیز فریا سے مخفی رکھی تھی۔ اس نے فریا عتیق کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ پاکستان کس سے انتقام لینے آیا ہے۔ فریا عتیق سے انتقام؟ مگر کیوں؟ کس لیے؟

☼ ☼ ☼

فریا نے ایک بہترین ساکھ رکھنے والے اسکول میں جاب کر لی تھی۔ ثنا اسے مصروف دیکھ کر بہت خوش تھیں۔ وہ جانتی تھیں ایک دن فریا اپنے لیے بہترین فیصلہ کرے گی۔

ایک اداس شام میں وہ ہمیشہ کی طرح اسی سنگی بینچ پر بیٹھی تھی۔ جب پوسٹ مین گیٹ کے قریب آ کر رکا۔ وہ اٹھ کر گیٹ پر گئی تو اس نے ایک رجسٹری اس کی طرف بڑھائی۔

فریا نے خاکی لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ فاران کی مہر لگی تھی۔ وہ حیران ہی تو رہ گئی۔

"یہ ممی نے کیا بھیج دیا ہے۔" وہیں بینچ پر بیٹھے

بیٹھے اس نے لفافہ چاک کر کے اندر سے کچھ کاغذات نکالے۔

"جانِ فری!" طرزِ تخاطب نے ہی اسے چونکا دیا۔

"حمزہ کا خط" اس نے بے صبری سے تحریر پر نظریں جما دیں۔

"تمہیں الجھنوں کے حوالے کر کے یہاں چلا آیا تھا۔ سچ پوچھو تو ایک دن بھی سکون سے نہیں گزرا۔ تمہاری یاد میں اتنی شدت ہے کہ بدلتے موسم بھی مجھ پر اثر انداز نہیں ہوتے۔

بات کا آغاز کہاں سے کروں، چلو، آج پھر تم میری داستان سنتی رہو، نہ میں نے پہلے تم سے جھوٹ بولا تھا، نہ اب بولوں گا۔ سلسلہ وہیں سے شروع کرتے ہیں جہاں سے ٹوٹا تھا۔

میں نے تمہیں بتایا تھا ناکہ لیڈی نینی ہمیں لینے کے لیے آئی تھی اور ہم اس کے ساتھ چلے گئے تھے۔ میں اور میرے ابو۔ نینی صرف چند دن کی مہمان تھی، ہمارے آنے کے صرف ایک ہفتے بعد لیڈی نینی انجانا کے ایک سے جاں بحق ہو گئی۔ نینی کا سابقہ شوہر اور بیٹا اس کی آخری رسومات کرنے پہنچ گیا۔ رسومات کا تو صرف بہانا تھا۔ دراصل وہ نینی کی پراپرٹی کے چکر میں آئے تھے۔ ان دونوں نے مجھے اور ابو کو گھر سے بے دخل کر دیا۔ اس مرتبہ پھر ہم کھلے آسمان تلے آ گئے تھے۔

ابو مجھے لیے پھر سے اپنے بھائی کے در پر آ گئے تھے۔ ہم بھلا جاتے بھی کہاں۔ فی الحال کوئی بھی ٹھکانہ نہیں تھا۔

چاچی نے ہمیں دیکھ کر طوفان کھڑا کر دیا۔

"بھوکے ننگے، قحط کے مارے پھر آ گئے۔" وہ بری طرح چلا رہی تھیں۔ ابو کا بس نہیں چل رہا تھا کہ زمین پھٹتی اور وہ اس میں سما جاتے۔

"اس بابے کی دوائیوں کا خرچا کون اٹھائے گا؟" وہ اس پل حد سے زیادہ جاہل لگ رہی تھیں۔ اور ابو بتاتے تھے چاچی بہت تعلیم یافتہ تھیں۔ چاچا کی ان کے ساتھ لو میرج تھی۔

"اسے کسی اولڈ ہاؤس میں پھینکو اور خود کسی ہوٹل میں برتن دھو لو یا واش روم صاف کرو، ہماری بلا سے۔"

چاچی مجھ سے مخاطب تھیں۔ انہیں اس بات کا بھی احساس نہیں تھا کہ ابو، چاچا کے بڑے بھائی ہیں۔ ان کے باپ کی جگہ پر ہیں۔

اس وقت صرف ایک احساس باقی تھا، ذلت، ذلت اور صرف ذلت۔

مگر یہ نہیں پتا تھا کہ اس سے آگے بھی بہت کچھ سنا ہے۔

سارا دن وہ مجھے کولہو کے بیل کی طرح جوتے رکھتی تھیں، پھر بھی فارغ رہنے کے طعنے ملتے تھے۔ نہ جانے کتنی نفرت بھری تھی ان کے دل میں ہمارے لیے۔ یہ نفرت اس وقت کھل کر سامنے آ گئی جب چاچا نے ابو کی محبت میں اعلان کر دیا کہ وہ میرا رشتہ اپنی بیٹی کے ساتھ پکا کر چکے ہیں۔

چاچی کو گویا آگ لگ گئی تھی کیونکہ اس دفعہ چاچا نے کچھ جرأت کا مظاہرہ کر دیا تھا۔ وہ اس رشتے کو باقاعدہ رسم کے بعد کوئی نام دینا چاہتے تھے۔ منگنی یا نکاح؟ ابو اور چاچا رات بھر نہ جانے کیا کچھ ڈسکس کرتے رہے تھے۔

اسی صبح کا قصہ ہے۔ قصہ ہی کہوں گا۔ اس شرمناک داستان کو اور کیا نام دوں۔

چاچی اس دن گھر میں تھیں، اور وہ ایک پلاننگ کے تحت گھر میں نظر آ رہی تھیں۔ آٹھ بجے کے قریب گھر میں چاچی کی ایک دوست داخل ہوئی۔ عجیب بات یہ تھی، چاچی کی وہ سہیلی سیدھی میرے اور ابو کے مشترکہ کمرے میں چلی گئی۔ میں اس وقت لاؤنج میں تھا۔ ہیٹر میں کچھ فالٹ تھا، جسے ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ صرف لمحوں کا کھیل تھا، منظر بدل گیا۔ چاچی کی سہیلی چیختی چلاتی ابو کے کمرے سے برآمد ہوئی۔

آگے کیا لکھوں جب جب وہ لمحات یاد آتے ہیں، رگوں میں دوڑتا خون ابلنے لگتا ہے۔

چاچا بھی اتفاقاً گھر آ گئے تھے۔ اف میرے خدا! جو الزام چاچی اور ان کی سہیلی نے میرے بیمار باپ پر لگایا تھا وہ کس قدر شرمناک تھا، گھٹیا تھا۔

وہ مجھ پر بہتان باندھ دیتیں۔ مجھ پر تہمت لگا دیتیں، مگر انہوں نے ابو کو استعمال کیا، اور ابو تو چاچا کی بے اعتباری کے پہلے گھاؤ سے ہی ڈھے گئے تھے۔

"بھائی تنویر! آپ نے ایسا کیا! نہیں بھائی تنویر! آپ نے اچھا نہیں کیا۔" چاچا کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔

"یہ لوگ قابل ہیں اس گھر میں رہنے کے؟ ہمارے مہمانوں کے ساتھ اب ایسی غلیظ حرکتیں کی جائیں گی۔ ارے مر جانے کا مقام ہے اس بابے کے لیے۔ اور یہ بے غیرت اس کا بیٹا، ہماری بیٹی کے قابل ہے، وہ تو خود اسے ریجیکٹ کر دے گی۔ پوچھ لو، ابھی اپنی بیٹی سے۔ وہ اس ان پڑھ، جاہل کے ساتھ رشتہ استوار کرنا چاہتی بھی ہے یا نہیں۔ لعنت بھیج دے گی اسے دیکھنے کے بعد۔ بڑے آئے ہماری بیٹی سے رشتہ گانٹھنے والے۔" چاچی کی زبان ابھی تک زہر اگل رہی تھی۔

"شاہجے! چپ کر، اس عورت کو۔ ایسی بدزبان عورت۔" ابو پسینہ پسینہ ہو گئے تھے۔

"پلیز بھائی تنویر! آپ یہاں سے چلے جائیے۔ ہمارے گھر کا ماحول گندا مت کریں۔"

چاچا نے ہاتھ باندھ کر ابو کو باہر کا راستہ دکھایا۔ اب مزید کچھ اور سننے کی ہم دونوں میں سکت کہاں تھی۔

ہم دونوں لٹے لٹے سے گھر سے باہر نکل آئے۔

اس وقت میں نے دروازے سے باہر کھڑے ہو کر عہد کیا تھا کہ میں چاچی کی بیٹی کا دل جیت کے دکھاؤں گا۔ اس کا دل جیت کر اپنے پاس رکھ لوں گا۔ وہ پھر کسی سے شادی نہیں کر سکے گی، اس رات میں اور ابو بے تحاشا روتے رہے۔

"یہ شاہجا ہے میرا بھائی۔ جب یہ یو کے آیا تو خالی ہاتھ تھا۔ کچھ نہیں تھا اس کے پاس۔ میں نے تین سال تک اپنا فلیٹ اسے دیے رکھا۔ خود ایک ہوٹل میں ساتھی ورکر سے کمرہ شیئر کرتا تھا۔

یہ شاہجا ہے، جسے کاروبار کے لیے رقم کی ضرورت تھی۔ میں نے تمام عمر کی پونجی نکال کر اس کے سامنے رکھ دی، سوچا تھا ایک چلتا اسٹور خرید لوں گا۔ تمہارے لیے کچھ تو سیونگ ہو۔ مگر... دیکھو، شاہجے نے میرا اعتبار نہیں کیا۔ مجھے دو کوڑی کا کر دیا۔"

ابو رو رہے تھے اور وہ اس رات آخری مرتبہ روئے تھے۔

نہ جانے کیا سوچ کر ابو پھوپھی کے گھر چلے آئے تھے۔ پھوپھو نے حتی المقدور ہماری مدارت کی۔ ہمیں رہنے کے لیے اچھا سا کمرہ دیا۔ ابو کے لیے پھوپھو کے دل میں کافی نرمی تھی، مگر میرے لیے نہیں۔

ابو اسی رات چپکے سے اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گئے۔ پھوپھی کے لیے یہ صدمہ بہت بڑا تھا۔ میں نے پھوپھی کو بے تحاشا روتے دیکھا تھا۔

ابو کے جانے کے بعد میں کتنا تنہا ہو گیا تھا۔ اور مجھے میرے اپنوں نے مزید تنہا کر دیا۔ ایک دن پھوپھی کی ایک دوست، جو بلند آواز میں شاید مجھے سنانے کے لیے کہہ رہی تھی۔

"نہ جانے یہ تنویر بھائی کی اولاد ہے یا پھر کسی اور کا خون، ان انگریز عورتوں کا بھلا کیا بھروسہ...؟"

یہی الفاظ جو کشفہ چاچی نے بھی ایک مرتبہ میرے لیے کہے تھے اور شاید چاچا بھی اسی لیے مجھ سے متنفر ہو چکے تھے۔ میرے بارے میں شاید سب ہی مشکوک ہو گئے تھے۔ یہی حالات تھے جب میں نے پاکستان کا رخ کیا تھا۔ تب میرے دل میں صرف انتقام کا جذبہ تھا۔

میں چاہتا تو تمہیں اغوا بھی کر سکتا تھا۔ تم سے گن پوائنٹ پر نکاح کر لیتا۔ تمہاری ماں کو نیچا دکھانے کے لیے کوئی سی بھی گھٹیا ترین حرکت کر سکتا تھا۔ بغیر نکاح کے بھی تمہیں لے کر فرار ہو سکتا تھا۔ تمہیں خود تمہاری نظر سے گرا دیتا۔ تمہیں کریکٹر لیس ثابت کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ مقصد تو صرف یہ تھا کہ سب لوگ، یہ معاشرہ سب چاچی کی طرف انگلی اٹھائیں۔ ان سے نفرت کا اظہار کریں، چاچی بھی ذلت اور رسوائی کا مزہ چکھیں۔

مگر جانتی ہو فری! کس چیز نے میرے شیطانی

ارادوں کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچایا۔ تمہاری معصومیت نے۔ اس محبت نے جو تم مجھ سے کرتی ہو۔ زندگی میں مجھے صرف ایک محبت تو میسر آئی ہے۔ اسے میں خود کیسے اپنے ہاتھ سے دفن کر ڈالتا۔ اگر میں ایسا کرلیتا تو جو میرے اندر ایک اور انسان رہتا ہے، وہ مجھے چین سے کبھی کہیں جینے دیتا۔

میں نے تین عورتوں کو خود پر مہربان دیکھا ہے۔ ایک نتا دوسری تم اور تیسری طوبیٰ باجی۔

رات بھر میں سوچتا رہا تھا۔ میری طبیعت سخت خراب تھی اور طوبیٰ باجی کی گویا جان پر بنی تھی۔ پہلے پہل میں باجی کی فکرمندی پر حیران ہوتا تھا۔ اب میں نے حیران ہونا چھوڑ دیا تھا۔ وہ اپنے سارے ملازمین کے لیے بہت نرم رویہ رکھتی تھیں۔ میرے علاوہ کوئی اور ملازم بیمار ہوتا تب بھی وہ اس کا خیال رکھتیں۔ اسے آرام کرنے کا موقع دیتیں۔ ڈاکٹر کو گھر بلا کر چیک اپ کرواتیں۔ پرہیزی خوراک مہیا کرتیں۔

اگر رب نے طوبیٰ باجی کو بے تحاشا نواز رکھا تھا، لیکن اس نوازش اور رزق کی فراوانی نے ان میں غرور اور تکبر نہیں بھرا تھا۔ یہ بھائی کی وہی پرانی، سادہ مزاج اور سادہ لوح طوبیٰ باجی تھیں۔ میں انہیں جان بوجھ کر توبہ باجی کہہ کر چھیڑتا تھا۔

تم حیران ہوگی، یہ میں نے کیا ذکر چھیڑ دیا ہے۔ چلو تمہیں بھی کچھ تفصیل بتا دیتا ہوں۔

اخبار میں ایڈ پڑھنے کے بعد میں سیدھا اسی پتے پر پہنچا تھا۔ پورے تین مہینے ہو گئے تھے مجھے ولنشیا میں گھریلو ملازم کی نوکری ڈھونڈتے ہوئے۔ میرے پاس رہنے کے لیے ٹھکانہ تک نہیں تھا۔ جیب میں جو کچھ تھا وہ ان تین مہینوں میں رہائش اور کھانے پینے کی وجہ سے ختم ہو چکا تھا۔ مجھے ولنشیا کے علاوہ کہیں اور ملازمت نہیں کرنی تھی۔ یہ تو طے تھا، میں نے کس مشکل اور مصیبتوں کے بعد تم لوگوں کا موجودہ پتا حاصل کیا تھا۔ یہ صرف میں ہی جانتا ہوں، تمہاری ممی نے آناً فاناً ڈیفنس والا گھر بکوا دیا تھا۔ یہ نیا گھر اس لیے تم لوگوں کو لے کر دیا تھا کہ انہیں شاید میری طرف سے خطرہ تھا۔ تمہیں ایک جھوٹی کہانی سنا دی کہ تمہارے ماموں کو رقم کی ضرورت تھی۔ تب ہی یہ شفٹنگ عمل میں لائی گئی ہے۔

لوگ اب صرف قابل بھروسہ لوگوں کو گھریلو ملازم رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے، حالات اتنے بگڑ چکے تھے کہ کسی پر بھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ میری تو سفارش کرنے والا بھی کوئی نہ تھا۔

میں ہر روز تمہیں آتے جاتے دیکھا کرتا تھا۔ اکثر تم نتا کو ہمراہ لیے پارک آتی تھیں۔ پچھلے تین مہینوں سے سوائے تمہیں دیکھنے کے اور کوئی تیسرا کام نہیں کیا تھا۔ اور اس دیکھنے دکھانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس ببل گم چباتی، لاابالی سی لڑکی کے لیے میرے دل میں کچھ نئے جذبات ابھر آئے۔ میں اس صورت حال پر حیران رہ گیا تھا۔ بچپن سے لے کر اب تک ستم کھائے اس دل پر نہ جانے کیسے دن دہاڑے واردات ہو گئی تھی۔ اس نئے ذائقے نے مجھے دم بخود کر دیا۔

بہرحال میں اخبار لیے یزدانی ہاؤس پہنچ گیا۔ پہلے دو امیدوار جب منہ لٹکائے باہر آئے تو مجھے اندر بلوایا گیا۔ سچ تو یہ تھا کہ باجی نے مجھے ہرگز نہیں پہچانا۔ ہاں میں انہیں پہلی نظر میں پہچان چکا تھا۔

"تو طوبیٰ باجی ہیں، بھائی والی، میرے کرتے سیا کرتی تھیں۔ واہ مولا! تو بھی نوازنے پر آئے تو خزانوں کے منہ کھول دیتا ہے۔"

میں باجی کی موجودہ رہائش کو دیکھ کر دم بخود تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میری ڈیمانڈ سن کر مسز یزدانی مجھے باہر کا راستہ دکھا دیں گی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ مجھے اپائنٹ کر لیا گیا۔ میری ڈیمانڈ بھی پوری کر دی گئی۔ طوبیٰ باجی کے نرم مزاج کی وجہ سے میں بہت جلد ان سے بے تکلف ہو گیا تھا۔ اور وہ مجھے باقی ملازمین کی نسبت کچھ زیادہ اہمیت دیتی تھیں۔ شاید میرے انگریزی بولنے کی وجہ سے۔ انہیں میرا انگلش لہجے میں بولنا بھی بہت پسند تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ میں ان کے بچوں کو انگریزی بولنا سکھا دوں۔

ایک دن میں نے باجی سے کہا۔ "میڈم! اگر آپ

برا نہ کریں تو ایک بات پوچھ لوں۔" میں نے ڈرتے ڈرتے اجازت طلب کی تھی۔

"تو پوچھو نا بچے! اجازت کیوں لیتے ہو۔"

"آپ بھائی والی طوبیٰ باجی تو نہیں۔" میں نے اپنی الجھن رفع کرنا چاہی۔

"اور تم کون ہو؟" وہ ٹھٹک گئی تھیں۔ مجھے بغور دیکھنے لگی تھیں۔

"میں حمزہ ہوں، بھائی والا۔"

"ارے تو حما ہے۔ وہی رحیماں کا پوتا۔ ماشاءاللہ اتنا بڑا ہو گیا۔ میں نے پہچانا ہی نہیں۔" میری توقع کے برخلاف وہ بے انتہا خوش ہوئی تھیں۔ میرا تو خیال تھا وہ مجھے پہچاننے سے انکار کر دیں گی۔

"تو یہ نوکری کر رہا ہے؟ اپنے ابو کے ساتھ باہر نہیں چلا گیا تھا تو؟" وہ حیران تھیں اور اپنی حیرت دور کرنا چاہتی تھیں۔ میری رام کہانی سننے کے بعد انہوں نے اپنے بارے میں بتایا۔

"تو جانتا ہے نا، میری ماں درزن تھی۔ بیوہ عورت تھی۔ ہمارے تمہارے حالات ایک جیسے تھے۔ حالانکہ تمہارے چچا اور ابو دونوں یورپ میں تھے۔ اس کے باوجود بھی۔ یزدانی ہاؤس والوں کے کپڑے میری ماں ہی سیا کرتی تھی۔ اماں کے بعد یہ کام میں نے سنبھال لیا۔ بڑی بیگم (حامد کی والدہ) بڑی نیک خاتون تھیں۔ میں ان کے کپڑے سی کر کوٹھی پہنچا آیا کرتی تھی۔ حامد صاحب نے مجھے دیکھا اور پسند کر لیا۔ شاید اس لیے کہ اللہ نے غربت کے باوجود حسن سے نواز رکھا تھا مجھے۔

شادی کے بعد مجھے پتا چلا تھا کہ بڑی بیگم کے متوجہ کرنے پر حامد صاحب میری طرف ملتفت ہوئے تھے۔ حامد صاحب بہت ہی کم رو انسان ہیں۔ اپنے حلقۂ احباب میں اسی وجہ سے ریجیکٹ ہوتے رہے تھے۔ کالی رنگت، پستہ قد۔ بے حد معمولی سے نین نقش، اور اب تو دولت بھی نہیں رہی تھی۔ صرف بھرم ہی باقی تھا۔ ان کا کاروبار ڈوب چکا تھا۔ شادی کے بعد میں نے بہت کڑا وقت دیکھا ہے۔ کوٹھی بک گئی تھی۔ گھر کا قیمتی سامان تک بک گیا۔ حامد کی امی اسی صدمے سے انتقال کر گئیں۔ پھر حامد باہر چلے گئے۔ ہمارے حالات پہلے جیسے ہو گئے۔ اللہ سوہنا بڑا مہربان ہے۔ سارے رنگ دکھاتا ہے۔ وہ بہت ہی بزرگی والا ہے۔ اسی کی شان ہے کہ وہ ہم جیسوں پر اپنا رحم کیے ہوئے ہے۔

تم غم نہ کھانا حامے! محنت میں عظمت ہے۔ شان ہے، تم یقین جانو، حامد نے یورپ میں اس سے بھی نیچ کام کیے ہیں۔ برتن دھوئے ہیں، جھاڑو لگائی ہے۔ آج ان کا اپنا اتنا بڑا ہوٹل ہے۔ کئی ملازم کام کر رہے ہیں۔ رب کی رحمت سے اور اس کے فضل سے بگڑے کام سیدھے ہو جاتے ہیں۔ بس ثابت قدم رہنا اور محنت اور لگن سے خدا کو منوا لینا۔

"آپ کیوں نہیں گئیں حامد صاحب کے پاس؟"

"تو مجھے کیا ضرورت ہے انگریزوں کے ملک میں بچے بگاڑنے کے لیے جانے کی۔ حامد نے بہت کہا ہے، مگر میں نہیں مانی۔ میرے بچے میرا اثاثہ ہیں۔ میں اس آزاد ملک کا شہری بنا کر خود سے اور زندگی سے دور نہیں کرنا چاہتی۔"

وہ صاف گو تھیں۔ اور جب میں انہیں میڈم کہتا تھا تو انہیں بہت غصہ آتا۔ "تو مجھے طوبیٰ باجی بولا کر حامے! مجھے میڈم شیڈم نہیں اچھا لگتا۔"

میں نے باجی کو اپنا رازدار بنا لیا تھا اور انہوں نے پوری بات سن کر مجھے نرمی سے سمجھایا۔

"دیکھ حامے! میں خود بیٹیوں والی ہوں، اس بچی کے ساتھ کچھ غلط کرنے کی کوشش مت کرنا۔"

باجی نے میرے اندر سے غصہ اور نفرت حتیٰ کہ انتقام کے جذبات کو اکھاڑ پھینکا تھا۔ انہوں نے کہا تو صرف اتنا "تم فریا کو پسند کرنے لگے ہو، اس کے لیے اپنے جذبوں کو خالص سمجھتے ہو تو کبھی بھی کسی بھی قسم کا انتہائی قدم مت اٹھانا جو تمہارے لیے عمر بھر کا پچھتاوا بن جائے۔"

"آپ کیا سمجھتی ہیں، یہ لوگ کبھی اسے میرا نہیں ہونے دیں گے؟ میرا دل کرتا ہے، ہم سول میرج

کرلیں۔ یا پھر خفیہ نکاح۔ اسٹیٹس کے مارے یہ لوگ فریا کے لیے کم از کم مجھے پسند نہیں کرسکتے۔" میں سخت مشتعل تھا۔

"تو ان لوگوں کو کچھ بن کر دکھا دو نا۔" باجی نے حلاوت سے مجھے سمجھایا۔ "دو سال ضائع کردیے تو نے حامے! ایک انتقام کے جذبے کے لیے' دو سالوں میں انسان کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔" انہوں نے کہا۔

"تم لوٹ جاؤ حامے! اگر کچھ حاصل کرنا ہے' فریا کو پانا ہے تو خود کو لاکھوں لوگوں کی بھیڑ میں منوالو۔ اپنی پہچان بناؤ' اپنا الگ سے مقام بناؤ اور یاد رکھو' اگر فریا تمہارے مقدر میں لکھ دی گئی ہے تو تمہیں ضرور ملے گی۔"

ان کی باتیں میرے دل میں اتر گئیں اور میں پلٹ گیا۔

چاچی' جن سے مجھے بے انتہا نفرت محسوس ہوتی تھی۔ انہوں نے کبھی اپنی سگی ماں کو عزت احترام نہیں دیا تھا تو وہ اپنے شوہر کے بڑے بھائی کو کیسے مقام دیتیں اور پھر شاید چاچا اور پھوپھی بھی تھے۔ خود غرض اور احسان فراموش' جو لوگ اپنی ماں کے ساتھ مخلص نہ ہوں' ان سے بھلا کون احمق شکوے کرے۔ کیا کیا تھا ابو نے' چاچا نے اور پھوپھی نے دادی کے ساتھ۔ اپنی اپنی "خواہشات کو عزیز رکھا۔ بوڑھی ماں کو ٹھوکریں کھانے کے لیے چھوڑ دیا۔ پلٹ کر ان کی خبر نہ لی۔

اور کاشفہ چاچی جو چاہتی تھیں کہ ان کی بیٹی کے لیے کوئی خاص الخاص لڑکا ہو' ان کی خواہش غلط نہیں تھی۔ طریقہ غلط تھا۔ مجھے اور ابو کو چاچا کی نظر سے گرانے کے لیے اتنا کچھ انہوں نے اسی لیے تو کیا تھا کہ چاچا مجھ سے متنفر ہو جائیں۔

اور آخری بات بتاؤں تمہیں' کچھ عرصہ پہلے یہ ہی کوئی سال ڈیڑھ سال پہلے چاچا میرے پاس آئے تھے۔ ابو نے جو رقم انہیں دی تھی مجھے واپس لوٹانے' میں نے دیکھا۔ وہ شرمندہ تھے' پشیمان تھے' انہوں نے صرف اتنا کہا۔

"جو ہونا تھا' وہ ہو چکا۔ وقت پلٹ تو نہیں سکتا۔ تم اس رقم سے کام شروع کرو' میں تمہیں سپورٹ کروں گا' شاید کچھ قرض اسی طریقے سے اتر جائیں جو میری جان پر دھرے ہیں' تم مجھے صرف اتنا بتاؤ' میری بیٹی تک کیسے پہنچ گئے حامے! اور وہ تم سے......"

وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئے تھے۔ پھر جب بولے تو ان کی آواز بہت دھیمی تھی۔

"فریا تم سے محبت کرتی ہے حامے! دیار غیر میں مشقت کی چکی پیستے ہوئے تھک گئے تو ستانے کے لیے کسی شجر کی چھایا ادھار مت لینا۔ میری بیٹی تمہارا انتظار کررہی ہے' وقتی سکون اور خوشی کی خاطر حقیقی مسرتوں کو مت کھونا۔"

وہ چلے گئے تھے۔ میں نے ان کی لرزیدہ آواز میں چھپی خواہش کو دل سے محسوس کیا تھا۔

"تو بیٹی کی محبت نے آپ کو توڑ ڈالا ہے چاچا!" میں حیران سا سوچتا رہ گیا۔ اب بھی سوچ رہا ہوں' کب سے کھڑا سوچ رہا ہوں۔ تقریباً" دو گھنٹے ہو گئے ہیں۔ اے فری! ذرا سر اٹھا کر اوپر تو دیکھو' تھوڑا گردن کو بھی موڑو' ارے۔ تم بھی پہلے مڑ کر دیکھو' آنسو پونچھو' ارے رو کیوں رہی ہو' نا۔۔۔ نا' رونا نہیں' شاباش پیچھے مڑ کر دیکھو۔"

فریا دنگ رہ گئی تھی۔ خط اس کے ہاتھوں میں لرز رہا تھا۔ اس نے سر اٹھایا' آنسو پونچھے' ذرا سا رخ موڑ کر دیکھا' وہ عین اس کے پیچھے ہی تو کھڑا تھا۔

"حامے! تم۔" فریا چلا اٹھی۔

☼ ☼ ☼

"کیا لینے آئے ہو یہاں' کمینے۔۔۔ ذلیل' خود غرض' بہروپیے!" اس کے منہ میں جو آرہا تھا بولے جارہی تھی۔ حمزہ کی شرٹ کے سارے بٹن ٹوٹ گئے تھے۔ اس نے ناخنوں سے اس کے ہاتھوں اور منہ تک کو نوچا' کھسوٹا تھا' وہ مسلسل چیخ رہا تھا۔

"ننا! ننا۔۔۔ بنگالی جی! ارے کوئی ہے' جو مجھے بچائے۔"

"شاباش' میرے ویر! اب اچھی طرح سے پٹتے رہو' کچھ تو سزا تمہیں بھی ملنی چاہیے۔" طوبیٰ باجی ٹیرس پر کھڑی مسکرا رہی تھیں۔

"آپ بھی جی بھر کے مسکرالیں' آگئی نا' ہو' تو سارے مزے ہوا ہو جائیں گے۔" طوبیٰ باجی نے ارسلان کی شادی طے کردی تھی۔ وہ ان ہی کے اصرار پر پاکستان آیا تھا فریا کو منانے۔

"آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ یہ کمینہ پاکستان آچکا ہے۔" وہ سخت کبیدہ خاطر ہو رہی تھی۔

باجی نے ڈرنے کی بھرپور ایکٹنگ کی۔

"اس کمینے نے منع کیا تھا۔"

"اپنی شکل گم کرو حامے! ورنہ میرے ہاتھوں انجام پذیر ہو جاؤ گے۔" وہ وارننگ دے رہی تھی۔

"اس کا بھرتہ بنادو فری!" باجی مسلسل حمزہ کو چڑا رہی تھیں۔

"اتنے سے بالشت بھر کے ارسلان کی شادی کررہی ہیں۔ ہاتھ سے نکل جائے گا۔ پچھتاتی رہنا پھر اب بھی ارادہ بدل لیں۔" وہ دونوں محاذوں پر جنگ کررہا تھا۔ دونوں کی کو باری کا جواب دے رہا تھا۔

ارسلان تو بڑا تیز نکلا۔ آپ کو لڑکی ڈھونڈنے کا تردد نہیں کرنا پڑا۔"

"منحوس جب ارسلان کے جتنے' بالشت بھر کے تھے' پتا ہے کیا کیا کرتے رہے ہو۔ بھول گئے ہو تو یاد دلاؤں' فریا کے ساتھ ایفیئر کس نے چلایا؟" وہ ہنس رہی تھیں۔ حمزہ نے مصنوعی شرمندگی خود پر طاری کرلی۔

"معافی تو لے دیں' میں تو منتیں کر کر کے تھک گیا ہوں۔ کیسی بہن ہیں' تماشا دیکھے جارہی ہیں۔" حمزہ نے دہائی دی۔

"جھوٹے' دغا باز! کب منتیں کی ہیں۔" فریا اس سفید جھوٹ پر تلملا کر رہ گئی۔

"تو کیا پیر پکڑلوں' وہ بھی باجی کے سامنے' یہ پھر طعنے دیتی رہیں گی عمر بھر۔" حمزہ نے رونی صورت بنالی۔

"کر دو نا معاف اسے۔۔" باجی نے سفارش کی۔

"نہ کروں تو؟" فریا اس اعصابی دباؤ اور اچانک ملنے والے جھٹکوں سے سنبھل گئی تھی۔

"باجی! آپ ہٹ جائیں ٹیرس سے۔" حمزہ نے بھرپور جذباتیت کا مظاہرہ کیا۔

"کیوں؟" فریا اور باجی دونوں حیران ہوئیں۔

"میں بس خودکشی کرنے والا ہوں۔"

"اللہ نہ کرے۔" ان دونوں نے دہل کر کہا۔ اسی پل ننا باہر آگئی تھیں' ان کے پیچھے بنگالی جی بھی تھے۔

"ننا! دیکھیں تو' طوبیٰ باجی کا خانساماں آگیا ہے۔" فریا نے اس تھکا دینے والے بوجھ کو شانوں سے اترتا محسوس کیا تھا۔

"لڑکی! ہوش کے ناخن لے' ذرا احترام کرنا سیکھ۔" ننا حمزہ سے گرم جوشی سے مل رہی تھیں۔

"کیوں کروں' میں اس کا ادب احترام۔۔۔ یہ اس قابل ہے' بغیر بتائے فرار ہو گیا تھا۔ اپنا اتا پتا بھی نہیں چھوڑا۔"

اب وہ مسکرا رہی تھی۔ ہاتھ میں پکڑے کاغذوں کو لفافے میں ڈال رہی تھی۔ حمزہ نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے وہ لفافہ پکڑ لیا۔ پھر اس کے کئی ٹکڑے

کر کے ہوا میں اچھال دیے۔
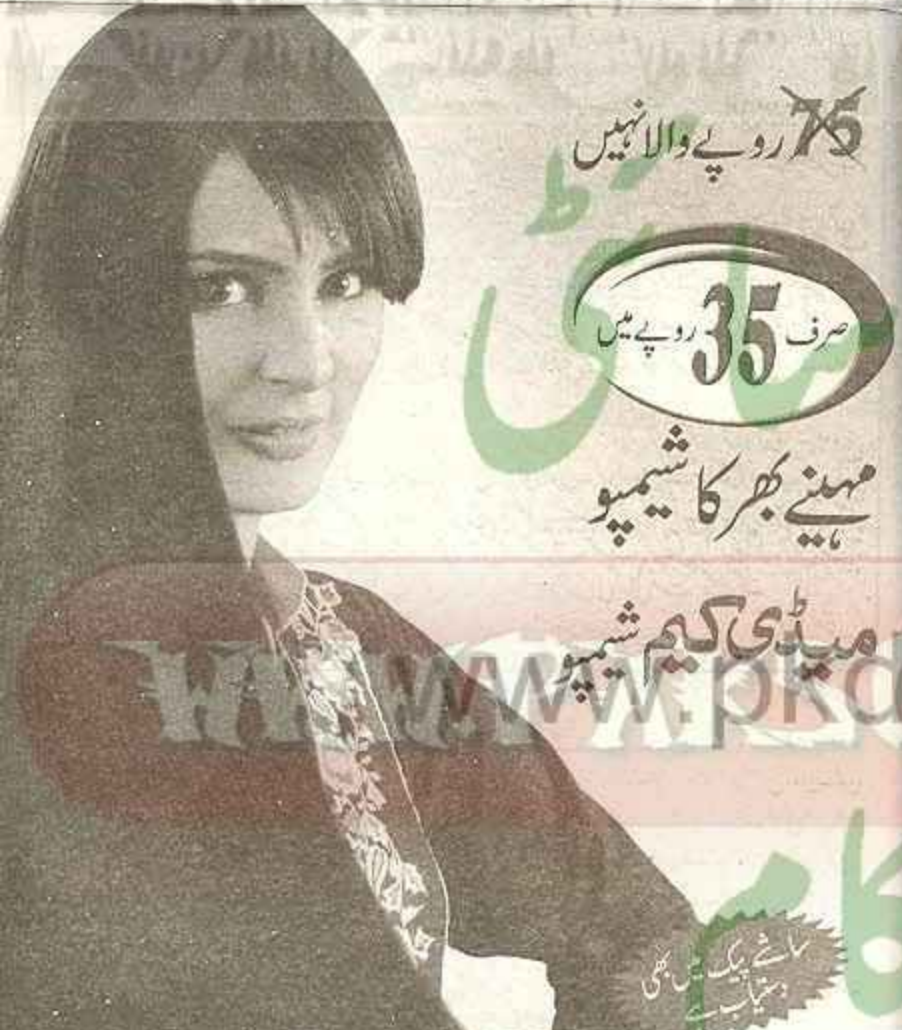
”آج سے اس بوسیدہ زندگی کا اختتام ہوا۔ اب نئی کتاب زندگی کے ہر صفحے پر اپنی پسند کی عبارت لکھوں گا۔“

”کیا لکھو گے؟“ فریا نے ایک بے تکا سوال کیا۔

”صرف محبت۔“ وہ بھرپور انداز میں مسکرا رہا تھا۔ ”تمہارے لیے۔“

”میں تمہارے ٹوٹے کروں گی۔“ وہ مسکراہٹ چھپا کر دھاڑی۔ ”میرے ساتھ پھر سے افیر چلاؤ گے؟“

”فری! بک بک نہ کر۔ یہ تیرا ہونے والا مجازی خدا ہے۔“ ثنا کے چہرے پر خوشی کھلی پڑ رہی تھی۔

”مجھے اس خبیث سے شادی نہیں کرنی، نہیں، نہیں، نہیں۔“ وہ چلائی۔

”یہ ریزن اپنے ماں باپ کو دینا۔ شام کی فلائٹ سے آ رہے ہیں دونوں۔ تمہارے ممی ڈیڈی نے حمزہ سے تمہاری بات طے کر دی ہے۔ آج سے تم مایوں بیٹھ رہی ہو۔ چلو اندر، منہ کھولے پھر رہی ہو۔ روپ کیا خاک آئے گا۔“ ثنا مسکراتے ہوئے اندر بڑھ گئی تھیں۔

”ممی مان گئیں؟ مگر کیسے؟“ فریا سارا غصہ بھلائے حیرت سے حمزہ سے پوچھنے لگی۔

”وہ نہیں تمہیں ساری عمر کنواری بٹھانے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ میرے ہجر میں سوکھ کر کانٹا بن رہی تھیں تم۔ کھانا پینا چھوڑ رکھا تھا تم نے اس لیے ساسو ماں کو ماننا ہی پڑا۔“ وہ آنکھوں میں ڈھیروں چمک لیے کہہ رہا تھا۔

”اس خوشی میں ہم دیسی ککڑی کی بریانی بناتے ہیں۔“ بنگالی جی چہک کر پلٹ رہے تھے۔

”بنگالی جی! گڑ والے میٹھے چاول اور ابیل پائی بھی بنایئے گا۔“ فریا نے چونک کر ہانک لگائی تھی۔ اسے اچانک زوروں کی بھوک لگنے لگی تھی۔ اور اسے بے تحاشا ہنسی آ رہی تھی۔

”فری! تُو نے مجھے معاف کر دیا؟“ وہ اس کے سامنے کان پکڑے کھڑا تھا۔ ”تجھے ناحق ستایا ہے، معاف کر دے نا۔“

”کر دیا معاف، کیا یاد کرو گے۔“ فریا نے شانِ بے نیازی سے کہا۔ ”ویسے محمد حمزہ! اپنی داستان امیر حمزہ تو سنا چکے ہو، ہماری نہیں سنو گے۔“

”پوری زندگی آپ کی ہی سنوں گا۔ اب صرف مجھے سنانے دیجیے۔“ بڑی عاجزی سے درخواست پیش کی گئی تھی۔

”سنایئے، فرمایئے، ارشاد کیجیے۔“ فریا نے شاہانہ انداز میں کہا۔

”آپ کو یہ معمولی سا مزدور کیسا لگتا ہے؟ اپنی ہمراہی کا شرف اسے بخش دیں گی؟ اگرچہ یورپ میں بھی میں مزدوری کرتا ہوں۔ میں اب بھی مزدور ہی ہوں، گورنر نہیں۔ اتنا سا بالشت بھر کا فلیٹ ہے میرا، دو آدمی چلیں تو ایک دوسرے سے ٹکراتے رہیں، ویسے تو یہ میرے اور تمہارے لیے نیک شگون ہے، یعنی ٹکرانا اور بار بار ٹکرانا۔ چھوٹا سا اسٹور ہے۔ اس میں گاہک بھی بہت کم آتے ہیں۔ یعنی آمدن نے زیرو سے اسٹارٹ لیا ہے۔ شاہ جہاں جتنا امیر نہیں ہوں۔ ان کے گھر جتنا بڑا گھر نہیں ہے میرا، مگر تابعداری میں ان سے بھی چار ہاتھ آگے رہوں گا۔ فرماں بردار شوہر کا ہر سال کا ایوارڈ مجھے ہی ملے گا۔ اب تم پھر بول دو نا!“ وہ دونوں ہاتھ پھیلائے کہہ رہا تھا۔

”کیا...؟“ فریا نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھوں میں اپنے دونوں ہاتھ دے دیے تھے۔

”ہاں، قبول ہے۔“

وہ اس کے کان کے قریب گنگنایا تھا۔ فریا کو لگا پانچ سال سے روٹھی بہار نے چپکے سے اس کے دریچے میں جھانک کر پہلی شرارت کی تھی۔

ناولٹ
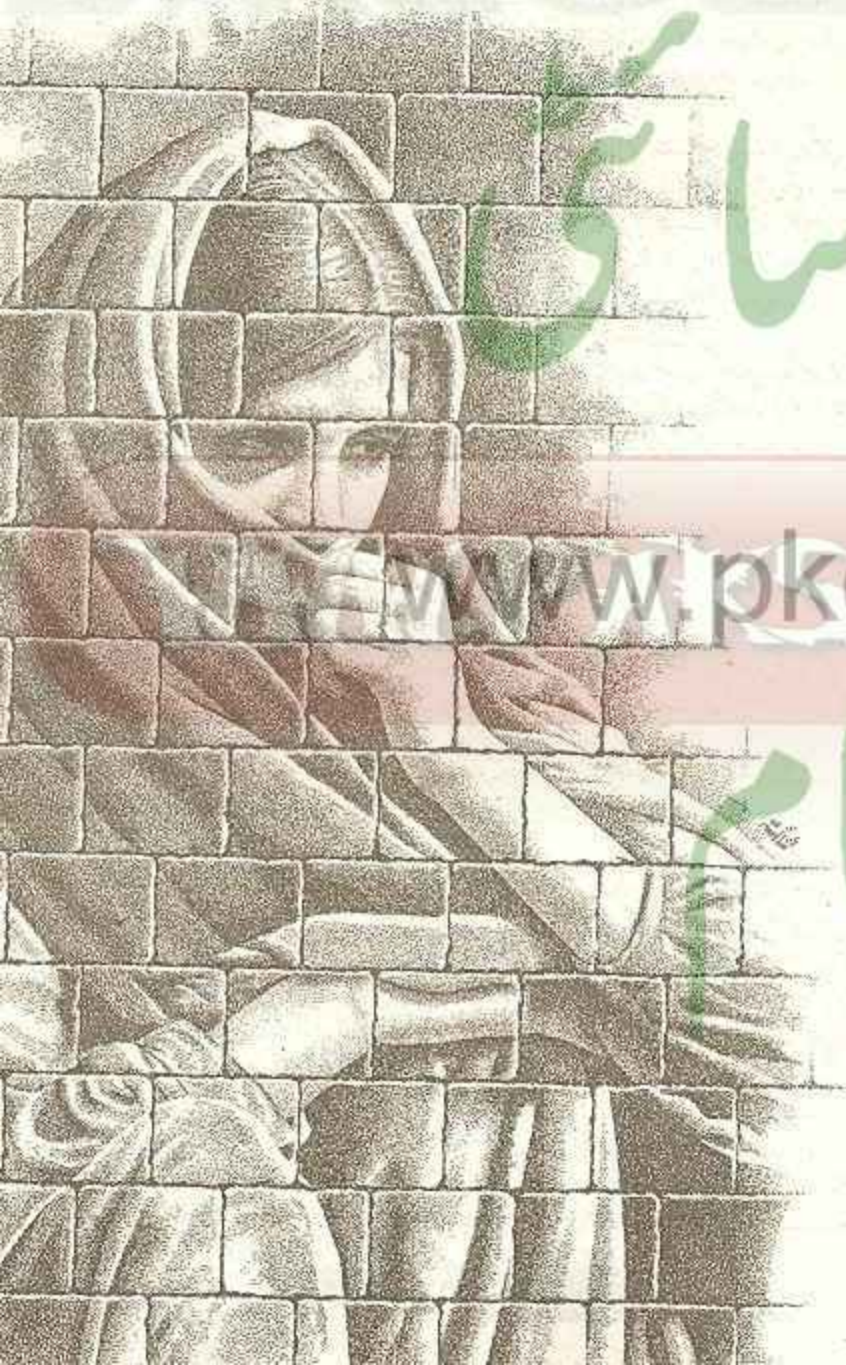
جام جم سے میرا جام سفال اچھا ہے

انسان مخصی ارتقا کے ابتدائی ادوار میں "گیلی مٹی" کی مانند ہوتے ہیں۔ جنہیں معاشرے کا "کمہار" تربیت کے "چاک" پر دھرتا ہے اور بازار حیات کی "مانگ" کو مد نظر رکھ کر اپنی نیت اور چاہت کے ہاتھوں سے ایک خاص سانچے میں ڈھالتا ہے۔ اس قالب سازی کے دوران اس کی "انگلیاں" ہر "برتن" کے بدن پر رنگوں، رواجوں، مذہب، سیاست، جذبوں، خوابوں اور سرابوں کی ان گنت پیچیدہ تحریریں رقم کرتی ہیں۔

گیلی مٹی کے یہ "سانچے" حالات کے "آوے" میں ڈھلتے ہیں۔ ان مراحل سے گزرتے ہوئے ہر برتن کا "ظرف" اور "نصیب" اس کی ہیئت کا تعین کرتا ہے۔ کچھ "سفال گر" کی بے توجہی کا شکار ہو جاتے ہیں، کچھ اس کے اناڑی پن کی نذر ہوتے ہیں۔ کچھ "آوے" کی "دہک" برداشت نہیں کر پاتے اور تڑخ جاتے ہیں، کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بازار تک تو پہنچتے ہیں مگر انہیں کوئی "خریدار" میسر نہیں آتا۔ ان کا نصیب اور بازار کا اسلوب، ہر "ظرف" کا مقام طے کرتا ہے۔ گل دان اور پیک دان میں ساخت کا فرق بھلے نہ ہو مگر نصیب کا فرق ضرور ہوتا ہے۔

یہ ہی میرے ناول کی تفہیم ہے۔

کچھ چند واقعات کو اپنے انداز میں آپ کے سامنے پیش کر رہی ہوں۔ کرداروں کے ساتھ انصاف کرنے کی زحمت میں نے نہیں اٹھائی کیونکہ میرا فہم و ادراک ناقص اور نامکمل ہے۔ میں یہ کام آپ پر چھوڑ رہی ہوں، میں آپ کو خود سے بہتر منصف پاتی ہوں۔ میں اپنی رائے بھی نہیں دے رہی۔ صرف آپ کی رائے مانگ رہی ہوں۔

آپ اس ناول کو جس بھی تناظر میں دیکھیں مگر اسے مٹی کے بے جان برتنوں کی کہانی مت سمجھیے گا۔

یہ جیتے جاگتے وجود رکھنے والے اور وجد کرنے والے انسانوں کی داستان ہے۔

بشریٰ سعید

بشریٰ سعید

سفال گر

صوفیہ بچپن سے نامساعد حالات سے گزر رہی ہے۔ اسے نہیں معلوم کہ اس کا باپ کون ہے جبکہ اس کی ماں البا گرانٹ کے عشق میں پاگل تھی۔ ماں کے انتقال کے بعد گرانٹ نے اس کی پرورش کی ہے۔ صوفیہ کو نہ اپنے والدین سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ ہی مذہب سے۔ وہ پابندیوں سے آزاد زندگی گزارنا چاہتی ہے۔ کلاس میں جیسکا اور کیلی کو مستقبل کے حوالے سے وہ بتاتی ہے کہ وہ غلط راستے پر چلنا چاہتی ہے۔ میل، صوفیہ کے پڑوس میں رہتا ہے۔ وہ صوفیہ کا خیال رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ گرانٹ، صوفیہ کو پوسٹ آفس خط ڈالنے کو دیتا ہے۔ جسے وہ ہر مرتبہ کی طرح لاپروائی سے ہوا برد کر دیتی ہے۔ کارل میکارتھی کالج کا سب سے ہینڈسم اور فلرٹ لڑکا ہے۔ لیکن صوفیہ اس پر توجہ نہیں دیتی۔ وہ کارل کے لیے ٹیڑھی کھیر ثابت ہو رہی ہے۔

عمر کی پرورش حکیم بیگم کے ہاتھوں ہوئی ہے جن کا خمیر محبت اور جفاکشی سے اٹھا ہے۔ انہوں نے عمر کی گھٹی میں "اللہ" سے محبت بھر دی ہے۔ حکیم بیگم کو اللہ سے عشق ہے۔ عمر کی خواہش ہے کہ بے جی (حکیم بیگم) کو اس کی ذات سے دکھ نہ پہنچے لیکن ہر مرتبہ کچھ نہ کچھ غلط ہو ہی جاتا ہے۔ عمر کو حکیم بیگم نے ایک عیسائی عورت سے گود لیا تھا۔ عمر کو اپنی ماں کے بارے میں جاننے کا تجسس ہے۔ ماسٹر صاحب کا قلم اٹھانے پر حکیم بیگم عمر پر سورۃ الناس اور سورۃ الفلق پڑھ کر پھونکتی ہیں تاکہ وہ آئندہ کوئی غلط حرکت نہ کرے۔ ان کی ایک بیٹی آمنہ امریکہ میں رہتی ہے۔ شادی کے بارہ برس گزرنے کے باوجود وہ بے اولاد ہے۔ حکیم بیگم ہر وقت اس کے لیے اولاد کی دعا مانگتی ہیں۔ عمر کو بے جی کی لگن حیران رکھتی ہے۔

پرنیاں آرٹ کو پارک میں ایک اجنبی gloxinia کا پھول دے کر پرپوز کرتا ہے تو وہ ششدر رہ جاتی ہے۔ بعد میں وہ صرف اسی شناسا اجنبی سے ملنے پارک جاتی ہے۔ اس ملاقات میں پرنیاں پر کھلتا ہے اجنبی (گرانٹ) کو اداکاری کا جنون ہے۔ وہ اپنے آپ کو مستقبل کا عظیم اداکار سمجھتا ہے۔ وہ اپنے کردار کی ریہرسل کے لیے پارک میں موجود لڑکیوں کو پرپوز کرنے کی اداکاری کرتا ہے۔ یہ جان کر پرنیاں کو دھچکا لگتا ہے۔

گرانٹ اس سے ملاقات کا وعدہ کر کے اپنی دوست البا مار سیلو کے ساتھ چلا جاتا ہے۔

ابراہیم چالیس کی دہائی میں اپنے تایا کے پاس امریکہ چلا آتا ہے۔ جو یہاں فرنیچر کا کاروبار کرتے تھے۔ تایا کی بیٹی ماریہ سے شادی کر کے اس کی لاٹری نکل آتی ہے۔ وہ ان کی جائیداد کا وارث بھی بن جاتا ہے۔ ماریہ کی رفاقت میں اسے اپنی خوش بختی کا احساس دلاتا ہے۔ بدقسمتی اس وقت ابراہیم کے دروازے پر دستک دیتی ہے جب ماریہ اسے ایک بچے کا تحفہ دے کر اپنے رب سے جا ملتی ہے۔ اسپتال جلدی پہنچنے کے لیے وہ اسٹون کی بیش قیمت کار ادھار لیتا ہے۔ جو اس کی بداحتیاطی سے تباہ ہو جاتی ہے۔ ساتھ ہی دو ملین کی رقم بھی آگ کی نذر ہو جاتی ہے۔ اس کی قیمت اسے اپنی تمام جائیداد اور تین انگلیاں اسٹون کے ہاتھوں کٹوا کر چکانی پڑتی ہے۔ وہ اکلوتے بیٹے احمد سمیت سڑک پر آ جاتا ہے۔

احمد کی وجہ سے اسے کئی جگہ نوکری سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔ ہر مرتبہ اس کا دل احمد کو ختم کرنے کو چاہتا ہے۔ آخر کار وہ کتابوں کی اپنی دکان کھول کر زندگی کی گاڑی گھسیٹنے لگتا ہے۔ اس کا رجحان مذہب کی جانب بڑھ جاتا ہے۔ جبکہ احمد کا دل تمام تر کوششوں کے باوجود اللہ کی جانب مائل ہونے سے انکاری ہے۔

احمد جتنا اللہ سے بھاگتا ہے۔ ابراہیم زبردستی اسے دین کی جانب لانے کی کوشش کرتا ہے۔ ہالی وڈ اسٹار بننے کا خواب احمد کو بے چین رکھتا ہے۔ باپ کی سختی اور مار پیٹ اسے اور شدت سے شوق کی تکمیل کے لیے اکساتی ہیں۔ اسکول میں وہ لڑکیوں کی "پسندیدہ" ہستی ہے۔ ایک میٹنی شو کے عوض وہ کسی بھی لڑکی کو اپنا قیمتی وقت دے سکتا ہے۔ وہ اداکاروں کا زبردست نقال ہے۔ کیری گرانٹ اس کا پسندیدہ اداکار ہے۔ اپنے خواب کی تکمیل کے لیے گھر سے بھاگنے کا فیصلہ کرتا ہے لیکن اس وقت جب وہ دہلیز سے باہر قدم رکھ رہا تھا۔ ابراہیم کو فالج ہو جاتا ہے اور اس کا جسم ناکارہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ دن رات کی خدمت سے تنگ آ کر وہ ابراہیم کو مار ڈالتا ہے۔ احمد کو یقین ہے کہ اب قسمت اس پر اپنی مہربانی ضرور کرے گی۔ اس کے خواب اس وقت چکنا چور ہو جاتے ہیں جب دو پولیس اہلکار گرفتار کر کے اسے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔

دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر پرنیاں گرانٹ کو فون کرتی ہے تو وہ اس کا خیر مقدم کرتا ہے۔ دونوں کے درمیان دوستی پروان چڑھنے لگتی ہے۔ گرانٹ کی ساری گفتگو اداکاری کے گرد گھومتی ہے جو کہ اس کا پہلا عشق بھی ہے۔ پرنیاں گرانٹ کو متاثر کرنے کے لیے کیری گرانٹ کے متعلق معلومات اکٹھی کرتی ہے۔ واؤدا سے ان مشکوک سرگرمیوں پر ٹوکتا ہے۔ کچھ ہی

دنوں میں گرانٹ کے سامنے تمام اصلیت آ جاتی ہے۔ وہ پرنیاں کے جذبے کی پذیرائی کرتا ہے۔ ہوٹل میں دعوت پر گرانٹ اپنی دوست البا کو لاتا ہے تو البا، ہسپانوی زبان میں اسے "کتیا" کہتی ہے۔ پرنیاں کو البا کی حرکتیں ایک آنکھ نہیں بھاتی۔

صوفیہ، پروم نائٹ پر کارل میکارتھی کی ساتھی بننے کی پیش کش قبول کر لیتی ہے۔ شو کے لیے ڈریس تک وہ کارل کے پیسوں سے خریدتی ہے۔ کارل اس پر تلملانے کے علاوہ کچھ نہیں کر پاتا۔ کارل، صوفیہ کے ساتھ چند لمحات قربت میں بتانا چاہتا ہے، جس کے لیے وہ صوفیہ کو اضافی رقم دیتا ہے۔ صوفیہ اس پیش کش کا جواب بھی مثبت دیتی ہے۔ کارل اپنے دوست کے ساتھ مل کر صوفیہ کی نازیبا ویڈیو بنانا چاہتا ہے تاکہ صوفیہ کو بلیک میل کر سکے۔

عمر کو اس کی ماں حکیم بیگم سے واپس مانگنے اٹھارہ سال بعد آ جاتی ہے۔ لامحالہ حکیم بیگم کو عمر کو لوٹانا ہی پڑتا ہے۔ عمر کی ماں (آپا) عیسائی ہے اور ایک مقامی اسکول میں ٹیچر ہے۔ وہ شد و مد سے عمر کو عیسائی بنانے کی کوششیں کرتی ہے لیکن عمر دین اسلام سے اپنا قلبی تعلق ختم نہیں کرتا۔ وہ مرحوم حکیم بیگم کو یاد کرتا رہتا ہے۔ آپا عمر کو اس کے حال پر چھوڑ دیتی ہے۔ آپا کے لیے شوکت صاحب کا التفات عمر کو ناگوار گزرتا ہے۔ جو ان کے اسکول کا پرنسپل بھی ہے۔ آپا اسے غیر ضروری ڈھیل دیتی ہیں جو عمر کو گراں گزرتی ہے۔ لیکن وہ ماں سے اس کا اظہار نہیں کرتا۔

آپا نازیبا فلمیں خریدنے عمر کے ساتھ مارکیٹ جاتی ہے تو عمر شرم سے گڑ کر رہ جاتا ہے۔ اس کی رائے ماں کے کردار کے متعلق اور بھی خراب ہو جاتی ہے۔

پروم نائٹ پر رقص کے دوران اچانک گرانٹ پہنچ کر کارل کا منصوبہ خاک میں ملا دیتا ہے۔ گرانٹ، صوفیہ کو مارتے پیٹتے ہوئے گھر لے جاتا ہے۔ اس بے عزتی پر وہ کسی سے نظریں ملا نہیں پاتی۔

ٹونی گریک عرف میل کو لاش کی بے حرمتی پر گرفتار کر لیا جاتا ہے تو وہ خوف کے مارے سچ اگلنے کو تیار ہو جاتا ہے جسے سن [illegible]

[illegible] ابراہیم کے قتل پر پولیس نے پکڑا ہے جبکہ اسے سوتائی شکایت پر پکڑا گیا ہے۔ پکڑے جانے پر احمد بھاگنے کی کوشش میں [illegible] کو قتل کر دیتا ہے۔ عدالت اس قتل پر اسے سات سال قید سناتی ہے۔ اس دوران اسے خدا انوث کر یاد آتا ہے۔ ساتھ ہی ابراہیم کے ساتھ کیے سلوک پر پچھتاوا ہونے لگتا ہے۔

پرنیاں گرانٹ کے عشق میں ڈوب چکی ہے۔ اسی اثنا میں اس پر انکشاف ہوتا ہے کہ گرانٹ نیوڈ ماڈلنگ کرتا ہے۔ یہ بات اسے پاگل کر دیتی ہے۔ تب بھی وہ گرانٹ سے بے اعتنائی نہیں برتتی۔ گرانٹ اس سے محبت کا اظہار کرتے ہوئے پرپوز کر دیتا ہے۔ ساتھ یہ انکشاف بھی کرتا ہے کہ احمد گرانٹ اس کا اسکرین نیم ہے اس کا اصل نام احمد ابراہیم ہے۔ وہ مسلمان ہے۔ یہ چیز پرنیاں کو ساکت کر دیتی ہے۔ وہ احمد کو بتا دیتی ہے کہ وہ اپنا مذہب تبدیل نہیں کرے گی اس لیے احمد اس سے شادی کا ارادہ دل سے نکال دے۔

ہالی وڈ میں حالات احمد کو بری طرح چپیا کرتے ہیں۔ اسے تھرڈ کلاس جگہ پر رہائش اختیار کرنا پڑتی ہے۔ تمام بڑی ایجنٹ کمپنیاں اسے بری طرح ریجیکٹ کرتے ہوئے mocking bird (نقال پرندہ) قرار دیتی ہیں۔ وہ اپنے مالک مکان سے کسی جاب کی بات کرتا ہے سب ادارے احمد کو ایکسٹرا کا کردار قبول کرنے کا مشورہ دیتے ہیں جو اسے قبول نہیں ہے۔ ایک ادارے کا اشتہار پڑھ کر احمد آڈیشن دینے جاتا ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

۴

چوتھی قسط

وہ کالا تھیٹر کے Foyer میں داخل ہوا تو اس کے قدم زمین سے چپک کر رہ گئے۔ وہاں اتنے نوجوان موجود تھے کہ کھڑے ہونے کے لیے بھی بمشکل کچھ جگہ بچی تھی۔ اس کی باری دوسرے روز لنچ کے بعد آئی تھی اور ایک پارک میں بنچ پر بے خواب رات گزارنے کی وجہ سے اس کی آنکھیں سوجن زدہ اور لباس شکن آلود تھا۔

ان پانچ لوگوں میں سے وہ دو کو پہچانتا تھا۔ ان میں سے ایک کامیاب اسکرپٹ رائٹر تھا اور دوسرا اکیڈمی ایوارڈ یافتہ ڈائریکٹر۔ اتنے مشہور لوگوں کو پہلی بار اپنے روبرو پا کر اس پر خفیف سی گھبراہٹ طاری ہوگئی لیکن اسے ان پر ثابت کرنا تھا کہ وہی ان کا صحیح انتخاب تھا۔ وہ گردن تان کر ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے اعتماد سے مسکرایا۔

"تم واپس جاؤ۔"

اسے اندر داخل ہوئے دس سیکنڈ بھی نہیں گزرے ہوں گے کہ اسے باہر نکلنے کے لیے کہا گیا۔

"لیکن کیوں؟ آپ لوگوں نے میرا آڈیشن تو ابھی۔۔۔"

"تم سفید فام نہیں ہو۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

چند افراد نے آپس میں معنی خیز نظروں کا تبادلہ کیا۔

"صرف سفید فام۔ یہ ایک اصول ہے۔"

وہ غصے سے بھبک اٹھا تھا۔

"ایڈورٹائزمنٹ میں ایسا کچھ نہیں لکھا تھا' میرے پاس نیوز پیپر کلپنگ ہے۔" وہ اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسی باتیں لکھی نہیں جاتیں۔ سمجھ لی جاتی ہیں۔ تم جاسکتے ہو۔"

اس کے رنگ کی وجہ سے اسے پہلی بار مسترد کیا گیا تھا۔ لیکن ایسا آخری بار نہیں ہوا تھا۔ اس دن کے بعد بھی متعدد دفعہ اسے سفید فام نہ ہونے کی بنا پر ٹھکرایا گیا۔

لڑکپن میں بس میں سفر کرتے ہوئے کبھی کبھار ایسا ہوتا تھا کہ اسے سفید فام مسافروں کے لیے نشست چھوڑنا پڑتی اور تب وہ بس اتنا ہی سوچتا تھا کہ شاید سفید لوگ رنگ دار لوگوں سے زیادہ معزز ہوتے ہیں۔ ایک عرصے سے افریقین امریکن لوگ نسلی تعصب کے خلاف سول رائٹس کی تحریک لڑ رہے تھے۔ آئے روز قتل و غارت گری کے واقعات ہوتے تھے لیکن اس نے کبھی ان باتوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ یہ تو "باہر کی دنیا" کے مسائل تھے۔ ہالی ووڈ میں یہ کیسے ہوسکتا تھا۔ اسے کسی طور یقین ہی نہ آتا تھا۔

ہالی ووڈ حقیقت میں ہرگز ویسا نہیں تھا' جیسا اس کے تخیل میں تھا۔ یہاں بھورے' زرد' سیاہ اداکاروں کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔

✲ ✲ ✲

وہ بوجھل قدموں سے پام کے درختوں کی دو رویہ قطاروں میں سے گزر رہا تھا۔ تھکن کسی اژدھے کی مانند اس کے بدن کو شکنجے میں جکڑے ہوئے تھی۔ کہر میں دھواں مل کر اس کی آنکھوں کو چبھا رہا تھا۔

اس نے بھاری سر اٹھا کر ماؤنٹ لی کو دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ لاس اینجلس کی معروف دھند آسمان سے اتر کر Griffith Park پر چھا رہی تھی۔ ہالی ووڈ سائن مٹ میلا اور نہایت بدوضع دکھائی دیتا تھا۔ لکڑی اور دھاتی پرتوں سے بنے وہ دیو ہیکل حروف بے معنی تھے۔ ہالی ووڈ کے پہلے "او" کا اوپری نصف ناپید تھا اور تیسرا "او" مکمل نیست ہوچکا تھا۔ باقی ماندہ حروف کی حیثیت محض ایک مہمل لفظ کی تھی۔ جس کا کوئی مفہوم نہ تھا۔

اس مایہ روپہلی نگر نے اس کے ساتھ چھل کیا تھا۔ فلموں میں اس نے جو دیکھا تھا وہ سب فریب نظر تھا۔ وہ یہاں مشاہیر میں شامل ہونے آیا تھا اور ہالی ووڈ نے اسے ایک گھٹیا بار میں رات بھر گندے گلاس دھونے اور فرش صاف کرنے کا فریضہ سونپا تھا۔

اضمحلال اس کے بند بند میں گاڑھا سیال بن کر رینگتا تھا۔ وہ ایک گاتھک طرز کی الگ تھلگ عمارت

کے گرد بے مقصد پاگلوں کی طرح چکرانے لگا۔ عمارت ویران تھی اور لان کے ایک گوشے میں بڑا سا پتھریلا سرمئی۔ پیالہ دھرا تھا' جس میں تین سفید جل پریاں منجمد تھیں۔ وہ نالی دیوار پھلانگ کر اندر اترا اور جل پریوں والے پیالے کے ساتھ ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

بہت عرصہ پہلے کہی ہوئی بورڈنگ ہاؤس کے مالک کی باتیں اسے یاد آئیں۔ وہ سچ کہہ رہا تھا۔ اس انجام سے دوچار ہونے والا وہ تنہا نہیں تھا۔ اس جیسے بے شمار لوگ یہاں پیہم آتے تھے۔ پلکوں پر ستارے سجائے ہوئے اور ان ستاروں کو ریت ہوتے دیر نہیں لگتی تھی۔ پلکوں کی ایک جنبش سے وہ سارے چمکیلے خواب خاک ہوجاتے تھے۔

محشر خرام وقت اس کے وجود کو روند کر گزر رہا تھا۔ اتنی مدت بیت جانے کے بعد بھی وہ ایک لائق کا پارٹ تک حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو پایا تھا۔ وہ پل جس کا انتظار کرتے کرتے اس کے اعصاب شل ہوچکے تھے' کسی طور آہی نہ چکتی تھی۔ وہ ترقی کی نردبان کا ادنیٰ ترین زینہ بھی چڑھ نہ سکا تھا۔

اسے اپنا خواب یاد آیا' جو اب ایک مٹا ہوا عکس تھا' اور اس کا جی رونے کو چاہا۔

اسے سرخ قالین' آسکرز اور اخباروں کی شہ سرخیاں یاد آئیں اور اپنی گمنامی پر رونا آیا۔

ڈوپلیکس اپارٹمنٹ پینٹ ہاؤس یاد آئے۔ Gucci اور Christi an Dior کی مصنوعات یاد آئیں۔ لموزین اور فراری یاد آئیں اور اپنی مفلسی پر رونا آیا۔

وہ خوبصورت تھا۔ کسی کو اس وصف سے غرض نہ تھی۔

باصلاحیت تھا۔ کوئی اسے آزمانا نہیں چاہتا تھا۔

اس میں آسمان کو چھونے کی جستجو تھی۔ وہ لوگ اس کے قدموں تلے سے زمین بھی چھین لینا چاہتے تھے۔

وہ مال کاسد تھا۔ اس کی بازار میں کوئی مانگ نہ تھی۔

✲ ✲ ✲

محبت نے گیت گاتی ساگر پھول کی مانند اسے بے بس کیا تھا۔

"ساگر پھول۔ جو بظاہر خوشنما پھول اور در حقیقت زہریلا جانور ہوتا ہے۔ وہ گھات لگائے بیٹھتا ہے اور جب کوئی بے خبر جاندار اس کے پرکشش رنگوں سے کھنچ کر قریب جاتا ہے' اسے اپنے زہریلے بازوؤں میں جکڑ لیتا ہے۔

وہ محبت کی مسموم گرفت سے آزاد ہونے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے ادھ موئی ہوئی جاتی تھی۔

اس نے مائع معموریہ کے پیالے میں انگلیوں کی پوریں ڈبو کر اپنے سامنے صلیب کا نشان بنایا۔

"میں اسے بھول جاؤں گی۔ بھولنا مشکل نہیں ہوگا۔ میرے مسیحی خدا صرف اتنا کردے کہ میرا حافظہ چھین لے۔ مجھے کچھ بھی یاد نہ رہے۔"

Tabernacle کے سامنے جھک کر اس نے دایاں گھٹنا فرش پر ٹیک دیا اور جلتی ہوئی شمع کے مقدس شعلے پر نظریں جمادیں۔

"میں اسے دل سے نکال دوں گی۔ بالکل آسان ہے۔ بس دل کو نشتر سے چیرنا ہی تو پڑے گا۔"

بین الصفوف راستے میں سے گزر کر وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ چوبی نشستوں کی طرف بڑھ گئی۔ اپنے دائیں اور بائیں۔ آگے اور پیچھے' بہت سے چہروں میں وہ ایک چہرہ تلاش کر رہی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ان میں سے نہیں تھا۔

"میں اسے کبھی نہیں دیکھوں گی۔ میں کسی اور کو بھی نہیں دیکھوں گی۔"

Priest اور Ministers کی جماعت گرجے میں داخل ہوئی اور مذبح کے چبوترے کی طرف قدم اٹھانے لگی۔ مطربوں کا گیت منبر کے قوی سائبان سے ٹکرا کر چہار اطراف بکھر رہا تھا۔ قربان گاہ کی تعظیم کرنے کے بعد وہ اپنی مسندوں پر بیٹھ گئے۔ اگروں میں سے اٹھتی خوشبو کی لپٹیں اس کے نتھنوں سے ٹکرائیں تو وہ سوچنے لگی کہ گرانٹ کون سا کلون لگاتا تھا۔ اس نے کبھی پوچھا نہیں تھا۔ پر شاید وہ کوئی بھی

خوشبو نہیں لگاتا تھا' وہ اس کے بدن کی اپنی مہک تھی۔ Priest کی گمبھیر آواز گونجی۔

"باپ' بیٹے اور روح القدس کے نام میں۔"

اس نے صلیب کا نشان بنایا اور بولی

"آمین یسوع کا پیار میرے لہو میں ہے۔ میرے اور یسوع کے درمیان میں دنیا نہیں آسکتی۔ لیکن۔ میری دنیا چھ فٹ قامت کے سانچے میں کیسے سمٹ گئی۔ کسی کی دنیا اتنی مختصر بھی ہوتی ہے۔" اس کا دھیان بار بار بھٹک رہا تھا۔

Priest مومنین کی جماعت کو' توبہ کے عمل' کی دعوت دے رہا تھا۔

"اکٹھے خدا کے کنبے کے طور پر' امید کے ساتھ باپ سے معافی کے خواستگار ہوں۔"

اسے اپنا گناہ یاد کرنا تھا اور اسے وہ یاد آیا۔ اس کے "گناہ" کی آنکھیں اندھیری رات سے زیادہ کالی تھیں اس نے سینے پر ہاتھ رکھا۔

"میں عظمت والے خدا سے اعتراف کرتی ہوں اور تم سے۔۔۔ میرے بھائیو اور بہنو کہ میں نے اپنی غلطی سے گناہ کیا ہے۔ اپنی سوچوں میں اور اپنے لفظوں میں' اس میں جو میں نے کیا اور اس میں جو میں نہ کر سکی۔ اور میں مقدس کنواری سے فریاد کرتی ہوں اور تمام فرشتوں اور برگزیدہ لوگوں سے کہ میرے لیے خداوند خدا سے دعا کریں۔ میرا گناہ یہ ہے کہ میں ایک مرد سے محبت کرتی ہوں۔ صرف اتنی محبت کہ اسے نہ دیکھوں تو مجھے بینائی کی ضرورت نہیں۔ اس کی آواز نہ سنوں تو مجھے سماعت سے غرض نہیں۔ وہ مبہم سا مسکرا دے تو میری روح سینے سے کھینچ لیتا ہے۔ وہ جہاں چھو لے' بدن کا وہی جزو دل بن جاتا ہے۔ آنکھ کے ایک اشارے سے وہ میری نبض روکنے پر قادر ہے۔ اتنی سی محبت تو خدا مجھے معاف کر دے گا۔"

چھلکتی ہوئی نمی اس کے گالوں کو بھگونے لگی۔

سب مل کر گا رہے تھے۔ "خداوند رحم کر۔"

اس نے بھی اپنی آواز ملا دی۔ "خداوند رحم کر۔"

"یسوع رحم کر۔"

"یسوع رحم کر۔"

پھر اسے پتہ بھی نہ چلا' کیسے عبادت کے تمام مراحل اس کے ہاتھ سے پھسل گئے۔

وہ اس وقت چونکی جب بڑھاپے چہرے والی دبلی بڑھیا نے' جس نے سر کے بالوں کو نیلے اسکارف سے ڈھانپا ہوا تھا۔ قریب سے گزرتے ہوئے اس کے کندھے پر استخوانی ہاتھ رکھا۔ اس کی کھردری انگلیوں کا کرخت لمس پرنیاں کو گرجے میں واپس کھینچ لایا۔ یہ دیکھ کر اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا کہ سب لوگ قطاریں بنا کر مقدس Communion لینے کو تیار کھڑے تھے۔ اس تمام وقت میں وہ کہاں رہی تھی۔؟ وہ قدم گھسیٹتے ہوئے نیلے اسکارف والی عورت کے پیچھے چل دی۔

"یسوع! میرے مضطرب دل پر اپنا مسیحا ہاتھ رکھ دے۔ تیرے معجزوں نے کوڑھیوں کو بھلا کیا ہے۔ میری بیمار روح کو ہر آلائش سے پاک کر دے۔" وہ گڑگڑانے لگی۔

Priest کہہ رہا تھا' "یسوع کا بدن۔"

پانے والے خوش نصیب نے کہا۔ "Amen۔"

"یسوع کا خون۔"

"Amen"

دبلی بڑھیا کچھ اور آگے بڑھ گئی تھی۔ وہ اپنی جگہ جامد رہی' وہ سب سے آخر میں کھڑی تھی اور کچھ لمحوں میں اس کی باری آنے والی تھی۔

"یسوع کا بدن"

"Amen"

"یسوع کا خون۔"

کسی عجیب سے احساس سے اس کی ٹانگیں کپکپانے لگیں۔ وہ گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"نہیں یسوع کے بدن اور خون میں شامل ہونے کے لائق نہیں ہوں۔" مطربوں کے سازوں کی لمبی انگلیاں تھمیں اور وہ اسی کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔

"نہیں اس قابل ہرگز نہیں ہوں۔ میں جھوٹی ہوں فریب کار ہوں۔" اس نے ایک اور قدم پچھلی سمت میں اٹھایا۔

محراب دار چھت پر کندہ فرشتوں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ اس کے کانوں میں گونج گئی۔

"میں نے کب سوچا تھا کہ ایک عام انسان میرے اور یسوع کے بیچ آ جائے گا۔"

وہ آنکھ کی پتلی پر یوں جم گیا تھا کہ اسے دوسری طرف کا منظر نظر بند ہو گیا تھا۔

وہ قدم بہ قدم پیچھے سرکتی رہی۔

مقدس شبیہیں خاموش نظروں سے اسے گھور رہی تھیں۔

اس کے دل کا کھوٹ جانتے تھے۔

☼ ☼ ☼

وہ کیمپس سے لوٹی تو ماحول میں عجیب نوع کی بے چینی تھی۔ گھر کے تینوں افراد لونگ روم میں جمع تھے اور کوئی بھی کسی سے بات نہیں کر رہا تھا۔ داؤد ٹیلی وژن کے سامنے بیٹھا اپنا فیورٹ شو دیکھ رہا تھا یا شاید نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں تو اسکرین پر تھیں مگر وہ جیسے خلا کے پار گھور رہا تھا۔ ولیم بھی جھنجلاہٹ سے ذرا ہی زیادہ تھا۔ چاچی بکھرے ہوئے فلور کشن سمیٹتے ہوئے اس کی طرف دیکھنے سے گریزاں تھی اور چچا اخبار کو گول کر کے میز کی سطح سے ٹکراتے ہوئے کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ ان کی خاموشی غیر معمولی نہیں تھی مگر اس خاموشی کے پیچھے کوئی غیر معمولی بات ضرور پنہاں تھی۔ جانے کیوں پرنیاں کو کسی سے پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ صوفے پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگی تھی۔ پھر چچا نے بولنے میں پہل کی۔

"تم پاکستان بات کر لو۔ میں ابھی کال بک کروا دیتا ہوں۔" اس کے اندر خدشات سنپولیوں کی طرح سر اٹھانے لگے۔

"کیا ہوا ہے؟"

"پہلے تم ونیس بھابھی سے بات کر لو۔" وہ اٹھ کر ملحقہ کمرے میں ٹیلی فون کرنے چلے گئے تھے۔

"ممی کا فون آیا تھا؟ کیا بات ہوئی ہے۔" اس نے انیتا سے پوچھا۔

"تمہارے ابو کی طبیعت خراب ہے۔" اسے چاچی کی آواز بھرائی ہوئی لگی۔

"ہم سب کو پاکستان جانا ہو گا۔ تم دل کو مضبوط رکھو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

یکبارگی اس کا دل بیٹھ گیا۔

"کتنی خراب ہے۔ ان کی طبیعت؟"

"تم دعا کرو۔ خداوند مسیحائی کرے گا۔ اگر آزرک بھائی یہاں آنے پر رضامند ہو جاتے تو یہ نوبت ہی نہ آتی۔ ڈاکٹر کہہ رہے ہیں کہ ان کی ٹانگ کاٹنا پڑے گی۔"

اس کے بدترین خدشات کی تصدیق ہو گئی تھی۔

اس کا باپ پچھلے کئی برسوں سے ذیابیطس کے مرض میں مبتلا تھا۔ اس کے گردے اور بینائی بری طرح متاثر ہو چکی تھی۔ پچھلی مرتبہ ونیس سے بات ہوئی تو وہ کچھ پریشان لگ رہی تھی۔ پرنیاں کے استفسار پر اس نے آزرک کے لان میں بے ہوش ہو کر گرنے کا ذکر سرسری انداز میں کیا تھا۔

"چکر آ گیا تھا۔ کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے۔" ڈاکٹر نے آ کر چیک کیا تو پتہ چلا ان کا بلڈ پریشر بڑھا ہوا تھا۔

وہ سمجھتی تھی کہ اس کی ماں اسے پردیس میں دکھی نہیں کرنا چاہتی تھی وہ جان بوجھ کر آزرک کی بیماری کے ذکر سے کنی کترا جاتی تھی۔

پرنیاں ٹیلی فون پر کبھی کبھی مذاق میں آزرک سے کہتی۔ "مجھے ڈاکٹر بن کے آلینے دیں۔ میں آپ کو ٹھیک کر دوں گی۔" اور اس کا لہجہ دھمکی آمیز ہوتا۔

آزرک کی صحت دن بہ دن گرتی جا رہی تھی۔ کسی کے کچھ بتائے بنا بھی اسے معلوم تھا لیکن صورت حال اس درجہ خراب ہو چکی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا۔

ونیس اس کی آواز سنتے ہی رو پڑی تھی۔ وہ بڑی

ہمت والی عورت تھی۔ پرنیاں نے مشکل سے مشکل وقت میں بھی اسے آنسو بہاتے نہیں دیکھا تھا۔

"پرنیاں! آنے میں دیر نہ کرنا۔ تمہارے ابو نے پوری رات تمہارا نام لیتے ہوئے گزاری ہے۔"

"آپ نے مجھ سے چھپایا کیوں؟ میں ہمیشہ پوچھتی تھی" اور آپ جھوٹی تسلیاں دیتی تھیں۔" وہ خود بھی رونے لگی تھی۔

"تم اتنی دور بیٹھ کر کیا کر سکتی تھیں۔ بیماری انہیں گھن کی طرح اندر سے کھا گئی ہے۔"

"انہیں امریکہ لے آئیں۔ یہاں بہت جدید سہولتیں ہیں۔ وہ بالکل ٹھیک۔"

"وہ کہتے ہیں میری مٹی خراب نہ کرو۔ مجھے سکون سے مرنے دو۔ ان کی ضد سے کون جیت سکتا ہے اور اب تو اتنا وقت بھی نہیں بچا۔"

"آپ ایسے نہ کہیں میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے۔" اس کے آنسوؤں میں شدت آگئی۔

"تم نے جو بھی شاپنگ کرنا ہو۔ ایک دو دن میں کر لینا۔ میں کوئی تیاری نہیں کر سکوں گی۔" وینس کی بے محل بات اسے بہت عجیب لگی تھی۔

"کیا مطلب؟ شاپنگ کس لیے۔"

"تمہاری شادی کے لیے میں نے بہت کچھ سوچ رکھا تھا۔ مگر اب تو۔ میں بہت تھک چکی ہوں پرنیاں! مجھے تمہاری بہت ضرورت ہے۔ کوئی رونے لگتا ہے تو چپ ہی نہیں ہوتا۔ تمہیں بڑا یاد کرتا ہے۔"

اسے لگا اسے سننے میں غلطی ہوئی ہے۔ اس کے آنسو تھم گئے تھے۔

"میری شادی کا یہاں کیا ذکر ہے۔"

"تمہارے ابو کی بس یہی خواہش ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ہی تمہیں دلہن بنے ہوئے دیکھ لیں۔"

"نہیں کچھ نہیں ہوگا۔ وہ بہت لمبا عرصہ جئیں گے لیکن میں ابھی شادی نہیں کر سکتی۔ ابھی تو میں نے اپنی پڑھائی شروع کی ہے۔"

"پڑھائی تم شادی کے بعد بھی کر سکتی ہو۔"

"ابھی میں نے اس بارے میں بالکل نہیں سوچا۔ اتنی جلدی کیسے۔"

وینس نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی۔

"میں نے تمہیں بتایا ہے پرنیاں! تم سے پوچھا نہیں۔" اس کا لہجہ سخت ہو گیا۔ "پاکستان آتے ہی تمہاری شادی ہو جائے گی۔ جو تھوڑا بہت انتظام کرنا ہے وہ تمہارے ماموں سنبھال لیں گے۔ تمہیں جو بھی ضروری سامان خریدنا ہے خرید لو۔ میں ہسپتال جا رہی ہوں۔ ابھی فون بند کر رہی ہوں۔"

پرنیاں کو ان الفاظ پر یقین کرنے میں بڑی دشواری ہوئی تھی۔

"آپ لوگ میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہیں۔"

"دماغ کو حاضر کر کے سنو۔ تمہارا باپ مر رہا ہے۔ مرتے ہوئے لوگوں کی خواہش تو کبھی کبھی دشمن بھی پوری کر دیا کرتے ہیں۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔ تمہارے ماموں باہر گاڑی میں میرا انتظار کر رہے ہیں۔"

"امی ایسا مت کریں مجھے یوں مجبور نہ کریں۔"

"ہزاروں جھمیلے ہیں جن میں میری جان پھنسی ہے اور تم اپنا رونا لے کر بیٹھ گئی ہو۔ کیریئر، مناسب وقت، پسند ناپسند، یہ سب باتیں خوش باش فارغ لوگوں کو جچتی ہیں اور ہمارا سامنا موت سے ہے۔ میں تمہارا مسئلہ ضرور سنتی لیکن میں مجبور ہوں میں نے انہیں بچوں کی طرح بلک بلک کر روتے دیکھا ہے۔ میں جا رہی ہوں۔"

"میں ابو سے خود بات کروں گی۔ وہ میرا کہا مان جائیں گے۔"

"وہ پہلے ہی بہت اذیت میں ہیں۔ میں کسی کو بھی ان کی تکلیف میں اضافہ نہیں کرنے دوں گی۔ تم اتنا شور کیوں مچا رہی ہو۔ پہلے یہ تو پوچھ لو۔ تمہاری شادی کس سے ہو رہی ہے۔ خود ہی خاموش ہو جاؤ گی۔"

اسے موت کی سزا سنائی جا چکی تھی۔ صرف طریقہ وضع کرنا باقی تھا۔ دار، سورج مکھی چکر، برقی کرسی یا پھر صلیب۔

"داؤد اور اس کے ماں باپ نے دوسری بات نہیں کی تم سے زیادہ تو وہ میرا درد سمجھ رہے ہیں، حالانکہ ان سے کوئی قریبی رشتہ داری بھی نہیں ہے۔ دوسری یا تیسری نسل میں داؤد سے کوئی رشتہ داری بنتی ہے۔ خود غرضی دکھانے کے لیے زندگی تمہیں اور مواقع دے گی یقین کرو یہ وہ موقع ہرگز نہیں ہے۔ رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔" وہ ریسیور ہاتھ میں لیے پتھر کا بت بنی کھڑی تھی۔

☼ ☼ ☼

"داؤد! تم میری بات سمجھ نہیں پائے۔ میں تم سے شادی نہیں کروں گی۔ تم ابھی فون پر یا پاکستان جانے کے بعد انکار کر دینا۔ تم کوئی بھی بہانہ بنا سکتے ہو۔ کہہ دینا کہ تم کہیں اور کمٹڈ ہو۔ کچھ بھی۔ ہم بچپن سے دوست ہیں۔ تم میرے لیے اتنا تو کر سکتے ہو۔"

داؤد اس کی متورم آنکھوں اور زرد رنگت کو بے تاثر چہرے کے ساتھ دیکھتے ہوئے ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرنے لگا تھا۔

"اس کی وجہ؟"

"وجہ کچھ بھی ہو لیکن تم میری مدد کرو۔" وہ اس کی جانب سے رخ پھیر کر آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"مجھے وجہ میں گہری دلچسپی ہے کیونکہ یہ گفتگو میری شادی کے بارے میں ہو رہی ہے۔ شاید یہ پہلو تمہارے ذہن سے محو ہو گیا ہے۔"

"مجھ پر طنز نہ کرو۔" وہ لجاجت سے بولی تھی۔ "کوئی نہیں ہے جس سے میں مدد مانگ سکوں۔ صرف تم مجھے اس مشکل سے نکال سکتے ہو۔"

"کبھی کبھی آخری ہیلپ لائن بھی مایوس کن ثابت ہوتی ہے۔" پرنیاں اٹھ کر اس کے قریب چلی گئی۔ وہ ہنوز آئینے میں دیکھ رہا تھا۔

"اتنی بے حسی سے بات مت کرو۔ تم مجھے بہت دکھ دے رہے ہو۔" وہ خاموش رہا اور بالوں میں انگلیاں چلانے لگا۔

پرنیاں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"پلیز مجھے مایوس نہ کرو۔ میں بہت مجبور ہوں۔"

"تمہیں مجھ سے شادی پر کیا اعتراض ہے۔؟" وہ تیزی سے گھوما اور اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

"تم بہت اچھے ہو داؤد! تم میں کوئی برائی نہیں۔ خرابی مجھ میں ہے۔"

"تم مجھے ہر خرابی کے ساتھ قبول ہو۔"

"میں۔ محبت کرتی ہوں۔ کسی اور سے۔"

اسے اس محبت کا اعتراف سر جھکا کر کرنا پڑا تھا۔

"کس سے؟"

"نام جان لینے سے کیا ہوگا۔ بس تم اتنا سمجھ لو کہ میں اور تم ایک دوسرے کے لیے موزوں نہیں ہیں۔"

"مجھے سب کچھ جاننے کا حق ہے کیونکہ یہ میری زندگی ہے۔ جس کے ساتھ تم یہ سب کر رہی ہو۔ تمہیں یاد نہیں ہے کہ میں گوشت پوست سے بنا جیتا جاگتا انسان ہوں اور مجھے درد بھی ہوتا ہے۔"

داؤد نے اس کے سامنے سے ہٹ کر دیوار سے ٹیک لگا لی۔ اس کی کنپٹی پر ابھری ہوئی رگ تیزی سے پھڑک رہی تھی۔

"وہ میری زندگی ہے داؤد! میں اس کے بغیر مر جاؤں گی۔"

"کوئی کسی کے بغیر نہیں مرتا۔ سب کو زندہ رہنا پڑتا ہے۔"

"میں سب کو نہیں جانتی۔ میں تو اپنی بات کر رہی ہوں۔"

"یہ شادی تایا جان کی خواہش ہے۔"

"اور تمہاری خواہش کیا ہے۔؟"

"تمہیں میری خواہش سے غرض ہی کیا ہے۔" داؤد کی آواز پھٹ سی گئی تھی۔ "مجھے معلوم ہے تم کس کے لیے مجھے رد کر رہی ہو۔ اس معمولی شخص کے لیے جسے تم صحیح طرح سے جانتی تک نہیں ہو۔"

"اسے مجھ سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔"

"تمہیں امریکہ آئے ہوئے پانچ مہینے اور نو دن ہوئے ہیں۔ اگر ایئرپورٹ پر جہاز سے اترتے ہی تمہاری اس سے ملاقات ہو گئی تھی تو بھی اتنا عرصہ کسی

انسان کو جاننے کے لیے بہت قلیل ہے۔ جو شخص بھوؤں جیسے کپڑے پہنتا ہو۔ باچھیں چیر کر قہقہے لگاتا ہو اور بات کرتے ہوئے پاگلوں کی طرح ہاتھ ہلاتا ہو۔ وہ تمہاری محبت کیسے ہو سکتا ہے؟"

"جب پانچ مہینے نو دن کسی کو جاننے کے لیے ناکافی ہیں تو تم ایک ملاقات میں کیسے اسے پرکھ سکتے ہو۔"

"تم اس سے شادی کر کے کبھی خوش نہیں رہ سکتیں۔ وہ تمہاری infatuation ہے۔ وقتی ابال ہے۔"

"میں اس کے ساتھ شادی نہیں کر رہی داؤد۔"

"تو پھر مسئلہ کیا ہے؟"

"اس کے ساتھ نہیں تو کسی اور کے ساتھ بھی نہیں۔"

"تم مجھے الجھا رہی ہو۔"

"میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی پر مجھے رہنا ہوگا۔"

"تو پھر ہم شادی کر لیتے ہیں اور میں سمجھوں گا کہ ہمارے درمیان یہ گفتگو کبھی نہیں ہوئی۔"

"میں اس سے جدا ہو کر بس جسم رہ گئی۔ ہوں۔ روح تو اس کے پاس ہے۔ روح کے بنا جسم کھنڈر ہوتا ہے۔ کھنڈر لے کر تم کیا کرو گے۔" وہ دیوار پر لگی سبز اوبلی پچی کو یک ٹک گھور رہی تھی۔

"تمہیں اگر اس سے اتنی ہی محبت ہے تو اس کے ساتھ بھاگ کر کورٹ میرج کر لو۔ تایا جان کو آج ہی مر جانے دو۔ مجھ پر لعنت بھیجو۔ تمہیں روکا کس نے ہے Go to hell۔" وہ دیوانوں کی طرح چیخنے لگا تھا۔

پرنیاں کی نگاہوں کا زاویہ نہیں بدلا۔ "میں نے کہا نا میں اس سے کبھی شادی نہیں کروں گی۔ وہ مسلمان ہے۔"

داؤد کو ایک جھٹکا لگا تھا۔ وہ تیز قدموں سے اس کے پاس آیا اور اس کی ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ اپنی جانب گھما دیا۔

"تم اپنے حواسوں میں ہو؟"

"پتہ نہیں۔" وہ اس کی قمیص کا کالر دیکھنے لگی تھی۔

"وہ تمہیں بالکل اندازہ نہیں ہے تم خود کو کس چیز میں ملوث کر رہی ہو۔"

داؤد کی انگلیاں اس کی ٹھوڑی میں گڑی جا رہی تھیں۔ "میری بات سنو۔ تمہاری شادی مجھ سے ہوگی اور میں یہ ہر قیمت پر کر کے رہوں گا۔ اب اگر وہ بلڈی باسٹرڈ تمہارے آس پاس مجھے نظر آگیا تو میں اسے قتل کر دوں گا اور ضرور کروں گا۔" لہجے کی برودت اسے اپنی ہڈیوں میں اترتی محسوس ہوئی تھی۔ اس کے بدن میں جھرجھری سی رینگ گئی۔

☆ ☆ ☆

اس نے پردہ سرکا کر کھڑکی کے پٹ وا کیے۔

سرمئی ہوا میں خوشگوار خنکی تھی۔ آسمان اجلے سپید پھولوں والا نیلا غالیچہ تھا جو کوئی دھو کر اس کے جھروکے میں سوکھنے کے لیے پھیلا گیا تھا۔ بانکا نکھرا سورج کیسر گھلے سفید رنگ کے پاپیے بھر بھر کے در و بام پر انڈیلتا تھا۔

اس نے سڑک کے پار قرمزی چھت والے درختوں کے کنج سے ایک دراز قامت شخص کو نکلتے دیکھا تھا۔ اس شخص کے ہاتھ بڑے بڑے تھے اور چلتے ہوئے وہ انہیں تیزی سے حرکت دے رہا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ایک لمبی سمرن جھول رہی تھی۔ پرنیاں کھڑکی کا پٹ تھامے اسے قریب آتے ہوئے دیکھتی رہی۔ جب آنے والے کا چہرہ وضاحت سے نظر آنے لگا تو اس نے حلق کی پوری طاقت صرف کر کے اسے پکارا اور ہاتھ کے اشارے سے وہیں رکنے کو کہا۔

کچھ دیر بعد وہ گھر کے مرکزی دروازے سے باہر آئی اور سست روی سے چلنے لگی۔ زمین پر پاؤں رکھنے سے اس کے سر میں دھمک سی اٹھتی تھی۔ تین دن سے اس نے ایک نوالہ بھی حلق سے نہیں اتارا تھا اور وہ مر جانے کی حد تک نقاہت محسوس کر رہی تھی۔ گرانٹ کے نزدیک پہنچ کر وہ گھٹنوں کے بل فٹ پاتھ پر بیٹھ گئی اور اس کا ہاتھ جس میں سرخ شگوفوں سے گندھی مالا تھی۔ سرد ہاتھوں میں تھام کر اپنے سامنے

پھیلا لیا۔ ایک گرم بوند اس کی پلکوں سے پھسل کر گرانٹ کی ہتھیلی پر گری۔ پھر بے بس تواتر پرنیاں نے اس کی ہتھیلی پر لب رکھ دیے تھے۔

"مجھ سے شادی کر لو۔" اس کی آواز تھکن گزیدہ تھی۔

☆ ☆ ☆

سارے میں دھان کی رس بھری پتیوں کی میٹھی مہک پھیلی تھی۔ گاؤں کی چکی کی لگاتار کھک بک۔ کھک بک۔ ٹریکٹر کے انجن کے شور سے کبھی دب جاتی اور کبھی ابھر کر بوڑھے تاہلوں کی چوٹیوں پر لہرانے لگتی۔

وہ کچی باٹ پر قدم دھرتا مسجد کے پہلو میں پہنچا تو نمبرداروں کی حویلی سے موروں کی کہک کانوں میں پڑنے لگی۔

اس نے دور سے ہی حکیم بیگم کو دروازے کا کواڑ تھام کر چہرے دیکھ لیا تھا اور نظر ملتے ہی وہ بے قرار ہو کر باہر کی طرف لپکی۔ قریب پہنچ کر حکیم بیگم نے بازو پھیلائے اور اس کی چھاتی سے لگ گئی۔ اس کے چہرے پر ایک ناقابل بیان تاثر تھا۔ وہ یوں ہانپتی تھی جیسے میلوں بھاگ کر آئی ہو۔

"السلام علیکم بے جی!"

بے جی نے سلام کا جواب نہیں دیا اور اس کا سر پکڑ کر اپنے چہرے کی جانب جھکایا۔ پھر بمشکل پھولی ہوئی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے اس کے کان میں دھیرے سے کچھ کہا۔ آواز اتنی مدھم تھی کہ وہ سن ہی نہیں پایا۔

"مجھے سمجھ نہیں آئی۔ تو نے کیا کہا ہے بے جی!"

حکیم بیگم نے دوبارہ سرگوشی کی تھی۔ اس بار الفاظ واضح تھے لیکن جو وہ بیان کر رہی تھی عمر کے لیے ناقابل یقین تھا۔ وہ حیرت سے گنگ رہ گیا تھا۔

آمنہ اور یوسف کل صبح کی فلائٹ سے پاکستان پہنچے تھے اور گزشتہ رات حکیم بیگم سے ملنے آگئے تھے۔ انہوں نے اپنے آنے کی اطلاع پیشگی نہیں دی تھی اور جب حکیم بیگم ٹیلی فون پر عمر کو ان کی آمد کے بارے میں بتا رہی تھیں تو وہ اس کی خوشی اور جوش کی وجہ سمجھ سکتا تھا۔ وہ خود بھی بہت خوش ہوا تھا مگر حکیم بیگم کی آواز میں کوئی ایسی بات تھی جس کی کوئی توجیہہ وہ ڈھونڈ نہیں پایا۔ وہ جیسے کچھ کہنا چاہتی تھیں اور ضبط کر کے خود کو روکے ہوئے تھیں۔

"آمنہ تے یوسف آئے ہیں۔ تو وی آجا۔ دو دیہاڑے (دن) چھٹی لے لینا۔ اللہ دا کرم۔" وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئیں۔ چند لمحے اس کی تیز سانسوں کی آواز ایئر پیس سے آتی رہی۔

"کیا بات ہے بے جی!"

"سوختے (جلدی) نکل پڑنا۔ میں لمی اڈیک (لمبا انتظار) نہیں کر سکدی۔"

اس نے واضح طور پر حکیم بیگم کے بدلے ہوئے لہجے کو محسوس کیا تھا۔

"گھر دا ماحول بڑا بدل گیا ہے۔ ام کلثوم دی پوتری جیھڑی پیار رنڈی ہوئی تھی (جو پچھلے سال بیوہ ہوئی تھی) اسے میں نے وڈا (بڑا) پکا کمرہ رہنے کے لیے دے دیا ہے۔ بچوڑے دا منڈا ہے اس دا۔ بڑی رونق لگ گئی ہے۔ تے صالحہ دے ڈھور ویہڑے میں باندھ لیے ہیں۔ سیالی (جاڑے میں) ان کے لیے کوٹھڑی بنواؤں گی۔ ہور سن (اور سنو) کاکا! اپنی کندھ (دیوار) نال جو ٹاہلی ہے۔ اس تے اک گالڑ (گلہری) نے آلنا (گھونسلہ) بنایا ہے۔ بڑے چراں پچھوں (مدت بعد) گالڑ نے ادھر وسوں (بسیرا) کی ہے تو گالڑوں کا بڑا ویری تھا۔ جے کوئی بھول بھلیکھے ایدھر منہ کر لیندا تے غلوے مار کے پرکا دیتا (ڈرا دیتا) تے ہاں صالحہ نے کبوتر وی رکھے ہیں۔ بس تو چھیتی آجا۔ تیرے دیکھن لئی بہت کچھ ہے۔ تو بڑا حیران ہوگا۔ میں تجھے کنج (کیسے) سمجھاواں۔۔۔ چڑی چوہکے (صبح سویرے) تے پینڈا شروع کر دینا۔" اس نے گویا ایک بار پھر خود پر جبر کر کے کچھ چھپایا تھا۔

ان میں کوئی بھی بات ایسی نہ تھی جو اسے حیران کر پاتی۔ نہ تو اسے کبوتروں اور گلہریوں سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہی صالحہ اور اس کے بیٹے کے ادھر بسرام

کرنے کی خبر اس کے لیے نئی تھی۔ پہلے بھی حکیم بیگم اس بارے میں تذکرہ کر چکی تھی۔ جہاں تک آمنہ کی آمد پر خوش ہونے کا تعلق تھا تو آج سے قبل کبھی بھی اس نے ایسی مسرت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ پھر کیا تھا جو وہ بتانے کے لیے بے چین تھی اور کہہ نہ پاتی تھی۔

وہ تمام سفر امکانات کے بارے میں سوچتا آیا تھا۔ اور اس کی الجھن تب دور ہوئی تھی جب مسجد والے کنوئیں کے پاس چھتنارے پیپل کی گھنی سبز چھاؤں تلے حکیم بیگم نے اس کے کان میں وہ فقرہ کہا تھا۔

"آمنہ دے بال (بچہ) ہونے والا ہے۔" وہ چند لمحے کوئی ردعمل ظاہر نہ کر سکا۔

"ہاں کاکا! اسے تیجا (تیسرا) مہینہ لگا ہے۔"

"عمر! تمہیں کوئی حق نہیں ہے۔ اتنا اسمارٹ ہونے کا۔ ایک لڑکے کا اس قدر خوبصورت ہونا تو غیر اخلاقی حرکت ہے۔"

آمنہ دو سال بعد اسے مل رہی تھی۔ اس کے ملیح چہرے پر اتنی بڑی مسکراہٹ عمر نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

"آپ کو بہت مبارک ہو باجی! مجھے تو یقین ہی نہیں آرہا۔" عمر نے اسے کندھے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"تم ناراض تو نہیں ہو کہ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد یہ خوشخبری کیوں سنائی۔" یوسف بولا تو عمر نے ہنستے ہوئے نفی میں گردن ہلائی۔

"دراصل ہمیں بھی یقین کرنے میں بڑی مشکل پیش آئی تھی انیس سال ہو گئے ہمیں در در دھکے کھاتے ہوئے۔"

عمر کی نظریں بے اختیار چھپر سے متصل کچی دیوار کی طرف اٹھیں جہاں حکیم بیگم کے ہاتھ سے کھنچی ہوئی کیسری لکیریں سالوں کے انتظار کی داستان سنا رہی تھیں وہ تعداد میں بیس تھیں۔ حکیم بیگم اور عمر ایک دوجے کو دیکھ کر یوں مسکرائے جیسے کسی سازش میں شریک ہوں۔ دونوں میں سے کسی نے یوسف کے حساب کی تصحیح نہیں کی تھی۔

"اتنے برسوں کی بے ثمر جدوجہد کے بعد جب ہم ہر طرف سے مایوس ہو چکے تھے تو اچانک۔"

"بھاء جی! آپ کے لیے لسی لے آوں؟" صالحہ نے اتلاج والی کوٹھڑی سے باہر آ کر اسے سلام کیا تھا۔

"بجھن (پوچھنے) دی لوڑ نئیں۔ تو چھیتی لے کے آ۔ تیرا ویر گرمی چ سڑ کے آیا ہے۔"

اس کے بجائے حکیم بیگم نے جواب دیا تھا۔

بعد میں آمنہ اسے خاصی دیر اس طریقہ علاج کے بارے میں سمجھاتی رہی تھی جس کے ذریعے یہ معجزہ رونما ہوا تھا۔ عمر کو اس سرجری کی پیچیدگی اور جدید طب کی سحر آفرینی میں کوئی اسرار نظر نہ آیا۔ اسے رتی برابر بھی شک نہ تھا کہ حکیم بیگم کی دعاؤں کے سوا کوئی شے آمنہ کو بار آور کرنے کا باعث بنی تھی۔

یوسف اور آمنہ صرف دو دن حکیم بیگم کے گھر گزارنے کا ارادہ رکھتے تھے اس کے بعد وہ یوسف کے والدین کے پاس نارووال شہر چلے جاتے۔

گاؤں میں قیام کے اختصار کی بہت ساری وجوہات تھیں۔ یہاں بات ہاتھ کے پنکھوں سے بڑھ کر پیڈسٹل فین اور ریڈیو سے چل کر ٹیلی ویژن تک ہی پہنچ پائی تھی۔ کنوئیں اور نلکوں کی جگہ بجلی کی موٹروں نے لے لی تھی۔ مٹی، تام چینی اور پیتل کے باسن پلاسٹک ڈنر سیٹوں سے بدل گئے تھے۔ لیکن ایئر کنڈیشنر، منرل واٹر، انٹرنیٹ کی منزل ابھی دور تھی۔ ہائی جین hygiene جیسے اہم مسئلے سے دیہاتی لوگ تا حال انجان تھے۔ انسانوں اور مویشیوں کا ایک ہی احاطے میں اکٹھا رہنا بالکل فطری بات سمجھی جاتی تھی۔

صالحہ کی گائے یا صالحہ کا چھ سالہ ادھ ننگا بیٹا جسے نزلہ ہوا تھا۔ چھینکتے تو آمنہ کی احتیاط کا درجہ دونوں صورتوں میں ایک جیسا ہی ہوتا۔ اسے اپنے ساتھ منرل واٹر کے کین ڈسپوزیبل برتن اور ٹشو پیپر کے ڈھیر لے کے آنا پڑتے اور پھر یہ فکر الگ کہ صالحہ، مزمل یا حکیم بیگم میں سے کوئی ان چیزوں کو چھو نہ لے پھر بھیڑ کا نوزائیدہ میمنا اور کبوتروں کا جوڑا دن بھر پورے

آنگن اور کمروں میں بے مہار پھرتے تھے اسے بہت چوکنا رہنا پڑتا۔ جب حکیم بیگم — چھٹیوں اور پاتھیوں کی آگ پر پکائے گئے پکوان انہیں کھلانے کی کوشش کرتی تو نوالہ نگلنے کے تصور سے ہی ان میاں بیوی کو ابکائیاں آنے لگتیں۔ کم و بیش تمام کھانے کی چیزوں میں گوبر کی بو رچی ہوئی تھی۔ مجبوراً انہیں ڈبوں میں بند خشک خوراک اور پھلوں سے بھوک مٹانی پڑتی۔ مکھیوں مچھروں کی کثرت "کموڈز" سیلولر نیٹ ورک کی عدم دستیابی اور ایسے بہت سارے عناصر تھے جو ان کو زیادہ دیر گاؤں میں ٹھہرنے نہ دیتے تھے۔

وہ آمنہ اور یوسف کے ساتھ کائن کے سائے میں کھاٹ پر بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ حکیم بیگم گائے کا دودھ دوہنے سے پہلے ولٹوئی سے چلوؤں میں پانی بھر کر اس کے بھرے ہوئے تھنوں کو دھو رہی تھی اور صالحہ بسورتے مزمل کو کندھے سے چمٹائے صحن میں ٹہل ٹہل کر سلانے میں مگن تھی کہ ام کلثوم ہاتھ میں حقہ لیے آگئی۔

"ماشاءاللہ مبارکاں حکیم بیگم! اب رب چاند جیسا دوہترا (نواسہ) تیری جھولی ڈالے۔ میں تو چھیج (چھاج) بھر کے مٹھیائی کالوں گی۔" اس نے حکیم بیگم کے قریب جھک کر سلام دعا کی اور نگاری میں سر گھسائے بھوسے ملے چارے پر منہ چلاتی ہوئی گائے کی گیلی تھوتھنی سہلاتی رہی۔ پھر وہ آمنہ کے سر پر پیار دینے کے لیے آگے بڑھی تو آمنہ نے جھرجھری لے کر کندھے اکڑا لیے اور پہلو بدلتے ہوئے اس کی دسترس سے دور ہو گئی۔

"کیا حال ہے ماسی! ٹھیک تو ہو ناں۔" آمنہ نے چھوماں کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو دیکھنے سے گریز کیا تھا۔ اس کی ہچکچاہٹ فطرت کے اصولوں کے عین مطابق تھی۔ یہ وہی ہاتھ تھا جس کو چند ثانیے قبل گائے نے اپنی زبان سے چاٹا تھا۔ لیکن چھوماں نے اس رویے کو اپنی توہین گردانا تھا اور ان سے پرے کبوتروں کی دھابلی کے پاس موڑھا بچھا کر بیٹھ گئی۔ مغرب کی اذان میں

تھوڑا وقت رہ گیا تو عمر اٹھا کائن کی شاخ پر ٹنگی ہوئی مٹھیا والی ڈونگچی میں نلکے سے پانی بھرا اور چھوماں کے قریب کھڑا ہو کر مسواک کرنے لگا۔ اسے آمنہ کا برتاؤ برا لگا تھا لیکن چھوماں سے اس کے کنبے کا حال احوال دریافت کرنے سے عمر کا مقصد اس کی دلجوئی کرنا نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ زہر اگلے بنا اس کا جی ہلکا نہیں ہو گا۔ ان لمحات میں وہ کچھ اور سوچ رہا تھا۔

"ماسی! جب میری ماں ادھر تھی۔ تو اس سے ملنے کبھی کوئی آیا تھا؟" اس نے حتی الوسع لہجے کو سرسری رکھنے کی کوشش کی۔

چھوماں نے چلم میں دہکتے کوئلوں کو چمٹے سے کرید کر آگے پیچھے لڑھکایا پھر قمیص کے دامن میں لگی جیب سے بٹے ہوئے تمباکو کا ٹکڑا اور گڑ کی بھیلی نکالی۔ بھیلی کو دو حصوں میں توڑ کر ایک ٹکڑا چلم میں رکھا اس پر تمباکو دھر کے دوسرا ٹکڑا تمباکو کے اوپر رکھا اور کوئلوں کو پھر سے ہلا جلا کر ترتیب دیا۔ حدت پاتے ہی گڑ پگھل کر تمباکو سے چپک گیا تھا چھوماں نے عمر کی بات جیسے سنی ہی نہ تھی۔ وہ سوال دہرانے ہی والا تھا کہ چھوماں بول پڑی۔

"وہ سائی (عیسائی) تھی۔ پر حکیم بیگم پاکی پلیدی کا دھیان نہیں کرتی تھی۔ جن بھانڈوں میں اسے کھلاتی تھی۔ انہی میں خود کھا لیتی۔ سچ پوچھو تو میرا روح ہی نہیں کرتا تھا ادھر آنے کو۔"

چھوماں نے منہال کو ہونٹوں میں دبا کر لمبی سانس کھینچی۔

"پر وہ چھ سات مہینے اس گھر میں رہی تھی۔ کسی نہ کسی سے تو رابطہ کرنے کی کوشش کی ہو گی۔ شاید بے جی نے تم سے کبھی ذکر کیا ہو؟"

"ایسی ادھلوں (گھر سے بھاگنے والی) کے پیچھے کون آتا ہے۔ عاشق چار دن دل خوش کر کے چھوڑ جاتے ہیں۔ اور وارث ڈھونڈ نکالیں تو گاٹا اتار دیتے ہیں۔"

آمنہ اور یوسف کسی بات پر زور زور سے ہنس رہے تھے۔ چھوماں کی توجہ ان کی جانب منعطف ہوئی تو اس کے ماتھے کی جھریوں میں لہری پیدا ہوئی۔ حقے کی نگالی کو

سمٹی میں بھینچ کر وہ بولی۔

"بدذات' کمینی۔ جیکبھی رنگی تے کھے پچی اڈاوے۔ تم بتاؤ چڑی کے بوٹ سینو لیے کھانے لگیں تو وہ الاں (چیلیں) بن جاتے ہیں؟ کمی کا اصل بھی نہیں بدلتا۔ کالے منہ والی۔" تمباکو ملے تھوک کے چھینٹے اس کے ہونٹوں سے اڑے۔ "کھوتوں کے گٹے جھاڑتی جوان ہوئی آمنہ اور آج مجھ سے حقارت کر رہی ہے۔ امریکہ چلی گئی تو خون بھی بدل گیا۔ میں غریبنی سہی پر زمینداروں کی دھی ہوں اک اٹ مسیت (مسجد) کے منبر میں لگی اور اک گٹر کے فرش میں جڑی۔ دونوں کا رتبہ ایک جیسا نہیں ہوتا۔"

ہوا کے تیز جھونکے نے گڑ اور تمباکو کی ملی جلی کڑوی مہک اس کے نتھنوں میں پھونکی۔ اب چھوماں سے کچھ پوچھنا عبث تھا۔ وہ خاموشی سے مسواک کرتا رہا۔

"ایک بات میں نے تمہیں کبھی نہیں بتائی۔" اس نے پیتل کی مسنال پر انگلی پھراتے ہوئے غور سے عمر کو دیکھا۔

"یہ تو تمہیں پتہ ہے کہ حکیم بیگم دائی کا کام کرتی تھی اور پھر کبھی کبھی کوئی کیس کرنے کے لیے مجھے بھی بلا لیتی تھی۔ تمہاری ماں جب یہاں آئی تھی تو وہ پیٹ گرانا چاہتی تھی۔"

مسواک کا پھونسڑا عمر کے حلق میں چلا گیا۔ کھانستے کھانستے اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا تھا۔

ہوش سنبھالتے ہی بہت سی ایسی باتیں اس کے کانوں میں پڑنے لگی تھیں جن کا مفہوم چاہے وہ سمجھ نہیں پاتا تھا مگر ذلت کا احساس ضرور ہوتا تھا۔ بچپن سے لے کر اب تک وہ توہین آمیز لفظوں، طعن اور گالیوں کا سامنا کرتا آیا تھا۔ اسے یاد نہیں تھا کبھی کسی ایک جملے سے اسے اتنی تکلیف پہنچی ہو۔

عشاء کی نماز پڑھ کر وہ لوٹا تو راوی کی طرف سے نم آلود ہوا چلنے لگی تھی اور اکا دکا بادل بھٹکے ہوئے مسافروں کی طرح بدحواس سے یہاں وہاں بکھرے تھے۔ وہ اور یوسف چہل قدمی کے لیے نکلے اور ٹہلتے ہوئے بنّی کے کنارے تک چلے گئے۔

"عمر! تم کچھ وقت نکال کر گھر کی الیکٹرک وائرنگ ہی ڈھنگ سے کروا دو۔ ریفریجریٹر اور بریزر کچھ فرصت میں خرید کر لے آؤ۔ ہم پیسے بجھواتے کس لیے ہیں۔ آخر ماں ضرورت کی چیزوں پر کیوں استعمال نہیں کرتیں۔ چولہوں میں پھونکیں مارنے اور کنوئیں سے پانی بھرنے کا دور گزر گیا۔

I dont know whats wrong
with her some times
she acts really wierd

(میں نہیں جانتا ان کے ساتھ کیا مسئلہ ہے بعض اوقات ان کا رویہ بہت عجیب ہوتا ہے۔)

وہ میاں بیوی حکیم بیگم سے ایسے ہی نالاں رہتے تھے۔

"مٹی کے تیل والا چولہا تو میں نے بے جی کو پچھلے مہینے لا دیا تھا مگر وہ استعمال نہیں کرتی اور ریفریجریٹر کا پوچھا تو اس نے منع کر دیا بس ٹیلی فون کا کہہ رہی تھی کہ لگوا دوں اور میں نے اپلائی بھی کر دیا ہے۔"

یوسف نے [illegible] ریت کو پاؤں کی ٹھوکر سے اڑایا۔

"ماں سے کئی بار کہہ چکے ہیں کہ ہمارے ساتھ چلیں لیکن وہ اس بارے میں سوچنے پر بھی آمادہ نہیں ہیں۔ ہم سے زیادہ ان کا سگا کون ہے اور اب انہوں نے ایک نئی ذمہ داری اٹھالی ہے۔ صالحہ اور اس کے بیٹے کو گھر میں رکھنے سے پہلے انہیں کسی سے مشورہ تو کرنا چاہیے تھا۔ اب اگر کچھ کہا جائے گا تو ان کا دل دکھے گا۔"

عمر اس سلسلے میں کیا بول سکتا تھا۔ وہ خود بھی تو ایسی ہی ایک ذمہ داری تھا جو حکیم بیگم نے کسی سے پوچھے بنا ہی اٹھالی تھی۔

"خیر چھوڑو۔ تم نے امریکہ آنے کے بارے میں کیا سوچا؟ اس ملک کے تعلیمی ادارے یورپ اور امریکہ کے معیار تک پہنچنے میں کم از کم سو سال تو ضرور ہی لگا دیں گے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم بھی ماں کی طرح جذباتی ہو۔

لیکن کوئی Melo dramatic response دینے سے پہلے یہ ضرور سوچنا کہ تمہاری آنے والی نسلیں بھی اس فیصلے سے متاثر ہوں گی۔ تم ہاں بھرو تو میں تمہارے کاغذات تیار کرواتا ہوں۔ چند ماہ میں تمہارا ماسٹرز بھی کمپلیٹ ہو جائے گا۔"

اگر کچھ عرصہ پہلے اس سے یہ بات پوچھی جاتی تو انکار کرنے کے لیے اسے ایک لمحہ بھی سوچنا نہ پڑتا لیکن اب بہت کچھ بدل چکا تھا۔ اس نے بنّی کے گہرے بھورے پانی میں گھلتی رات کی سیاہی کو دیکھتے ہوئے اقرار میں سر ہلا دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اسے سگریٹ کی طلب محسوس ہو رہی تھی اور شاید ایک ٹھنڈے مارگریٹا کی بھی۔ اس نے چوتھی مرتبہ ریسٹ واچ میں وقت دیکھا تھا۔ گرانٹ کے کمرے سے کوئی آہٹ نہ آئی تھی۔ وہ یا تو سو چکا تھا یا پھر سونے کے لیے لیٹ چکا تھا۔ کچھ عرصے سے یوں بھی وہ دن [illegible] لیٹ کر گزارتا تھا [illegible] باہر جاتا بھی [illegible] ہر دم [illegible] اونچی آواز میں بڑبڑاتا۔ اپنے کمرے کی چار دیواری میں بند رہتا۔ اس کی ہمہ وقت موجودگی نے صوفیہ کے گھر سے نکلنے کے امکانات محدود کر دیے تھے۔ وہ لباس تبدیل کر چکی تھی اور جوتوں سمیت چادر اوڑھے بستر پر بیٹھی خاصی دیر سے ساتھ والے کمرے میں خاموشی چھانے کی منتظر تھی۔ بظاہر تو حالات اس کے لیے سازگار ہو چکے تھے۔ تاہم تصدیق کرنا ضروری تھا۔ اگر اس کے جانے کے بعد گرانٹ اس کے کمرے میں جھانک لیتا تو اس بات کا قوی امکان تھا کہ صوفیہ کی واپسی پر وہ اسے اندر گھسنے نہ دیتا اور تمام رات اسے فٹ پاتھ پر گزارنا پڑتی۔ ہنگامہ اور گالی گلوچ اس کے سوا تھے۔

وہ کربے پائی سے چل کر گرانٹ کے کمرے کے دروازے تک پہنچی اور دروازے سے کان چپکا دیا۔ پھر اس نے دروازے کی ناب کو دھیرے سے گھما کر ہاتھ کا ہلکا دباؤ ڈالا تو دروازہ مدھم چرچراہٹ کے ساتھ کھل گیا۔ بے اختیار اس کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی تھی۔ ملگجے اندھیرے میں عین اس کے سامنے ایک ہیولہ تھا اور وہ یوں جھوم رہا تھا جیسے کھڑے کھڑے کھلی آنکھوں کے ساتھ سو گیا ہو۔ وہ الٹے قدموں واپس اپنے بستر پر چلی آئی یہ جانتے ہوئے بھی کہ اب اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

"کہاں جا رہی تھیں؟" گرانٹ کی بلغم زدہ آواز پر صوفیہ نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور اسے لگا جیسے وہ مدت بعد اسے دیکھ رہی ہو۔ وہ انتہائی دبلا لگ رہا تھا۔ اس کے بڑیالے کندھے آگے اور نیچے کی سمت جھکے ہوئے تھے اور آنکھیں غیر معمولی حد تک بڑی نظر آ رہی تھیں۔

"میں چیز برگر لینے جا رہی تھی۔ کچن میں کھانے کو کچھ نہیں ہے۔"

"تم جھوٹ بولتی ہو۔" وہ نقاہت بھری آواز میں گرجا۔ "میں نے شام کو اسپیگٹی بنائی تھی میٹ بالز کے ساتھ اور [illegible] پیزا کا سامان چیز اور ٹوپینو ساس بھی ہے۔ اتنا سب ہونے پر تم کیوں نہیں کھا سکتیں؟"

"یہ پرسوں شام کی بات ہے۔"

وہ کچھ دیر کھوئی ہوئی کیفیت میں سوچتا رہا۔ "تو شاید میں بھول گیا ہوں میں بھولنے لگا ہوں۔"

"میں تم سے یہی پوچھنے آئی تھی تو کیا میں جاؤں؟"

"ہرگز نہیں' وقت کیا ہوا ہے؟"

صوفیہ نے ریسٹ واچ پر نظر ڈالی اور اکتائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"ابھی تک دس بھی نہیں بجے۔"

"تم نے باہر قدم نکالا تو واپس نہ آنا۔"

اگر اس کے پاس رہنے کے لیے کوئی اور جگہ ہوتی تو وہ ایسا کرنے میں خوشی محسوس کرتی۔

"یہ میرا گھر ہے اور اس میں وہ ہو گا جو میں چاہوں گا۔ اس وقت صرف آوارہ لڑکیاں باہر نکلتی ہیں۔ میں نے تمہیں آوارگی کی اجازت دے دی تو تم اپنی ماں جیسی بن جاؤ گی۔"

صوفیہ نے ایک طویل سانس بھری اور ریموٹ کنٹرول اٹھا کر ٹیلی ویژن آن کردیا۔ اس کے بعد گرانٹ جو کچھ کہتے جا رہا تھا' وہ اسے ازبر تھا۔ کچھ دنوں سے وہ یہ تقریر سننے سے بچی ہوئی تھی۔ اور آج خود ہی اسے دعوت دے بیٹھی تھی۔ اب نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اس تمام کارروائی سے گزرنا تھا جو ایک عرصے سے ان کی روزمرہ زندگی کا جزو لاینفک بن چکی تھی۔

"میں تمہیں آزاد چھوڑ دوں تو تمہارا انجام بھی اپنی ماں جیسا ہوگا۔ تم نے اتنے سال اس عورت کے سائے میں گزارے ہیں۔ تمہارا ذہن کچا تھا۔ لیکن صحبت کا اثر تو جانوروں پر بھی ہوتا ہے۔ وہ جھوٹی تھی اور تم بھی جھوٹ بولتی ہو۔ اس نے میری دنیا برباد کردی اور تم میری آخرت برباد کرنے پر تلی ہو۔"

صوفیہ نے ٹیلی ویژن کا والیوم بڑھا دیا تھا۔

"تم سمجھتی ہو میں تمہیں اس جیسا بن جانے دوں گا۔ یہ تمہاری بھول ہے۔ میں مرتے دم تک ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ تصور کرو' وہ جسم فروشی کرتی تھی۔ تم بھی یہی کروگی اگر میں تمہیں نہ روکوں۔ خون اپنا اثر ضرور دکھاتا ہے اور تمہارے جسم میں وہی گندہ خون ہے۔ وہ کسی آوارہ کتیا سے بھی بدتر تھی۔" گرانٹ کی آواز لحظہ بہ لحظہ بلند ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے ٹیلی ویژن کا والیوم آخری حد تک اونچا کردیا۔

"میں اس سے نہ ملا ہوتا تو میری زندگی مختلف ہوتی۔ اس نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا۔ مجھے میری محبت سے محروم کردیا۔ وہ لڑکی ڈیزی کا پھول تھی۔ خالص اور معصوم۔ البا نے مجھے اس سے دور کردیا۔" اس کے کانوں تک آواز پہنچانے کے لیے گرانٹ کو چیخنا پڑ رہا تھا۔ اچانک وہ خاموش ہو کر ہانپنے لگا۔ کچھ دیر تک خالی خالی نظروں سے ٹیلی ویژن اسکرین کو گھورتے رہنے کے بعد وہ آگے بڑھا اور سوئچ بینل پر ہاتھ مار کر برقی رو منقطع کردی۔

"وہ کیسی شرمناک موت مری تھی۔" اس نے تھکے ہوئے لہجے میں سلسلہ کلام پھر سے جوڑا۔ "اس کا عذاب تمام نہیں ہوا۔ وہ جل رہی ہوگی۔ تا ابد جلتی رہے گی۔ خدا نے بدکاروں کی یہی سزا مقرر کی ہے۔ تمہیں جہنم سے خوف نہیں آتا صوفیہ' کیا تم بھی اپنی ماں کے پاس جہنم میں پہنچنا چاہتی ہو؟"

اسے بے اختیار ہنسی آگئی۔ جس جہنم میں وہ زندگی بسر کررہی تھی کیا اس کے سوا کوئی اور جہنم بھی اس کا منتظر تھا۔ وہ اپنے سیل فون پر گیم کھیلنے لگی۔

"خدا کے قہر کو آواز مت دو۔ جسم فروش عورتوں جیسا حلیہ بنا کر تم چوری چھپے گھر سے نکل رہی تھیں۔ میں تم پر نظر نہ رکھوں تو تم آوارہ لڑکوں کے ساتھ آزادانہ گھوموگی۔ پارٹیاں' رقص اور نائٹ کلبز' تمہارے گناہوں میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔"

وہ کولہوں پر ہاتھ رکھے یوں جھکا ہوا تھا جیسے بے تحاشا تھک گیا ہو۔ اس کی آواز میں نقاہت بڑھ چکی تھی۔ "تمہیں روکنے کے لیے مجھے جس بھی حد تک جانا پڑا' میں جاؤں گا' تم ہی میری نجات ہو' اگر ایک گناہ گار ماں کی اولاد کو میں گناہ سے بچالوں تو خدا مجھے جنت"

صوفیہ نے اس کے منہ سے سرخ بلبلے اڑتے ہوئے دیکھے۔ اس نے آستین سے اپنا منہ صاف کیا اور کف پر لگنے والے لال دھبے خون کے سوا کسی شے کے نہیں تھے۔ صوفیہ کو اس کے کان کی کچپا پر سادہ نیلاہٹ زدہ گہرا سرخ ابھرا ہوا آبلہ بھی دکھائی دیا۔ ایسے ہی کچھ چھالے کچھ روز قبل اس کی پنڈلیوں کی پشت پر دیکھ چکی تھی۔ وہ روز بروز گھناؤنا ہوتا جا رہا تھا۔ صوفیہ اب اس کی چھوئی ہوئی اشیا استعمال کرنے سے کترانے لگی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ واڈکا کی آدھی بوتل جو اس نے باتھ روم کیبنٹ سے نکال کر اپنے بیڈ کے گدے تلے چھپائی تھی' اسے واپس اسی جگہ رکھ دے۔ کیا خبر گرانٹ نے دہانے کو اپنا غلیظ منہ لگایا ہو۔

صوفیہ گیم ہار گئی تھی۔ اس کا موڈ پٹ گیا تھا۔ اس نے دوبارہ کھیل شروع کیا۔

"تمہاری ماں کے گناہ ایسے رذیل ہیں کہ بیان کرتے ہوئے بھی مجھے شرم آتی ہے۔" وہ اس کی ماں کے فریب کے بارے میں بتانے لگا۔ کیسے اس نے گرانٹ کو مکر جال میں پھنسایا تھا اور کیونکہ اس کی محبت کو اس سے دور کردیا تھا' وہ کیسے مجبور ہوا تھا' کیسی اذیت سے گزرا' صوفیہ کو ایک ایک لفظ معلوم تھا۔ چھوٹی سے چھوٹی تفصیل بھی اسے ذہن نشین ہو چکی تھی۔ گرانٹ سیکڑوں بار یہ سب دہرا چکا تھا۔

گرانٹ کی آواز اب بڑبڑاہٹ سے مشابہ ہو چلی تھی اور قالین پر لمبے گھٹنے اٹھائے ٹیڑھا ہو کر بیٹھ چکا تھا۔ وہ اس سے بالکل لاتعلق ہو کر سیل فون میں مگن رہی۔ جب بولتے بولتے گرانٹ کا گلا بیٹھ گیا اور وہ آٹھویں مرتبہ بھی کھیل جیتنے میں ناکام ہو چکی تھی تو گرانٹ آہستگی سے اٹھا اور جھکے جھکے انداز میں چلتا ہوا اپنے کمرے میں گھس گیا۔ اس نے سیل فون کو بیڈ پر زور سے پٹخ دیا۔ اب تک اس نے جوتے نہیں اتارے تھے۔ اس کا ارادہ تبدیل نہیں ہوسکا تھا۔

ایک گھنٹے بعد جب وہ دبے قدموں گھر سے نکل رہی تھی تو گرانٹ کے نیند میں بڑبڑانے کی آواز دروازے سے باہر تک سنائی دے رہی تھی۔ وہ کوکین اور بوز میں لت پت ہو کر جانے کس سے معافی مانگے جا رہا تھا۔

سڑک کا موڑ مڑتے ہی صوفیہ کو دور سے بیساکھی کے بل اچک اچک کر بے ہنگم چال چلتا میبل دکھائی دیا۔ وہ رک کر اس کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگی تھی۔ میبل اس کے پاس ٹھہرنے کے بجائے سر جھکائے ہوئے خاموشی سے گزرنے لگا تو صوفیہ نے بازو سے تھام کر اسے روک لیا۔

"وقت نہیں ہے۔" اس نے کندھا ہلا کر بازو چھڑوالیا۔

"کس کے پاس وقت نہیں ہے؟" اس نے میبل کا کالر زور سے مٹھی میں جکڑ لیا۔

"وہ ناراض ہوگا۔ میں واپس گیراج جاؤں گا۔ کچھ کاغذ لینے ہیں گھر سے' انکل انتھونی غصے میں تھا۔"

"اگر اتنی جلدی تھی تو وہ خود کیوں نہیں آگیا۔ تم جیسے 'تیز رفتار' آدمی کو کیوں بھیج دیا۔"

میبل پھر سے جانے کے لیے کسمسایا۔ "جانے دو' مجھے دیر ہوگئی ہے۔"

"تمہیں میری بات سننا ہوگی۔ میں تمہیں اس کے بغیر نہیں جانے دوں گی۔ میں بہت اداس ہوں۔"

صوفیہ نے کالر کو جھٹکا دے کر اسے جھکا دیا۔

"تم اداس ہو' رونا مت' میں تمہاری مدد کرتا ہوں۔" اس نے اپنا بھدا ہاتھ پتلون سے رگڑ کر صاف کیا اور پھر تشویش بھرے انداز میں اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اس کے بال سہلانے لگا۔

صوفیہ نے کالر چھوڑ کر اس کا ہاتھ سختی سے ہٹا دیا تھا۔

"میں رو نہیں رہی ہوں۔ مورون۔ اپنے گندے ہاتھ مجھ سے دور رکھو۔"

"ٹھیک ہے تم اداس نہیں ہو۔ میں بھی نہیں ہوں۔" وہ ہنسنے لگا۔

"تم گیراج میں کرتے کیا ہو؟"

"دیکھو' رجسٹر میرے پاس ہوتا ہے۔ میں سارا حساب کرتا ہوں۔"

"تو پھر تمہارے ہاتھوں پر گریس کیوں لگی ہے۔" صوفیہ نے اپنے بالوں میں پر انگلیاں رگڑ کر ہاتھ کو سونگھتے ہوئے پوچھا۔

"میں دوسرے کام بھی کرتا ہوں۔"

"وہ انتھونی تمہیں کتنی تنخواہ دیتا ہے؟"

"مجھے پتا نہیں۔"

"کیا مطلب' تمہیں پتا نہیں؟"

"وہ خود اپنے پاس رکھتا ہے۔"

"کیوں؟"

"اسے پتا ہے۔" میبل نے سر کو زور سے ہلایا تھا۔

"وہ کمینہ ہے' کاغذات میں وہ تمہیں اپنا تنخواہ دار ملازم ظاہر کرتا ہے۔ تمہیں تنخواہ بھی نہیں دیتا اور ٹیکس کے چند ڈالر بھی بچا لیتا ہے۔"

"وہ میرا خیال رکھتا ہے۔"

"وہ تو میں دیکھ ہی رہی ہوں۔ اچھا سنو' تمہیں کیا لگتا ہے کارل میکارتھی مجھ سے پیار کرتا ہے یا نہیں؟"

میبل خاموش کھڑا پلکیں جھپکانے لگا۔

"میں اس کی سب گرل فرینڈز سے زیادہ خوب صورت ہوں۔ اس میں کچھ شک نہیں اور میں ان سب سے بڑھ کر طرح دار بھی ہوں۔ بس ایک چھوٹی سی مصیبت ہے' خدا نے اس کے دل میں میرے لیے پیار نہیں ڈالا۔ خدا نے دنیا کے کسی بھی شخص کے دل میں میرے لیے پیار نہیں رکھا۔ حتیٰ کہ اس نے میری سگی ماں کو بھی اس خصوصیت کے بغیر بنایا۔ وہ میرے لیے اس دھات کی طرح تھی۔" اس نے میبل کی بیساکھی پر زور سے ہاتھ مارا۔ "ٹھوس اور ٹھنڈی' وہ مجھے اس جنونی آدمی کے حوالے کر گئی جو مجھے... لیکن خدا سے میں کچھ نہیں مانگوں گی۔ نتیجہ مجھے پہلے سے معلوم ہے۔ وہ نہیں دے گا' اس نے کبھی مجھے کچھ نہیں دیا۔"

میبل نے پورا منہ کھول کر جماہی لی اور غنودہ آواز میں بولا۔ "بہت تھک گیا ہوں' مجھے نیند آرہی ہے۔" شاید وہ بھول چکا تھا کہ اسے گیراج واپس پہنچنا تھا۔

صوفیہ نے اس کے گھنگھریالے بال مٹھی میں لے کر اسے جھنجوڑ ڈالا۔

"میری بات غور سے سنتے رہو' آنکھیں مت بند کرو۔ کیا کارل اس مدقوق شکل والی لنڈسے سے دوبارہ ملنے لگا ہوگا۔ پھپلز نے اس کی صورت بگاڑ دی تھی۔ اس نے مجھے ایک فون بھی نہیں کیا۔ وہ اپنے ایک سو پچاس bucks کے لیے ہی رابطہ کرلیتا۔ ایک آخری فون کال' اور وہ کہتا میں تمہیں ڈمپ کررہا ہوں۔ تم میری محبت کے قابل نہیں ہو۔ تم نے مجھ سے ڈیٹ پر جانے کی قیمت کیوں وصول کی ہے۔ میں تمہیں واقعی پسند کرنے لگا تھا' لیکن تم نے میرے جذبے کو پہچانا ہی نہیں۔ تم بہت بڑی احمق ہو اور میں کوئی..."

میبل آنکھیں موند کر بیساکھی کے سہارے جھولنے لگا تھا۔

صوفیہ نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر سیدھا ہوا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔

"تمہیں میری بات سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔ تم اتنے بے وقوف کیوں ہو۔ جانور بھی تم سے زیادہ سمجھ دار ہوتے ہیں۔" اس نے ایک اور تھپڑ میبل کے گال پر مارا۔ اس نے انگوٹھی پہن رکھی تھی' جس کا نوکیلا سرا لگنے سے میبل کی آنکھ کے نیچے والی جلد پھٹ گئی اور خون کی ننھی ننھی بوندیں پھوٹ پڑیں۔ وہ تکلیف سے بلبلا اٹھا تھا۔

"مجھے نہ مارو' مجھے درد ہوتا ہے۔" وہ سہم کر چند قدم دور ہٹ گیا۔

"تمہیں درد کی سمجھ آتی ہے۔ درد کی سمجھ سب کو آتی ہے' تمہیں پتا ہے رات کے اس پہر تم میرے سامنے کھڑے بے چاروں کی طرح کیوں رو رہے ہو۔ یہ خدا کی مرضی ہے' وہ چاہتا ہے کہ تمہیں درد ہو۔ وہ تم سے نفرت کرتا ہے۔ اسی لیے اس نے تمہیں سفید فاموں کی دنیا میں کالا بنایا۔ تمہاری اس دنیا میں کسی کو ضرورت نہیں تھی' پھر بھی خدا نے تمہیں بنگی بھی سے بنایا اور تمہیں یہاں بھیج دیا۔ صرف تمہارا تماشا دیکھنے کے لیے۔ تم اتنے بدصورت ہو کہ کسی بھی نفیس سفید فام کو تمہاری صورت دیکھ کر متلی ہوسکتی ہے۔ اس نے تم سے تمہارے ماں' باپ اور بہن بھائی چھین لیے اور تمہیں معذور کردیا تاکہ تم زمین پر رینگتے پھرو۔ مسز میک گریگور کا Landseer (ایک بڑا جھبرا کتا) بھی تم سے بہتر زندگی گزارتا ہے۔ اس کی مالکن کم از کم انتھونی جیسی بے حس نہیں ہے۔ وہ اسے شیمپو سے نہلاتی ہے۔ اس کی پشم میں کنگھی کرتی ہے اور اس کے پسندیدہ بسکٹ اسے کھلاتی ہے۔ لیکن تمہیں تو انتھونی نے کبھی پچکارا تک نہیں اور یہ سب خدا کی چاہت ہے میبل۔"

وہ اب ہچکیوں سے رو رہا تھا۔

"وہ مرنے کے بعد بھی تمہارے درد میں کمی نہیں ہونے دے گا۔ اس نے تمہارے لیے جہنم دہکا رکھا ہے۔ جب تم نے جہنم میں ہی جانا ہے تو تم گناہ کیوں نہیں کرتے' کچھ ایسا کر جاؤ کہ تمہیں جہنم میں جلنے پر

پچھتاوا نہ ہو۔ کسی کو جان سے مار ڈالنے کے بارے میں کیا خیال ہے انتھونی کو یا پھر مجھے۔ ایک ہی بار بھڑک کر بھسم ہوجاؤ۔ موم کی طرح کیوں سلگتے ہو۔"

بلکتا ہوا میبل مڑ کر جانے لگا تو صوفیہ نے اس کی واحد پنڈلی پر زور سے ٹھوکر ماری۔

"چلے جاؤ نگر اور کبھی مجھے اپنی شکل نہ دکھانا۔ تمہیں دیکھ کر مجھے گھن آتی ہے۔" وہ چلا کر بولی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس رات وہ تین بجے کے بعد بار سے لوٹا تو تھکن سے چور تھا۔ وہ Bar back کی حیثیت سے کام کرتا تھا اور اس کی ڈیوٹی آخری شفٹ میں تھی۔ لاسٹ کال کے بعد جس کا وقت رات دو بجے مقرر تھا اور جس کے اعلان پر آخری گاہک کو بھی رخصت کردیا جاتا' وہ بار ٹینڈرز کے ساتھ مل کر ٹوٹی ہوئی بوتلیں' گلاسوں کا کانچ اور تلف کیے جانے کے لائق گارنشز کو پلاسٹک کے تھیلوں میں جمع کرکے ڈمپ سٹر میں ڈالتا۔ استعمال شدہ گلاسوں کو دھو کر ہوا میں خشک ہونے کے لیے چھڑوں میں معلق کردیتا۔ فرش پر بچھے ربر میٹ جو بیئر اور کاک ٹیلز گرنے سے چپ دار اور متعفن ہوجاتے تھے' انہیں دھونے کے بعد فرش کی صفائی کرتا اور آخر میں بار کی سطح اور میزیں صاف کرکے اگلے دن پہلی شفٹ کے لیے تنظیم قائم کردیتا۔

اس بے زار کردینے والی مشقت سے روز ہی ان کا بدن اور ذہن کلی انکار کرتے تھے' مگر آج معمول سے بڑھ کر کچھ ہوا تھا۔

اس کی شفٹ کا آغاز ہی ہوا تھا کہ دو نوجوان لڑکوں نے جو شاید آزمودہ کار نہ تھے' ایک پینٹ کے دو' دو گلاس پینے کے بعد میز اور فرش پر قے کردی تھی۔ اس سے قبل بھی اس فرش پر سے یہ گندگی صاف کرنا پڑی تھی۔ لیکن ایسا ہمیشہ بار خالی ہونے کے بعد ہوا کرتا تھا۔ اس نے لوگوں کی بھیڑ میں کبھی یہ رذیل کام نہ کیا تھا۔ لیکن آج وہ مجبور ہوگیا تھا۔ ساتھ والی میزوں پر بیٹھے لوگ اٹھ کر گوشوں میں سمٹ گئے تھے اور چند

افراد بار سے باہر جانے والی راہ بھی اپنا رہے تھے۔ اسے سب کی موجودگی میں گھٹنوں کے بل جھک کر سر کندھوں پر گرا کر وہ غلاظت صاف کرنا پڑی تھی۔ وہاں کسی نے بھی اس کی کیفیات کو محسوس نہ کیا ہوگا' مگر وہ ان لمحات میں خود کو دنیا کا سب سے حقیر آدمی سمجھ رہا تھا۔

اپارٹمنٹ کے دروازے پر لگی کال بیل بجانے کے بعد ایک لمحے کا توقف کیے بغیر وہ دروازے کو ہتھیلی سے پیٹنے لگا تھا۔ اس کے پاس دروازے کی چابی تھی' لیکن رائن نے اندر سے بولٹ چڑھایا ہوا تھا۔ پانچ منٹ تک مسلسل دروازہ بجانے پر بھی جب کوئی رد عمل ظاہر نہ ہوا تو اس نے دروازے کو ٹھوکر مارنے کے لیے پاؤں اٹھایا ہی تھا کہ رائن نے آنکھیں مسلتے ہوئے دروازے کا پٹ ذرا سا وا کیا۔ اس نے رائن سے کچھ بھی کہے بنا اندر جانے کی کوشش کی تھی' کیونکہ وہ زبان کھولتا تو سوائے گالی کے کچھ برآمد نہ ہوتا۔

"رکو۔ تم اندر نہیں آسکتے۔ میری بات تو سن لو' پلیز رکو۔" رائن غنودہ آواز میں بولا اور بازو موڑ کر اس کی چھاتی پر رکھتے ہوئے اسے اندر جانے سے روک دیا۔

"رائن! میں تمہیں سنجیدگی سے بتا رہا ہوں کہ اس وقت میرے ساتھ الجھنے کی غلطی ہرگز نہ کرنا' میں کسی بھی حد تک جاسکتا ہوں۔" اس نے رائن کو دھکیلنے کی کوشش کی تھی۔

"وہ سوزن آئی ہوئی ہے' وہ تمہاری صحبت کو بالکل پسند نہیں کرے گی۔ بہت نفیس طبیعت کی ہے۔ تم سے بو آرہی ہے۔ تم کار میں کیوں نہیں سو جاتے۔" رائن سوئی جاگی کیفیت میں بول رہا تھا۔

احمد کا جی چاہا کہ وہ رائن کا دم گھونٹ کر اسے مار ڈالے اور اس نازک طبع سوزن کا سر کلیننگ سلوشن سے بھیگے ہوئے اپنے بھاری جوتوں سے کچلنے کے بعد عقبی کھڑکی سے چھلانگ لگا کر اس اذیت ناک زندگی کا اختتام کردے۔

اس نے مٹھی بھینچ کر رائن کے ماتھے پر ضرب لگائی

اور چیخ کر بولا۔

"مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہاری ماں کوئی بدکردار عورت تھی۔ کتیا کے بچے! میں کسی روز تمہیں جان سے مار دوں گا۔ میں تمہارے ساتھ رہنا ہی نہیں چاہتا' میرا سامان باہر نکال دو' میں ابھی کہیں اور چلا جاؤں گا۔"

رائن چند لمحے اپنا ماتھا سہلاتا رہا' پھر سابقہ نیند بھرے لہجے میں کہنے لگا۔

"بار بیک ہونے کا یہ ہی ایک فائدہ ہے کہ مفت ڈرنکس ملتی ہیں۔ میں نے برا نہیں مانا۔ مجھے معلوم ہے تم نشے میں ہو۔ تمہاری ان باتوں کا کوئی مطلب نہیں ہے۔ کار کی چابی تو تمہارے پاس ہے نا۔ صبح جلدی اٹھ جانا۔ مجھے دس بجے وارنر برادرز اسٹوڈیو جانا ہے اور میرے لکی موزے نہیں مل رہے۔ شام سے ڈھونڈ رہا ہوں۔ تم نے تو نہیں دیکھے۔ وہ رائل بلیو رنگ کے ہیں۔" سر کھجاتے ہوئے مڑ کر اس نے دروازہ بند کر دیا تھا۔

کچھ دیر احمد اکھڑے ہوئے' روغن والے بند دروازے کو جلتی آنکھوں سے گھورتا رہا اور پھر دروازے پر لگاتار ٹھوکریں رسید کرنے لگا۔ سامنے والے اپارٹمنٹ سے خمیدہ کمر والا ڈونلڈ آنکھیں ملتا ہوا نکلا تھا اور کچھ گالیاں بکنے کے بعد دوبارہ اندر غائب ہو گیا تھا۔

عمارت کے پارکنگ لاٹ کی گھٹن زدہ فضا میں اسے سخت گھبراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ وہ کار کو باہر سڑک پر نکال لایا اور سمت کا تعین کیے بنا روانہ ہو گیا۔ رائن کے ان دھلے رائل بلیو لکی موزے اسے پیسنجرز سیٹ کی گدی پر ایک میسن جار میں گھسیڑے ہوئے مل گئے تھے۔ اس نے جار سمیت انہیں کھڑکی سے باہر فٹ پاتھ پر اچھال دیا تھا۔

رائن کے ساتھ مزید ایک دن بھی گزارنا اس کے لیے ناقابل برداشت ہو چکا تھا۔ وہ غلیظ' لاپروا' بے حس اور ڈھٹائی کی حد تک بے شرم تھا۔ ہفتے میں ایک یا دو بار احمد کو ضرور ہی کار میں رات بسر کرنا پڑتی تھی۔

وہ رائن کے طرز بود سے نہایت عاجز آچکا تھا اور کب کا اپارٹمنٹ چھوڑ کر جا چکا ہوتا۔ اگر اس کے پاس کوئی بھی معقول متبادل ہوتا' پھر رائن کی کار استعمال کرنے کی سہولت سے دستبردار ہونا بھی ایک مسئلہ تھا اور یہ مسئلہ رہائش سے بھی زیادہ اہم تھا۔ وہ اپنی قلیل آمدنی میں سے تھوڑا تھوڑا پس انداز کر رہا تھا اور اسے امید تھی کہ وہ آٹھ' دس ماہ تک ایک سیکنڈ ہینڈ واکس ویگن خریدنے کے قابل ہو جائے گا۔ اور شاید اس دوران کسی فلم' کمرشل یا ٹیلی ویژن سیریل میں کوئی رول مل جائے اور بار کی نوکری کو ترک کرتا۔

سوچتے ہوئے اس نے خود کو ٹوک دیا تھا۔ وہ پھر سے ناممکن کو ممکن شمار کر رہا تھا۔ اس کی خوش فہمیوں کی عمر تمام ہوئے ایک مدت بیت چکی تھی۔ پر امید جانے کیوں ایسی سخت جان تھی' کسی طرح دم توڑتی ہی نہ تھی' سلگتی' کبھی مدھم جلتی' کبھی بھڑک اٹھتی' لیکن بجھنے کا نام نہ لیتی۔

اپنی سوچوں میں گم ایک چوراہے سے کار موڑتے ہوئے اسے اچانک یوں محسوس ہوا جیسے ونڈ اسکرین اور کھڑکیوں کے شیشوں سے ان گنت ننھے شرارے چھوٹے ہوں۔ اس نے شدید دھماکہ سنا اور جسم کو لگنے والے دھچکے سے بے ساختہ اچھل کر اسٹیئرنگ وہیل کے اوپر چھاتی کے بل گرا۔ نشست سے جدا ہوتے ہوئے اس کا سر اور کندھوں کی پشت دھاتی چھت سے ٹکرائے تھے۔ خاصی دیر وہ کسی مردے کی طرح بے حس و حرکت' اسی حالت میں پڑا رہا۔ جب ذہن نے کام کرنا شروع کیا تو اسے دھیرے دھیرے سمجھ میں آگیا کہ کسی گاڑی نے اس کی کار کو عقبی سمت سے ٹکر ماری تھی اور کار جو نہایت سست روی سے چل رہی تھی' سڑک سے اتر کر ایک درخت کے تنے سے ٹکرانے کے بعد رک چکی تھی۔ وہ آہستگی سے سیدھا ہو کر بیٹھا اور اپنے جسم کو ٹٹولتے ہوئے چوٹوں کا جائزہ لینے لگا۔ بظاہر سب کچھ ٹھیک ہی لگ رہا تھا۔ ماتھے اور ہاتھوں پر ہلکی خراشیں تھیں۔ پسلیوں' گردن اور گھٹنوں میں درد کا احساس تھا' مگر وہ برداشت کی حد سے

تجاوز نہیں ہوا تھا۔ گاڑی کی ونڈ اسکرین اور ایک کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ چکا تھا۔ پچھلی نشست بھی ایک طرف سے قدرے پچکی ہوئی نظر آتی تھی۔

پھر دھیان اس کی جانب منتقل ہوا جو اس حادثے کا باعث بنا تھا۔ اس کا ذہن واضح نہیں تھا کہ غلطی کس کی تھی' لیکن بہرحال اسے عقب سے دھکیلا گیا تھا تو غالب امکان یہ ہی تھا کہ غفلت دوسرے فریق نے دکھائی تھی۔

وہ نیچے اترا' کار کو لاک کیا اور کسی قدر لنگڑا کر چلنے لگا۔ کچھ دور فٹ پاتھ پر پرانے ماڈل کی گہرے سرخ رنگ کی کار آڑی کھڑی ہوئی تھی۔ اس کا اگلا فینڈر اور ایک ہیڈ لائٹ ٹوٹ کر جھولنے لگے تھے۔ بونٹ کا کونا بھی اندر دب گیا تھا۔ اس نے نزدیک پہنچ کر کھڑکی کے شیشے سے اندر جھانکا اور شیشے پر انگلیوں سے دستک دی۔ کوئی جواب نہ پا کر اس نے ڈور ہینڈل پکڑ کر باہر کی جانب کھینچا تھا۔ دروازہ لاکڈ نہیں تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر سرخ بالوں والی لڑکی سر جھکائے خاموشی سے ساکت بیٹھی تھی اور کار میں [illegible] احمد نے [illegible] آواز دے کر اسے متوجہ کرنے کی کوشش کی لیکن شاید وہ اب تک صدمے کی کیفیت میں تھی۔ کئی بار بلند آواز میں پکارنے پر بھی کوئی رد عمل ظاہر نہ ہوا۔ پھر جب اس نے لڑکی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے ذرا سا ہلایا تو وہ یوں متحرک ہو گئی جیسے اسی بات کی منتظر تھی۔ وہ اچانک چیختے ہوئے اپنے نکیلے ناخنوں سے احمد کے بازوؤں کو بری طرح کھسوٹنے لگی تھی اور اگر وہ فوراً" دور نہ ہٹتا تو شاید اس کی کلائیاں لہولہان ہو چکی ہوتیں۔

"یہ کیا بے ہودگی ہے' تمہیں احساس ہے تم نے کیا کیا ہے؟ اور بجائے معذرت کرنے کے تم مجھے مزید چوٹ پہنچا رہی ہو۔ اگر میری کار درخت سے بھڑ کر رکتی نہیں اور الٹ جاتی تو شاید میں مر ہی گیا ہوتا۔ تم نے تو میری جان لینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔" وہ سخت طیش کی حالت میں اسے برا بھلا کہنے لگا تھا اور

جواب میں اس کی کھکھلاتی ہنسی سن کر ساکت ہو گیا۔

وہ گاڑی سے اترنے کے لیے کسی مخمور — کی طرح ڈول کر اٹھی' پہلے ایک ٹانگ باہر نکالی اور دو' تین بار زمین کو پاؤں سے چھونے کے بعد' جھجکتے ہوئے نیچے اتری۔ وہ ایک زرد رو دراز قامت لڑکی تھی۔ اس کے پتلے ہونٹوں پر لگی گہری لپ اسٹک بکھری ہوئی تھی اور ہونٹوں کے گوشے گیلے سے لگتے تھے۔

" cops کو مت بلانا' مجھے ان سے نفرت ہے' نہیں' نفرت نہیں' ڈر لگتا ہے' پولیس کار کو دیکھا تو میں بھاگ پڑی۔

وہ مجھے breth reath breth liser میں سانس لینے کو کہتے تو پتا چل جاتا۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر لوگوں کو گرفتار کر لیتے ہیں۔" اس کی باتیں بے ربط اور آواز لڑکھڑاہٹ زدہ تھی۔ breathalyzer کہنے کے لیے اسے بہت جدوجہد کرنا پڑی تھی۔

"بربن ہمیشہ میرے ساتھ یہ ہی کرتی ہے۔ مجھے میرے ہاتھ تو نہیں کانپ رہے' دیکھنا ذرا غور سے دیکھو' لیکن وہ بربن نہیں تھی' شاید جن نہیں' جن بھی نہیں' "رم... رڈرم' پر وہ مفت تھی۔ بالکل مفت ایک بھی سینٹ خرچ نہیں ہوا۔" وہ ہنسنے لگی اور ڈگمگاتی ہوئی احمد کے پاس آگئی۔

"مجھے نیند آ رہی ہے' میں تمہیں پکڑ کر سوؤں گی' ورنہ گر سکتی ہوں۔"

اس نے پھر کر لڑکی کو پرے دھکیل دیا تھا۔

"میں تمہیں خود پولیس اسٹیشن لے چلتا ہوں۔ تمہارا نشہ وہ لوگ ایک منٹ میں اتار دیں گے۔ تم جیسے لوگوں کو جیلوں میں ہونا چاہیے۔ سڑکوں پر آزاد گھومنے کے لائق نہیں ہو تم۔"

اسے مسلسل ہنستے پا کر احمد نے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔ اس لڑکی سے الجھنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ کسی بھی بات کو صحیح مفہوم کے ساتھ سمجھنے سے قاصر تھی اور احمد سوچ رہا تھا کہ اس معاملے سے کیسے نمٹے

اسے اپنے جسم اور کپڑوں سے شراب کی بو آرہی تھی۔ اس کی آستینیں اور ٹراؤزرز کے پائنچے تیز مہک والے سستے صابن کے محلول سے سنے ہوئے تھے۔ وہ ایک بھرپور غسل کی شدید خواہش محسوس کررہا تھا۔ بے خوابی کے درد سے اس کی آنکھیں جھلستی تھیں۔ اس کا مضمحل بدن ایک آرام دہ بستر مانگ رہا تھا۔ اور ایسے میں پولیس آفیسرز کی کڑی نگاہوں اور چبھتے ہوئے سوالات کا سامنا کرنا اسے نہایت ناپسندیدہ خیال لگ رہا تھا۔ وہ لاشعوری طور پر ہمیشہ ہی پولیس سے کترایا کرتا تھا اور اس ذہنی و جسمانی کیفیت میں تو سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔

"تمہارا پرس کہاں ہے؟" احمد نے اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے پوچھا۔ "اس میں کتنی رقم ہے؟ میں تمہیں صرف اس صورت میں جانے دوں گا کہ تم مجھے گاڑی کا ورکشاپ کا خرچ فراہم کردو۔ ورنہ دوسرا راستہ سیدھا پولیس اسٹیشن کو جاتا ہے۔ بلکہ جانے کی بھی کیا ضرورت ہے۔ میں cops کو یہیں بلا لیتا ہوں۔" اس نے لڑکی کو خوفزدہ کرنے کے لیے اس کے منہ پر ایک تھپڑ بھی مار دیا تھا۔

"مجھے بے وقوف سمجھتے ہو۔ الکوحل میرے دماغ کو بند نہیں کرتا۔ میرے شعور کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ زیادہ چالاک مت بنو۔ میں سوبر ہوں۔ سو سمجھو میں ایک ٹانگ پر کھڑی ہو سکتی ہوں۔" وہ احمد کا کندھا پکڑ کر اچکتے ہوئے ایک پاؤں اٹھانے کی سرتوڑ کوشش کرنے لگی۔ تھپڑ کا اس پر تل برابر بھی اثر نہ ہوا تھا' اور وہ مسلسل اول فول بکے جارہی تھی۔ جھنجلا کر احمد نے اسے زور سے دھکا دیا۔

"میں تمہارے پرس کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ مجھے اپنے نقصان کی قیمت چاہیے بلکہ تم رہنے دو۔ میں خود ہی لے لیتا ہوں۔" اس نے ڈرائیور والی طرف کے کھلے ہوئے دروازے کو دھکیلتے ہوئے بند کیا تھا۔

"میں cops کو بلاؤں گی۔ تم ظالم ہو۔ میں تمہارا ڈرائیونگ لائسنس کینسل کروادوں گی۔ ایک پولیس آفیسر میرا دوست ہے پر شاید۔ ایسا فلم میں تھا۔ مجھے یاد نہیں آرہا۔"

وہ گھٹنوں اور کہنیوں کے بل رینگتی ہوئی اس کے پیچھے آنے لگی۔

"میرے پرس میں بہت مزے دار چیزیں ہیں۔ میں تمہیں بھی دوں گی۔ تم دکھی ہو۔ تمہیں غم بھولنے کی ضرورت ہے۔ ڈرو مت۔ میں تمہیں دوں گی۔ جادو کی چیزیں۔" اس نے احمد کے پیروں کے قریب فٹ پاتھ پر بیٹھے بیٹھے بازو لمبا کرکے ڈرائیو سیٹ کے نیچے سے ایک لیڈیز بیگ نکالا اور اس میں ہاتھ ڈال کر کچھ تلاش کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد اس نے ایک درمیانے درجے حجم کی بوتل جو کسی قسم کے لیبل سے عاری تھی۔ نکال کر احمد تھمادی تھی۔

"پیو۔ یہ تمہاری ہمدرد ہے۔ دوست ہے۔ سب کی دوست ہے۔" احمد نے چند لمحے سوچنے کے بعد بوتل کا ڈھکن ہٹایا اور دہانے کو ناک سے قریب کرتے ہوئے سونگھا۔

اس نے ہچکچاتے ہوئے بوتل میں سے ایک چھوٹا سا گھونٹ لیا۔ ذائقہ نہایت تلخ تھا' اسے حلق میں شدید جلن محسوس ہوئی۔

لڑکی ہسپانوی میں مسلسل کچھ بڑبڑا رہی تھی لیکن احمد نے اس کی آواز پر دھیان دینا بند کردیا تھا۔ ایک دھند سی تھی جو اس کے حواس پر غلاف کی طرح لپٹ رہی تھی۔ اچانک اسے ہنسی آگئی۔

"تم نے رائن کی کار توڑ دی۔ اچھا کیا۔ میرا دل بھی یہی کرتا تھا۔ توڑ دی تم نے توڑ دی۔ توڑ دی۔۔۔ سب کچھ توڑ ڈالا۔"

ساتھ والی سیٹ پر ٹانگیں پسار کر بیٹھی ہوئی لڑکی کے سر پہ دھپ مار کر وہ اسے گالیاں دینے لگا۔ وہ ان سب لوگوں کے نام جن کی طرف سے اسے ذلت سہنا پڑی تھی' یاد کرکے انہیں گالیاں دینے لگا۔ حیرت کی بات تھی کہ اسے ایسا کرتے ہوئے مزہ آرہا تھا۔ اس

کے اندر ایک بے عنوان خوشی پھیل رہی تھی۔

بوتل میں الکوحل کے سوا جانے کیا تھا کہ اس کا سر گھومنے لگا تھا اور جوتوں میں مقید اس کے پیروں کے انگوٹھوں میں سنسناہٹ دوڑ رہی تھی۔ اس نے لڑکی سے کہنا چاہا کہ اسے نیند آرہی ہے اور وہ لیٹنا چاہتا ہے لیکن اس سے کہا ہی نہیں گیا۔ وہ اس قدر تھک چکا تھا کہ اس سے زبان بھی ہلائی نہ جاتی تھی۔ وہ لڑکی تو ہسپانوی بولے جارہی تھی اور احمد کو اس زبان سے خاص واقفیت نہیں تھی۔ اس سے کچھ کہنے کا فائدہ بھی کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس کی آنکھوں پر اتنا بوجھ تھا کہ اسے پپوٹے کھولنے کے لیے سخت مشقت کرنا پڑی تھی۔ پلکیں ذرا سی جدا ہونے پر اس نے دوبارہ آنکھیں بھینچ لی تھیں۔ روشنی کسی تیز دھار چاقو کی انی تھی جو اس کی پتلیوں کو چیر رہی تھی۔ اس کی کنپٹیاں درد سے بھری تھیں۔

بمشکل اٹھ کر اس نے بستر سے نیچے اترنا چاہا اور لڑکھڑا کر فرش پر ڈھیر ہوگیا۔ اسے الٹی آرہی تھی۔ قے کرتے ہوئے اس کے بدن کے سارے مساموں سے پسینہ پھوٹ پڑا اور آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ اس نے ایک ہاتھ کا لمس اپنے بالوں میں محسوس کیا تھا۔ وہ سرخ بالوں والی ہسپانوی لڑکی تھی۔

وہ اس کے ساتھ گھسٹتا ہوا ایک ادھ کھلے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے پاؤں بے حد وزنی تھے اور انہیں اٹھا کر زمین پر دھرنا ایک صبر آزما کام تھا۔ وہ کمرہ دراصل باتھ روم تھا۔ نلکوں سے گرتا ہوا پانی نہایت پرشور آواز کے ساتھ باتھ ٹب کے داغ دار پینڈے سے ٹکرا کر چھینٹیں اڑا رہا تھا۔

لڑکی نے قوت کے ساتھ اسے دھکیلتے ہوئے اس کا سر یخ ٹھنڈے پانی کی موٹی دھار تلے دبا دیا تھا۔ اس کا سانس الٹنے لگا۔ اس نے خود کو آزاد کروانے کی کوشش کی تھی۔ اس کے اعضاء میں مزاحمت کی سکت ہی نہیں تھی۔ چند لمحوں بعد اس نے کھولتے ہوئے گرم پانی کو اپنے سر پر پڑتا ہوا محسوس کیا تھا۔ اس نے ہاتھ پاؤں مار کر اپنا سر پانی کے نیچے سے نکالنے کی ایک اور سعی کی۔ کچھ پانی اس کے کھلے ہوئے منہ اور ناک کے ذریعے حلق میں بھی چلا گیا تھا۔ خاصی دیر بعد اس نے گردن اور سر پر سے ہاتھوں کا دباؤ ہٹتے ہوئے پایا تھا۔ لڑکی نے تولیے سے اسے خشک کرتے ہوئے پوچھا کہ وہ کیسا محسوس کررہا تھا تو اس نے جواب میں کہا۔

"خاصا بہتر۔" بیڈ پر دیوار کا سہارا لے کر بیٹھنے تک واقعی اعصاب کے بوجھل پن میں کمی ہوچکی تھی۔ اس کی کنپٹیوں میں ہونے والا درد تقریباً" عنقا ہوگیا تھا۔ اور پپوٹے پہلے جیسے بھاری نہ رہے تھے۔ گردن ڈھلکا کر اس نے آس پاس نظریں گھمائیں۔

وہ ایک مختصر اور بے ترتیب کمرہ تھا۔ کھڑکی کے ذرا سے ہٹے ہوئے پردے کی اوٹ سے اس نے باہر اترتی شام کو دیکھا اور حیران ہوا۔ وہ کتنا وقت سویا رہا تھا۔ یا مدہوش رہا تھا۔ اسے یاد نہیں تھا۔ رائن کو آج وارنر براورز اسٹوڈیوز جانا تھا۔ اس کے اور swinger کے یوں غائب ہوجانے پر وہ سخت کوفت میں مبتلا رہا ہوگا۔

جانے وہ لڑکی اسے کہاں لے آئی تھی اور اس حالت میں اس نے ڈرائیونگ کیسے کی ہوگی؟ ایک آواز سن کر اس کی توجہ کھڑکی کے قریب دیوار کے ساتھ رکھے کاٹ کی طرف منعطف ہوئی۔ ایک بچہ کاٹ میں لیٹا ہاتھ پاؤں ہلا رہا تھا۔ اس کی عمر بمشکل ڈیڑھ دو ماہ ہوگی اور شاید وہ لڑکی تھی۔ اس کے نقوش سے ایسا ہی تاثر ابھرتا تھا۔ تو وہ اس کے رونے کی آواز تھی۔ پھر احمد نے ہسپانوی لڑکی کو دروازہ کھول کر اندر آتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں کانچ کا گلاس تھا جس میں اس کے بالوں کی رنگت سے ملتا جلتا سیال بھرا ہوا تھا۔

"اسے پی لو۔"

احمد نے ہاتھ بڑھا کر گلاس لے لیا تھا۔ "کیا ہے یہ؟"

"بلڈی میری (واڈکا اور ٹماٹر کے رس پر مبنی ایک کاک ٹیل) سوچو مت۔ پیگ اور (کثرت شراب

خوشی کے بعد پیدا ہونے والی نفسیاتی و جسمانی کیفیات) میں اس سے بڑا افاقہ ہوتا ہے۔ تم بس خاموشی سے پی جاؤ تمہیں اچھا لگے گا۔"

"ہمارے درمیان جو کچھ بھی ہوا۔ میرا اس میں کوئی ارادہ شامل نہیں تھا۔ اگر میرا ذہن صحیح کام کر رہا ہوتا تو میں یہ کبھی نہ ہونے دیتا۔" اس نے وضاحت کرنا ضروری سمجھا تھا۔

مونا اسٹوکر کے بعد اس نے کسی بھی لڑکی کے "نزدیک" آنے کی غلطی نہیں کی تھی۔

"تم میرے لیے desconocido نہیں ہو۔"

"میں کیا نہیں ہوں؟"

"تم اجنبی نہیں ہو۔ میں نے پچھلے سال تمہیں سانتا کلاز پریڈ میں دیکھا تھا۔ اور تب میرے سر پر eros (محبت کا یونانی دیوتا) کا مجسمہ معلق تھا' میں اس کے محبت بھرے پروں کے سائے میں تھی۔ اس نے موہ کا بان مجھ پر آزمایا۔ میں تب ہی تمہاری محبت میں مبتلا ہو گئی تھی اور اس وقت سے تمہیں ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔ میں نے تمہیں ہالی وڈ بلیوارڈ اور سن سیٹ بلیوارڈ کے آس پاس کے علاقوں میں بہت تلاش کیا لیکن تم ملے ہی نہیں اور آج قسمت نے ہمیں خود ملا دیا۔ میں بہت خوش ہوں۔"

چاہے احمد اس وقت بھی بلڈی میری کے دیے ہوئے خمار میں تھا لیکن اسے بالکل بھی شبہ نہیں تھا کہ لڑکی کی بات سچ ہو سکتی تھی۔

"میں پچھلے سال کرسمس پریڈ میں نہیں گیا تھا۔" اس نے تردید کی۔

"تو اس سے پچھلے سال گئے ہو گے۔ محبت میں وقت کا حساب رکھنا ممکن ہی کہاں ہے۔" اس نے اپنی ابھری ہوئی ہنسلی کی ہڈی کو انگلیوں کی پوروں سے چھوتے ہوئے کہا تھا۔

"میں کبھی بھی اس پریڈ میں شریک نہیں ہوا۔ کسی بھی سال نہیں۔"

"تو پھر وہ تمہارے جیسا کوئی ہو گا لیکن۔۔۔" اس نے چند لمحوں کا توقف کیا۔ "تمہارے جیسا کوئی اور کیسے ہو سکتا ہے۔ تم تو صرف ایک ہی ہو۔ اور تم میرے ہو۔"

احمد کو لگا جیسے وہ لڑکی اب بھی نشے میں تھی۔

وہ البا مارسیلو تھی۔ کچھ سالوں قبل پامپلونا سے لاس اینجلس آئی تھی۔ احمد کی طرح اسے بھی اداکاری اور شہرت کا شوق یہاں کھینچ لایا تھا۔ وہ چند غیر اہم فلموں میں ایکسٹرا کے طور پر کام کر چکی تھی اور اس کی جز وقتی ملازمت ڈاؤن ٹاؤن لاس اینجلس میں ایک ڈپارٹمنٹ اسٹور کے لیے ماڈلنگ کرنے کی تھی۔ لیکن کچھ ماہ پہلے کسی معمولی کوتاہی کو بنیاد بنا کر اسے ماڈل کی حیثیت سے محروم کر دیا گیا تھا اور ان دنوں وہ صرف اپنے ایکٹنگ کیریئر پر دھیان دے رہی تھی۔ وہ بچی صوفیہ البا کی بہن کی بیٹی تھی جس کی پیدائش کے محض دو ہفتے بعد ہی اس کے ماں باپ ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہو گئے تھے۔ اور اب اس کی ذمہ داری البا کے سپرد تھی۔

احمد نے سوچا تھا کہ البا اور اس کی مڈبھیڑ one night stand ثابت ہو گی مگر اس کا قیاس درست نہیں تھا۔ اگلی رات دو بجے بارٹینڈر ایلون کے جانے کے بعد جب وہ اکیلا ہی صفائی کا کام نمٹانے میں مگن تھا تو کاؤنٹر میں سے باسی پھل علیحدہ کرتے ہوئے اسے فرش پر گونجتی اونچی ایڑی کی ٹک ٹک سنائی دی تھی۔ اس نے سر اٹھایا اور البا اسے بار کے سامنے ایک اسٹول پر بیٹھنے کے لیے جھکتی ہوئی نظر آئی۔ کچھ لمحوں کے لیے وہ ساکت ہو گیا تھا۔

"تمہیں یہاں کا پتا کیسے معلوم ہوا؟"

البا نے باؤل میں سے چیری کا خوشہ اٹھا کر منہ میں ڈالا اور اسے چبائے بغیر زبان کی مدد سے گال میں تھماتے ہوئے بولی۔

"تمہارا ڈرائیونگ لائسنس تمہارا آئی ڈی۔۔۔ تمہاری بار کا تشہیری کارڈ' سب کچھ تو تمہاری جیبوں میں تھا۔ پھر بھی پوچھ رہے ہو۔"

کہنیاں بار کی سنگ پر رکھ کر وہ آگے جھکی اور تب احمد نے عین اوپر جلتے ہوئے گلوب کی تیز روشنی میں دیکھا کہ البا کے بالوں کی اصل رنگت سرخ نہیں تھی۔ اس کی پیشانی کے قریب چند لٹیں بھوری تھیں۔ اس نے بالوں کو رنگا ہوا تھا۔

"مجھے ایک "بلڈی میری" مل جائے گا۔ کاک ٹیلز میں سے سب سے زیادہ پسند ہے مجھے۔ لیکن میں اس کی قیمت ادا نہیں کروں گی۔ یہ ہاؤس کی طرف سے ہو گا۔"

☼ ☼ ☼

اس رات کے بعد بلاناغہ ہر رات البا بار میں آنے لگی۔ وہ "لاسٹ کال" تک کسی میز پر بیٹھی اس کے فارغ ہونے کی منتظر رہتی۔ احمد ڈرنکس سرو کرنے کے لیے جس طرف بھی رخ کرتا' البا کی نظروں کو خود پر جمے ہوئے پاتا۔ چاہے اس کے پاس رکنے یا اسے مخاطب کرنے کے لیے احمد کو ایک لمحہ بھی میسر نہ ہوتا' وہ بنا کسی کوفت کے گھنٹوں تحمل کے ساتھ اس کا انتظار کرتی۔ یہاں سے وہاں جاتے ہوئے جب بھی احمد کی نظر اس پر پڑتی' وہ اسے دیکھ کر مسکرانے لگتی یا ہاتھ ہلا کر اپنی موجودگی کا احساس دلاتی یا پھر کوئی رنگین اشارہ اچھال دیتی۔ احمد کو اس ارتکاز سے بعض اوقات الجھن ہونے لگتی تھی۔ اسے البا ناپسند نہیں تھی اور وہ اس کے ساتھ کوئی دیرپا تعلق قائم کرنے کا بھی خواہاں نہیں تھا۔

تمام کسٹمرز کے جانے کے بعد احمد اور ایلون صفائی کے لیے کمر کستے تو البا بھی ان کے ساتھ شامل ہو جاتی۔ منع کرنے کے باوجود وہ احمد کے حصے کا تقریباً تمام کام اپنے ذمے لے لیتی۔ پھر وہ دونوں خالی ہال میں بیٹھ کر چند ایک ڈرنکس پیتے اور باتیں کرتے۔ البا پوری رات اس کے ساتھ بتا دیتی اور احمد کو شک گزرتا کہ اس سے ملنے کے سوا البا کو دنیا میں کوئی کام تھا ہی نہیں۔ جب بھی وہ البا سے استفسار کرتا کہ وہ رات بھر کے لیے صوفیہ کو کس کی نگرانی میں چھوڑ آتی ہے تو وہ کوئی واضح جواب دینے کے بجائے موضوع ہی بدل ڈالتی۔ اس نے زیادہ تجسس بھی ظاہر نہیں کیا۔ کیونکہ یہ سراسر البا کا ذاتی معاملہ تھا۔

ابتدا میں احمد نے اس کی حوصلہ شکنی کرنے اور پہلو تہی برتنے کی اپنی سی کوشش کر کے دیکھ لی تھی پر البا نے ذرا سا بھی اثر قبول کیے بنا پیش قدمی جاری رکھی۔ اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ احمد کو بھی اس کا ساتھ نسبتاً "کم ناگوار" لگنے لگا۔ اتنا عرصہ اپنے خول میں بند ہو کر جینے کے بعد اسے سنانے کے لیے کوئی سامع درکار تھا اور البا کے ساتھ فروعی نوعیت کی باتیں کرنے سے اس کے اندر کی گھٹن کم ہو جاتی تھی جیسے کارخانوں کی چمنیاں دھواں اگل کر اندرونی فضا کو شانت کر دیتی ہیں۔

البا سے ملتے ہوئے اسے قریباً "ایک ماہ بیت چکا تھا اور اس دوران کسی ایک رات بھی البا نے بار میں آنے والے معمول کو توڑا نہ تھا۔ جب ایک بار وہ بار کے بند ہونے تک بھی نہ آئی تو احمد کے علاوہ ایلون نے بھی اس کی غیر موجودگی کو محسوس کیا تھا۔

"تمہاری "بلڈی میری" کہاں ہے۔" ایلون نے تیسری بار اس سے پوچھا تھا۔ البا کے پسندیدہ کاک ٹیل اور اس کے بالوں کی رنگت میں مماثلت کی بنا پر ایلون نے اس کا نام بلڈی میری رکھ چھوڑا تھا۔

"مجھے کیا معلوم۔" اس نے بے نیازی ظاہر کی۔

"تو کسے معلوم ہے؟"

"وہ کل آئے گی تو اس سے ہی پوچھ لینا۔"

"تو وہ کل آ رہی ہے؟"

"یہ تو وہی جانتی ہے۔"

"تم کچھ نہیں جانتے؟"

"کیا تم دیکھ نہیں رہے میں مصروف ہوں۔" احمد نے ان دھلے ہوئے گلاس سنک میں ڈھیر کیے۔

"کیا تم دونوں کے بیچ کوئی ناراضی ہو گئی ہے؟"

"جو میں کر رہا ہوں مجھے ختم کرنے دو۔"

"یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ تم اگر پریشان ہو تو اسے فون کر لو۔" وہ کسے ہوئے جبڑوں کے ساتھ گلاس دھونے میں جتا رہا۔

"تم اگر پہلے سے فون کر چکے ہو تو مجھے بتا دو۔ ویسے

زیادہ دیر تم سے ناراض رہ ہی نہیں سکتی۔ وہ تمہاری محبت میں سرتاپا ڈوبی ہوئی ہے۔ مانو تم تو اس کے لیے ایسے ہی ہو جیسے ”بلڈی میری“ میں ٹماٹر کارس، تمہارے بغیر وہ نہ تو bloody (لہو الیی لال) سکتی ہے اور نہ ہی merry (مسرور)۔“ وہ خاموش ہو گیا۔ احمد نے جان بوجھ کر ایک گلاس سنک کے کنارے سے ٹکرا کر توڑ ڈالا تھا۔ ایلون کے سوالات بند کرنے کا اسے اور کوئی طریقہ نہیں سوجھا تھا۔ بعد میں وہ اپنے رد عمل پر متعجب بھی ہوا۔ اس قدر طیش میں آنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ شاید وہ اس لیے جھنجلا رہا تھا کہ البا کے نہ آنے سے اسے بار کی ابتری سمیٹنے کا فرض خود نبھانا پڑا تھا۔

دوسری رات اور پھر تیسری رات بھی وہ نہ آئی تو احمد کو تشویش ہوئی۔ اس نے البا کو ٹیلی فون کرنے کا بھی سوچا لیکن پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔ شاید وہ کسی مصروفیت میں پھنسی ہو گی یا بیمار ہو اور ممکن تھا وہ اکتا گئی ہو اور مزید اس سے ملنا نہ چاہتی ہو۔ اس آخری توجیہہ کو تسلیم کرنے سے اس کا دل صاف انکار کرتا تھا۔ احمد سے اکتا جانا ایک معمولی شخصیت والی لڑکی کے بس کی بات نہ تھی۔

چوتھی رات جب وہ بار سے واپس آیا تو اپارٹمنٹ کے دروازے کو اندر سے بند پا کر دھک سے رہ گیا۔ رائن گزشتہ دو دن سے نیویارک گیا ہوا تھا۔ جہاں مارٹن آرتھر کی ایک فلم کے کچھ مناظر مین ہٹن کے علاقے میں آن لوکیشن فلم بند ہونا تھے۔ اور رائن مارٹن کا اسٹینڈ ان تھا۔ آج دوپہر کو اس نے فون پر احمد کو بتایا تھا کہ وہ ایک ہفتے بعد لوٹنے والا تھا۔ تو پھر اپارٹمنٹ میں کون تھا۔ کچھ دیر تذبذب میں مبتلا رہنے کے بعد اس نے کال بیل بجائی اور تنے ہوئے اعصاب کے ساتھ دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ جس نے اطلاعی گھنٹی کا جواب دیا اسے وہاں دیکھنے کی احمد کو ہرگز توقع نہ تھی۔

”البا! تم اندر کیسے داخل ہوئیں؟“ اس نے حیرت پر قابو پاتے ہوئے سوال کیا۔

”میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی ہتم میری کمی کو اتنی شدت سے محسوس کرو گے۔ میں روزانہ ایلون کو فون پر پوچھتی تھی اور اس نے بتایا کہ تم میرے بغیر کتنے اداس ہو۔ وہ کہہ رہا تھا کہ تم بہت چڑچڑے ہو گئے ہو۔ میں بیان نہیں کر سکتی میں کتنی خوش ہوں۔ میں دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی ہوں۔“

”تم نے اپارٹمنٹ کا دروازہ کیسے کھولا؟“ احمد نے سوال دہرایا تھا۔ ”میں نے ایلون کے ساتھ مل کر تم سے چھوٹا سا مذاق کیا۔ میرا مقصد ہرگز تمہیں دکھ دینا نہیں تھا۔ تم مجھ سے خفا تو نہیں ہو؟“

”تمہارے پاس چابی کہاں سے آئی؟ شام کو میں خود دروازہ لاک کر کے گیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔“

”کچھ دنوں پہلے میں تمہارا والٹ دیکھ رہی تھی تو مجھے خیال آیا کہ تمہارے اپارٹمنٹ کی چابی کی ایک نقل بنوا لینی چاہیے۔ بس یونہی کیا خبر کب ضرورت پیش آجائے۔ تمہیں دوبارہ بھی تو ہینگ اوور ہو سکتا ہے اور دیکھ لو اگر میں ایسا نہ کرتی تو میرے اچانک سامنے آنے پر جو خوشی تمہیں ملی ہے۔ اس کی شدت اتنی زیادہ تو نہ ہوتی۔ اچھا دیکھو میں بہل یا غم میں زیادہ دلکش تو نہیں لگ رہی۔“

تب پہلی بار احمد کو اس لڑکی سے خوف آیا تھا۔

☆ ☆ ☆

شیو بناتے ہوئے اس نے رائن کی پکار سنی اور باتھ روم کا دروازہ تھوڑا سا کھولتے ہوئے باہر جھانکا۔

رائن ہاتھ میں ٹیلی فون کا ریسیور پکڑے اسے باہر نکلنے کے لیے کہہ رہا تھا۔

”تمہارے لیے فون ہے۔ نہیں وہ تمہاری ہسپانوی دوست نہیں ہے جس سے تم نے ابھی تک مجھے نہیں ملوایا۔ یہ تو ایڈی بلیک ول ہے۔ بہت ہی غیر معروف اور ناکارہ قسم کا ایجنٹ ہے۔

میں پچھلے دو منٹ سے اسے سمجھا رہا ہوں کہ میرا دوست کسی غیر اہم کردار سے اپنے کیریئر کا آغاز نہیں کرنا چاہتا ہے اسے جتنا عرصہ بھی انتظار کرنا پڑ جائے لیکن وہ بضد۔“

احمد نے جھاگ میں ملفوف ہاتھ اپنی شرٹ سے رگڑتے ہوئے رائن کے ہاتھ سے ریسیور جھپٹ لیا تھا۔

ایڈی بلیک ول کوئی بھی رسمی جملہ ادا کرنے کی زحمت گوارا کیے بنا مطلب کی بات پر آگیا۔

”ایک انڈیپنڈنٹ پروڈکشن ہے۔ بجٹ بہت قلیل ہے۔ پروجیکٹ سے جڑے سب ہی لوگ غیر معروف ہیں۔ بالکل تمہاری اور میری طرح۔ ”یقیناً“ ایڈی نے رائن کی ہرزہ سرائی سن لی تھی۔ ”میرا وعدہ ہے کہ آئندہ تمہارے لیے یقیناً“ اس سے کچھ بہتر کروں گا۔ تم میں مجھے وہ جنون نظر آتا ہے جو آج کل کے نوجوانوں میں ناپید ہوتا جا رہا ہے۔“ احمد دم سادھے سنتا رہا۔

”خوشی کی بات یہ ہے کہ وہ تمہیں ایک part speaking (مکالمے والا کردار) کے لیے بلا رہے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ میرے آفس میں تم ایکٹر بننے کا ذکر سنتے ہی بھڑک اٹھے تھے۔“

ریسیور پر جمی اس کی نم ہتھیلی اور بھی مرطوب ہو گئی۔ ایڈی کا ذہن اس ایک جملے میں اٹک کر رہ گیا تھا۔ ”وہ مجھے ایک اسپیکنگ پارٹ کے لیے بلا رہے ہیں۔“

☆ ☆ ☆

اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے اسے جو سطر پڑھنے کے لیے کہا تھا۔ وہ اطالوی میں تھی۔ ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ اس نے اجنبی الفاظ پر نظریں دوڑائیں اور بے بس سے اسسٹنٹ ڈائریکٹر کو دیکھنے لگا۔

”تمہیں اطالوی پڑھنا نہیں آتی۔“ احمد کی خاموشی کو محسوس کر کے اس نے پوچھا تھا۔ وہ اسے کیا بتاتا کہ اس کی اٹالین مقامی ریستورانوں کی فہرستوں میں لکھے اطالوی کھانوں کے ناموں تک ہی محدود تھی۔ اور یہ کہ پڑھنے کے علاوہ اسے اطالوی بولنا بھی نہیں آتی تھی۔ وہ اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے ہونٹوں سے برآمد ہونے والے اگلے فقرے کی منت کرنے لگا۔

”تم نے میرا وقت برباد کیا ہے۔“ ”یا پھر“ ایڈی میں پیشہ ورانہ رویے کا فقدان ہے۔ کیا سوچ کر اس نے تمہیں میرے پاس بھیج دیا۔“

وہ گھٹنے سختی سے آپس میں ملائے پیروں کو اضطراری کیفیت میں جنبش دے رہا تھا۔

”ایڈی نے خاص طور پر تمہارا نام تجویز کیا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ تم کسی بھی مردانہ آواز اور لہجے کی ہو بہو نقل اتار سکتے ہو۔“

اس کے پیروں کی حرکت موقوف ہوئی۔

”اس نے درست کہا ہے۔“

”ابھی دیکھ لیتے ہیں۔ میں تمہیں ایک ٹیپ شدہ آواز سنوا رہا ہوں۔ تم مجھے اس کی نقل کر کے سناؤ اور پھر مجھے طے کرنے دو۔“

”ٹھیک ہے۔“

وہ ایک درمیانی عمر کے مرد کی آواز تھی جس میں کھرکھراہٹ کا خفیف عنصر تھا۔ جوں ہی ان چند جملوں کی گونج تھمی۔ احمد نے آواز و انداز میں کسی تحریف کے بنا من و عن انہیں دہرا دیا۔

اگر سامنے بیٹھا شخص متاثر ہوا بھی تھا تو اس نے اپنے تاثرات سے ظاہر نہیں ہونے دیا۔

”اچھا اب میرے پیچھے اس اطالوی جملے کو دہراؤ۔ لیکن آواز مورگن کی طرح ہی رکھنا۔“ تو آواز کے مالک کا نام مورگن تھا۔

وہ مختصر اور آسان سا فقرہ تھا۔ احمد کو مورگن کے لب و لہجے میں اسے ادا کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی تھی۔ اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے گردن کو خم دیا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔ پھر وہ احمد کو اس کا کردار سمجھانے لگا جو ایک قاتل کا تھا۔ وہ مجسم سماعت بن گیا۔

وہ ایک بہت ہی عجیب سا کردار تھا اور اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے اس قدر کفایت لفظی سے کام لیا تھا کہ اس کے لیے کچھ بھی نہ پڑا۔ احمد نے ایک دفعہ اسے ٹوکتے ہوئے کچھ چیزوں کی وضاحت مانگی اور ایک مشورہ دیا تو وہ آگ بگولہ ہو گیا تھا۔ اس نے اتنی کرختگی سے احمد کو

جھاڑ کر دوبارہ اسے کچھ کہنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔ بس وہ اتنا ہی سمجھ سکا وہ کردار ہیروئن کو قتل کر دیتا ہے۔ اس کردار کو نبھانے کے لیے اسے ایک کمونو ور کار تھا جو اسے خود مہیا کرنا تھا اور اس کا چہرہ پردے پر نہیں دکھایا جائے گا۔ اسے مایوسی تو ہوئی لیکن جو بھی مل رہا تھا غنیمت تھا۔ کم از کم کریڈٹس میں اس کا نام تو شامل کیا جائے گا۔

"منگل کے دن صبح دس بجے سیٹ پر پہنچ جانا۔"

"کیا ہم ریہرسل کریں گے؟"

اسے نفی میں جواب ملا تھا۔ "اس ایک لائن کو بولنے کے لیے تمہیں ریہرسل کی ضرورت ہے؟"

"کوئی ضرورت نہیں۔ میں تو ایسے ہی۔" وہ بوکھلاہٹ زدہ آواز میں بولا۔

"کیا مجھے فلم کا پورا اسکرپٹ مل جائے گا پڑھنے کے لیے۔ میں اپنے کردار کی اصل روح کو سمجھ کر اسے ادا کرنا چاہتا ہوں۔"

اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کی دماغی صحت کے بارے میں مشکوک ہو گیا ہو۔

"تم پاگل تو نہیں ہو؟ ایک لمحے سے پہلے یہاں سے نکل جاؤ ورنہ میں اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔"

احمد کے ذہن میں بہت سے سوالات کلبلا رہے تھے اور جواب پانے کے لیے اسے کوئی اور راہ ڈھونڈنی تھی۔ وہ اکتایا ہوا شخص جو اپنے کام میں بالکل اناڑی لگتا تھا، اسے مزید برہم کرنے کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا تھا۔

اسے ہر حال میں فلم کا پورا اسکرپٹ پڑھنا تھا، جب تک اسے معلوم ہی نہ ہو کہ قاتل کا دوسرے کرداروں کے ساتھ کیا رشتہ تھا اور اس کے اعمال کے پیچھے کون سی ذہنی روش کار فرما تھی، وہ کیونکر ایک سطر کے اس مکالمے کو اس کے درست معانی کے ساتھ ادا کر پائے۔ منگل صرف دو دن کی دوری پر تھا اور اتنی تھوڑی مہلت میں اسے ڈھیروں کام کرنا تھے۔ اس کی رگوں میں دوڑتے خون کی گردش تیز ہو گئی۔ دو گھنٹوں کی دوڑ دھوپ کے بعد وہ یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ فلم کی کہانی ایک ناول سے لی گئی تھی۔

بالی ووڈ بلیوورڈ پر pickwick بک اسٹور سے اسے temptation (ترغیب) نامی وہ ناول مل گیا تھا۔ وہ تیسرے درجے کا رومانی تھرلر تھا اور کہانی بے سروپا ہونے کے ساتھ ساتھ سستی جذباتیت سے اٹی پڑی تھی۔ احمد کو اس کے ادبی معیار سے سروکار نہ تھا۔ اس کا مطمع نظر تو محض اپنے کردار کی گتھی سلجھانا تھا۔

"مے فلاور" کافی شاپ میں بیٹھے بیٹھے اس نے وہ ناول پڑھ لیا تھا اور کہانی ذہن نشین کر لی تھی۔ پھر وہ ریمزے کے bistro کی جانب روانہ ہوا جہاں اینجلو janitor کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ اطالوی اینجلو ایلون کا دوست تھا اور کبھی کبھار بار میں اسے ملنے کے لیے آجایا کرتا تھا۔ احمد کی بھی اس سے رسمی جان پہچان تھی۔

اس نے اینجلو کو وہ mimeographed ورق دکھایا اور اسے وہ جملہ بولنے کو کہا۔ اینجلو کو سنجیدگی اپنانے پر مجبور کرنے کے لیے اسے قریباً" دس منٹ صرف کرنا پڑے تھے۔

"اس طرح نہیں اینجلو! ایسا انداز مت اپناؤ جیسے تم کوئی لکھی ہوئی عبارت پڑھ کر سنا رہے ہو۔ کاغذ کی طرف مت دیکھو اسے بھول جاؤ۔ تمہارے لہجے میں استحقاق ہونا چاہیے۔ حق جتا کر بولو۔ جیسے تمہیں یقین ہو کہ جب تم اسے پارک میں ملاقات کے لیے کہو گے تو وہ ہر صورت وہاں پہنچے گی۔ محسوس کر کے بولو۔"

اینجلو کوڑھ مغز اور بد مذاق تھا۔ خاصی دیر اسے زچ کرنے کے بعد اس نے جملے کو نسبتاً" بہتر انداز میں ادا کیا۔ احمد نے متعدد بار اس کے سامنے الفاظ کو دہرا کر اپنے اطالوی تلفظ کی درستی کا اطمینان کیا تھا۔

اس کی اگلی منزل استعمال شدہ ملبوسات کی دکانیں تھیں۔ رات کی تاریکی گہری ہونے لگی تھی۔ جب اسے ایک فرسودہ کمونو کرائے پر دستیاب ہو سکا۔ پہلی نظر میں ہی احمد نے بھڑکدار رنگوں والے اس کمونو کو ناپسند کیا تھا۔ مگر اس پر سمجھوتے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ اس نے ناول میں بیان کردہ خاکے سے ملتا جلتا مکھوٹا بھی حاصل کیا اور آخر میں فلورسٹ کے پاس پہنچا۔

قاتل کو کون سا پھول ہیروئن کو دینا چاہیے تھا؟ ایسی صورت میں جب وہ مکھوٹے سے منہ ڈھانپ کر خود کو اس کا محبوب ظاہر کر رہا تھا۔ اس نے انتخاب کے لیے پھولوں پر نظریں دوڑائیں۔ ہر پھول کی اپنی ایک زبان تھی۔ آئرس جو دیوتاؤں کا پیامبر تھا۔ بسنتی گلاب ... میں تمہارے بغیر جی نہیں سکتا۔ گلابی کارنیشن ... میں تمہیں کبھی فراموش نہیں کروں گا۔

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ بالآخر اس نے کاسنی gloxinia کو منتخب کیا تھا۔ وہ پھول پہلی نظر میں محبت کی تجسیم تھا۔

اس نے چہار اطراف جلتے بجھتے روشنیوں کے جگنوؤں کو رات کی کالی پوشاک پر چمکتے ہوئے دیکھا۔ اور ایک طویل سانس سینے کی تہہ سے کھینچ کر فضا کے سپرد کی۔

وہ آئندہ صبح ریہرسل کرنے کی تمام تیاری مکمل

☼ ☼ ☼

اگلے روز علی الصبح اس نے رائن کو جگا کر مطلع کیا کہ وہ اس کی کار لے کر جا رہا ہے۔ رائن نے صاف انکار کر دیا تھا۔ اسے خود کہیں جانا تھا لہٰذا اس نے احمد کو بس کے ذریعے سفر کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ مجبوراً" اسے البا کو ٹیلی فون کرنا پڑا۔ وہ اب تک سو رہی تھی لیکن احمد کی آواز سنتے ہی حسب توقع اس پر چھائی کسلمندی دور ہو گئی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ تیار ہو کر اپارٹمنٹ کے دروازے پر آموجود ہوئی اور آتے ہوئے وہ اس کے لیے بیکن اور سنگترے کے رس کا ناشتہ بھی لیتی آئی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ رائن کی موجودگی میں آئی تھی۔ اس سے قبل رائن نے اس کا ذکر ضرور سنا تھا مگر ملاقات نہ ہو پائی تھی۔

"میں بیکن نہیں کھاتا۔" احمد نے عجلت میں سنگترے کا رس پیتے ہوئے البا کو بتایا تھا۔

"مگر کیوں؟ یہ بہت خستہ بنے ہوئے ہیں۔"

"یہ پورک بیلی سے بنتے ہیں اور میں مسلم ہوں۔ میرے لیے پورک ممنوع ہے۔"

"مجھے معاف کر دینا۔ مجھے معلوم نہیں تھا۔"

رائن نے مداخلت کی "تمہیں افسوس کرنے کی ضرورت نہیں۔ انہیں میں کھا لیتا ہوں۔ مجھے کسی قسم کے گوشت کی ممانعت نہیں ہے۔ ویسے میں نے تمہیں پہلے کہیں دیکھا ہے۔ مجھے تمہاری صورت بالکل بھی انجان نہیں لگ رہی۔"

"مجھے یقین ہے، میں تم سے پہلے کبھی نہیں ملی۔" البا نے قطعیت سے کہا تھا۔

"میری یادداشت تو بہت شاندار ہے۔ مجھے کبھی بھی دھوکہ نہیں دیتی۔ جانے کیوں مجھے یاد نہیں آ رہا کہ میں تمہیں کہاں دیکھ چکا ہوں۔" اس نے روئے سخن احمد کی جانب موڑا۔ "تمہاری دوست کی شکل مجھے مانوس لگ رہی ہے۔ یقین کرو یہ میرا وہم نہیں ہے۔"

احمد کو اس کی بات سننے کی فرصت ہوتی تو بھی وہ دھیان نہ دیتا، ان لمحات میں تو یوں بھی اس کے اعصاب پر اپنا کردار اور آنے والا منگل چھایا ہوا تھا۔ وہ ان سنی کرتے ہوئے البا کے ہمراہ باہر نکل آیا تھا۔

مطلوبہ پارک کے سامنے پہنچ کر احمد نے اپنی ٹی شرٹ اور جینز کے اوپر کمونو پہنا اور رنگین جھبوں والا مکھوٹا چہرے پر لگا لیا۔ راستے میں وہ البا کو وہاں آنے کا مقصد مختصراً" بتا چکا تھا اس لیے اس نے کوئی سوال نہ کیا تھا۔

"مجھے بارہ بجے لینے کے لیے آجانا پھر ہم اکٹھے ہی دوپہر کا کھانا کھائیں گے لیکن اس وقت سے پہلے تم پارک میں نہیں گھسو گی کیونکہ تمہاری موجودگی سے میری توجہ بٹ رہی ہے۔ مجھے مکمل یکسوئی چاہیے۔" پارک کے داخلی راستے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے اس نے ہدایت کی تھی۔

اندر آتے ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ بہت جلدی آگیا تھا۔ پارک تقریباً" ویران پڑا ہوا تھا۔ وہ روشوں پر بے مقصد ٹہلنے لگا۔ ہفتہ واری تعطیل اور خوشگوار موسم کی وجہ سے اسے امید تھی کہ جلد ہی لوگوں کی آمد شروع ہو جائے گی۔ اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ سب سے پہلے دو بوڑھی عورتوں اور چار نو عمر لڑکوں کی آمد ہوئی جو شکل و شباہت سے ایک

ہی خاندان کے افراد لگتے تھے۔ ان کے بعد درمیانی عمر کے دو مرد اور پھر ایک یورپی بوڑھا جو پرام دھکیلتا ہوا سبک قدموں سے چل رہا تھا۔

جس کی بھی اس پر نظر پڑی، وہ ایک لمحے کو ضرور ٹھٹکا۔ اس کا حلیہ یقیناً "چونکا دینے والا اور بلاشبہ مضحکہ خیز تھا۔ لیکن احمد کو اس بات کی پروا ہی کب تھی۔ اسے کسی نوجوان دوشیزہ کے پارک میں آنے کا انتظار تھا تاکہ وہ ریہرسل کا آغاز کر سکے۔ حیرت انگیز بات ہوئی کہ اس کا انتظار "انتظار ہی رہا۔ گیارہ بجے تک بھی کوئی جوان لڑکی اسے نہیں مل سکی۔

جب وہ اگلے دن دوبارہ پارک میں آنے کا تہیہ کر کے وہاں سے جانے لگا تو اسے ارغوانی پھولوں کے تختے سے خم کھا کر نکلتی روش پر پگ پگ چلتی وہ لڑکی دکھائی دی۔

اس نے اپنے پلیٹ فارم جوتوں کو پتھریلی روش سے ٹکراتے ہوئے دھمک اٹھانے والی چال اختیار کی اور لڑکی کے نزدیک پہنچ کر اسے پکارا۔

"کارا!"

وہ ایک خوب صورت اور کھوئی ہوئی سی لڑکی تھی جو چہرے مہرے سے جنوبی ایشائی لگتی تھی۔ وہ اس کے بالکل قریب ہو گیا اور ہاتھ میں تھاما کاسنی پھول اس کی طرف بڑھاتے ہوئے گمبھیر لہجے میں بولا۔

mia venuto al parco di domani

cara

چند لمحے اسے حیرانی سے دیکھتے رہنے کے بعد لڑکی نے پھول لے لیا تھا۔ احمد کو یقین تھا کہ وہ جملے کے مفہوم سے نا آشنا تھی۔ لیکن یہ اس کا مسئلہ نہیں تھا۔ پھول اسے دینے کے بعد وہ رکے بغیر آرائشی پودوں کی قطار کی جانب قدم اٹھانے لگا تھا۔ پیچھے دیکھے بنا بھی اسے احساس تھا کہ لڑکی اسی مقام پر رک کر اسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

پیر کے دن وہ بس کے ذریعے اسی پارک میں آیا اور وہ دن نکلنے کے بعد آیا تھا۔ الپا اس کے ارادے سے باخبر تھی۔ وہ دو بجے اسے واپس لے جانے کے لیے آنے والی تھی۔

اس روز صورت حال گزشتہ دن سے یکسر برعکس تھی۔ دوپہر ہونے تک اس نے گملوں میں موجود پانچوں پھول وہی مخصوص جملہ بولتے ہوئے مختلف لڑکیوں کو دے دیے تھے۔ ایک پیلے چہرے والی بے زار لڑکی نے اسے گالی بھی دی تھی لیکن اس نے کوئی احتجاج کیے بنا اگلی لڑکی کی تلاش شروع کر دی تھی۔

جب وہ اپنی مشق سے مطمئن ہونے کے بعد خاموشی سے کھڑا الپا کی آمد کا انتظار کر رہا تھا تو پاکستان سے آئی ہوئی پرنیاں آذر کے نے اسے مخاطب کیا۔ وہ اسی سے ملنے پارک میں آئی تھی۔ احمد حیران رہ گیا تھا۔ اسے بالکل یاد نہیں تھا کہ ماضی میں ان کی ملاقات ہو چکی ہے۔ پھر پرنیاں کی باتوں سے اسے معلوم ہوا کہ گزشتہ دن جس لڑکی کو اس نے gloxinia کا پھول تھمایا تھا، وہ پرنیاں ہی تھی۔ اسے یہ اتفاق خوب لگا تھا۔ پیڑوں کے سبز سائے میں نرم گھاس پر بیٹھ کر اس نے پرنیاں کے ساتھ بہت ساری باتیں کی تھیں۔

احمد نے کئی حسین لڑکیاں دیکھ رکھی تھیں مگر پرنیاں میں کوئی ایسی خاصیت تھی جو ان سب لڑکیوں میں مفقود تھی۔ وہ ہاتھی دانت سے تراشے ہوئے بت کی طرح بے داغ اور دلکش تھی۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں گل گندم کی پتیوں کے رنگ کی تھیں۔ جب آنکھوں کی سطح پر تیرتی کچی دھوپ کے عکس سے چمکتی تو گمان ہوتا گویا نیلگوں سنگریزے اجلے پانی میں ڈوبے ہوں۔ ہنسنے کی خاطر مرطوب ہونٹوں کو کھولتی تو نارنگی کی پھانک سا دہانہ وا ہو جاتا۔ ماتھا چندر ماں، ابرو محراب دار، گردن راج ہنسی سی، ہاتھ کنول روئی، ہر ادا کے سنگ وہ نیا بہروپ بھرتی۔ کبھی دم برفانی صبح ایسی سپید، کبھی شہد آشام کے شگوفوں جیسی تو کبھی پگھلا ہوا سونا۔ احمد نے کسی ایک جسم کو اتنے رنگ بدلتے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن خوبروئی کے ساتھ جو تفاخر ملزوم ہوتا ہے وہ پرنیاں میں ناپید تھا۔ وہ جیسے اپنے حسن سے کلی طور پر بے خبر تھی۔

(باقی آئندہ)

"تمہارے شہر کی ہوا میں سانس لے رہی ہوں سعید احمد۔"

سعید احمد کے موبائل پر پیغام نمودار ہوا۔ سعید احمد نے ایک بار اسکرین پر نگہت کا بھیجا ہوا ایس ایم ایس پڑھا اور سگریٹ کا طویل کش لیتے ہوئے موبائل دوبارہ تپائی پر رکھ دیا۔ مہینوں بعد نگہت نے اسے یاد کیا تھا اپنے مخصوص انداز میں۔ سعید احمد اسے بھلا نہیں پایا تھا وہ ابھی تک اس کے دل سے نہیں اتری تھی۔

ناولٹ

دونوں میں کوئی رابطہ نہیں رہا تھا مگر آج نصف شب کے وقت نگہت کے پیغام نے اسے بیتے ہوئے دنوں کی ایک یاد دلا دی تھی۔

"بہت تیز بارش ہے اور میں برآمدے میں اکیلی کھڑی ہوں۔"

"اکیلی؟"

"مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے" آسمان نظر نہیں آ رہا' ہر طرف اندھیرا ہے اور تیز بارش۔"

"ڈرنے کی کیا بات ہے پاگل؟"

"دور تک کوئی نہیں ہے' میں اکیلی ہوں' چوکیدار پتا نہیں کہاں چلا گیا ہے' میرا دل ڈوب رہا ہے۔"

"ڈرو نہیں!"

"میں کیا کروں' مجھے بہت خوف آ رہا ہے۔"

"چپ' پاگل! اس میں رونے والی کیا بات ہے؟؟"

"میں کیا کروں؟"

"میں آ جاؤں۔۔۔ چھتری لے کر۔۔۔؟"

"تم نہیں آؤ گے' کبھی نہیں آؤ گے سعید احمد۔۔۔ میں جانتی ہوں' میں ہمیشہ اسی طرح اکیلی کھڑی رہوں گی۔" اس نے بھیگی ہوئی آواز میں کہا تھا۔

وہ بھیگی ہوئی آواز اور ڈرا ہوا لہجہ ہمیشہ کے لیے سعید احمد کی سماعت میں محفوظ ہو گیا۔ اس نے ٹھیک ہی کہا تھا' تیز بارشوں میں اس کی کہی ہوئی بات تو ہمیشہ شدت سے یاد آئی۔ "چھتری سایہ تو ہے سہارا نہیں سعید احمد!"

اپنائیت بھرا لہجہ' دل موہ لینے والے الفاظ کا چناؤ اور اس نے وقت بھی تو عجیب چنا تھا' آدھی رات کا وقت'

جب پورا درد جاگتا ہے‘ درد دینے اور لینے والے سب جاگتے ہیں۔ سعید احمد جاگ رہا تھا‘ نگہت جاگ رہی تھی۔ اس نے مختصر الفاظ کو یادوں کی ”مالا“ میں پرو کے بھیج دیا تھا۔

”تمہارے شہر کی ہوا میں سانس لے رہی ہوں سعید احمد!“ کتنا بامعنی اور بھرپور جملہ تھا۔ اس ایک جملے میں ساری کہانی تھی‘ ایسی کہانی جس کے صرف دو کردار تھے اور کوئی تیسرا اس قصے سے واقف نہیں تھا۔ ایسا ہی ایک پیغام بیتے دنوں میں سعید احمد نے نگہت کے نام بھیجا تھا۔ ”اس سڑک پر خنکی بہت ہے۔“ کوئی کیسے جانتا وہ کس سڑک پر سے گزر رہا ہے؟ کہاں کی بات کر رہا ہے‘ مگر نگہت تو اس کی پور پور سے واقف تھی۔

”جانتی ہوں آج میرے اردگرد خوشبو کا ڈیرہ ہے۔“ اس نے جوابی ایس ایم ایس بھیجا تھا۔

”کیسے جانا؟“ سعید احمد حیران رہ گیا۔

”یہاں ایسی خوب صورت صبح کبھی نہیں اتری‘ آج میں سوچ میں پڑ گئی تھی۔“

”کس سوچ میں؟“

”یہ خیال گزرا کہ کسی خوب صورت شخص کے قدم آج یہاں پڑے ہیں۔“

”میں ایک کتاب کی تقریب رونمائی میں آیا ہوں‘ تمہارے ہاسٹل کے سامنے والی سڑک سے گزر کر۔“

”میں نے کب کہا مجھ سے ملنے آئے ہو۔“

سعید احمد نگہت کے ہاسٹل کی سامنے والی سڑک سے گزرا تھا اور نگہت کو خبر ہو گئی تھی کہ اس کے اردگرد خوشبو کا ڈیرہ ہے اور کسی خوب صورت شخص کے گزرنے سے صبح خوشگوار ہو گئی ہے اور وہ شخص سعید احمد ہی ہو سکتا ہے۔ مگر نگہت اس کے شہر کی ہوا میں سانس لے رہی تھی اور سعید احمد کو خبر نہ ہوئی۔ سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے سعید احمد نے موبائل دوبارہ تپائی سے اٹھا لیا۔ اس کا پیغام ایک بار پھر پڑھا اور جواب لکھا ”کیسے آنا ہوا؟“

پیغام بھیج کر وہ موبائل اسکرین پر نظریں جمائے رہا۔ اسے یقین تھا جواب آئے گا۔ ”بے فکر رہو تم سے ملنے نہیں آئی ہوں۔“ یا ہو سکتا ہے وہ کہے۔ ”تمہارے دروازے پر کھڑی ہوں‘ ایک ہاتھ میں پھول اور دوسرے میں کتابوں کا بنڈل ہے‘ دروازہ کھولو!“ وہ یہ بھی کہہ سکتی تھی۔ ”فائزہ کے سامنے بیٹھی ہوں‘ اس کا سر میرے ہاتھ میں ہے۔“

اس سے کچھ بعید نہیں تھا‘ مگر سعید احمد کو جواب موصول نہیں ہوا۔ وہ الجھنے لگا‘ کچھ دیر انتظار کے بعد اس نے پھر پیغام بھیجا۔ ”کہاں ہو؟“

”تمہارے پاس نہیں ہوں کیا؟“ وہ کہے گی۔ سعید احمد نے اپنے آپ کو دلاسا دیا‘ جھوٹی تسلی‘ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اب نگہت سے اس کا وہ رشتہ نہیں تھا‘ وہ تعلق اب نہیں رہا تھا۔

”سعد اللہ کی بارات میں۔۔۔ ثمرقند ہوٹل آجاؤ۔“ دیر بعد مختصر سا جواب آیا اور سعید احمد کا سینہ اتھل پتھل کر گیا۔

☼ ☼ ☼

یہ عجیب بات ہوئی تھی کہ نگہت کے ساتھ ہی فائزہ کی یاد بھی دبے پاؤں چلی آئی تھی۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا‘ ایسا کیوں ہوتا تھا؟ سعید احمد اس بات کا فیصلہ اس وقت کر پایا تھا جب وہ دونوں اس سے مسلسل رابطے میں رہتی تھیں‘ نہ آج سعید احمد کو یہ بات سمجھ میں آرہی تھی‘ جب وہ دونوں ہی اس کے ذہن سے محو ہوتی جارہی تھیں۔

فائزہ جس نے سعید احمد کی کتاب پر خوب صورت تبصرہ لکھا تھا۔ تب تک سعید احمد اس سے ملا نہیں تھا‘ مگر وہ ان چند لوگوں میں شامل تھی جن کے بارے میں سعید احمد کا خیال تھا کہ زندگی کی رعنائی ایسے ہی چند لوگوں سے ہے۔

”سر! آپ کی کہانیوں میں اتنی اداسی کیوں ہوتی ہے؟“ اس نے ایک بار پوچھا تھا۔ سعید احمد کے پاس اس کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ خود نہیں جانتا تھا اس کی ہر کہانی اداس کیوں ہو جاتی ہے اور ہر کہانی کا

اختتام یہ المناک کیوں ہوتا ہے۔

”آپ ہمیشہ جدائی کا رستہ کیوں اختیار کرتے ہیں؟ کبھی تو ملن۔۔۔؟ کسی کہانی کا اختتام تو ملاپ۔۔۔ سر پلیز!“

سعید احمد ہر بار کوشش کرتا تھا مگر فائزہ کی خواہش کا احترام وہ کبھی نہ کر سکا۔ اس نے ہمیشہ اداس کہانی لکھی۔ فائزہ نے تبصرے میں لکھا تھا۔ ”سعید احمد کی کہانیوں کی اداسی کو قاری دھیرے دھیرے اپنی گرفت میں لیتی ہے اور پھر دیر تک اداس رکھتی ہے۔“

☼ ☼ ☼

پچھلے سال فروری کی چودھویں شام سعید احمد کا تعارف نگہت سے ہوا تھا۔ وہ آندھی اور طوفان کی طرح اس سے ٹکرائی تھی۔

”یہ کیا فضول کہانیاں لکھتے ہیں آپ؟“

سعید احمد کو فون پر ایک اجنبی نمبر کی کال پر ایک اجنبی آواز سن کر اتنی حیرت نہیں ہوئی تھی جتنا اس اجنبی کی غیر متوقع بات نے سعید احمد کو چونکا دیا تھا۔ وہ ایک افسانہ نگار تھا اور بہترین ادبی پرچوں میں چھپتا تھا۔ لوگ اس کے افسانوں کو پسند کرتے تھے۔ اس کی دو کتابیں شائع ہو چکی تھیں اور اسے بہت سے تعریفی خط موصول ہوتے تھے جن میں اس کی کہانی کی ستائش اور کرداروں کی توصیف ہوتی تھی۔ کئی لڑکیاں اسے فون بھی کرتی تھیں‘ سعید احمد کی تحریر انہیں پسند تھی اور وہ برملا اس کا اظہار کرتی تھیں‘ مگر یوں زندگی میں پہلی بار کسی نے اسے ششدر کر دیا تھا۔ ایک اجنبی جس سے اس کا کوئی تعارف نہیں تھا اس کی کہانیوں پر تنقید کر رہی تھی۔

”کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔“ سعید احمد واقعی اس کی بات کو سمجھ نہیں پایا تھا۔

”کس زمانے کی کہانیاں آپ لکھتے ہیں‘ اب عورت اتنی مجبور نہیں رہی کہ مرد کی محکوم رہے‘ نہ آج کی لڑکی اتنی بے بس ہے کہ والدین کے ہر غلط فیصلے پر سر جھکا دے۔“ بہت تند و تیز لہجہ تھا اس کا۔ اتنا تیز جو سعید احمد جیسے مرد کو بھی تھوڑی دیر میں اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا۔

”آپ کس کہانی کی بات کر رہی ہیں؟“ سعید احمد نے سیلاب کے آگے کمزور بند باندھنے کی کوشش کی۔

”اس ماہ جو ”دریچے“ میں آپ کا افسانہ ”زرد پتے“ چھپا ہے اس میں آپ نے لکھا ہے کہ انیس سالہ صباحت نے اپنے سارے خواب خود ہی راکھ کر دیے‘ ساری خواہشات کا گلا گھونٹ دیا اور اپنے باپ کے حکم پر سر جھکا دیا۔“ اس کے لہجے میں بہت تلخی تھی جو سعید احمد کو اپنے اندر اترتی محسوس ہو رہی تھی۔

”جی ہاں۔ میں نے افسانے میں یہی لکھا ہے۔“

”بالکل بکواس لکھا ہے۔“ فون والی کا لہجہ یک دم اتنا کسیلا ہو گیا کہ سعید احمد اپنے ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ اس لہجے میں کبھی کوئی اس سے مخاطب نہیں ہوا تھا۔ ایسے کڑوے لفظوں میں کبھی کسی نے اس سے بات نہیں کی تھی۔ ایسی تلخ بات سننے کا وہ عادی نہیں تھا۔ یہ نہ جانے کون تھی جو سارے حساب آج ہی چکانے والی تھی۔

”پلیز!“ سعید احمد نے بڑے تحمل سے کہا۔

”یہ کیسے ممکن ہے کہ جو لڑکی بچپن سے کسی کے خواب دیکھتی رہی ہو‘ اس کی زندگی کا ہر سانس کسی کی امانت ہو‘ وہ دل کسی کو دے چکی ہو اور اچانک ایک روز باپ کے حکم پر ریت کے سارے گھروندے توڑ کر کسی اور کے محل میں جا بسے‘ اپنا جسم کسی اور کے حوالے کر دے‘ جسے اس نے چاہا تک نہیں‘ کبھی زندگی میں پہلے کبھی دیکھا۔“ اس کی بات بہت کڑوی تھی اور لہجہ مزید کڑوا ہوتا جا رہا تھا۔

”ہمارے ہاں ایسا ہی ہوتا ہے‘ میں نے ایسا ہی لکھ دیا ہے۔“ سعید احمد نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ وہ کم گو شخصیت تھا‘ کم بولتا تھا۔ کسی اجنبی سے یوں بات کرنا اس کے لیے بہت مشکل تھا اور جب بولنے والا بغیر کسی رو رعایت کے بولتا چلا جا رہا ہو۔

”وہی عام مردوں والی سوچ ہے آپ کی بھی۔ عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھنا۔ لڑکی کو بکری اور گائے کی

طرح جہاں جس کھونٹے سے چاہے باندھ دیتا اور اس کی روح کو قتل کرکے اپنی کامیابی پر جشن مناتا کہ میری بیٹی نے میری حکم عدولی نہیں کی میری بہن نے میری لاج رکھ لی۔ کیوں کرتے ہو تم مرد ایسے؟ کیوں عورت کو دکھ دے کر تمہیں تسکین ملتی ہے؟ بولو جواب دو!"

اس نے سعید احمد کو یوں مخاطب کیا تھا جیسے کلاس میں ٹیچر کسی بچے کو کھڑا کرلیتی ہے اور اس سے وہی سوال پوچھتی ہے جو اسے یاد نہیں ہوتا۔ یا عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ملزم کی طرح جس پر عائد جرم کی شیٹ جج کے سامنے رکھی ہوتی ہے اور وہ ان سوالوں پر جواب دہ ہوتا ہے جو اس نے خود کبھی سوچے نہیں ہوتے۔ سعید احمد بھی اس وقت کلاس میں ٹیچر کے سامنے کھڑا سبق بھولا ہوا طالب علم تھا یا عدالت کے کٹہرے میں سر جھکائے ملزم، جس کے حواس اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے، ہر بات وہ سن تو رہا تھا مگر ٹھیک سے سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

"آپ کون ہیں؟" پھنسی آواز میں بمشکل اس نے پوچھا۔

"میرا نام نگہت ہے اور میں تمہارے افسانے کی انیس سالہ لڑکی صباحت جیسی نہیں ہوں جس نے باپ کے حکم پر سر جھکا دیا اور چپ چاپ پینتالیس سالہ شخص آفیسر کی پھولوں والی کار میں بیٹھ گئی۔ میں نے چھ کینال کی کوٹھی والے بوڑھے مل اونر کی انگوٹھی پہننے سے انکار کردیا ہے اور اپنے بھائی کا گھر چھوڑ کر ہوسٹل میں آگئی ہوں۔ تم مجھے باغی کہہ سکتے ہو۔"

کڑوے لہجے میں بات شروع کرنے والی نے کسیلے لفظوں میں بات ختم کرکے کال ختم کردی۔ سعید احمد موبائل فون کان سے لگائے بہت دیر تک گم صم بیٹھا رہ گیا۔ اس نے جو لکھا تھا وہ غلط نہیں تھا۔ زمانہ بدل گیا تھا، سب کچھ پہلے جیسا نہیں رہا تھا، رویے، نہ لوگ، مگر ایسی کہانیاں ابھی عام تھیں۔ لڑکیاں تو خواب دیکھتی ہیں، سپنے بوتی ہیں، مگر زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ آخر کار والدین ہی کرتے ہیں۔ بیٹیاں چپ چاپ اس فیصلے پر سرنگوں ہوجاتی ہیں۔

باغی کی بات میں بھی وزن تھا، وہ دلیل سے بات کررہی تھی۔ نا صرف بات کررہی تھی بلکہ عملی طور پر اس نے ثابت کردیا تھا۔ وہ بھائی کی خواہش کے مطابق بوڑھے مل مالک کی چھ کینال کی کوٹھی کی مالکن بننے کے بجائے اپنے باپ کا گھر بغاوت کرکے چھوڑ آئی تھی اور اب ہاسٹل میں تھی۔ سعید احمد کو وہ اجنبی لڑکی اپنی کسی کہانی کا کردار لگی، ایسی کہانی کا جو ابھی اس نے لکھی نہیں تھی، مگر آنے والے دنوں میں اور کسی افسانے کا مرکزی کردار بننا تھا۔ ایسا ہی ایک کردار اسے آج دوپہر بھی ملا تھا۔ تب بھی یہ خیال سعید احمد کے ذہن میں رینگا تھا۔

وہ کتابوں کی دکان پر کھڑا نئی کتابوں کا جائزہ لے رہا تھا، جب اس کی نظر سامنے پھولوں کے اسٹال پر پڑی۔ دبلی پتلی، چھوٹے قد کی لڑکی تازہ پھول چن کر گلدستہ بنا رہی تھی۔ اس کا چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا اور پھولوں کو گلدستے کی شکل سجاتے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ وہ عجلت میں تھی اور اس کی گھبراہٹ بتا رہی تھی کہ وہ نروس ہے۔ پھول لیتے ہوئے وہ کسی آن دیکھے خوف کا شکار ہے۔ ایک ونے میں کسی ہوئی لڑکی وجود کو چادر میں چھپائے، چہرے کو نقاب میں چھپائے باقی لوگوں سے لاتعلق، شاید وہ اس خوف میں مبتلا تھی کہ کوئی اسے دیکھ نہ لے۔

"یہ پھول وہ کس کو دے گی؟"

کتابوں سے نظریں ہٹا کر اس لڑکی کو دیکھتے ہوئے سعید احمد نے سوچا تھا۔ کئی لوگ پھول خرید رہے تھے۔ مگر وہ ان سب سے جدا، سب سے الگ تھی۔ کالج یا یونیورسٹی کی اسٹوڈنٹ لگ رہی تھی اور خواب دیکھنے والی اس عمر کی لڑکیوں کی طرح یقیناً وہ بھی اپنے خوابوں کے شہزادے کے لیے پھول خریدنے آئی تھی۔ آج پھول بھیجنے کا دن تھا، چودہ فروری۔ سعید احمد ذاتی طور پر خوشیوں کو دنوں سے منسوب کرکے تقسیم کردینے کے خلاف تھا۔ پھول تو کسی بھی روز کسی کو بھی دیے جاسکتے ہیں۔ محبت کا اظہار تو کسی بھی روز کسی سے بھی کیا جاسکتا ہے۔ گلدستہ بنا کر اس لڑکی نے

پھولوں کی قیمت دکان دار کو دی اور اپنے بیگ میں سے ایک کارڈ نکالا، قلم کے لیے وہ کچھ دیر بیگ ٹٹولتی رہی، پھر مایوس نظروں سے دکان دار کی طرف دیکھا۔

"سامنے کاؤنٹر سے لے لیں۔" دکان دار نے اس سے کہا۔

وہ ایک ہاتھ میں پھول سنبھالتی اور دوسرے میں اپنا بیگ پکڑے سعید احمد کے پاس آکھڑی ہوئی۔ کاؤنٹر پر رکھی پنسل اٹھائی، کارڈ کاؤنٹر کے شیشے پر جمایا اور کارڈ کھولنے سے پہلے دائیں بائیں پھر بائیں دیکھا۔ کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ سعید احمد کی نظریں بے ارادہ اسے دیکھ رہی تھیں۔ لڑکی فیصلہ نہیں کرپائی کہ اس کے سامنے کارڈ پر لکھے یا نہ لکھے۔ وہ تذبذب کا شکار تھی۔ سعید احمد نے اچٹتی سی نظر اس کے ہاتھ میں پکڑی پنسل اور شیشے پر رکھے کارڈ پہ ڈالی، ہاتھ سے بنا ہوا وہ ایک دلکش کارڈ تھا، شوخ رنگوں والا شاہکار، کارڈ پرنٹڈ نہیں تھا۔ یقیناً لڑکی نے اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔ بے ساختہ سعید احمد کا دل اسے داد دینے کو چاہا۔ نقاب والی لڑکی کی بے چینی نے اسے پرے دیکھنے پر مجبور کردیا۔

لڑکی نے عجلت میں چند الفاظ کارڈ پر گھسیٹے، پنسل کاؤنٹر پر رکھی، کارڈ گلدستے میں جمایا اور بیگ کندھے سے لٹکا کر مڑی اور سعید احمد سے ٹکرا گئی جو عین اسی وقت پلٹا تھا۔ گلدستہ نیچے گر گیا اور اس میں سے پھسل کر کارڈ بھی فرش پر کھل گیا۔ دونوں ایک ساتھ جھکے۔ لڑکی زیادہ تیزی سے جھکی تھی اور اس نے کارڈ کو اٹھایا تھا، جیسے وہ اس کے اندر لکھی تحریر کو سعید احمد سمیت زمانے بھر کی نظروں سے چھپائے رکھنا چاہتی ہو۔ سعید احمد نے گلدستہ اٹھاتے ہوئے لڑکی کے ہاتھ میں پکڑے کارڈ میں موتیوں جیسے پروئے ہوئے لفظوں کی ایک جھلک دیکھی، انتہائی خوب صورت لکھائی میں لکھا تھا۔ "اگلے برس ہم مل کر پھول چنیں گے۔"

لڑکی، سعید احمد کے ہاتھ سے گلدستہ لے کر تیزی سے سڑک کے اس پار گئی اور اس کی نظروں سے اوجھل ہوگئی، مگر اپنے پیچھے ایک ایسی کہانی چھوڑ گئی جو

آنے والے دنوں میں سعید احمد نے لکھنا تھی اور جس کا مرکزی کردار ایک اجنبی لڑکی تھی، جس کا سارا وجود چادر میں لپٹا ہوا تھا اس کا چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا اور وہ اپنے محبوب کے لیے پھول خریدتے ہوئے سعید احمد کو نظر آئی تھی۔ اپنے خوب صورت ہاتھوں سے اس نے شوخ رنگوں والا ایک دلکش کارڈ بھی بنایا تھا، جس کے اندر صفحے پر اس نے اپنے دل کے اندر برسوں سے پالی ہوئی خواہش کو لفظوں میں سمودیا تھا۔ موتیوں جیسے لفظوں میں لکھی اس عبارت کو سعید احمد نے پڑھ لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

کڑوے لہجے والی نگہت نے سعید احمد کو واقعی بے چین کردیا تھا۔ اسی شب سعید احمد نے نگہت کو پہلی بار فون کیا۔ یہ اس کے مزاج کے خلاف تھا۔ وہ یوں بھی کسی اجنبی کو فون نہیں کرتا تھا۔

"سعید احمد بول رہا ہوں۔"

"میرے موبائل پر آپ کا نام آرہا ہے، بولیں۔" وہی کڑوا لہجہ، مگر شرمندہ کردینے والی صاف گوئی۔

"مجھے آپ سے یہ کہنا تھا کہ آپ بھی کہانی لکھیں۔" سعید احمد نے مدعا بیان کیا۔

"میں؟ میں کہانی لکھوں؟" وہ حیرت زدہ تھی۔

"جی ہاں! آپ لکھیں، اس لڑکی کی کہانی جس نے بھائی کے سامنے بغاوت کی۔" سعید احمد نے مختصر مگر جامع بات کی۔

"مطلب اپنی کہانی؟" وہ سمجھ گئی تھی۔

"میں یہ ہی کہہ رہا تھا۔" سعید احمد نے متانت سے کہا۔

"میں نہیں لکھ سکتی، مجھے لکھنا نہیں آتا۔" پہلی بار اس کا لہجہ نرم پڑا۔

"لکھ سکتی ہیں، مگر لکھنا نہیں چاہتیں۔"

"کیوں؟ یہ کیوں کہا آپ نے؟" وہ تیز لہجے میں بولی۔

"اس لیے کہ آپ سچ بول سکتی ہیں، مگر سچ لکھنے سے خوف زدہ ہیں۔" سعید احمد نے اسی کے لہجے میں جواب دیا۔

"میں خوف زدہ نہیں ہوں، کسی سے ڈرتی نہیں ہوں۔ سچ بولتی ہوں ہمیشہ، کسی کو اچھا لگے یا برا۔" نگہت ہتھے سے اکھڑ رہی تھی۔

"وہ تو میں جانتا ہوں آپ کو کسی کی پروا نہیں۔ کسی کو اچھا لگے یا برا۔ جو زبان پر آئے بولتی چلی جاتی ہیں۔ مگر میں پھر بھی کہہ رہا ہوں آپ لکھیں، مجھے یقین ہے آپ بہت اچھی کہانی لکھ سکتی ہیں۔" سعید احمد نے اپنی بات مکمل کرکے کال ختم کردی۔ اسے یقین تھا وہ لکھے گی اور بہت اچھا لکھے گی۔

☼ ☼ ☼

مارچ کی دسویں صبح عبداللہ کے فون نے سعید احمد کو نیند سے بیدار کیا۔

"تیسری کتاب کے سرورق پر سعید احمد کی تصویر چھپے گی تو اس شہر کی آدھی لڑکیوں کو آپ جیسی سکون کی نیند نصیب ہوگی سر جی۔ ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔" عبداللہ کی زندگی سے بھرپور چہکتی آواز میں اتنا غرارت نمایاں تھی۔ یہ شوخی اور شرارت عبداللہ کے مزاج کا خاصہ تھی، جو سعید احمد جیسے خشک مزاج تخلیق کار کو بھی بہت پسند تھی۔

"پچھلے سال کی طرح اس بار بھی عبداللہ۔۔۔ تھینک یو سو مچ!" سعید احمد کو بہت اچھا لگا۔

"اس بار بھی کیک عبداللہ کی طرف سے بھول مت جایئے گا۔" اس نے یاد دلایا۔

"چھوڑو یار! ایک کا تکلف نہیں کرنا۔" سعید احمد نے بے تکلفی سے کہا۔

"کیک تو کٹے گا اور ڈنر بھی اکٹھے کریں گے۔ سب سے پہلے وش کرنا تھا اس لیے اتنی صبح فون کیا ہے، اب آپ مزے سے نیند پوری کریں۔ ونس اگین ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔" عبداللہ نے کھنکتا کروش کیا۔

عبداللہ نوجوان پبلشر تھا، جس کے ساتھ سعید احمد کا محبت اور خلوص کا رشتہ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے مزاج کو خوب سمجھ گئے تھے۔ سعید احمد کے دونوں افسانوی مجموعے عبداللہ نے شائع کیے تھے اور اہتمام سے شائع کیے تھے۔ دونوں بار اس نے سعید احمد سے بہتیرا کہا تھا کہ بیک ٹائٹل پر سعید احمد کی تصویر بھی چھاپی جائے تاکہ اس کے افسانوں کے قارئین کو اس کی صورت سے بھی آشنائی ہو، مگر سعید احمد نے انکار کردیا تھا۔ اس کا موقف تھا کہ قاری کو تخلیق کار کی تصویر نہیں تحریر سے روشناس ہونا ضروری ہے۔

عبداللہ اس کی اس دلیل سے متفق نہیں تھا۔ وہ اکثر مذاق میں کہتا تھا۔ "سر! آپ کی کہانیاں لڑکیوں کو پسند آتی ہیں، کبھی کسی مرد کی زبانی آپ کی تعریف نہیں سنی۔"

"اس میں میرا کیا قصور ہے بھائی؟" سعید احمد ہنس کر کہتا۔

"قصور آپ کا ہی ہے، تصویر جو چھاپنے نہیں دیتے، لڑکیوں کو پتا چلے کہ سعید احمد بیس سال کا لڑکا نہیں بلکہ ساٹھ سالہ مرد ہے، جس کے بال سفید اور آدھے دانت گر چکے ہیں۔ مگر شیریں اور چھائی مخمور سے کام بعض اوپر سیاہ لگتا ہے تو آپ کا افسانہ بھی کوئی لڑکی پڑھے نا تعریف کرے۔"

سعید احمد کو اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ اس کی کہانیاں لڑکیاں پسند کرتی ہیں یا مردوں میں وہ زیادہ مقبول ہے، وہ سرے سے یہ تقسیم ماننے کے خلاف تھا۔ قاری تو قاری ہوتا ہے اس میں مرد اور عورت کی کیا تقسیم۔ پسندیدگی اس کا مسئلہ نہیں تھا۔ تخلیق اس کی ترجیح تھی۔ وہ لکھتا تھا، کبھی بہت زیادہ لکھ لیتا، کبھی کئی ہفتے اس پر تخلیق کا در وا نہیں ہوتا تھا۔

اسی دوپہر ڈاک میں سعید احمد کو دو لفافے موصول ہوئے۔ پہلا لفافہ نگہت نے بھیجا تھا۔ جس میں بارہ صفحوں پر لکھی ہوئی ایک کہانی تھی۔ "ایک اجنبی سے مل کر۔" لکھائی بہت کمزور تھی۔ سعید احمد کو پڑھنے میں بہت تردد کرنا پڑا، مگر کہانی بہت شان دار تھی، جان دار کہ سعید احمد اس کے سحر سے نکل نہیں پایا۔ ٹرین کے انتظار میں پلیٹ فارم پر بیٹھے ہوئے ایک لڑکے کی کہانی، جس کی پہلی ملاقات ایک لڑکی سے ہوئی تھی جو ویٹنگ روم میں سوتی رہ گئی تھی اور اس کی ٹرین نکل گئی۔ سعید احمد سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ نگہت اتنی خوب صورت کہانی لکھ پائے گی۔

دوسرے لفافے پر انتہائی خوب صورت لکھائی میں سعید احمد کا پتا لکھا گیا تھا۔ جوابی پتا موجود نہیں تھا۔ سعید احمد کو وہ لکھائی مانوس لگی، مگر یاد نہیں آیا ایسی خوب صورت صاف لکھائی میں کون لکھتا ہے۔ اس نے لفافہ کھولا اور ایک پل کے لیے ساکت رہ گیا۔

اس کی نظریں لفافے میں موجود برتھ ڈے کارڈ پر جم کر رہ گئیں۔ کچی پنسل سے بنا ہوا انتہائی دلکش کارڈ مصور کی شاہکار تخلیق تھا۔ سعید احمد نے کارڈ کھولا۔

"انتہائی محترم سعید احمد صاحب سالگرہ مبارک۔"

وہی لکھائی جو سعید احمد کتابوں کی دکان میں پھول سنبھالتی لڑکی کے ہاتھ سے لکھی دیکھ چکا تھا۔ وہ کون تھی؟ سعید احمد نہیں جانتا تھا، مگر سالگرہ کارڈ بھیج کر اس نے باور کرادیا تھا کہ سعید احمد اس کے لیے اجنبی نہیں۔ وہ اسے جانتی ہے نا صرف جانتی ہے بلکہ اسے پہچانتی بھی ہے۔ سعید احمد کا برتھ ڈے جان لینا کوئی بڑی بات نہیں تھی، بہت سے لوگ جانتے ہوں گے، اس کا پتا بھی بے شمار لوگوں کے پاس تھا، اسے خط موصول ہوتے تھے۔ کتابیں اور رسالے اسے ملتے تھے، مگر یوں کبھی کسی نے برتھ ڈے کارڈ نہیں بھیجا تھا۔ یہ سعید احمد کے لیے خوشگوار حیرت تھی۔ اس دن کتابوں کی دکان میں لڑکی نے اسے پہچان لیا تھا؟ وہ اسے جانتی تھی؟ یہ سوال شام تک اس کے ذہن سے چپکے رہے۔

"اس کا فون نمبر دیں، میں بات کرتا ہوں۔" عبداللہ نے کیک کاٹنے سے پہلے کہا تھا۔

"پاگل ہوئے ہو؟ میں تو اسے جانتا تک نہیں۔ پتا نہیں کون ہے؟ کہاں ہے؟" سعید احمد نے عبداللہ کو بتایا تھا کہ آج اسے ایک اجنبی لڑکی نے سالگرہ کارڈ بھیجا ہے اور اپنا نام نہیں لکھا۔

"یہ عجیب بات ہے، کوئی کارڈ بھیجے اور اپنا نام نہ

لکھے۔" عبداللہ بھی حیران تھا۔
"ہاں مجھے خود عجیب لگا ہے 'مگر اچھا بھی لگا۔" سعید احمد نے کہا۔
"اچھا جی... سمجھ گیا۔" عبداللہ نے شرارتی انداز میں اچھا جی کو کھینچ کر لمبا کیا۔
"ایسا کچھ نہیں 'اچھا جی۔" سعید احمد نے ہنستے ہوئے اسی کے انداز میں "اچھا جی" کو طول دیا۔ "اور تم بھی ذرا ایس ایم ایس کم کیا کرو 'کتنی لڑکیوں کے نمبر ہیں تمہارے موبائل میں؟"
"میں تو ایک ہی ایس ایم ایس کرتا ہوں سر... بارہ لڑکیوں کو۔" عبداللہ نے معصومیت سے کہا۔
"ہاں... میں جانتا ہوں۔" سعید احمد کھلکھلا کر ہنسا۔
اسی شام ڈنر کرتے ہوئے عبداللہ کے سامنے سعید احمد نے نگہت کی کال سنی۔ نگہت کے سوال سے پہلے ہی سعید احمد نے پوچھ لیا۔
"ایک اجنبی سے مل کر... واقعی آپ نے لکھی ہے؟" سعید احمد نے سنجیدگی سے پوچھا۔
"ہاں!" نگہت نے جواب دیا۔
"پہلی کہانی ہے؟" وہ بہت سنجیدہ تھا۔
"بالکل! میں نے اس سے پہلے کچھ نہیں لکھا۔ کتابیں بہت پڑھی ہیں 'مگر لکھا کبھی نہیں تھا۔"
"مجھے یقین نہیں آرہا۔" سعید احمد کو واقعی یقین نہیں آرہا تھا۔
"کیوں؟" وہ حیران تھی۔
"اتنی اچھی کہانی۔"
"کیا واقعی سر؟" پہلی بار نگہت نے نرم لہجے میں پوچھا۔ ایسا لہجہ جس میں یک دم احترام بھی شامل ہو گیا تھا۔
"ہاں مجھے بہت پسند آئی 'ونڈرفل!" سعید احمد نے کھلے دل سے تعریف کی۔ وہ کم ہی کسی کی تعریف کرتا تھا۔ "رئیلی؟" نگہت کے لیے بھی یہ ناقابل یقین بات تھی۔
"سچ! بہت اچھی! آپ اچھی رائٹر ہو۔"

"نہیں... رائٹر... نہیں سر... " وہ اس لہجے پر کھلا گئی تھی۔ سعید احمد جیسا تخلیق کار اس کی تعریف کر رہا تھا۔ یہ بہت بڑی بات تھی۔
"آپ لکھو 'مزید لکھو... ایسی اچھی اچھی کہانیاں لکھو۔" سعید احمد نے اسے تھپکی دی۔ عبداللہ نے دیدے نچا کر شرارتی انداز میں سعید احمد کو دیکھا۔
"تھینک یو سوچ... مجھے امید نہیں تھی سر... میں لکھوں گی 'مزید لکھوں گی 'مگر سر ایک وعدہ کریں پلیز!"
"وعدہ؟" سعید احمد چونکا۔
"آپ میری کہانیاں پڑھا کریں گے 'مجھے بتائیں گے میں کہاں غلط 'کہاں ٹھیک ہوں 'میری اصلاح کریں گے 'کریں گے نا سر؟"
"ضرور! میں کہانیوں پر بات کرنے کے لیے ہر وقت حاضر ہوں۔" سعید احمد نے کہا۔
"کہانیوں کے علاوہ بھی بات کرنے کے لیے۔" عبداللہ نے شوخی بھری سرگوشی کی۔ سعید احمد نے اسے گھور لیا۔
"بہت شکریہ 'آج سے آپ میرے استاد ہیں سر!" نگہت کا لہجہ بے حد ممنون تھا۔
"ارے نہیں استاد نہیں 'جو مجھے پتا ہے وہ میں کہانی کے بارے میں آپ کو بتا دیا کروں گا۔" سعید احمد نے خلوص سے کہا۔ کال بند ہو گئی۔
"جلد ہی ایک اچھی افسانہ نگار کی کتاب چھاپنے کے لیے تیار رہو پبلشر۔" سعید احمد نے کوک کا سپ لیتے ہوئے عبداللہ سے کہا۔
"یہ سلسلہ کب سے چل رہا ہے صاحب؟" عبداللہ نے سعید احمد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔
"ایسا کچھ نہیں ہے یار! تھانے دار نہ بنا کرو۔" سعید احمد ہنسا۔

☼ ☼ ☼

اپریل کی پہلی صبح نگہت نے سعید احمد کو عجیب سی

خوشی اور غم کے دوراہے پر لا کھڑا کیا۔
"استاد جی! میں بھائی کے ساتھ گھر جا رہی ہوں واپس 'ہاسٹل چھوڑ دیا ہے۔" اس کے لہجے میں مسرت تھی۔
"اچھا؟ یہ تو بہت اچھا فیصلہ ہے۔" سعید احمد کو بھی خوشی ہوئی۔
"سوچا تھا اب کبھی لوٹ کر نہیں جاؤں گی 'مگر بھائی آگیا ہے لینے تو اسے مایوس نہیں کیا۔" وہ بہت خوش تھی۔
"میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں 'واپسی کا سفر اچھا فیصلہ ہے۔" سعید احمد اس کی خوشی میں شامل تھا۔
"آپ کو خوشی ہوئی سر؟" اس نے پرجوش لہجے میں پوچھا۔
"بہت... بہت زیادہ۔" سعید احمد کے لہجے میں بھی خوشی نمایاں تھی۔
"کیوں سر... میری واپسی پر آپ کیوں خوش ہیں؟" اس نے عجیب سا سوال کیا۔ سعید احمد ایک پل کے لیے چپ رہ گیا 'اسے واقعی سمجھ نہیں آیا نگہت کی خوشی میں اسے کیوں خوشی محسوس ہو رہی تھی۔
"بتائیں نا سر!" نگہت نے دوبارہ پوچھا۔
"تم خوش ہو اس لیے مجھے بھی خوشی ہوئی۔" سعید احمد نے مختصر جواب دیا۔
"میری خوشی سے آپ کی خوشی کا کیا تعلق؟" اس نے پھر شوخی بھرا سوال کیا 'ایسا سوال جس کا جواب سعید احمد دے نہیں سکا۔
"ایک اور بھی خوشی کی خبر ہے سر!" نگہت سے خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔
"خوشی کی خبر؟" سعید احمد نے سوال دہرایا۔
"جی سر... میں چھ کینال کی کوٹھی میں چلی جاؤں گی... میں نے بھائی کی بات مان لی ہے۔" نگہت کی بات مکمل ہونے کے بعد بھی دیر تک سعید احمد کی زبان سے کوئی لفظ ادا نہیں ہوا۔ نگہت چھ کینال کی کوٹھی

میں چلی جائے گی 'بھائی کی بات مان کر وہ مل مالک سے شادی کرلے گی۔
نگہت اس فیصلے پر بے حد مسرور تھی 'مگر سعید احمد... اس کی بات سن کر اتنا رنجیدہ کیوں ہو گیا تھا؟ الفاظ اس کی زبان کا ساتھ کیوں چھوڑ گئے تھے؟ وہ چپ کیوں رہ گیا تھا؟ اس سے بولا کیوں نہیں گیا؟ اس نے خود کہا تھا وہ نگہت کی خوشی میں خوش ہے تو اب کیا ہوا تھا؟ نگہت خوش تھی 'سعید احمد ناخوش کیوں تھا؟
"سر! آپ میری بات سن رہے ہیں؟" نگہت نے پوچھا۔
"ہاں... ہاں!" سعید احمد نے بمشکل کہا۔
"میں نے ٹھیک کیا نا؟" وہ تائید چاہ رہی تھی۔
"ٹھ... ی... ک۔" سعید احمد نے ٹوٹے لفظوں میں کہا۔
دونوں طرف کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ نگہت چپ ہو گئی تھی 'سعید احمد بھی چپ تھا۔
"آج یکم اپریل ہے سر... اپریل کا پہلا دن یاد رکھا کریں پلیز!" یک دم نگہت کا قہقہہ 'والہانہ ابھر آیا۔ اس کی آواز میں ایک ایسا درد تھا جس نے سعید احمد کو شاد کر دیا۔ نگہت نے جھوٹ بولا تھا۔ وہ اپریل فول بنا رہی تھی 'مگر آج اس کے جھوٹ نے سعید احمد کو ایک سچ سے روشناس کرا دیا تھا کہ نگہت سے اس کا تعلق محض ایک ادبی رشتہ نہیں رہا۔ یہ بات وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔
اسی دوپہر سعید احمد نے عبداللہ کو جواب دیا۔
"میری نئی کتاب کا ٹائٹل وہ لڑکی بنائے گی جسے میں جانتا نہیں اور وہ مجھے خوب صورت کارڈ بنا کر بھیجتی ہے۔"
"مجھے مسودہ پریس میں بھیجنا ہے 'آپ کمال کرتے ہیں۔" عبداللہ حیران رہ گیا۔
"میری کتاب اس کے ہاتھ کے بنے ٹائٹل سے ہی چھپے گی۔" سعید احمد نے حتمی بات کی۔ عبداللہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ کارڈ بھیجنے والی نہ جانے کون تھی؟ کہاں تھی؟

☼ ☼ ☼

اسی سہ پہر سعید احمد نے زندگی میں پہلی بار جھوٹ بولا۔ نگہت کا فون دوبارہ آیا' اس کا پہلا افسانہ ادبی پرچے میں چھپ گیا تھا' وہ بہت خوش تھی۔

"آپ آج شام ہاسٹل آجائیں میں سبز چائے کے ساتھ اپنے ہاتھ کا بنا کیک کھلاؤں گی' میں کیک بہت اچھا بناتی ہوں استاد جی!" اس نے کہا تھا۔

"مجھے کیک پسند نہیں۔" سعید احمد نے بے ساختہ کہا' مگر فوراً" ہی اسے احساس ہو گیا کہ وہ غلط کہہ گیا ہے۔

"میں کیک نہیں کھاتا۔" اس نے وضاحت کی۔

"میں مچھلی فرائی کرلوں گی' مچھلی تو آپ کھاتے ہیں نا؟" اس نے برا نہیں مانا۔ سعید احمد کہہ نہیں سکا کہ فرائی مچھلی تو اس کی کمزوری ہے' وہ بہت شوق سے کھاتا ہے۔

"ہاں! کبھی کبھار!" اس نے مختصر جواب دیا۔

"تو ٹھیک ہے آپ آج شام فرائی مچھلی کھا رہے ہیں میرے ساتھ۔" نگہت نے حتمی بات کی۔ سعید احمد ایک پل کے لیے چپ رہا۔ اسے سمجھ میں نہیں آیا وہ کیا جواب دے۔ وہ آج تک نگہت سے ملا نہیں تھا' اس نے نگہت سے ہمیشہ فون پر بات کی تھی۔ نگہت نے بھی اسے دیکھا نہیں تھا' ہمیشہ فون پر رابطہ رکھا۔ یوں اچانک ملاقات سے وہ خائف تھا۔ نہ جانے کیا بات تھی وہ نگہت سے ملنے سے گریزاں تھا۔ ایک جھجک تھی یا سعید احمد کے اندر مدت سے ڈیرہ جمائے وہ خوف اسے روک رہا تھا جو اس نے خود ہی پال رکھا تھا کہ دور سے دکھائی دینے والے اکثر خوب صورت لوگ قریب سے بہت بدنما ہوتے ہیں۔ دوری ایک بھرم ہے جو قرب میں چکنا چور ہو جاتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ ان دیکھے لوگوں کے بارے میں ذہن جو مجسمہ تراش لیتا ہے' اصل پیکر ویسا اجلا نہیں ہوتا۔

"میں انتظار کروں؟" نگہت نے بڑی آس سے پوچھا۔ ایسی آس جس میں ارمان کی آمیزش تھی۔

"نہیں!" سعید احمد نے کہا۔

"کیوں؟" نگہت کی آواز ذرا سی بجھی۔

"آج شام کوئی اور میرا انتظار کر رہا ہے۔" سعید احمد نے عجیب لہجے میں کہا۔

"کوئی اور...؟" نگہت کی آواز مزید بجھ گئی۔

"ہاں! اس نے کھانے پر بلایا ہے' وہ کچے قیمے کے کباب بہت اچھے بناتی ہے۔"

"کون؟" نگہت کی آواز ڈوبتی چلی گئی' اس کا ٹوٹا لہجہ سعید احمد کو اجنبی لگا۔

"پہلی بار اس سے ملنا ہے' میں اسے نہیں جانتا۔" سعید احمد نے بات مکمل کر کے اپنے لبوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا تھا' اسے جھوٹ سے نفرت تھی۔ اسے اپریل فول منانا بھی سخت ناپسند تھا' وہ اسے فضول اور بے معنی رسم سمجھتا تھا' مگر آج اس نے عجیب حرکت کی تھی۔ نگہت سے جھوٹ بولا تھا۔ ایسا جھوٹ جس کا سرے سے کوئی جواز تھا نہ وجود۔ شاید اس کے جواب میں نگہت نے کچھ کہا ہو' مگر سعید احمد کو سنائی نہیں دیا۔ سنائی کیسے دیتا' نگہت رو گئی ہو گی نا۔

☼ ☼ ☼

مئی کی بیسویں دوپہر سعید احمد کو ڈاک میں اجنبی لڑکی کا ایک سطری خط موصول ہوا۔

"انتہائی محترم سعید احمد صاحب! میری خواہش ہے آپ کی کسی کتاب کا ٹائٹل میں بناؤں۔"

نیچے کوئی نام نہیں لکھا تھا' جوابی پتا نہیں تھا۔ لفافے میں ایک پنسل اسکیچ سے بنا ہوا کتابی سرورق تھا' جسے پہلی نظر میں دیکھتے ہی سعید احمد کے منہ سے بے اختیار داد نکلی۔ مصور کا نام یا دستخط موجود نہیں تھے۔ سعید احمد دیر تک اس خوب صورت سرورق کو توصیفی نظروں سے دیکھتا رہا اور پھر بغیر وقت ضائع کیے عبداللہ کے دفتر کی سیڑھیاں چڑھ گیا۔ عبداللہ حسب معمول فون کا ریسیور کان سے لگائے مدھم سرگوشیوں میں مصروف تھا۔

"کون کرتا ہے تمہیں لمبی لمبی کالیں... خدا کے لیے کسی وقت تو اس کی جان چھوڑ دیا کرو۔" سعید احمد نے بھی سرگوشی میں اسے مخاطب کیا۔ عبداللہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔

"میں بعد میں بات کرتا ہوں۔" کہہ کر اس نے فون کا ریسیور رکھ دیا۔

"کس بے چاری کو سبز باغ دکھا رہے تھے؟" سعید احمد نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"سر جی! ممانی سے بات ہو رہی تھی۔" عبداللہ چہکا۔

"توبہ! توبہ! ممانی سے سرگوشیوں میں بات اور چہرے پر زمانے بھر کی خوشی' سدھر جاؤ لڑکے!" سعید احمد نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"ماموں کی چغلیاں کر رہا تھا۔" عبداللہ نے آنکھ دبا کر سرگوشی میں کہا اور سعید احمد کھلکھلا اٹھا۔

"یہ لو ٹائٹل!" سعید احمد نے لفافے میں سے سرورق نکال کر میز پر رکھا۔ عبداللہ کی نظریں سرورق پر جم گئیں۔

"زبردست! کس نے بنایا ہے؟" عبداللہ کو بھی سرورق پسند آیا تھا۔

"اس بات کو چھوڑو' میری طرف سے یہ فائنل ہے کتاب چھاپ دو۔"

"شکر ہے' میں تو اب مایوس ہو کر مسودہ ردی میں بیچنے والا تھا۔" عبداللہ نے اطمینان کا سانس لیا۔

"کیوں؟ اتنا برا لکھتا ہوں؟"

"کب سے کمپوز کر کے بیٹھا ہوں' پریس میں نہیں بھیجا کہ سر جی کو ٹائٹل پسند نہیں آ رہا۔"

"اب آگیا پسند' تمہیں کیسا لگا؟" سعید احمد نے اس کی رائے پوچھی۔

عبداللہ نے سرورق کو دوبارہ دیکھا' ہونٹ سکیڑے جیسے بادل نخواستہ قبول کر رہا ہو' ورنہ ٹائٹل کچھ خاص نہ ہو۔ سعید احمد کی نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"کمال ہے سر جی!" عبداللہ نے خوشی سے چہکتی آواز میں کہا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ سعید احمد نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ اس کا چہرہ بھی کھلا ہوا تھا۔ سعید احمد کا تیسرا افسانوی مجموعہ اشاعت کے لیے تیار تھا۔ مگر دو ماہ سے اسے کوئی سرورق پسند نہیں آ رہا تھا' عبداللہ بیسیوں ٹائٹل اسے دکھا چکا تھا' مگر سعید احمد کے من میں نہ جانے کیا سمایا ہوا تھا۔ جس کے علاوہ اسے کوئی بھلا نہیں لگا۔ اجنبی لڑکی نے اسے سرورق بنا کر بھیجا تھا' جو سعید احمد کو بہت پسند آیا' مگر در حقیقت اس نے اپنے من کو ٹٹولا تو اسے خود بھی اس سوال کا جواب نہیں ملا کہ وہ سرورق واقعی ایسا خوب صورت تھا... یا... اس لڑکی کی خواہش وہ رد نہیں کر سکا تھا۔

☼ ☼ ☼

مئی کی بیسویں شب ہی سعید احمد کو فلیٹ پر لوٹتے ہی سامنے والی بچی ایک گفٹ پیک پکڑا گئی۔

"ایک آنٹی تھیں' آپ گھر پہ نہیں تھے۔" اس نے گفٹ پیک پکڑاتے ہوئے کہا۔

"آنٹی! نام کیا بتایا تھا؟" سعید احمد تذبذب کا شکار ہو گیا۔ "کون ہو سکتی ہے؟"

"نام نہیں بتایا' بس اتنا کہا آپ سے ملنا ہے۔" بچی پیغام دے کر چلی گئی۔ سعید احمد الجھا ہوا تالا کھول کر اندر آگیا۔ یوں پہلی بار ہوا تھا کہ کوئی لڑکی اس سے ملنے اس کے فلیٹ پر آئی تھی۔ مگر وہ کون تھی؟ کارڈ بھیجنے والی؟ سعید احمد کے دل نے ایک کروٹ لی۔ اس نے عجلت میں گفٹ پیک کھولا' کھدر کے سوٹ پر ایک چھوٹا سا کارڈ پڑا تھا' ویسا نہیں جیسا کارڈ... اجنبی لڑکی اپنے ہاتھ سے بنا کر بھیجتی تھی اور جس کے بنائے ہوئے سرورق کو سعید احمد نے اپنی کتاب پر سجایا تھا۔

"سعید احمد! ریڈیو پر افسانہ پڑھنے کا چیک ملا ہے۔"
نگہت

مختصر اور مکمل بات' بالکل ویسی جیسی سعید احمد کو پسند تھی۔ نگہت کو ریڈیو پر افسانہ پڑھنے پر پہلا چیک ملا تھا اور اس نے ان پیسوں سے سعید احمد کے لیے کھدر

کا سوٹ خرید لیا تھا۔ کیا یہ اہم بات تھی کہ وہ بطور افسانہ نویس کامیابی کے زینے طے کر رہی تھی؟ یا یہ امر باعث خوشی تھا کہ اس نے اپنے لیے کچھ خریدنے کے بجائے ان پیسوں سے سعید احمد کے لیے کھدر کا سوٹ خرید لیا تھا۔ کھدر۔۔۔ جو سعید احمد کا برسوں سے پہناوا تھا' اسے بے حد پسند تھا۔ سعید احمد نے ان دونوں باتوں پر غور نہیں کیا' وہ تو اس الجھن۔ کی سلجھن میں بھی نہیں پڑا کہ نگہت چل کر اس سے ملنے اس کے فلیٹ تک چلی آئی تھی۔ وہ تو جملے کے آغاز میں انداز تخاطب پر گم صم تھا۔ "سعید احمد!" آج پہلی بار نگہت نے اسے نام سے مخاطب کیا تھا' وہ ہمیشہ اسے استاد جی یا سر کہہ کے مخاطب کرتی تھی اور آج۔۔۔ سعید احمد۔۔۔!

☼ ☼ ☼
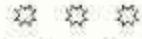
جون کی آٹھویں صبح عبداللہ نے سعید احمد کے تیسرے افسانوی مجموعے "پڑاؤ" کی پہلی کاپی اس کی ہتھیلی پر رکھ دی۔ ہمیشہ کی طرح عبداللہ نے کتاب محنت سے کمپوز کی اور خوب صورتی سے شائع کر کے محبت کے ساتھ سعید احمد کو پیش کی تھی۔ عبداللہ کی یہ ادا سعید احمد کو بہت پسند تھی۔ وہ ایک کامیاب پبلشر تھا اور اپنے کام میں ماہر تھا۔ اس بار سعید احمد کو اپنی کتاب سے زیادہ اس کے سرورق سے دلچسپی تھی۔ وہ شدت سے منتظر تھا۔

"بیک ٹائٹل پر سرجی کی تصویر بھی چھپ جاتی تو۔۔۔"

"تو لڑکیوں کو پتا چل جاتا سعید احمد بیس سالہ لڑکا نہیں ساٹھ سالہ بڈھا ہے' جس کے بال سفید اور دانت نقلی۔۔۔" سعید احمد نے اس کی بات کاٹ دی۔

"نہیں سرجی! لڑکیوں کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا کہ فرنٹ ٹائٹل زیادہ خوب صورت ہے یا بیک ٹائٹل۔" عبداللہ نے بھی سعید احمد کی بات مکمل نہیں ہونے دی تھی۔ سعید احمد اس کی حاضر جوابی پر مسکرا دیا۔

سعید احمد نے "پڑاؤ" کے پہلے صفحے پر اہتمام کے ساتھ اپنی لکھائی میں لکھا۔ "خوب صورت کارڈ بھیجنے والی۔۔۔ لڑکی کے لیے!" نیچے دستخط کر کے اپنے لکھے کو اس نے کئی بار پڑھا' پھر اپنی حماقت پر ہنسا۔ وہ کارڈ بھیجنے والی لڑکی کو جانتا نہیں تھا۔ اس سے واقف نہیں تھا۔ اس کا پتا معلوم نہیں تھا۔ مگر وہ اسے اپنے دستخط کے ساتھ اپنی نئی کتاب کی پہلی کاپی بھیجنے کا ارادہ کر بیٹھا تھا۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی' اس سے بڑی حماقت وہ پہلے کرنے والا تھا۔ جب اس نے "پڑاؤ" کا انتساب ایک اجنبی لڑکی کے نام کرنے کا سوچا تھا۔ ہزار پردوں میں چھپی ہوئی لڑکی' جس سے اس کا رابطہ ڈاک سے تھا' وہ بھی یک طرفہ۔

"خوب صورت کارڈ بھیجنے والی اجنبی لڑکی کے نام۔۔۔"

کا انتساب لکھ کر اس نے کاٹ دیا تھا۔ وہ جانتا تھا اس انتساب کی ہزار وضاحتیں اسے کرنا ہوں گی۔ عبداللہ بال کی کھال اتار لے گا اور سچ تو یہ ہے کہ عبداللہ سے انتہائی بے تکلفی کے باوجود وہ اس لڑکی کا ذکر عبداللہ کے سامنے کرنے سے اب گریزاں ہونے لگا تھا۔

"خوب صورت کارڈ بھیجنے والی۔۔۔ لڑکی کے لیے۔" لکھ کر کتاب اس نے اپنی الماری میں رکھ لی۔

☼ ☼ ☼

جون کی آٹھویں شام عبداللہ نے سعید احمد کو فون کیا۔

"سرجی! کہاں ہیں؟" اس کی آواز چہک رہی تھی' وہ بہت خوش تھا۔

"میں شہر سے باہر جا رہا ہوں' کل لوٹوں گا' کیوں؟"

"آپ نہیں جا رہے ہیں۔ بیس منٹ میں میرے آفس پہنچیں۔" عبداللہ نے دو ٹوک بات کی۔

"کیا مطلب؟ میں اس وقت اسٹیشن پر ہوں' گاڑی آنے والی ہے۔" سعید احمد نے حیرانی سے کہا۔

"گاڑی آنے دیں اور جانے دیں۔۔۔ میں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔" کہہ کر عبداللہ نے کال ختم کر دی۔

سعید احمد گو مگو کا شکار بار بار اس کا نمبر ڈائل کرتا رہا' مگر عبداللہ نے فون اٹینڈ نہیں کیا۔

"یہ کیا حرکت تھی؟" سعید احمد الجھا ہوا عبداللہ کے پاس پہنچا۔

"پہنچیں!" عبداللہ نے ٹھنڈے پانی کا گلاس اسے تھما دیا۔

"پہلے بتاؤ۔" سعید احمد نے گلاس میز پر رکھ دیا۔ اس کا مزاج واقعی بگڑ رہا تھا۔

"ان سب پر آپ کے دستخط چاہئیں۔۔۔ آٹو گراف۔" عبداللہ نے کونے میں تہ در تہ کتابوں کی طرف اشارہ کیا۔ وہ سعید احمد کی نئی کتاب "پڑاؤ" کے بنڈل تھے۔

"سب پر۔۔۔؟" سعید احمد حیرت زدہ تھا۔

"جی! ایک ہزار ہی تو ہیں۔"

"آٹو گراف؟"

"جی ہاں! جنہیں دستخط بھی کہتے ہیں۔" عبداللہ اس کی الجھن سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"کیوں؟" سعید احمد مزید الجھتا جا رہا تھا۔

"میں نے ان کتابوں کی قیمت مع آٹو گراف وصول کر لی ہے' اس لیے۔" عبداللہ نے اطمینان سے کہا۔

"کیا؟" سعید احمد کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

"جی! پہلا ایڈیشن بک گیا ہے' ایک ہزار کتابیں' ایک گاہک!" عبداللہ نے ایک کتاب کا پہلا صفحہ کھول کر سعید احمد کے سامنے رکھ دیا اور قلم پکڑانے کی کوشش کی۔ "بسم اللہ!"

"کس نے خریدی ہیں؟" سعید احمد نے قلم نہیں پکڑا۔

"مس نگہت۔۔۔ نے!" عبداللہ نے سعید احمد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر شرارت بھرے لہجے میں کہا۔

"نگہت نے؟" سعید احمد نے دہرایا۔ اسے لگا اس کا سارا وجود سن ہو گیا ہے۔

"وہ پے منٹ کر گئی ہے۔"

"کر گئی ہے؟" سعید احمد چونکا۔

"جی ہاں! وہ آئی تھی' خوب صورت لڑکی ہے' جب ہنستی ہے تو اس کے گالوں میں ڈمپل پڑتا ہے اور ٹھوڑی کے نیچے ایک تل بھی ہے۔" عبداللہ نے شوخی میں کہا مگر سعید احمد کو زندگی میں پہلی بار عبداللہ کا شوخ لہجہ بہت برا لگا۔

"کل تک کتاب کی ہزار کاپیاں اس کے ہاسٹل میں پہنچانی ہیں۔"

"ہزار؟"

"اس نے شرط رکھی تھی پہلے ایڈیشن کی ساری کاپیاں۔۔۔ ہر کاپی پر سعید احمد کے دستخط! وعدے کے مطابق مجھے وہ کاپی بھی مس نگہت کو دینی ہے جو صبح آپ کو دی تھی۔"

سعید احمد کھلے منہ کے ساتھ عبداللہ کا چہرہ تکتا رہ گیا۔ کئی پل کی خاموشی کے بعد اس نے ایک جملہ کہا' جسے سن کر عبداللہ بھی چونک گیا۔

"وہ کاپی۔۔۔ میں نہیں دوں گا۔"

☼ ☼ ☼

جولائی کی آخری شام تک سعید احمد اور نگہت ایک دوسرے کو اپنے آپ سے زیادہ جان چکے تھے۔ نگہت کو پتا چل چکا تھا کہ بظاہر ایک مضبوط شخصیت کا مالک سعید احمد اندر سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار' تنہائی کا مارا ہوا شخص ہے' جو ہجوم سے گھبرایا ہوا لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے۔ اس کے والدین کی آپس کی ناچاقی نے اسے بھی توڑ کے رکھ دیا ہے۔ ماں' باپ کی علیحدگی کے بعد وہ چھوٹی عمر میں بڑے دکھ پال بیٹھا تھا۔ اس نے دونوں کو چھوڑ دیا تھا' ماں' باپ کی زندگی سے نکل آیا تھا۔ سعید احمد کو خبر ہو چکی تھی کہ نگہت والدین کی موت کے بعد بھائی کی عدم توجہی کا شکار لڑکی ہے۔ باپ کی چھوڑی ہوئی کروڑوں کی جائیداد عیاشی میں اڑانے والا بھائی اپنی مرضی کے فیصلے اس پر مسلط کرنا چاہتا ہے' مگر وہ اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کی خواہش مند ہے۔ بینک بیلنس موجود تھا' اس کے پاس پیسے کی کمی نہیں تھی' مگر دکھ بانٹنے والا اس کے ساتھ کوئی نہیں تھا۔

علیحدہ گھر لے کر اکیلے رہنے کے بجائے وہ ویمن ہاسٹل میں آگئی تھی جہاں اسے تحفظ کا احساس تھا۔

سعید احمد جان گیا تھا نگہت کو بھی اس کی طرح شب بے داری کی عادت اور کچے رستوں پر دور تک چلنا پسند ہے۔ نگہت سمجھ گئی تھی کہ کالا رنگ سعید احمد کی کمزوری اور تیز بارشوں میں ننگے پاؤں بھیگنا سعید احمد کا جنون ہے۔

ہر شب بارہ بجے سعید احمد کا ایس ایم ایس "گڈ نائٹ" موصول ہوتا تھا اور پھر نگہت صبح تک اسے جگائے رکھتی تھی۔ ہر صبح "کون سا رنگ پہنوں؟" نگہت پوچھتی تھی اور سعید احمد ہر روز اسے کالے رنگ کے پہناوے پر مجبور کرتا تھا' دونوں کا صبح شام کا ساتھ تھا' ہر پل کی ہمراہی تھی' مگر سعید احمد نے نگہت کو دیکھا تھا' نہ نگہت سعید احمد کے سراپے سے آشنا تھی۔

☼ ☼ ☼

جولائی کی آخری شام پہلی بار وہ دونوں ہاسٹل کے سامنے لان میں اگی گھاس پر ایک ساتھ چلے۔ نگہت نے کالی قمیص' کالی شلوار پہنی ہوئی تھی۔ اس کے شانوں پر کالا دوپٹہ تھا۔ کلائی پر کالے ڈائل والی گھڑی۔ پیروں میں کالے سینڈل۔ کانوں میں کالے بندے' کالی نیل پالش' کالے بالوں والی کی آنکھوں کی رنگت بھی کالی تھی۔ اس کے قدم سے قدم ملاتے ہوئے سعید احمد نے دھیرے سے اس کی کلائی تھام لی۔ دونوں کے قدم رک گئے۔ سعید احمد نے اس کی کلائی کانچ کی کالی چوڑیوں سے بھر دی۔

وہ پہلی شام تھی جب دونوں پہلی بار ملے۔ پہلی شام جب دونوں نے ایک لفظ نہیں بولا۔ گھنٹوں بے تکان بولنے والی نگہت چپ رہی اور سانس لیے بغیر باتیں کرنے والا سعید احمد خاموش!

☼ ☼ ☼

اسی شام واپسی کے سفر پر راستے میں سعید احمد کے موبائل پر ایک نامانوس نمبر سے ایک نامانوس آواز نے ایک عجیب سا سوال پوچھا۔ "محبت یک طرفہ ہو سکتی ہے سر؟"

سعید احمد نے وہ آواز پہلی بار سنی تھی۔ وہ سوال پہلی بار پوچھا گیا تھا۔ اس کے جواب سے پہلے ہی پوچھنے والی نے رابطہ منقطع کر دیا۔ وہ کال ختم نہ کرتی تو بھی اسے جواب نہ ملتا۔ سعید احمد چپ رہ جاتا۔ وہ آواز پہلے نہیں سنی تھی' مگر سعید احمد کو لگا وہ لہجہ اس کی سماعت میں مدت سے محفوظ ہے۔ وہ انداز تخاطب اجنبی تھا' نہ مخاطب کرنے والا انجان۔ وہی لڑکی تھی جو۔۔۔ پچھلے کئی دنوں سے اسے روزانہ ایک کارڈ بھیج رہی تھی؟ کیا وہ۔۔۔ سعید احمد۔۔۔ کی محبت۔۔۔ میں۔۔۔ یک طرفہ محبت۔۔۔ میں؟ سعید احمد یک دم سرشاری و اداسی کے حصار میں جکڑ گیا۔

سونی کلائی والی کی بانہہ چوڑیوں سے بھر دینے کی سرشاری تھی یا اس سے پہلی ملاقات کی۔

کارڈ بھیجنے والی کی پہلی کال نے اسے شاد کر دیا تھا یا اس کی یک طرفہ محبت کے اقرار نے۔

ایسا پہلا اتفاق محبت پیدا ہوا تھا۔ نگہت' سعید احمد کے من میں پہلی بار جاگی تھی اور کسی دوسرے کو اس قریب میں جگہ دینا سعید احمد کے لیے ممکن نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

اگست کی سولہویں شب اس لڑکی کے فون نے سعید احمد کو عذاب میں مبتلا کر دیا تھا' جو اسے خوب صورت کارڈ بنا کر بھیجتی تھی' ہر صبح "صبح بخیر زندگی" کا ایس ایم ایس کرتی اور عجیب سوال پوچھتی تھی۔

ایک بار اس نے پوچھا تھا۔ "بیک وقت دو مختلف لوگوں سے محبت ہو سکتی ہے سر؟"

سعید احمد شش و پنج میں پڑ گیا تھا۔ کیا وہ اسے آزما رہی تھی؟ کیا وہ جانتی تھی کہ سعید احمد' نگہت کی محبت میں مبتلا ہے؟ کیا وہ گمان کر بیٹھی ہے کہ سعید احمد اس ان دیکھی لڑکی کے عشق میں گرفتار ہے؟ وہ کیوں پوچھ رہی ہے بیک وقت دو لوگوں سے محبت ہو سکتی ہے یا نہیں؟ پھر ایک شام اس نے پوچھا تھا۔ "کسی کو چاہنا اور کسی سے چاہا جانا اختیار میں ہے سر؟"

سعید احمد اس سوال کا جواب بھی نہیں دے سکا تھا۔ کیا وہ اسے باور کرانا چاہ رہی تھی کہ وہ سعید احمد کو چاہتی ہے اور یہ اس کے اختیار کی بات نہیں؟ کیا وہ جتلانا چاہتی ہے کہ سعید احمد اس سے چاہت کا اظہار نہیں کرتا' یہ بھی اس کے بس میں نہیں؟

سعید احمد اس کی بات سن کر چپ رہتا تھا۔ وہ بھی جواب لیے بغیر خاموش ہو جاتی۔ کال ختم کر دیتی تھی' مگر اگست کی سولہویں شب اس نے سعید احمد کو عذاب میں مبتلا کر دیا تھا۔

"کسی کے بغیر جینا محال ہو تو۔۔۔؟" اس کے لہجے میں بہت کرب تھا۔ ایسا کرب جس نے سعید احمد کو بھی درد کا کانٹا چبھو دیا۔

"اسے اپنا لینا چاہیے۔" سعید احمد نے بمشکل کہا۔

"وہ اپنانا نہ چاہے تو؟" دکھی لڑکی کی بھیگی آواز نے سعید احمد کو دکھ میں مبتلا کر دیا۔ اس کا جی چاہا وہ اسے سب کچھ صاف صاف بتا دے۔ بتا دے کہ اس نے نگہت کی کلائی کانچ کی چوڑیوں سے بھر دی ہے۔ تو چپ چاپ الٹے قدم کا سفر۔۔۔ سعید احمد کے الفاظ اس کے حلق میں پھنس رہے تھے۔

"میں۔۔۔ مر جاؤں گی!" پاگل لڑکی یک دم چھلک پڑی۔ فون مردہ ہو گیا۔ سعید احمد کو لگا اس کی شریانوں میں دوڑنے والا لہو یک دم رک گیا ہے۔ اس کے ہاتھ پیر بے جان ہو گئے ہیں' وہ مر گیا ہے۔ اسے اس اجنبی لڑکی سے محبت نہیں تھی' مگر وہ انس محسوس کرنے لگا تھا۔ اس لڑکی کے دکھ نے سعید احمد کو کاٹ کے رکھ دیا تھا۔

اس شام پہلی بار سعید احمد نے نگہت کو اس پاگل لڑکی کے بارے میں بتایا۔

"میں سمجھ نہیں پا رہا وہ لڑکی یک طرفہ میری محبت میں پاگل ہو رہی ہے یا۔۔۔"

"تم فیصلہ نہیں کر پا رہے' وہ تمہیں پسند کرتی ہے یا تم اس سے محبت کرنے لگے ہو۔" نگہت نے اس کی بات کاٹ دی۔ اس کی نظریں سعید احمد کے چہرے پر

بھی نہیں' جو اس سے آنکھیں چرا رہا تھا۔

"نہیں؟ اس کی محبت میں۔۔۔؟"

"ہاں! سچ یہی ہے سعید احمد!" نگہت نے ہونٹ بھینچے۔

"یہ جھوٹ ہے۔ یقین جانو مجھے اس سے محبت نہیں ہے۔" وہ کھوکھلے لہجے میں نگہت کو یقین دلانا چاہتا تھا۔

"تمہیں خود پر یقین نہیں ہے۔ اپنے آپ پر اعتبار نہیں ہے۔" نگہت نے مضبوط لہجے میں کہا اور کرسی کی پشت سے سر ٹیک لیا۔ اسے لگا اس کا ریت گھروندہ کوئی پاؤں تلے روند گیا ہے۔

جوس کے گلاس میز پر لبالب بھرے پڑے رہے۔ سعید احمد اور نگہت دونوں اندر سے خالی ہو کر اٹھ چکے تھے۔

☼ ☼ ☼

ستمبر کی دسویں صبح تک سعید احمد نے دوبارہ کبھی اس لڑکی کی کال نہیں سنی۔ اس کا ایس ایم ایس نہیں پڑھا' پڑھے اور جواب دیے بغیر ڈیلیٹ کر دیا۔ اس کے بھیجے ہوئے کارڈ نہیں دیکھے۔ بند لفافے کمرے میں بکھرے پڑے تھے۔ وہ اس سے محبت نہیں کرتا تھا اور اسے یک طرفہ محبت کے روگ میں قید رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس سے رابطے کا ہر سلسلہ توڑ چکا تھا۔ یک واہمے' ایک گمان کی بنیاد پر وہ نگہت کو کھو دینے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا' نگہت جس کے بغیر سعید احمد کا جینا اب محال تھا۔

ستمبر کی بارہویں صبح عبداللہ اس سے ملنے آیا اور اس کے کمرے میں بکھرے ہوئے ڈاک کے لفافے سمیٹ کر لے گیا۔

"خوب صورت لکھائی والی یقیناً خود بھی خوب صورت ہوگی سر جی!" اس نے عجیب سی بات کی تھی۔ سعید احمد نے اس کی بات کا جواب دیا نہ اسے اجنبی لڑکی کے کارڈ والے لفافے لے جانے سے روکا۔ وہ اس کہانی کو اب ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس قصے کو عبداللہ سے بھی چھپانے کا خواہش مند نہیں رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اسی شام وہ نگہت کو اپنے نام کی انگوٹھی پہنانے لے گیا۔

"میرا سنہرا خواب آج تعبیر ہو رہا ہے سعید احمد۔" نگہت نے شوکیس میں سجے سونے کے جھلملاتے زیوروں کو دیکھتے ہوئے خوشی سے کہا۔

"یہ خواب میں نے بھی دیکھا تھا۔" سعید احمد بھی بے حد خوش تھا۔

"مجھے کالے رنگ کا رنگ پہناؤ۔ میں نے زندگی میں سے باقی سارے رنگ نکال دیے ہیں سعید احمد۔" نگہت نے جیولری شاپ سے نکلتے ہوئے کہا۔ سعید احمد ایک پل کے لیے کھڑا رہ گیا اور پھر نگہت کے پیچھے چلا آیا۔

"ایک منٹ۔۔۔ پلیز!" دروازے سے نکلتے ہوئے سعید احمد کے قدم اس لڑکی نے روک لیے' جس کا سارا وجود چادر میں لپٹا ہوا تھا' چہرہ نقاب میں چھپا ہوا۔ جو کبھی بار اسے کتابوں کی دکان میں پھول تھامے ہوئے ملی تھی۔ جو اسے کارڈ بھیجتی تھی' جس نے اس کی کتاب کا سرورق بنایا تھا' جو اسے روزانہ ایس ایم ایس کرتی اور عجیب سوال پوچھتی تھی اور جس سے۔۔۔ سعید احمد کو محبت نہیں تھی۔

اس کی آواز میں عجیب سا درد تھا' لہجے میں بے پناہ کرب۔

"تم۔۔۔؟" سعید احمد کے قدم رک گئے تھے' نگہت بھی ٹھہر گئی تھی۔

"فائزہ!" اس نے کہا۔ سعید احمد رکا رہا۔ نگہت کے قدم دھیرے دھیرے اٹھنے لگے' وہ مڑ کر دیکھ رہی تھی۔

"مجھے جانا ہے۔" سعید احمد نے اس کے پاس سے گزر کر نگہت کے پیچھے جانا چاہا۔

"میں بھی چلی جاؤں گی' ہمیشہ کے لیے۔" اس کی آنکھیں یک دم چھلک گئیں۔ سعید احمد بے بس لڑکی کے پاس سے گزر نہیں سکا۔ اس نے چاہا کہ وہ آج اسے صاف صاف بتا دے کہ وہ نگہت سے محبت کرتا ہے۔

"وہ ناراض ہے۔ مجھ سے بات نہیں کرتا' میری بات نہیں سنتا' میں مر جاؤں گی سر!" رندھی ہوئی آواز نے سعید احمد کو چونکا دیا۔ وہ یوں چونکا جیسے طویل خواب سے جاگ گیا ہو۔

"وہ۔۔۔ کون؟"

"عبد۔۔۔ اللہ!" دل کے ہاتھوں مجبور لڑکی نے سعید احمد کی پلکیں نم کر دیں۔ ساری کہانی اسے سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ عبداللہ سے محبت کرتی تھی۔ عبداللہ کا سعید احمد سے محبت کا رشتہ تھا اور عبداللہ سے جڑے ہر رشتے سے فائزہ کو محبت تھی۔

نگہت دور نکل گئی تھی' سعید احمد کی زندگی سے دور' سعید احمد اسے روک نہیں پایا۔

☼ ☼ ☼

اکتوبر کی سوگوار شامیں گزر گئی تھیں' نومبر کے اداس دن بھی۔ دسمبر کے رت جگے کٹ گئے تھے' جنوری بھی خالی ہاتھ۔۔۔

نگہت نے جاتے ہوئے صرف ایک ایس ایم ایس کیا تھا۔ "اس شہر میں رہنے کا جواز ختم ہو گیا۔" اور وہ شہر چھوڑ گئی تھی۔

اس شام کے بعد فائزہ نے کبھی کال نہیں کی تھی۔ خوب صورت کارڈوں والے لفافے لے جانے کے بعد عبداللہ کبھی بھول کر بھی اس طرف نہیں آیا تھا۔

سعید احمد نے سب ہی پیاروں سے رابطے توڑ لیے تھے' مگر ہر شب اس نے خلوص دل سے نگہت کے لیے دعا کی۔ ہر صبح اس نے ہاتھ اٹھا کر پروردگار سے اداس لڑکی کے لیے' عبداللہ کو مانگا۔

ہر دعا میں اس نے عبداللہ کو شامل رکھا۔

آج کئی ماہ بعد نگہت کا پیغام سعید احمد کے موبائل پر نمودار ہوا تھا۔ "تمہارے شہر کی ہوا میں سانس لے رہی ہوں۔"

سعید احمد کو لگا آج مدت بعد اس کے شہر کی ہوا خوشگوار ہوئی ہے۔

"عبداللہ کی بارات میں' ثمر قند ہوٹل آ جاؤ۔" اس کا ایس ایم ایس آیا تھا اور سعید احمد کا دل پسلیاں توڑ کر باہر آنے والا تھا۔

"عبداللہ کی شادی تھی' دلہن کون تھی؟"

"فائزہ۔ اگر وہ نہ ہوتی' کوئی اور' تو وہ مر جائے گی۔" سعید احمد کو فائزہ کا دکھ بے چین کر گیا۔ اتنا بے چین کہ اس نے انا کی چادر اتار دی اور بن بلائے ثمر قند ہوٹل پہنچ گیا۔

نگہت نے آج بھی کالا سوٹ پہنا ہوا تھا۔

بجھے ہوئے چہرے والے سعید احمد کو اس نے دمکتے چہرے کے ساتھ خوش آمدید کہا۔

"مجھے بہت اچھا لگا سر جی۔" اسمارٹ عبداللہ سفید شیروانی میں بہت جچ رہا تھا۔ وہ ان دونوں کو ساتھ دیکھ کر اسٹیج سے اتر آیا تھا۔ سعید احمد کی کنپٹیاں سلگ رہی تھیں۔ اس کا جی چاہا وہ عبداللہ کو گریبان سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالے اور چیخ چیخ کر پوچھے۔ "تمہیں کیا حق پہنچتا ہے کسی کے خواب اجاڑنے کا؟"

مگر وہ ایسا نہیں کر سکا۔

نگہت اسے بازو سے پکڑ کر اسٹیج کے پاس لے آئی۔ بجھے دل والا سعید احمد اس منظر سے جلدی نکل جانا چاہتا تھا۔

"کسی کے بغیر جینا محال ہو تو' سر جی؟" اچانک اس کے کان میں عبداللہ نے شوخی بھری سرگوشی کی۔ سعید احمد نے چونک کر عبداللہ کو دیکھا۔

"مجھے لمبی لمبی کالیں کرنے والی سے نہیں ملیں گے؟" عبداللہ نے سعید احمد کو دلہن کے سامنے لا کھڑا کیا۔

"میں نے کہا تھا نا' اس کے بغیر مر جاؤں گی۔" سر جھکائے دھیمی آواز میں کہا۔ سعید احمد کو لگا جیسے وہ تپتے صحرا سے یک دم گھنی چھاؤں میں آ گیا ہے۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے سب کے سامنے ہاتھ پھیلا دیا' نگہت نے اپنا ہاتھ اس کی ہتھیلی میں دے دیا۔

☼

رخسانہ نگار عدنان
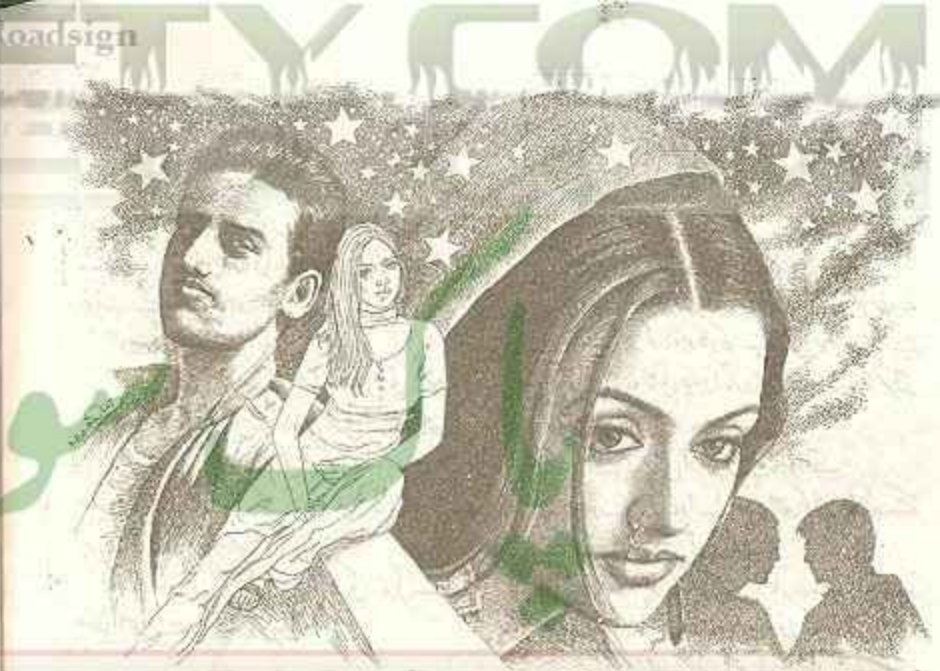
محبت خواب سفر

قسط ۵۸

"اور تمہارا فیصلہ...!" ایک لمبی چپ کے بعد بہت پُر امید نظروں سے دائم کو دیکھتے ہوئے عزہ نے مدھم آواز میں پوچھا۔

جواب میں ایک گمبھیر خاموشی تھی۔ عزہ اسے پلکیں جھپکائے بغیر دیکھتی رہی۔ پھر جیسے تھک کر اس نے نظریں دوسری طرف کرلیں۔

"میرا فیصلہ بھی بھی...؟" جب وہ اس کے جواب سے مایوس ہو چکی تھی تو دائم نے بہت ناپ تول کر کہنا چاہا۔ عزہ نے جلدی سے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔

"مجھے تمہارا جواب مل گیا ہے' اب کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں۔" بہت تیزی سے اس نے یہ دونوں جملے بولے لمحہ بھر کو اسے لگا اس کا آدھا سانس حلق کے نیچے ہی کسی خلا میں گم ہو گیا ہے اور اس کا گلا گھٹنے سا لگا۔ گلے کو ہاتھ سے دبا کر اس نے بمشکل سانس باہر کو کھینچا۔

"تم ابھی بھی کچھ نہیں سمجھیں؟" وہ اس کی کیفیت سے بے خبر تلخی سے بولا۔ "ابھی بھی وہی جلد بازی، وہی عجلت ہے تمہارے اندر جو فوراً کسی فیصلے پر پہنچ جانے اور نتائج اخذ کرنے کی عادی ہے۔"

اس کی نگاہوں میں شکایتیں ہی شکایتیں تھیں۔

"ابھی بھی عجلت میرے اندر ہے؟" وہ تعجب بھرے انداز میں بولی۔

"یہ عجلت پسندی نہیں تو اور کیا ہے۔ تم خود سے ہی ہر نتیجہ نکال لیتی ہو۔" وہ چڑے ہوئے انداز میں بولا۔

"اور کتنا میں نے تمہیں منع کیا تھا۔ روکا تھا کہ عزہ اتنی جلدی اتنا بڑا فیصلہ مت کرو مگر اس وقت بھی یہی جلد بازیاں...!"

"پلیز مجھے اب اور کچھ نہیں کہنا سننا..... آپ جا سکتے ہیں۔" اس کے حلق میں نمکین پانیوں کے گولے اٹکنے لگے تھے۔

ماں باپ کے بعد اب دائم کا اسے یوں اکیلا چھوڑ دینے کا فیصلہ..... یہ سب کچھ سہہ جانا آسان کب تھا۔

وہ اب اس سے صرف اتنی رعایت چاہتی تھی کہ وہ جلد سے جلد یہاں سے چلا جائے اور وہ جی بھر کر کمرہ بند کر کے روئے اتنا..... اتنا کہ پھر زندگی بھر کے لیے اس کی آنکھیں ان پانیوں سے خالی ہو جائیں۔

"اور جو تم سے محبت کرتے ہیں، تم انہیں اتنا سا بھی حق نہیں دو گی کہ وہ تمہیں ذرا سی سرزنش ہی کر سکیں۔" وہ پھر سے شکایتی لہجے میں بولا۔ اس کی نظریں عزہ کے متغیر چہرے پہ جمی تھیں۔

"ذرا سی سرزنش...!" اس نے اذیت سے آنکھیں بند کر لیں۔

"اس ذرا سی سرزنش کا سلگتا جہنم جو اس کے اندر سانسیں لینے لگا تھا معلوم نہیں آئندہ آنے والے دنوں میں وہ اسے جینے بھی دیتا یا نہیں۔ ابھی تو وہ سراپا سوال بنی ہوئی تھی۔ باہر والوں کے، ارد گرد والوں کے فیصلے سننے کی منتظر۔

مگر وہ یہ بھی جانتی تھی آخری فیصلہ وہی ہوگا جو اس کے اندر سے آئے گا اور وہ کیسا وحشت ناک اور خوفناک ہوگا اور اس فیصلے کے ماتحت اس کی آنے والی زندگی کیسے گزرے گی یہ خیال اسے ابھی سے ہراساں کر رہا تھا۔

"میں نے ساری زندگی ہر طرح کا فیصلہ چھوٹا ہو یا بڑا، معمولی یا غیر معمولی خود کیا ہے۔" وہ جانے کس پل اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا تھا اور اب نظریں اس کے ہراساں چہرے پہ جمائے کہہ رہا تھا۔

عزہ کا جی چاہ رہا تھا اپنے پیچھے ایستادہ پہلو دھکا دے کر گرا دے اور یہاں سے بھاگ جائے کسی بھی آخری فیصلے کو سنے بغیر!

"مگر اس ہر چھوٹے بڑے معمولی غیر معمولی فیصلے میں میرے پیرنٹس کی رضا شامل ہوتی تھی۔ کبھی ان کی رضا مجھے پہلے مل جاتی اور کبھی ذرا بعد میں، میری کچھ کوشش اس میں شامل ہوتی اور کبھی وہ خود ہی میرے مزاج کو دیکھ کر سمجھ جاتے کہ اب انہیں یہ سب کرنا ہی پڑے گا۔"

"اوہ تو آپ اپنے مزاج کو ابھی اس نہج پر لے کر جائیں گے جس سے خوفزدہ ہو کر یا بلیک میل ہو کر آپ کے پیرنٹس بالآخر آپ کا کوئی بھی فیصلہ منظور کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔" وہ ایک دم سے پہلے والی عزہ بن کر بولی۔ "تو پھر میری طرف سے سوری۔"

دائم نے بے اختیار اس کے لبوں پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"ابھی نہیں..... ابھی کچھ بھی نہیں کہو۔"

"پلیز....." اس نے تیزی سے اس کا ہاتھ اپنے لبوں سے ہٹایا۔

"تمہارے ایڈونچر کے جھٹکے سے ہماری محبت کی پوری عمارت جو ابھی تو تعمیر شدہ تھی سوکھے پتے کی طرح لرز رہی ہے۔ سو پلیز ابھی پھر سے کوئی جلد بازسا فیصلہ نہیں کرو۔" وہ ذرا سا مسکرا کر آنکھوں میں گہری سنجیدگی سے بولا۔

"اور جو فیصلہ آپ کے پیرنٹس ابھی فرما کر گئے ہیں۔" وہ تیزی سے بولی۔

"وہ ان کا حق ہے۔ میں نے انہیں استعمال کرنے دیا مگر عزہ! یہ میری زندگی ہے، جس طرح اپنی زندگی کا ہر فیصلہ کرنے کا مجھے شروع سے حق حاصل رہا ہے تو میں یہ حق کسی کو آسانی سے کیسے تفویض کر سکتا ہوں مگر مجھے اس طرح کمزور پڑنے پر بھی تم نے مجبور کیا۔"

اور وہ اسے پتھرائی نظروں سے دیکھتی رہ گئی۔

یہ طعنہ، یہ جملہ اس کی زندگی کے آنے والے ہر دن کا ایک ناگزیر حصہ بننے والا تھا۔ کیا وہ اسے اپنی زندگی کے ہر دن کا لازمی جزو بنا کر ایک مکمل زندگی گزار پائے گی؟

ایک ایسا سوال جس نے اسے منجمد سا کر دیا۔

دائم اور بھی کچھ بول رہا تھا مگر اس کے کان کچھ نہیں سن رہے تھے۔ صرف دائم کے ہلتے لب اور.....

"مجھے کمزور بھی تم نے کیا۔" ایک ہی جملے کی بازگشت۔

"میں ابھی گھر جا رہا ہوں اور تم یہ مت سمجھنا۔ میں تم سے بہت ناراض ہوں۔ اب اس کا فائدہ بھی نہیں تم اپنی مرضی کر چکی ہو۔ لیکن مجھے کچھ دن یہ سب کچھ سیٹ کرنے دو۔ اتنا تو مجھے فیور کرو گی نا عزہ؟" وہ اس کا کندھا ہلا کر پوچھ رہا تھا۔

اور وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔

"کیا ہوا! آپ کیا سوچنے لگیں؟" وہ اس کی کیفیت پہ لحہ بھر کو چونکا۔

عزہ نے کوئی جواب دیے بغیر آہستگی سے اس کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹا دیا۔

"مما بھی یہیں ہیں اور مجھے پتا ہے تم اسے اس وجہ سے خفا بھی نہیں بلکہ ان کا ووٹ تو میرے ساتھ ہے۔ انہوں نے پاپا کو منانے کی کوشش بھی کی بلکہ تم دیکھنا چند دنوں میں پاپا بھی مان جائیں گے۔ وہ میری اور مما کی کسی بات سے زیادہ دن انکار کر ہی نہیں سکتے پھر ہم....."

وہ اب ذرا جوش میں اسے تسلی دے رہا تھا۔

"اب اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔" وہ منجمد لہجے اس سے فیصلہ کروا چکے تھے۔

"مطلب؟"

"آپ شاید گھر جا رہے تھے۔" وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ اس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔

دائم اس کے چہرے کو دیکھ کر کچھ اخذ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

"تم نے کیا سوچا ہے؟" وہ اس کی چپ سے قدرے ڈرے ہوئے انداز میں بولا۔

"کم از کم وہ نہیں جو اب میرے ارد گرد والوں کے لیے مزید کسی پریشانی کا باعث بنے۔" وہ ٹھوس آواز میں بولی۔

"اور میں تمہارے ارد گرد والوں میں شامل ہوں نا؟" وہ ذرا سا بے یقین ہو کر بولا۔ عزہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"عزہ!"

"دائم! ابھی آپ جائیں۔ ابھی ہمارے گھر میں بھی..... بلکہ کہیں بھی کچھ نارمل نہیں۔ تو ہم ایسے حالات میں کوئی بھی اچھا نہ سہی مناسب فیصلہ کر سکیں گے۔"

اور دائم کو کچھ عجیب سا لگا۔ کچھ دیر پہلے وہ دائم کا آخری فیصلہ جاننے کی منتظر تھی اور اب وہ کہہ رہی تھی "ہم کوئی مناسب فیصلہ نہیں کر سکتے۔"

وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔

ایک ایڈونچر کر چکی تھی مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ وہ اپنی طبیعت یا فطرت کے اس لازمی جزو کو اپنے اندر سے نکال پھینکنے کا ارادہ کر چکی تھی۔

بلکہ شاید کوئی اور ایسا ہی فیصلہ!

"تم نے کیا سوچا ہے عزہ؟" وہ لمحہ بھر میں بہت کچھ جان چکا تھا کہ عزہ کچھ اور سوچ چکی ہے۔

"میں نے ___ کیا اس سارے منظر نامے میں مجھے بھی حق حاصل ہے کوئی فیصلہ کرنے کا؟" وہ عجیب پھیکے سے لہجے میں بولی۔

دائم کو وہ بہت بکھری ہوئی اور شکست خوردہ سی لگی۔

اس سارے میں اگر کسی نے کچھ نہیں پایا تھا تو عزہ کے ہاتھ بھی کچھ نہیں آیا تھا آگ کا دریا عبور کر آنے کے بعد بھی وہ خالی ہاتھ تھی۔

"تمہیں واپس آجانے کا دکھ ہے ___ پیشن تھا نا تمہارا تو خود کو یوں پروجیکٹ کرنے کا؟" یک دم سے دائم کو خیال آیا۔

"پروجیکٹ ہونہہ۔" وہ صرف یہی دہرا کر چپ ہو گئی۔

اس منحوس پریڈ کے بعد اس دن سے برینڈڈ کمپنیوں کے کتنے فون آچکے تھے اسے کہ اس نے فون ہی مستقل آف کر دیا تھا۔ ان لوگوں کے لیے یہی بات بہت حیران کن تھی کہ ایک ہی رات میں شہرت کی بلندیوں پر بیٹھ کر وہ کیسے شہرت سے خائف ہو گئی۔

وہ شاید ابھی بھی خائف نہ ہوتی اگر میڈم یاقوت کا اصل چہرہ، تکلیف کا تیز احساس اس کے اندر کسی برقی رو کی طرح دوڑا۔

وہ میڈم یاقوت جس کو میڈم بنانے میں کچھ نہ کچھ نہیں بلکہ بہت بڑا ہاتھ اس کے آئیڈیل باپ کا بھی تھا۔

"او کے تم اندر چل کر تھوڑا ریسٹ کرو ہم پھر بات کریں گے۔" دائم کو اس کی ذہنی حالت کچھ اتنی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ سوزی سے اس کا ہاتھ چھو کر بولا۔ عزہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نہ کوئی الوداعی کلمہ۔ اور آہستگی سے اندر کی طرف مڑ گئی۔

اور دائم کے روش پہ چلتے قدم بے اختیار ٹھٹک گئے۔

وہ جھک کر اس سی ڈی کے چاروں ٹکڑے اٹھا کر سیدھا ہوا اور ان ہی قدموں پر واپس چلتا عزہ کے پاس آگیا۔ وہ اس کے یوں واپس آنے پر ٹھٹک کر مڑی تھی۔

دائم نے خاموشی سے وہ چاروں ٹکڑے اس کی طرف بڑھا دیے۔

"اتنی محنت کے بعد سب کچھ حاصل کرنا اور پھر فوراً" ہی اسے یوں برباد کر دینا۔" وہ ان ٹکڑوں کو دیکھتی رہ گئی۔

ان چمکتے بے جان ٹکڑوں میں کیا نہیں تھا۔

محمود ولا کو بنیادوں سے ہلا کر زمین بوس کر دینے کا سارا سامان ___ اور اس سے زندہ رہ جانے کا ہر جواز چھین لیا جاتا اگر یہ ٹکڑے آپس میں جڑے رہتے۔

وہ کانپ کر رہ گئی۔

"شاید وہ ابھی بھی صرف ..... محمود عالم سے محبت کرتی ہیں اور اسی محبت سے مجبور ہو کر ___"

دائم وہ ادھورے جملے بول کر بہت کچھ کہہ گیا۔ عزہ ہاتھوں میں وہ بے جان ٹکڑے لیے اس عورت کی محبت کے ٹکڑوں کو جوڑنے کی ناکام سعی کرتی رہی جو شاید اسے کبھی ثابت مکمل ملی ہی نہیں تھی۔

کبھی دن کے چور لمحوں میں یا رات کے تاریک اندھیروں میں ___ ایک مکمل سالم دن بھی اس کی محبت کو نصیب نہیں ہو سکا تھا اور وہ پھر بھی ..... پھر بھی محمود عالم کو اس کی پوری زندگی لوٹا گئی تھی اور عزہ کو ..... پہلے برباد کرنا چاہا اور اب .....

اس نے زور سے ان ٹکڑوں کو مٹھی میں بھینچ لیا۔

☼ ☼ ☼

میڈم یاقوت کو لگا ان کے قدم زمین نے کچھ اس قوت سے جکڑے ہیں کہ وہ عمروں کی توانائی لگا کر بھی اپنے پیر نہیں چھڑا سکیں گی۔

اور یہ منظر کاش کچھ ان کی بینائی چھین چکی ہوتی تو اس طرح کا کوئی منظر وہ نہ دیکھ پاتیں۔

مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔

وہ اسی طرح مقناطیسی زمین کے ساتھ ایستادہ تھیں اور ان کی بے دم ہوتی نگاہیں اس منحوس منظر کو یک ٹک دیکھ رہی تھیں۔

لائبہ اور جہانگیر ہمدانی...

دونوں ساتھ ساتھ ایک ہی صوفے' ایک دوسرے کے پاس قدرے بے تکلف سے انداز میں اور مطمئن چہروں کے ساتھ اسے یوں دیکھ رہے تھے جیسے وہ انہیں کوئی کرتب دکھانے لگی ہوں۔

"مام! میٹ مائی ہزبینڈ جہانگیر ہمدانی!" لائبہ چہک کر بولی۔

"اوہ سوری میں بھول گئی۔ آپ دونوں تو شاید پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔"

"وہ تمہیں ایسے ہی ___ پہلے کسی جنم میں۔" جہانگیر بے باکانہ انداز میں لائبہ کی گردن میں بانہہ حمائل کر کے خباثت سے بولا۔

اور میڈم یاقوت کو لگا آج ہی حشر کا دن ہے۔

ان کے اعمال نامے کا ایک ایک پرت آج ہی کھل کر رہے گا۔ ہر وہ پرت جس پہ ان کے کردہ' ناکردہ چاہے ان چاہے ان دیکھے گناہ کا حساب یوں سطر سطر درج ہے کہ وہ خود سے یہ سب پڑھ سکتی ہیں اور اس سارے شمار نامے کے ساتھ ان کی سزا کا اندراج بھی ساتھ ہی لکھا ہے۔

"کیا بات ہے ساس جی! یہ منظر اتنا دل کو بھایا کہ نظریں ہٹانے کو جی نہیں چاہ رہا۔ ایسی بات ہے تو ادھر آجایئے نا ہمارے بالکل قریب ___ آپ بھی پاس ہوں گی ہمارے دل و جان کی روشنی' زندگی' خوشبو بہار اور کیا نام دوں میں اپنی اتنی شاندار' حسین لائف پارٹنر کو تو دیکھیے' زندگی کی ہر بہار ہم سے حسد کرنے لگے گی قسم سے..."

جہانگیر ہمدانی ..... ان کے دربار کا وہ کتا جو ہمیشہ ان کے قدم چاٹنے کے لیے دم ہلاتا لوٹیں لگاتا یاقوت کی قربت کے چند گھنٹے' چند منٹ نصیب ہونے کے لیے سب کچھ کر گزرنے کو تیار رہتا تھا۔ اب وہ لائبہ ان کی سگی ان کی جائز ان کی سب سے لاڈلی اولاد...

کتنا کریہہ منظر تھا۔

مگر نہیں' انہوں نے تو اس سے بھی زیادہ کریہہ اور غلیظ مناظر بہت سے ___ ان گنت کہ اب تو گنتی بھی بھول گئی تھی اور وہ سارے رجسٹر اندراج نامے بھی کل دفتر کھلنے پر نذر آتش کر دیے جاتے' ایسے کتنے ہی منظر انہوں نے بہت سی لڑکیوں کے مقدر میں لکھے تھے۔

اور ان کی بے بسی پر فلک شگاف قہقہے بھی لگائے تھے۔

کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ نہ آسمان شق ہوا تھا نہ زمین پھٹی تھی۔ نہ پہاڑ ریزہ ریزہ ہوئے تھے۔ بس یومِ حساب کو ن اوسی مل گیا تھا۔

مگر شاید صرف ان کے لیے...

باقی دنیا کے سارے لوگ تو اسی طرح اپنی دنیاداری کے دھندوں میں مگن رواں دواں تھے۔۔۔ یہ یوم حشر صرف ان کے لیے تھا۔

جانے کون سا وہ لمحہ تھا۔ انہوں نے اپنے وجود کی ساری قوتیں مجتمع کر کے زور سے جھٹکا لگایا اور جیسے اڑتی ہوئی ان دونوں کے سروں پر پہنچ گئیں۔

ایک زوردار تھپڑ انہوں نے لائبہ کے منہ پر رسید کیا تھا اور پھر ایک کے بعد دوسرا اور پھر تیسرا...

"خبردار!" دوسرے لمحے جہانگیر ہمدانی نے پوری قوت سے ان کی کلائی جکڑی تھی۔

"جوش میں بھی ہوش قائم رکھو یاقوت بیگم!"

وہ کسی زخمی شیر کی طرح غرایا۔

"یہ اب تمہاری بیٹی ضرور ہے مگر میری بیوی ہے۔۔۔ اس کو ہاتھ لگانے سے پہلے بلکہ چھونے سے بھی پہلے تمہیں مجھ سے اجازت لینا ہوگی ورنہ مجھے اتنا کمزور نہ سمجھنا کہ میں اپنی چیز کی حفاظت نہ کر سکوں۔"

وہ پورا زور لگا کر بھی اپنی کلائی اس خبیث سے چھڑا نہیں سکی تھیں۔

"تم سے اب میرا جو رشتہ ہے صرف اس کا لحاظ کر کے چھوڑ رہا ہوں ورنہ تم جانتی ہو جہانگیر اپنے غصے میں کیسا دیوانہ ہو جاتا ہے۔ اپنے غیر کی پہچان نہیں رہتی اسے۔"

اس نے غرور بھرے انداز میں یاقوت کی کلائی ایک جھٹکے سے چھوڑ کر انہیں پرے دھکا دیا تھا۔

دوسرے لمحے میڈم یاقوت نے نیچے گرتے گرتے سنبھل کر تیزی سے اپنے کندھے سے جھولتے بیگ میں ہاتھ ڈالا اور دوسرے لمحے سیاہ پسٹل ان کے ہاتھ میں تھی۔

"اب میری سمجھ میں آیا کہ اتنا سب کچھ ہوا اور تم مردود نہیں مرے اس کی کیا وجہ تھی؟" وہ جھٹکے سے سنبھل چکی تھیں۔

"اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ تم نے آج اس لمحے میرے ہاتھوں سے مرنا تھا۔" وہ نفرت بھرے انداز میں غرا کر بولیں۔

"چچ چچ، اپنی بیٹی کو اتنی جلدی بیوہ کرو گی۔ ایسی بھری جوانی میں بیوگی، مر نہ جائے کہیں یہ۔ اسی کا ہی سوچ لو مجھ سے اگر کوئی دشمنی ہے بھی تمہیں تو ساس جی!" وہ بہت مطمئن انداز میں بول رہا تھا۔

"تم دشمنی، دوستی کو بھول جاؤ۔ اب صرف اپنی آتی جاتی سانسوں کو گنو کہ کون سی سانس آخری ہوگی۔" انہوں نے بڑی مہارت سے پستول کا رخ عین اس کے دل کی طرف کرتے ہوئے مطمئن انداز میں کہا۔

"نہیں مام!" دوسرے لمحے لائبہ عین جہانگیر ہمدانی کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

اور جہانگیر ہمدانی کو لگا، وہ اپنی جوانی کے عین پچیسویں سال میں چلا گیا ہے جب کبھی یاقوت بھی اس کی یونہی ڈھال بنا کرتی تھی۔ اسی طرح سے ہر مشکل میں اس کے آگے کھڑی ہو جایا کرتی تھی۔

"مائی سویٹ ہارٹ، مائی ڈارلنگ! تمہیں ذرا سی خراش بھی آئے تو اس سے پہلے میں اس گولی کو اپنے سینے پر کھانا پسند کروں گا۔ پلیز ہٹ جاؤ میرے سامنے سے۔" وہ بڑی بے باکی سے لائبہ کو اپنی بانہوں میں بھر کر بولا۔

"کچھ یاد ہے یاقوت بیگم! کبھی تم بھی ہماری یونہی ڈھال بنا کرتی تھیں لوہے اور اسٹیل سے مضبوط ڈھال۔"

وہ بے باکی سے یاقوت کو آنکھ مار کر بولا۔

"لائبہ! ہٹ جاؤ، جاؤ اس شیطان کے سامنے سے۔ آج میں اس کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔" وہ پاگلوں کی طرح چلا کر بولیں۔

لائبہ یاقوت کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

"کیوں مام۔۔۔ کیوں زندہ نہیں چھوڑیں گی؟" وہ مطمئن انداز میں سامنے آ کر بولی۔

"تم۔۔۔ تم ہٹ جاؤ۔ میں کہہ رہی ہوں۔" وہ جنونی انداز میں بولیں۔

"اس لیے کہ میں نے اس سے اپنی رضا اور خوشی سے شادی کی ہے؟" وہ اسی بے لچک آواز میں بولی۔

"لائبہ!" اس سے زیادہ سننا ان کے لیے محال تھا زور سے چیخ کر بولیں۔ لائبہ کے چہرے پر وہی سکون تھا۔

"یا! اس لیے کہ اس نے ہر اس شیطانی دھندے میں آپ کی معاونت کی، اسے آگے بڑھایا جس میں آپ کی بھی خوشی شامل ہوتی تھی۔" وہ رک رک کر بولی۔

یاقوت کے ہاتھ میں پستول لرز کر رہ گیا۔

"بکواس بند کرو اور ہٹ جاؤ اس کے سامنے سے۔" وہ خود پر قابو پا کر چلائیں۔

"مام! اگر یہ گولی کے لائق ہے، کتا کہلوانے کے قابل ہے تو آپ خود کیا ہیں؟ کچھ سوچا آپ نے یا ابھی سوچنے کے لیے آپ کو قیامت کے دن کا انتظار ہے۔"

وہ لائبہ کو دیکھتی رہ گئیں۔

اس نے کیسے تاک کر نشانے لگائے تھے۔

"مام! اگر ایسی موت اس کا مقدر ہو سکتی ہے تو آپ کی کیوں نہیں؟" وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں، یہ سب کچھ ان سے لائبہ کہہ رہی ہے۔

دوسرے لمحے وہ پیچھے پھل کی ٹوکری میں پڑے لمبے پھل والا چاقو کھینچ کر ہاتھ میں لے چکی تھی۔

"اگر آپ جہانگیر کو شوٹ کریں گی تو میں اس سے، آپ کی جان نہ لے سکی تو اپنی لے لوں گی۔ آئی سویئر مام!"

اس نے چاقو کے لمبے پھل کی نوک اپنے سینے میں کھبو رکھی تھی، یاقوت کو لگا شاید نوک ان کے سینے میں اتر چکی ہے۔

"ہٹاؤ۔۔۔ ہٹاؤ اسے، یہ لگ جائے گا لائبہ! کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ ہٹاؤ۔" وہ زور سے چیخیں۔

"میں اسے ایک انچ ہٹالوں گی یا ایک انچ اپنے اندر اتار لوں گی مام! اگر آپ نے اگلے سیکنڈ میں یہ پسٹل ہاتھ سے نہیں رکھی تو۔۔۔" وہ پھر سے اسی لہجے میں بولی۔

"اوہ۔ جو لڑکی اس جیسے شیطان سے جانتے بوجھتے شادی کر سکتی ہے وہ کیا نہیں کر سکتی۔" اتنا تو انہیں اندازہ ہو ہی گیا تھا۔ لائبہ جذباتی پن میں ان سے بھی بہت آگے ہے۔ وہ ان کی کسی دھمکی میں نہیں آئے گی۔

انہوں نے تھکے ہوئے انداز میں پسٹل والا ہاتھ نیچے کر لیا۔

"گڈ!" جہانگیر بچوں کی طرح تالیاں بجانے لگا۔ "ویری اوبیڈینٹ مدر۔" وہ خوش ہو کر بولا۔

"رکھو اسے واپس۔" یاقوت خود پر اپنے آتش فشاں کی طرح ابلتے غصے پر قابو پا کر لائبہ سے بولیں۔

اس نے آہستگی سے چاقو پھل والی ٹوکری میں واپس رکھ دیا۔ کمرے میں موت کی سی خاموشی چھا گئی۔

"چلیں ڈارلنگ! آپ کی والدہ کا آشیرباد تو ہمیں مل گیا۔ یہ دل اپنی نئی زندگی کی شروعات کرنے کے لیے بے تاب ہوا جا رہا ہے۔ اب اور زیادہ انتظار ممکن نہیں۔"

وہ پھر سے لائبہ کی گردن میں بازو حمائل کر کے بے تکلف انداز میں بولا اور یاقوت کے ہاتھ کی گرفت پستول کے ٹریگر پر سخت ہو گئی۔

”ہوں، کیوں نہیں۔ مام! آپ پلیز بیٹھیں گی۔“ لائبہ یوں جہانگیر کی طرف نرم مسکراہٹ اچھال کر بولی جیسے دونوں میں بے تحاشا محبت ہو اور یہ قربت۔

میڈم یاقوت کی آنکھوں میں جیسے کسی نے مرچیں بھر دیں۔

وہ زور سے آنکھیں بند کر کے رہ گئیں۔

”کیوں اس بے چاری کا اس عمر میں اتنا کڑا امتحان لے رہی ہو۔ اس عمر میں بلڈ پریشر، ہارٹ اٹیک، برین ہیمبرج جیسی کتنی جان لیوا اچانک سے اٹیک کا خطرہ ہو سکتا ہے۔ تم پھر بھی بار بار انہیں اسی اذیت ناک کیفیت سے دوچار کر رہی ہو۔“ وہ پھر سے مزہ لے کر اس کے اور بھی قریب ہو کر بولا۔

”بے چاری کھڑے کھڑے تھک گئی ہوں گی۔ اب انہیں آرام کرنے دو، اس عمر میں آرام کی کتنی ضرورت ہوتی ہے۔ تمہیں بھی اندازہ ہو گا۔ آج یہ عمر رسیدہ عورت تمہاری ماں ہے لاکھ خود کو فٹ شو کرے مگر عمر کا جادو تو اثر کر کے ہی رہتا ہے۔“ جہانگیر اس سے گن گن کر بدلے لے رہا تھا۔

اور میڈم یاقوت کے پاس سوائے بدن سے اٹھتے شراروں کو ضبط کرنے کے اور کوئی راستہ نہیں تھا فی الحال۔

”کیا یہ بڈھا صحیح بکواس کر رہا ہے لائبہ!؟“ وہ خود پر قابو کر کے قدرے نارمل آواز میں بولیں۔

لائبہ سوالیہ نظروں سے ماں کو دیکھنے لگی۔

”ڈارلنگ! حیران کیوں ہوتی ہو، یہ ایک سو کالڈ ”الٹرا ماڈرن ماں کا المیہ ہے جو اپنی بیٹی کے شوہر کو حریص نظروں سے دیکھتی ہو، یہ وہ حسد ہے جو چیخ رہا ہے اس کے لہجے میں۔“ پھر سے تانک اڑا کر بولا۔

”آپ کا مطلب نکاح سے ہے مام؟“ لائبہ نے جہانگیر کی ہرزہ سرائی کو نظر انداز کر کے کہا۔

”ہم آپ سے جھوٹ کیوں بولیں گے مام؟“ وہ ذرا توقف سے بولی۔

”مگر کیوں؟“ وہ زور سے چیخیں۔

”یہ ضروری تھا مام!“ وہ نظریں جھکا کر بولی۔

”کیوں، کیوں ضروری تھا؟“ وہ سامنے پڑا مینٹل پیس فرش پر مار کر زور سے بولیں۔

”دو باتوں کے لیے۔“ لائبہ اسی سکون سے بولی۔

”اونہوں ڈارلنگ! چلو نا۔ کیوں اس خبطی بڑھیا کے ساتھ اپنے بھیجے کی لسی بنا رہی ہو۔ ہم اس کے آگے جواب دہ نہیں۔“ اس کے منہ سے بہتی رال اسے اور بھی مکروہ بنا رہی تھی۔

”میری آپ سے ایک ریکویسٹ ہے جہانگیر!“ لائبہ نے ایک نظر یاقوت کے لمحہ بہ لمحہ سرخ ہوتے چہرے پر ڈال کر ملائمت سے جہانگیر سے کہا۔

”حکم کرو میری جان! کہو تو پلکوں کے بل چل کر باہر گاڑی اسٹارٹ کروں یا جو تم کہو۔“ وہ اور بھی رال ٹپکا کر بولا۔

”ہماری ہوٹل میں بکنگ ہو چکی ہے نا!“ وہ اس کی بہتی رالوں سے نظریں چرا کر بولی۔

”آف کورس ڈارلنگ! بلکہ روم بھی فرسٹ برائیڈل نائٹ کے لیے ڈیکوریٹ کرا لیا گیا ہے۔ اب تم چلو نا اور کتنا تڑپاؤ گی مجھے۔ بس اب اس بحث پر لعنت بھیجو اور چلو بس۔“ وہ بچوں کی طرح ضدی پن سے کہتے ہوئے لائبہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بے قراری سے بولا۔

یاقوت نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔

”آپ ہوٹل جائیں میں مام سے بات کر کے وہیں آ جاؤں گی۔“ وہ تحمل سے اسے دیکھ کر بولی۔

”کیا؟“ اس کا منہ اور بھی کھل گیا۔

”نہیں بالکل بھی نہیں۔“ دوسرے لمحے وہ زور سے سر ہلا کر بولا۔

”میں تمہیں ساتھ لیے بغیر نہیں جاؤں گا، ہرگز نہیں۔“ وہ پھر سے اس کے قریب آنے لگا تھا۔ لائبہ آہستگی سے ایک طرف ہو گئی۔

”میرا مام سے بات کرنا بہت ضروری ہے۔“

”اوکے ہم کر لو بات۔ میں یہیں بیٹھ کر انتظار کر لیتا ہوں۔“

وہ اب کے ذرا مہذب انداز میں کہتے ہوئے پھر سے صوفے پر بیٹھنے لگا۔

”نہیں پلیز! ایسے نہیں، میں اس طرح بات نہیں کر سکوں گی۔ آپ ہوٹل چلے جائیں۔ مجھے کچھ ٹائم لگے گا۔“

جہانگیر الجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

”مجھے صرف وہ بات بتاؤ جو تمہارے دل میں ہے۔“ دوسرے لمحے وہ اکھڑ پن سے بولا۔

”ایسا کچھ بھی نہیں ہے جہانگیر! آئی سوئیر۔ وہ میری ماں ہیں اور یہ نکاح میں نے ان کی رضامندی کے بغیر کیا ہے تو اتنا حق تو ہونا چاہیے کہ میں اپنی ماں کو منانے کی کوشش کروں۔“

وہ ایک تابع دار بیوی کی طرح جہانگیر کی منتیں کر رہی تھی۔

”نہیں ہے یہ عورت کسی کی بھی ماں بننے کے لائق اور نکاح کے بعد اس کو منانے کی یا کسی بھی اور رشتہ کو شوہر کی خوشی پہ ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ تم اتنا سمجھتی ہو نا!“ وہ ہٹ دھرم لہجے میں بولا۔

اپنے مطلب کے لیے اسے رشتوں کی درجہ بندی بھی کرنا آ گئی تھی۔

”تم دفع کیوں نہیں ہو جاتے یہاں سے۔“ یاقوت اسے کھا جانے والے لہجے میں بولیں۔

”پلیز مام! میں بات کر رہی ہوں نا! آپ ہمارے معاملے میں نہ بولیں، اوکے۔“ وہ ایک بالکل ہی بدلی ہوئی لائبہ تھی۔

یاقوت بے یقینی سے اسے دیکھتی چلی گئیں۔

”جہانگیر! آپ کا رشتہ سر آنکھوں پر لیکن میں مام سے بات کیے بغیر نہیں جاؤں گی اور وہ بھی آپ کی غیر موجودگی میں۔ آپ کو جانا ہو گا۔“ وہ سنجیدگی سے ٹھہر ٹھہر کر بولی۔

”اور اگر نہ جاؤں تو؟“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔

”تو آپ جانتے ہیں آپ بھی میرے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتے۔“ وہ لمحہ بھر کی خاموشی کے بعد ٹھوس آواز میں بولی۔

”مطلب کیا ہے اس سارے ڈرامے بازی کا؟“ وہ پھر سے غصے میں آ کر بولا۔

”میں ابھی گارڈز کو بلاتی ہوں، اسے ہاتھوں میں اٹھا کر باہر سڑک پر پھینک آتے ہیں۔“ یاقوت نفرت سے بولیں۔

”مام پلیز۔“ لائبہ زور سے چلائی۔

اور یاقوت کو خاموشی اختیار کرنا پڑی۔

اب ان کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا کہ اس جہانگیر کو کس طرح ہمیشہ کے لیے....

”مگر بہت پہلے میں نے اس.... سے جان چھڑا لی ہوتی.... جبکہ میں جانتی تھی یہ لائبہ پہ بری نظر رکھتا ہے۔ تو کیا لائبہ کو تنزیل نے نہیں اس نے اغوا کیا تھا؟“

ایک حیرت انگیز سی بات ان پر منکشف ہوئی۔

وہ مشکوک نظروں سے جہانگیر کو دیکھنے لگیں۔

تو پھر تنزیل مجھے فون کیوں کرتا رہا۔

"اوکے اگر تم دو گھنٹے میں ہوٹل نہ پہنچیں تو میں خود آجاؤں گا اور اکیلا نہیں آؤں گا۔ اپنی ماں کو اپنی زبان میں سمجھا لیتا۔ ویسے تو شرافت کی زبان اس کی سمجھ میں نہیں آتی تم جو اس کو سمجھانا چاہ رہی ہو نہیں سمجھے گی یہ۔" وہ نفرت سے میڈم یاقوت کو دیکھ کر بولا اور اٹھ کر جانے لگا۔

"میں نے کہا نا۔ میں آجاؤں گی ڈونٹ وری۔" لائبہ اس کو دروازے تک چھوڑنے جا رہی تھی۔

"اپنا فون آن رکھنا۔" وہ فکر بھری تاکید اسے کر رہا تھا جیسے دونوں بطور میاں بیوی ایک لمبا عرصہ ایک ساتھ گزار چکے ہوں۔

میڈم یاقوت کے بدن میں پھر چنگاریاں سی پھوٹنے لگیں۔

"میں آپ کے فون کرنے سے پہلے پہنچ جاؤں گی۔ آئی پرامس۔" وہ اسے خوب تسلیاں دے رہی تھی۔

وہ سرہلاتا چلا گیا اور لائبہ اندر آگئی۔ میڈم یاقوت نے منہ پھیر لیا۔

☼ ☼ ☼

"کیا سوچ رہے ہو آغا..... کیسی الٹی۔ کہانی نکلی محمود عالم..... میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی حق ہاہ اللہ بخشے اس کی ماں شاہین کو۔ کیسے کیسے حلف اٹھا رہی تھی بیٹے کی پارسائی کے دعوے قسمیں، بتاؤ بھلا بندہ کس کا یقین کرے کس کا نہ کرے۔"

ثریا بانو ایک شاک کے عالم میں تھیں، کبھی تو بالکل گم صم بیٹھے آغا فیاض کو مخاطب کر کے کچھ بولتیں اور کبھی خود ہی اپنے آپ سے باتیں کرتی جاتیں۔

"لاکھ بری سہی نیلم، ہزار برائیاں ہوں گی اس کی ماں زریں میں..... اس کا بھید ہم تم جانیں پر انصاف سے کہو ہم میں سے کس نے نیلم کو کوئی گناہ کرتے دیکھا اس پر بدکردار ماں کا ٹھپہ لگا ہی رہا اور اس محمود نے کیسے فائدہ اٹھایا، اس کو کیا کہو گے؟"

اتنے سارے سوالوں نے بھی آغا فیاض کی چپ کو نہیں توڑا۔

"سچ بولتی تھی سارہ! بالکل ٹھیک اس کو دورے پڑتے تھے عالی سے جھگڑنے کے۔ بیچاری پہلے پہل آکر مجھ سے دہائیاں دیتی رہی کہ اماں رات رات بھر جاگ کر خالی کتابوں کو کوئی کیسے چاٹ سکتا ہے۔ ابھی شادی کو دن ہی کتنے ہوئے تھے مگر اس کو تو اس عشق کا ہڑکا لگا تھا اور ضمیر کے کچوکے بھی تو جگاتے ہوں گے۔ ظلم تو کمایا ہی کمایا تھا۔

اور لو دیکھو تنزل..... کوئی مان سکتا ہے اس بات کو عقل شل ہوتی ہے سوچ سوچ کر۔ کیسا دھتکارا ہوا انداز ہوتا تھا عالی کا ہمیشہ تنزل کے ساتھ اور دیکھو قدرت نے کیا کھیل کھیلا اس کے ساتھ.....

"پر دیکھ لو، بیٹا بھی اس کا توڑ نکلا، کیسا منہ پر جوتا کھینچ کر مار کر آیا کہ اگر خدا نے بچے کو بغیر باپ کے پیدا کرنا تو کیا خوب تھا۔ اس کا غصہ غلط تو نہیں تھا آغا!"

"تم کیا پتھر کے بن گئے ہو۔" بہت دیر بعد انہیں آغا کی لمبی چپ پر غصہ سا آیا۔

"اتنی بکواس کرے جا رہی ہوں میں، کچھ تو منہ سے پھوٹو۔" وہ اپنی اصلیت پر آکر تیز آواز میں بولیں۔

"تم نے وہ بات تو سنی ہوگی نا بھابھو! نیچے والی اینٹ ٹیڑھی رکھو تو اس دیوار کو پھر آسمان تک اٹھا کر لے جاؤ۔ وہ ٹیڑھی ہی جائے گی۔"

وہ بغیر ان کی طرف دیکھے جیسے خود کلامی کے سے انداز میں بولے۔

"تو یہاں اس عالم فاضل محاورے کی کیا ضرورت؟" وہ ناک چڑھا کر نخوت سے بولیں۔

"یہ سارا گند جو پھیلا اور جس کا ذمہ دار ہم نہ خالی محمود کو کہہ سکتے ہیں نہ نیلم کو نہ کسی اور کو بلکہ....." وہ پھر چپ

کر گئے۔

"اور کون ہوگا ذمہ دار اس محمود کے سوا۔" وہ تیزی سے بولیں۔

"میں، میں ہوں اس ساری تباہی اور بربادی کا ذمہ دار اور میری حصے دار تم بھابھو اور بہشتن میری اماں!"

"کیا بک رہے ہو میں نے کیا کیا ایسا۔" ثریا بانو کو تو گویا بچھو نے کاٹ لیا، تڑپ کر بولیں۔

"کچھ نہ کرتے ہوئے بھی سب کچھ کر ڈالا۔" وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولے۔

"سٹھیا گئے ہو جو اپنے کیے دھرے کا ملبہ مجھ پر اور اماں بیچاری پر ڈال رہے ہو۔"

"وہ سب جو میں نے زرین کے ساتھ کرتا تھا۔ اس پر مجھے کون اکساتا تھا؟ بھول گئیں..... ایک شخص..... اگر فقط ایک شخص کو معاف کر دیا جاتا، زرین کی خود سری کو اس کی جوانی کی بھول سمجھ کر ہمیشہ کے لیے معاف کر دیا جاتا تو بھابھو آج اتنی زندگیاں تباہ نہ ہوتیں۔"

"بھول گئیں تم اور اماں کس کس طرح مجھے اس کے خلاف بڑھ چڑھ کر اکساتی تھیں۔ میں کیا دن بھر گھر میں بیٹھا رہتا تھا جو سنتا تھا تم لوگوں کے منہ سے اور اس کے بعد....."

"جانے دو آغا فیاض! اب اپنے گناہوں پر تم یوں نہ پانی ڈالو اتنی آسانی سے نہیں دھلنے والے۔" انہوں نے کبھی غلطی تسلیم کی تھی جو اب کرتیں۔

"یہ تو میں جانتا ہوں۔ یہ تو عمروں کی غلاظت ہے یوں دو چار آنسوؤں سے تو نہ دھلے گی اور میرے یہ سب کہنے کا مقصد..... تمہیں مورد الزام ٹھہرانا نہیں تھا، صرف حقیقت بیان کرنا تھا۔"

وہ ان نظر آنے والے نکتے کو مسلسل گھور کر بولے۔

"حقیقت بیان کر رہا تھا۔" وہ منہ میں بڑبڑائیں۔

"اگر ان دنوں میں تحمل سے جو کچھ میں اس کے بارے میں جان چکا تھا اس سے پوچھ لیتا یا اسے معاف کر کے اسے گھر میں ایک باعزت جگہ دے دیتا تو نیلم اس نفرت کی زد میں نہ آتی جو زریں کا مقدر بن چکی تھی..... کیوں میں نے یہ فیصلہ بھی تسلیم کر لیا کہ زریں کی بیٹی بھی اس جیسی ہی نکلے گی؟ کیوں میں نے اس کی سرپرستی سے ہاتھ اٹھا لیا..... ایسا کیا دیکھ لیا تھا بھابھو اس کی ننھی سی عمر میں، میں نے، تم نے، ہم سب نے کہ مسلسل ایک ہی گردان زریں کی بیٹی ہے نا..... ورنہ اگر میں اس کا باپ بن کر سینہ تان کر اس کے آگے کھڑا ہوتا تو کیا شاہین، میری بہن کیسے عاجزی سے اپنے بیٹے کے لیے نیلم کا رشتہ مانگتی اور سب کچھ ایسے ہرگز نہ ہوتا جیسے ہوا۔ یا پھر تم..... احسن کا۔"

"بس رہنے دو آغا فیاض! اب گڑے مردے اکھاڑ کر تم کون سا کمال کر رہے ہو۔ اس سے بھلا اب کیا ٹھیک ہوگا۔" وہ الٹا ہاتھ مار کر نخوت سے بولیں۔

"جانتا ہوں۔" وہ آہ سی بھر کر بولے۔ "اب تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔"

"اور تم تو بڑے ٹھگے سے گئے تھے کہ مجھے نیلم سے ملنا ہے تو اس وقت جانا تھا۔ ساروں کے بیچ جا کر ذرا ہاتھ جوڑ کر منمنا کر معافی کے دو بول بولتے پھر دیکھتے وہ تمہارے ساتھ کیا کرتی، کیوں نہ گئے اس کے سامنے تم؟" وہ چمک کر بولیں۔

انہیں تو اس بات پر ہی غصہ آگیا کہ آغا فیاض ہر کیے کا الزام ان پر لگا رہے ہیں۔

زریں کا ٹھپہ نیلم پر نہ ہوتا تو بھی وہ احسن کی شادی اس سے کرتیں نہ عالی کی نیلم سے ہونے دیتیں، سارہ کی دیوانگی ایسا کرنے دیتی بھلا۔

"اور ایسا کرنے کے بعد بھی بہت کچھ غلط ہو جاتا۔" انہوں نے دل میں سوچا اور یہ ایسا کچھ غلط تو نہیں تھا۔

"اب جانے کا کچھ فائدہ نہیں تھا مجھے۔ اب اس سے معافی نہیں چاہیے تھی۔" وہ پھر بہت سوچ کر بولے۔

"بس... اب کیا دھل دھلا گئے تمہارے سارے کالے گناہ؟" وہ اکلوتے کو اس کی بدصورتی سے بار بار آگاہ کیے بغیر رہ نہیں سکتی تھیں۔

"گناہ توبہ سے دھلتے ہیں نا! وہ اگر مجھے معاف کر بھی دیتی تو شاید میرا خدا مجھے معاف نہ کرتا۔ جس طرح ایک باغ کا رکھوالا مالی ہوتا ہے اور اس باغ میں ہونے والی ہر خرابی اور بدصورتی کا ذمہ دار وہی ایک فرد اسی طرح ایک گھر کا سربراہ اس گھر کے اندر ہونے والی ہر خرابی اور بہتری کے لیے جواب دہ ہوتا ہے۔

میں اپنی غرض کے لیے معافی مانگنا چاہتا تھا لیکن اب میری سمجھ میں آگیا کہ یہ معافی میری مشکل کو آسان نہیں کر سکتی... کچھ اور بھی اس کے لیے۔" ان کی آواز ڈوب سی گئی۔

"کچھ اور... یعنی۔" وہ الجھ کر بولیں۔

"احساس ندامت... توبہ کے آنسو اور بس۔"

ثریا بانو آگے سے کچھ بول ہی نہ سکیں۔ یہ تو ان کا دل بھی گواہی دیتا تھا مگر توبہ کے آنسو تو کوئی تب بہاتا ہے جب وہ اپنے گناہ کو تسلیم کرتا ہے۔ وہ تو ابھی اس مرحلے میں تھیں اس آخری درجے کی تمنا کیسے کر سکتی تھیں۔

آغا فیاض آہستگی سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔

"لگتا ہے بیچارے کے بھیجے پر ٹھیک ٹھاک اثر ہو گیا ہے اور اس گھٹنے میسنے عالم کو دیکھو کیا پارسا بنا رہا ساری زندگی جیسے اس نے کچھ کیا ہی نہیں یہ تو دیکھو بھئی شریف امیر زادوں کے کرتوت اور جو کوئی اس بے چاری نیلم کے رونے چلانے پر کسی کو یقین آیا ہو۔"

جانے کیسے ان کا دل نیلم کی حمایت میں آگے ہی آگے سوچتا چلا گیا۔

✡ ✡ ✡

اتنی ساری باتیں ہو گئیں اور محمود عالم کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ اپنی خطا کا سرا کہاں سے پکڑیں۔

ڈاکٹر رخشندہ کی کہانی کو سوچتے تو جیسے پیشانی عرق عرق ہو جاتی۔

تنزیل ان کا بیٹا... تو دل جیسے مٹھی میں آجاتا۔

ایک اور بیٹی، وہ بھی نیلم کے پاس۔ اور نیلم جواب یاقوت ہے کالے دھندے کی سرپرست اعلا تو کیا اس کی بیٹی یعنی محمود عالم کی بیٹی... کیا اپنی ماں کی لائن پر نہیں چلی ہو گی۔"

ان کا دل جیسے نیچے ہی نیچے اترتا چلا جا رہا تھا۔

"اور میں، جو صرف عزہ کو ایک ریمپ پر چلتے دیکھ کر دل پکڑ کر بیٹھ گیا ہوں اگر وہ بھی ماں جیسی۔"

ان کے کمزور دل میں درد کی تیز لہری ابھری تھی۔

"اور مصطفیٰ کا رویہ کتنا ہتک آمیز تھا۔ کس طرح اس نے میرے منہ پر اور یاقوت آپ کا تنزیل کے سامنے تڑپا دہ سب کچھ کہہ گئی اور میں... میں کیسے تنزیل کو بتاؤں کہ میرے دل میں بیٹے کی تمنا کتنی شدید تھی وہ بھی اپنے بیٹے کی۔ اور تم ملے بھی تو... ملتے تھے جب بھی۔ میں تمہارے ساتھ کس نفرت سے پیش آتا تھا تو کیا اس کے بعد بھی معافی... نہیں؟

سارہ... جس کے غصے، ناراضی اور اس کے شک کو میں ساری زندگی اس کا پاگل پن، نفسیاتی پن قرار دیتا رہا جب اب کس منہ سے اس کا سامنا کر سکوں گا۔

ایک بھول جیسے کیسے گناہوں نے جنم لیا۔

اور اب عزہ... جانے اس نے یاقوت نے عزہ کے بارے میں کیا سوچا۔ اگر وہ عمل کر گزری یہ۔

انہیں اپنی وہ ادھوری بے چینی یاد آئی جس کی بنا پر وہ مصطفیٰ اور دائم کی منتیں کر رہے تھے کہ وہ کسی طرح میڈم یاقوت کو یہاں لے آئیں۔ وہ آئی بھی اور وہ اتنی اہم بات اس سے کرنا بھول گئے اس کی منت کرتا اس کے پاؤں پکڑتا۔

اگر وہ اپنے عزائم پر عمل کر گزری۔ اب تو اس کے پاس بہت سے جواز ہیں۔

تنزیل کو نہ سہی عزہ کو تو وہ بخوشی برباد کرنا چاہے گی۔

میں کیا کروں خود جاؤں اس کے پاس۔ وہ بے قرار ہو کر اٹھ کر بیٹھ گئے۔

اگر وہ ضد میں انتقام میں اندھی ہو رہی ہے اور بھی ضد میں آگئی تو... کس کو بلاؤں... کون اس کے عزائم کے بارے میں مجھے پتا کر کے بتا سکتا ہے؟ وہ بے قراری سے سینہ مسلنے لگے۔

"مصطفیٰ کا رویہ... کتنا ناقابل فہم سا تھا۔ اگرچہ اس معاشرے کے اصول و ضوابط سے ہٹ کر تو نہیں مگر انہیں اپنے اتنے جانثار دوست سے یہ توقع نہ تھی۔

تم اس کی جگہ ہوتے محمود عالم تو شاید تمہاری جانثاری کا عالم اس سے بھی سوا ہوتا اس نے کون سا انوکھا کام کیا ... اب تو معاملہ دوستی و جانثاری کا نہیں بلکہ اپنے گھر کی عزت کا تھا۔

تو عزت جس کی خاطر میں نے کیا نہ کیا اس جھوٹی عزت کی خاطر کاش میں نیلم کو دن کی روشنی میں Own کرنے کی ہمت کر لیتا تو آج یہ سب سب۔

"میں... اب کیسے پتا کروں یاقوت کی بیٹی... میری بیٹی، وہ بھی، نہیں نہیں خدا نہ کرے... یاقوت کا نمبر ایڈریس کچھ بھی تو نہیں میرے پاس۔" وہ بدقت بستر سے اٹھ کر بیٹھ گئے۔

سرہانے پڑا سیل فون ہاتھ میں لے کر سوچنے لگے کس کو فون کریں۔ یوں لگ رہا تھا شہر بھر میں ایک بھی دوست ایک بھی خیر خواہ نہیں رہا۔ "اگر کسی جاننے والے کو فون کیا اس نے عزہ کے بارے میں پوچھ لیا تو۔" ان کے ہاتھ بے جان سے ہونے لگے۔

✡ ✡ ✡

"بس کریں میں نا مما! اور کتنا طویل سجدہ کریں گی۔ گھنٹہ بھر سے نفل پڑھ رہی ہیں۔" دائم رخشندہ کی مسلسل نماز سے کچھ چڑ کر بولا۔

رخشندہ نے کچھ دیر بعد سر اٹھایا تو ان کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

"اللہ رب العزت تیرا کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔ تو نے ایک جان بچالی جو میری غفلت کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔ میں کس زبان سے شکر ادا کروں۔"

انہوں نے چہرہ صاف کر کے جائے نماز سمیٹ لی۔

دائم خاموش بیٹھا انہیں دیکھتا رہا۔

"ایسے کیوں بیٹھے ہو دائم! میں اپنے اللہ کا جتنا بھی طویل سجدہ شکر ادا کروں کم ہے اس نے میری بریت کو قبولیت عطا کی آج تمہاری اور اپنی نظروں میں سرخرو ہو گئی میں۔"

وہ پھر سے رونے لگیں۔

"پاپا کہاں ہیں؟" وہ خود پر قابو نہیں پا رہی تھیں۔ اس لیے ان کا دھیان ہٹانے کو بولا۔

"معلوم نہیں۔"

"بہت مایوس کیا مجھے مصطفیٰ کے رویے نے دائم!" ذرا دیر بعد وہ خود ہی اصل موضوع کی طرف آگئیں۔

”میں مصطفی کو بہرحال اتنا تنگ نظر تو نہ سمجھتی تھی اور جب ان سے میں نے یہ سب شیئر کیا تو بھی انہوں نے فراخ دلی سے سب قبول کرلیا مگر اب عزہ‘ وہ تو ان کے دوست کی بیٹی تھی اور پھر عزہ کی غلطی اتنی بڑی تو نہیں۔“ وہ رک گئیں۔

”لیکن گھر سے یوں نکل کر راتیں باہر گزار کر آنا واقعی ایک لڑکی کے لیے اچھی بات نہیں مگر مصطفی کو کم از کم محمود بھائی کے ساتھ.... جب کہ وہ اتنی سیریس کنڈیشن میں ہیں‘ مجھے اچھا نہیں لگا۔“

دونوں خاموش بیٹھے رہ گئے۔

”اور قسمت کی خوبی دیکھو‘ محمود بھائی ساری زندگی بیٹے کے لیے ترستے رہے اور بیٹا ملا بھی تو کس طرح۔“ دائم کے پاس تو جیسے شیئر کرنے کے لیے بھی کچھ نہیں رہ گیا تھا۔

”تمہاری عزہ سے بات ہوئی؟“

”وہ بہت عجیب کیفیت سے گزر رہی ہے۔ میں آگیا کہ ابھی شاید کچھ بھی کہنا مناسب نہیں۔ کچھ خاص بات نہیں ہوئی۔“

”مما! پاپا نے ایسا کیوں کیا؟“ بہت دیر بعد وہ کچھ بے بسی سے بولا۔

”تمہارے پاپا اس معاشرے سے الگ تھوڑی ہیں۔“ وہ پھیکی مسکراہٹ سے بولیں۔

”پھر بھی ’میرے لیے‘ میری خاطر۔“

”کرنا تو پڑے گا انہیں سب کچھ‘ تمہاری خاطر سہی‘ اپنے ان ہی قدموں پر لوٹ کر شاید جانا پڑے۔“

”اگر پاپا نہ مانے تو۔“ وہ بے یقین سا تھا۔

”تو تم نے کیا سوچا ہے‘ کیا کرو گے؟“

”مجھے کیا کرنا چاہیے؟“ وہ الٹا سوال کرکے بولا۔

”مما! میں کچھ بھی ایسا نہیں کرنا چاہتا جس سے آپ یا پاپا ہرٹ ہوں یا کوئی ایسی بات‘ جس سے ہماری یا انکل کی عزت کو اور بھی نقصان پہنچے‘ یہ سب کچھ جو بھی ہوا ہے اس کی وجہ یہی کمزور فیصلہ تو تھا جس پر جذباتی پن میں انہوں نے عمل تو کر ڈالا مگر پھر اسے نبھانے سے بھاگ گئے اور دیکھیں۔“

”شاباش میری جان! مجھے تمہارے خیالات جان کر خوشی ہوئی۔ کاش ہم سب ایسے جذباتی مرحلوں پر پہنچ کر کوئی بھی بڑا قدم اٹھانے سے پہلے اس کے نتائج پر غور کرلیا کریں تو بہت سی خرابیوں اور مصیبتوں سے بچ جائیں۔“ وہ تاسف سے بولیں۔

”آپ پاپا سے بات کریں گی؟“ وہ ذرا دیر بعد امید بھرے لہجے میں بولا۔

”ابھی نہیں‘ میرے خیال میں ان کا غصہ کہہ لو یا خفگی جو بھی ہے وقتی ہے وہ خود ہی ٹھیک ہو جائیں گے کچھ دنوں میں۔“

”اور مما! میں اتنے دن....“ وہ الجھ گیا۔

”بیٹا! جہاں اتنا صبر کیا کچھ دن اور ٹھہر جاؤ۔ وہ یقیناً ”درست فیصلہ کرے گا ہمارے حق میں۔“

”آپ کہاں جارہی ہیں؟“ انہیں اٹھتے دیکھ کر دائم بولا۔

”تمہارے پاپا کو دیکھوں اور دائم! مجھے لگتا ہے ایک بار تو مجھے یاقوت سے معافی مانگنی چاہیے۔ ایک بار اس سے مل کر یا کچھ دن بعد۔ ابھی تو وہ جس ذہنی ابتری میں ہے اسے کوئی بھی بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔“

اسی وقت دائم کا فون بجنے لگا۔

”کس کا فون ہے ’عزہ کا؟“ رخشندہ اسے دیکھ کر بولیں۔

”نہیں ممی! آتا ہوں ابھی۔“ وہ فون کان سے لگائے باہر نکل گیا۔

”مجھے یاسمین کی طرف بھی جانا چاہیے۔ تنزیل کا رویہ یاقوت کے ساتھ.... وہ ہے تو اس کی ماں ہی جس کے لیے وہ اتنا تڑپی ہے۔ مجھے پہلے وہیں جانا چاہیے مگر مصطفی.... شاید وہ یہ سب پسند نہیں کریں۔“

”جی میں بس ابھی بات کرکے بتاتا ہوں گھنٹے بھر میں۔“ دائم کہتے ہوئے باہر کی طرف جارہا تھا وہ اسے آواز دے کر پوچھنا چاہتی تھیں مگر رک گئیں۔ شاید وہ انہیں صحیح جواب نہیں دیتا۔

”یہ یقیناً“ عزہ کا فون ہوگا۔“

وہ قیاس کرتی باہر نکل گئیں۔ ابھی انہیں مصطفی کا موڈ دیکھنا تھا۔

☆ ☆ ☆

”بہت بھیانک لمحے تھے ماموہ! میری زندگی کے خوف ناک ترین لمحات۔ اگر اس لمحے میں کمزور... مگر میں کمزور تو پڑ چکی تھی۔ میں کچھ بھی نہیں کرسکتی تھی۔ اس پہ جس طرح شیطان سوار تھا۔

”شیطان.... مام آپ اس کو تو اچھی طرح جانتی ہوں گی جو ایک زمانے سے آپ کا ہم راہی ہے۔“ وہ طنز بھرے انداز میں بولی۔

یاقوت کچھ بول نہیں سکیں۔

”اتنی ساری لڑکیاں.... مام! آپ کو گنتی یاد ہے ان کی کس طرح اپنے اس ہم راہی کے ساتھ مل کر آپ نے زندہ جسموں کو زندہ لاشوں میں تبدیل کیا۔“ وہ کرب سے بولی۔

شاید آئینہ بھی وہ کام نہیں کرسکتا تھا جو کام اس وقت لائبہ کے الفاظ کررہے تھے۔

بہت بار انہوں نے سوچا۔ اس دلدل سے نکل جائیں مگر ہر بار یہ خیال سوچ سے آگے نہ بڑھ سکا۔ کاش کبھی انہوں نے اس پر عمل کرنے کا ارادہ کیا ہوتا تو آج لائبہ ایسی نگاہوں میں اتنی نفرت لیے نہ دیکھ رہی ہوتی۔

”آپ کو مام لاشیں پسند ہیں نا‘ بے جان لاشیں‘ جو مزاحمت نہیں کرتیں میں بھی اس لاش میں بدلنے والی تھی کہ میرے ہاتھ پیروں نے مزاحمت کرنا چھوڑ دی تھی۔ اس لمحے مام! میں نے آپ کو بہت یاد کیا۔ بہت زیادہ۔ کاش آپ اس لمحے وہاں ہوتیں تو میرا تار تار ہوا لباس دیکھ سکتیں۔ مجھے مادر زاد.... مام! آپ سمجھتی ہیں نا کیا ہوتا ہے آپ کی سب ہی برانچز میں یہی کام ہوتا ہے نا‘ کبھی بوتیک کی شکل میں کہیں پارلر اور مساج سینٹر میں میں ہر جگہ ایسی لڑکیوں کی کلیکشن اور پھر ان میں سے بہت سی بدقسمتوں کو سلیکٹ کرلیا جاتا ہے۔ ان تاریک کنوؤں میں دھکیلنے کے لیے وہاں سے نکلنے کا راستہ موت کے سوا اور کہیں بھی نہیں جاتا۔ جانتی ہیں نا آپ۔“ اور میڈم یاقوت کی زبان جیسے گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔

ان کے پورے بدن میں جیسے کہیں بھی زندگی کی رمق باقی نہیں تھی۔ صرف ان کے کان زندہ تھے اور آنکھیں جو لائبہ کی آنکھوں اور اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھیں جہاں صرف نفرت تھی۔ دکھ اور اذیت!

”ان لمحوں میں‘ میں نے خواہش کی کاش آپ آئیں اور مجھے اس حالت میں دیکھ کر ایک اچھی سی ویڈیو بنوائیں اور....

لیکن نہیں صرف ایک ویڈیو سے کیا ہوتا‘ آپ کو تو مختلف کلائنٹس کو ڈیل کرنا ہوتا ہے۔ سب کی پسند الگ‘ سب کا مزاج الگ تو اس حساب سے اٹریکشن پیکیج۔“

وہ انہیں واقعی یونہی ختم کردینا چاہتی تھی‘ اپنی باتوں کے زہر سے۔

وہ بے حس بنی سن رہی تھیں۔

"ایک ویڈیو تو آپ کے اتنے سالوں کی محنت کا صلہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ظاہر ہے مام! آپ کے بعد یہ پروفیشن میں نے سنبھالنا تھا' اس لیے ذرا مجھے بھی تو پریکٹیکل ہونا چاہیے تھا' تھوڑا ٹریڈ۔ ہے نا مام؟"

وہ ان کی حالت سے مزہ لے رہی تھی۔

"اور مجھے جو ٹریڈ کرے وہ آپ کا رائٹ ہینڈ کیوں نہ ہو؟ اس سے اچھا خیال اور کیا ہو سکتا ہے۔ بس میں نے جہانگیر کے سامنے یہی خیال رکھا اور مام! یہ میری لک تھی کہ انہیں نہ صرف یہ خیال پسند آیا بلکہ انہوں نے مجھ سے شادی کرنے کا بھی فوری فیصلہ کرلیا۔

To live in an ever last hell" (ہمیشہ کی دوزخ میں رہنا) کیسا آئیڈیا تھا مام؟"

میں نے ٹھیک کیا نا؟" وہ پرجوش انداز میں پوچھ رہی تھی۔

میڈم یاقوت خاموش بیٹھی رہیں۔

"اگر آپ ہمارے ساتھ پارٹنر شپ کرنا چاہیں گی تو موسٹ ویلکم' ورنہ ہم دونوں نے یہ سوچا ہے کہ ہم آپ کے مقابلے میں آپ سے بھی زبردست ایمپائر کھڑی کرسکتے ہیں۔ ظاہر ہے جہانگیر کا تجربہ آپ سے زیادہ ہے اور اس کی مسز میڈم یاقوت کی بیٹی... اور مام مجھے بھی کوئی ایسا یونیک سا نیم دیں نا' کوئی قیمتی پتھر' نیلم جیسا کہ آپ کا پہلے نام تھا' ظاہر ہے اس فیلڈ کو سپروائز کرنے کے لیے سینے میں گوشت پوست کا دل تو نہیں چلے گا۔ پتھر کا زر و جواہرات کا دل چاہیے "آپ مجھے اچھا سا کوئی نام دیں گی؟"

وہ اسی طرح خاموش بیٹھی رہی۔

"اوکے مام! میں اب چلتی ہوں' جہانگیر میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ شاید ہم زندگی میں دوبارہ کبھی ملے تو کسی مقابلے کی میز پر یا... کسی ایسے ہی اندھے کنویں کے کنارے' جہاں آپ بھی کچھ لاشیں دھکیلنے آئی ہوں اور میں بھی... والدین کا پروفیشن تو اولاد ہی سنبھالتی ہے نا مام۔" وہ جاتے ہوئے رکی۔

"ایک منٹ۔" وہ ابھی دروازے تک نہیں پہنچی تھی کہ میڈم یاقوت کھڑی ہو کر بولیں' لائبہ رک گئی۔

"تم نے ٹھیک کہا کہ اب شاید ہم دوبارہ کسی ایسی ہی جگہ پر ملیں۔ تو کیوں نہ آج جانے سے پہلے میرے ساتھ ایک کپ کافی کا پی لو' آخری کپ' اور بے فکر رہو اس کپ میں میں تمہیں زہر نہیں دوں گی۔ تم خود ملازم کو بلا کر کافی کا آرڈر دو گی اور میں دونوں کپ تمہارے سامنے چکھوں گی۔" وہ بولتے ہوئے رکیں۔

لائبہ متذبذب سی کھڑی رہ گئی۔

"کیا ماں اپنے شوہر سے زیادہ قابل بھروسا نہیں؟" اسے سوچتے دیکھ کر وہ بولیں۔

"اس میں کچھ حرج نہیں' میرے خیال میں۔" لائبہ کندھے اچکا کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"تو پھر آرڈر کرو۔"

"کیوں نہ ہم کہیں باہر جاکر کافی پی لیں؟"

"تو گویا ابھی بھی شک ہے مجھ پر کہ گھر میں کچھ نہ کچھ ملایا جاسکتا ہے' اوکے' ایز یو وش۔" وہ پھیکے پھیکے انداز میں کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ لائبہ انہیں بغور دیکھ رہی تھی۔

"میرے خیال میں ہم یہیں پیتے ہیں۔ آپ ملازمہ کو بلا کر میرے سامنے آرڈر کردیں۔" لائبہ قدرے مطمئن انداز میں بولی تو میڈم یاقوت مسکرا دیں۔

☼ ☼ ☼
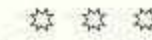
"سو جائیں نا آپ' میں کہیں نہیں جاتا۔ آپ کے پاس ہی ہوں' کیوں بے بھروسا ہو رہی ہیں۔" تنزیل نرمی سے یاسمین کا ہاتھ دبا کر بولا۔

"نہیں' تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔" یاسمین رونے لگیں۔

"پہلے تانیہ چلی گئی' اب تم' پہلے تو مجھے پتا تھا تم ناراض ہو بھی گئے تو لوٹ آؤ گے اور اب..."

"تو کیا اب یقین نہیں رہا؟"

"ہے' مگر وہ عورت' وہاں ہے تمہاری۔"

"پلیز امی!" وہ ایک دم سے کھڑا ہو گیا۔

"اب اگر آپ نے یہ بات دہرائی تو میں واقعی آپ کو چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔"

"اور محمود بھائی' باپ ہیں تمہارے' ماں' باپ کی محبت' تنزیل! آدمی کو بے بس کردیتی ہے۔"

"تو آپ واقعی چاہتی ہیں' میں آپ کو چھوڑ کر چلا جاؤں؟" وہ دھمکانے والے انداز میں بولا۔

"اچھا چھوڑیں' آپ سے ایک بات کہنی ہے۔" وہ ذرا دیر بعد بولا۔

"اور آپ کا خیال ٹھیک ہے امی! مجھے یہاں رہنا تو نہیں۔"

"تنزیل!" اب وہ دہل گئیں۔

"ابو کا رویہ... نہیں امی! یہاں رہنا اور یہ فیس کرنا' اب بہت مشکل ہو گا میرے لیے۔"

"اسی لیے تو میں کہہ رہی ہوں' تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔" وہ پھر سے رونے لگیں۔

"امی! میں شادی کر رہا ہوں۔" وہ یاسمین کے آنسو صاف کرتے ہوئے۔ رک کر ایک دم سے بولا۔

یاسمین کے آنسو وہیں رک گئے۔

"اب یہ مذاق رہ گیا تھا کرنے کو۔" وہ خفگی سے بولیں۔

"مذاق نہیں حقیقت امی! اور لڑکی بھی پسند کرلی ہیں نے..."

"مذاق کر رہے ہو نا تنزیل!"

"امی! اس عورت کی ڈسی ہوئی ایک اور لڑکی... تانیہ جیسی... آپ اسے قبول کرلیں گی نا؟"

اور یاسمین جیسے جواب میں بولنا ہی بھول گئیں' ایسا تو انہوں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔

☼ ☼ ☼

"دیکھا۔ کتنا بڑا دھوکے باز انسان ہے تمہارا باپ' ایک عمر مجھے دھوکے میں رکھا' جس کے ساتھ محبت کی' اس کو کتنا بڑا دھوکا دیا۔ یہ ہے اس صاف ستھرے بظاہر' مہذب انسان کی' اندر سے اصلی صورت تو' کیا میں اس سے غلط لڑتی جھگڑتی تھی۔

سارہ' عزہ کے پاس بیٹھی پھٹ پڑنے والے انداز میں بولی۔ عزہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"ایسا بے وفا انسان' دیکھو جس سے محبت کی اسے کیسا کھلا دھوکا دیا اور ساری زندگی قسمیں کھاتا رہا' جھوٹی قسمیں کہ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔"

"اور مجھے پہلی بار عزہ! پہلی بار نیلم سے اتنی ہمدردی محسوس ہوئی' ہو سکتا ہے وہ بہت بری عورت ہو' برے کام کرتی رہی ہو' مگر یہ بھی تو دیکھو' اس کے ساتھ کیسا سلوک کیا گیا' پہلے ہمارے گھر میں' پھر اس شخص نے' میرا دل چاہتا ہے... اس عمر میں تمہارا خیال نہ ہوتا تو عزہ..."

وہ بولتے ہوئے رک گئی

"تمہاری شادی ہوجائے جلدی سے تو میں اس دھوکے باز کے ساتھ ایک دن نہیں رہوں گی۔ یہ تو طے کرلیا

ہے میں نے۔"

"عزہ کی شادی کا انتظار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آج ابھی کیوں نہیں۔"

ان دونوں کو پتا نہیں چلا کب محمود عالم ان کے پیچھے آکر کھڑے ہوئے تھے۔

"اتنی شرم تو ہے مجھ میں، تم میں نہیں ہوگی کہ خدا نے بیٹی کی ذمہ داری دی تو میں اسے نبھانے کی کوشش کروں۔" وہ تڑخ کر بولی۔

"زندگی بھر تو تم نے یہ کوشش کی نہیں تو اب بھی کیا ضرورت ہے۔" وہ جواباً بولے۔

"تمہیں طلاق چاہیے نا' ایک دن تم مجھ سے دھوکے باز کے ساتھ نہیں رہ سکتیں۔ تم عزہ کی فکر مت کرو۔ اس کا باپ ابھی زندہ ہے۔" وہ تلخی سے بولے۔

"تمہیں طلاق چاہیے نا' تو میں تمہیں طلاق۔" وہ نفرت بھرے انداز میں دیکھ کر بولنے ہی لگے تھے کہ عزہ اٹھ کر ان دونوں کے درمیان آگئی۔

"عزہ! تم ہٹ جاؤ بیچ میں سے۔" وہ غرا کر بولے۔

"ہٹ ہی تو رہی ہوں۔" وہ بھی اسی لہجے میں بولی۔

"اور مجھے اس بات میں بھی کوئی اعتراض نہیں کہ آپ دونوں اب مزید اکٹھے نہ رہیں' پہلے آپ دونوں نے اکٹھے رہ کر کیا کرلیا۔ کم از کم میرا نقصان تو کردیا۔" دونوں اس کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ تلخی سے بولی۔

"آپ بے شک کوئی بھی فیصلہ کرلیں' لیکن پہلے میرا فیصلہ سن لیں۔" وہ دونوں کی طرف دیکھ کر بولی۔

☼ ☼ ☼

"مسز جہانگیر ہمدانی' سویٹ نمبر 105 اوکے۔" وہ ریسپشن سے معلوم کرکے مسکراتے ہوئے آگے بڑھنے لگیں۔

"میم! انہیں اطلاع کردوں؟" ریسپشنسٹ نے انہیں ٹوکا۔

"نو تھینکس، میں چلی جاؤں گی۔ انہیں میں فون کرچکی ہوں۔" وہ مسکرا کر جواباً بولیں۔

ریسپشنسٹ مسکرا کر فون اٹینڈ کرنے لگی۔

لفٹ رکتے ہی وہ باہر نکل آئیں۔

"سوری لائبہ بیٹی! کم از کم میں تمہیں اتنی دکھ بھری زندگی کے حوالے نہیں کرسکتی۔ کچھ تو مجھے کرنا ہی تھا' اور میری جان مرنا تو سب کو ہی ہے ایک دن اس سے فرار تو کسی کو بھی نہیں۔ مجھے' تمہیں۔ بھی سب کو مرنا ہے' ہے نا۔ اور اگر آپ کی یہ موت بہت سوں کی مشکلوں کو آسان کردے تو کیا یہ مرنا اچھا نہ ہوا۔"

وہ کوریڈور کے سرے پر ہی رک کر خود کو کمپوز کرنے لگیں۔

ظاہر ہے یہ کوئی چھوٹا کام تو نہیں تھا جو وہ کر آئیں اور آج تک یاقوت نے چھوٹا کام کیا کون سا تھا۔ حتیٰ کہ دل کے معاملے میں بھی' جب محبت نہ ملی تو اس نے ہر محبت بھرے دل کو بنجر کردیا۔

وہ سج سج کر چل رہی تھیں۔

اس بات سے بے خبر کہ کوئی اور بھی ان کا منتظر ہے' ذرا سی دیر میں ہوٹل میں ایک دلدوز چیخ ابھری تھی' جس نے لمحہ بھر کے لیے ہر شے کو ساکت کردیا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

زندگی کب میرے پندار کا سودا کردے
جانے کب کوئی ضرورت مجھے رسوا کردے

کب اڑا کر مجھے لے جائے ہوا دور کہیں
آسماں کب میری ہجرت کا اشارا کردے

دشمنی مار نہ دے جان سے بڑھتے بڑھتے
دوستی جینے کا مجھ سے نہ تقاضا کردے

بھیڑ میں کھینچ کے لے جائے میری تنہائی
میری وحشت مجھے پھر بھیڑ میں تنہا کردے

ہے ہر اک شخص کے ہونٹوں پہ گزارش پیہم
میرے مولا! میرے حالات کو اچھا کردے

دل سے نکلی ہوئی اک آہ مٹادے مجھ کو
ایک ٹپکا ہوا آنسو میرا چرچا کردے

شمیم فاطمہ

یہاں کتنا اندھیرا ہے

ہزاروں سال سے گہرا یہ کوئی غار ہے شاید
ہزاروں سال سے اونچی کوئی دیوار ہے شاید
ہزاروں سال سے لمبا کوئی بازار ہے شاید
ہزاروں سال سے سورج
پرانا دائرہ پہنے
ہے اپنے راستوں میں گم
ہزاروں سال سے لیکن
ہے جانے دن کہاں پیارے
نہ جانے ہیں کہاں ہم تم

کامی شاہ

وفا سرشت ہوں دُوری میں بھی محبت ہے
اکیلے رہنے میں لیکن بڑی اذیت ہے

یہ جاگتی ہے تو پھر دیر تک جگاتی ہے
مرے وجود میں سوئی ہوئی جو وحشت ہے

جہاں پہ عشق کی سرحد جنُوں سے ملتی ہے
وہاں پہ آ کے ملے وہ اگر محبت ہے

بہت ہیں خواب مگر خواب ہی سے کیا ہوگا
ہمارے بیچ جو حائل ہے وہ حقیقت ہے

وہ دَور آیا کہ وہ بھی گھروں کو چھوڑ گئے
جو سوچتے تھے کہ اب مستقل سکونت ہے

سمجھ رہے تھے مسافر قیام کو منزل
خبر نہیں تھی کہ آگے بھی ایک ہجرت ہے

بہت سے لوگ دِلوں میں چھپائے بیٹھے ہیں
یہ فاطمہ ہی نہیں ہے جسے شکایت ہے

فاطمہ حسن

وہ حال ہے کہ تلاشِ نجات کی جائے
کسی فقیرِ دُعا گو سے بات کی جائے

یہ شہر کیسا خوش اوقات تھا اور اب کیا ہے
جو دن بھی نکلے تو وحشت نہ رات کی جائے

کوئی تو شکل گماں ہو، کوئی حیلہ خیر
کسی طرح تو بسر اب حیات کی جائے

گھروں میں وقت گزاری کا اب ہے شغل ہی کیا
یہی کہ گفتگوئے حادثات کی جائے

مُصر ہے دل کہ مخاطب ہوں استعاروں میں
گھٹن یہ کہتی ہے، اب کھُل کے بات کی جائے

کچھ ایسے بھی ہیں تہی دست ورنہ تو جن سے
ملائیں ہات تو خوشبو نہ ہات کی جائے

محشر بدایونی

شگفتہ جاہ

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”دو شخص جب گالی گلوچ کریں تو دونوں کا گناہ اسی پر ہوگا جو ابتدا کرے گا، جب تک مظلوم زیادتی نہ کرے۔“

حضورؐ کی عظمت آئینہ عالم میں،

ایک نامعلوم متعصب ذہنیت رکھنے والے مؤرخ یوں رقمطراز ہیں۔
”یہ بات مجھے ورطۂ حیرت میں ڈالتی ہے کہ چند ایک غریب اور مفلوک الحال مسلمان ایک ایسی مسجد میں بیٹھے ہیں جس کی چھت کھجور کے پتوں سے ڈھکی ہے۔ حتیٰ کہ بارش ہو تو چھت ٹپک ٹپک کر نیچے کیچڑ ہو جاتی ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکار جب سجدہ کرتے ہیں تو پیشانی کیچڑ سے لت پت ہو جاتی ہے۔ مگر یہ لوگ مسجد میں بیٹھ کر مشورے کرتے ہیں تو ایران و روم کی سلطنتوں کو تخت و تاراج کرنے اور آتش کدۂ ایران کو ٹھنڈا کر کے خدائے واحد کی حکمرانی قائم کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں اور پھر ہم دیکھتے ہیں کہ چند ہی سالوں میں یہ ایسا کر دکھاتے ہیں۔ میں محمدؐ کی رسالت کا تو قائل نہیں ہوں مگر یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ اتنا بڑا انقلاب کیسے آ گیا؟“

ہندوستان کے مشہور شاعر ہری چند اختر لکھتے ہیں۔

کس نے قطروں کو ملایا دریا کر دیا
کس نے ذرّوں کو اُٹھایا صحرا کر دیا
کس کی حکمت نے یتیموں کو کیا دُرِّ یتیم
اور غلاموں کو زمانے کا مولا کر دیا

آدمیت کا غرض ساماں مہیا کر دیا
اک عرب نے آدمی کا بول بالا کر دیا

شاہدہ شیرانا۔ رحمان گڑھ

کچھ باتیں بڑے لوگوں کی،

- آپ کے ساتھ اچھی گاڑی میں سواری کرنے کے لیے بہت سے لوگوں کی خواہش ہوگی مگر آپ کی زندگی میں کیا کوئی ایسا شخص بھی ہے جو گاڑی خراب ہونے پر آپ کے ساتھ بس میں سفر کر سکے۔
(اوپرا ونفری)
- ڈھلتی عمر کے پیار کی خوشی جلتی ہوئی سبز لکڑی کی طرح ہوتی ہے اس لیے کہ آگ بھڑکنے میں جتنی دیر لگے اس سے اتنی ہی زیادہ حرارت پیدا ہوتی ہے اور اس کی قوت اتنی ہی زیادہ دیر تک برقرار رہتی ہے۔
(کرشن وتروا)

گل افشاں۔ صادق آباد

محبوب کے لیے،

- وہ میرا شمال، میرا جنوب، میرا مشرق اور مغرب تھا
میرے ہفتے بھر کا کام تھا اور اتوار کا آرام تھا
میری دوپہر، میری نیم شب، میری گفتگو، میرا گیت تھا
میں نے سمجھا کہ پیار ہمیشہ باقی رہے گا
مگر میں غلط تھا۔
(ڈبلیو ایچ آڈن)
- سایۂ شجر میں شعروں کی ایک کتاب
شراب کا ایک پیالہ، روٹی کا ایک ٹکڑا
اور تم میرے پہلو میں گیت گاتی ہوئی
وہ جنگل بھی میرے لیے جنت کا ٹکڑا بن جائے گا
(عمر خیام)

٭ مجھے یقین ہے کہ اگر میں مر جاؤں اور تم میری قبر کے پاس سے گزرو تو میں زمین کی گہرائیوں میں بھی تمہارے قدموں کی آواز سن لوں گا۔

(بیتی تو ہیر گلڈون)

٭ جتنی بار تم میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتے ہو اگر اتنی بار میں ہاتھ بڑھا کر آسمان سے ایک ستارہ توڑ سکوں تو رات کا سارا آسمان میری ہتھیلی پر آجائے۔

(ڈوروتھی پارکر)

٭ ہر روز میں تمہیں گزرے ہوئے کل سے زیادہ اور آنے والے کل سے کم محبت کرتی ہوں۔

(روز منڈ جیرالڈ)

٭ تمہارے ساتھ گزرے ہوئے لمحات میرے نزدیک ایک خوشبودار باغ، ایک ملگجی شام اور دن میں گنگناتے ہوئے ایک فوارے کی مانند ہے، صرف تم ہی مجھے احساس دلاتی ہو کہ میں زندہ ہوں۔ کہا جاتا ہے کہ دوسروں نے فرشتوں کو دیکھا ہے لیکن میں نے تمہیں دیکھا ہے اور میرے لیے یہی کافی ہے۔

(چارج مور)

٭ پیار ایسے ہی سکون پہنچاتا ہے جیسے کہ بارش کے بعد دھوپ۔

(شیکسپیئر)

ثمرہ، اقرا۔ کراچی

آسان کام ،

دو ادھیڑ عمر کاہل اور کام چور آدمی پارک میں بینچ پر بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے۔ ایک بولا۔

"میں نے بائیس سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی تہیہ کر لیا تھا کہ میں بہت دولت کماؤں گا اور ایک امیر کبیر آدمی بنوں گا۔"

"لیکن تم امیر کبیر تو نہیں بنے۔" دوسرے نے حیرت سے کہا۔

"دراصل بائیس سال کی عمر کو پہنچنے سے بس کچھ روز پہلے میں نے فیصلہ کیا کہ دولت کمانے کے مقابلے میں خیالات تبدیل کر لینا زیادہ آسان کام ہے۔" پہلے کاہل نے جواب دیا۔

جاسمہ مریم نوید۔ کراچی

زریں اصول ،

جب دو کاریں آپس میں ٹکرا جائیں تو یہ فیصلہ کس طرح کیا جائے گا کہ کون سا ڈرائیور غلطی پر تھا، ہمارے لوگوں نے اس سلسلے میں چند اصول بنائے ہیں۔ ممکن ہے ان پر عمل کرنے سے دوسرے ممالک کے لوگوں کو بھی فائدہ ہو۔

* غلطی ہمیشہ سیکنڈ ہینڈ اور کم قیمت گاڑی والے کی ہوتی ہے۔
* غلطی مرد ڈرائیور کی ہے، خاتون ڈرائیور کی نہیں خواہ وہ بغیر لائسنس کار چلا رہی ہو۔
* غلطی ملازم ڈرائیور کی ہے، مالک ڈرائیور کی نہیں۔
* غلطی ہمیشہ معمولی لباس پہننے والے ڈرائیور کی ہوتی ہے۔ یونیفارم یا سوٹ پہننے والے کی نہیں۔
* غلطی ہمیشہ مقامی یا اردو بولنے والے ڈرائیور کی ہوتی ہے، انگریزی بولنے والے کی نہیں۔

کرن بینش۔ کراچی

چراغ زندگی ،

٭ کسی کام کا آغاز اس کی نصف کامیابی ہے۔ بغیر مقصد کے زندگی کبھی پائیدار نہیں گزرتی۔ سو آغاز بہتر اور مقصد بہترین ہونا چاہیے۔

٭ جس چیز کو دیکھنے سے نظر خراب ہو، اسے نہ دیکھنا بہتر ہے۔

٭ آدمی جب تک ٹوٹتا نہیں، اسے پتا نہیں چلتا کہ وہ کتنا مضبوط ہے۔

٭ کردار کی مضبوطی میں دو چیزیں شامل ہیں۔ ایک قوت ارادی اور دوسری ضبط نفس۔

٭ محبت میں محبت جائز ہے دھوکا جائز نہیں۔

سیدہ نسبت گیلانی۔ کہروڑ پکا

تو ہی ہے ،

ایک شاعر نے مولانا جامی رحمتہ اللہ علیہ کے اس شعر پر اعتراض کیا۔

بس کہ در جان فگار و چشم بیدارم توئی
ہر کہ پیدا می شود از دور پندارم توئی

(تو میرے دل اور آنکھوں میں اس طرح سمایا ہوا ہے کہ دور سے ہر آنے والے کو میں سمجھتا ہوں کہ تو ہی ہے)

شاعر کا اعتراض تھا کہ "اگر دور سے گدھا آتا دکھائی دے تو پھر آپ کیا سمجھیں گے؟"

مولانا نے جواب دیا۔ "میں سمجھوں گا کہ تو ہی ہے۔"

انیقہ انا۔ چکوال

تعلیم بالغاں ،

• پانچویں کلاس کے اکثر طالب علم آج دیر سے آئے تھے۔ اسمبلی میں سزا ملنے پر ایک طالب علم نے وجہ بتائی۔

"سر کے بال رنگنے کی وجہ سے دیر ہو گئی۔"

• گود میں روتے ہوئے بچے کی وجہ سے اسے سبق دہرانا مشکل ہو گیا تھا۔

• بریک ٹائم میں دو طالبات نے آپس میں پوتی اور بیٹے کا رشتہ طے کر دیا۔

• آج طالبات بہت پریشان تھیں کیونکہ زیادہ تر طالب علم اپنی چھڑی اور نظر کی عینکیں گھر بھول آئے تھے۔

• ابھی وہ معاشرتی علوم کا سبق سنا رہا تھا کہ اسے موبائل پر ایس ایم ایس آگیا۔

"مبارک ہو آپ دادا بن گئے ہیں۔"

• بستے کا بوجھ اٹھائے، پسینے میں شرابور وہ گیٹ کے پاس گرنے ہی والی تھی کہ ایک لڑکے نے اسے "امی" کہہ کر اس سے بستہ لے لیا۔

• وہ طالبات کی اکثر بات پر بے ساختہ ہنسا کرتا تھا۔ اور سب طالبات اس سے شرماتی تھیں مگر اس دن وہ بہت شرمندہ ہوا جب طالبات کی کسی بات پر کھلکھلا کر ہنستے ہوئے اس کی "بتیسی" نیچے گر گئی۔

مدیحہ یوسف۔ کراچی

ہری مرچیں،

○ ایک بڑی فرم کے مالک نے اپنے دوست سے کہا۔
"میرا اکاؤنٹنٹ تنخواہ کی ایک ایک پائی حلال کرتا ہے۔ اس نے تین بار مجھے انکم ٹیکس کے سلسلے میں جیل جانے سے بچایا۔"

○ "کیا آپ اپنے شوہر کے مستقبل کے بارے میں کچھ جاننا چاہیں گی؟" قسمت کا حال بتانے والے نے ایک خاتون سے پوچھا۔
"جی نہیں۔" خاتون بولیں۔ "مجھے تو بس آپ اس کے ماضی کے بارے میں تفصیل بتا دیجیے۔"

○ ایک صاحب کی بیوی کہیں غائب ہو گئی۔ انہوں نے اخبار میں اشتہار دیا۔
"میری بیوی ایک ہفتے سے غائب ہے۔ اگر کسی نے اطلاع دینے کی کوشش کی تو میں اسے جان سے مار دوں گا۔"

آسیہ جاوید۔ علی پور چٹھہ

زاہدوں کی تلاش،

ایک بادشاہ کو ایک مہم پیش آگئی۔ اس نے منت مانی کہ اگر میں اس مہم میں کامیاب ہو گیا تو زاہدوں کو درہم دوں گا۔ اللہ نے اس کی مراد پوری کر دی تو اس نے منت کی رقم ایک خاص غلام کو دی اور حکم دیا۔
"اسے زاہدوں میں بانٹ دو۔"
یہ غلام بڑا عقل مند تھا۔ وہ تمام دن گھومتا رہا اور شام کو واپس آکر تمام رقم پوری کی پوری بادشاہ کے سامنے رکھ دی اور کہا کہ "جہاں پناہ! میں نے ہر چند ڈھونڈا، لیکن مجھے کوئی زاہد نہیں ملا۔"
بادشاہ نے کہا۔ "کیا بکتا ہے۔ میرے علم کے مطابق تو اس ملک میں چار سو سے کم زاہد نہ ہوں گے۔"
غلام نے ہاتھ باندھ کر عرض کی۔
"عالم پناہ! جو زاہد ہے وہ لیتا نہیں اور جو لیتا ہے وہ زاہد نہیں۔"

سیدہ نسبت زہرا۔ کہروڑ پکا

باتیں خلیل جبران کی،

- اگر تیرا دل آتش فشاں ہے تو پھر کیوں توقع رکھتا ہے کہ وہ پھولوں کو تیرے ہاتھ میں تر و تازہ رہنے دے گا۔
- مبالغہ ایک حقیقت ہے جس کی فطرت قابو سے باہر ہوتی ہے۔
- بڑے سے بڑے غنی اور بڑے سے بڑے فقیر کے درمیان حدِ فاصل ایک دن کی بھوک اور ایک دن کی پیاس ہے۔
- جب تمہارا غم یا خوشی حد سے بڑھ جائے تو دنیا تمہاری نظروں میں حقیر ہو جائے گی۔
- دوستی میں کوئی غرض پنہاں نہیں ہونی چاہیے۔ سوائے اس کے کہ روح کی گہرائیاں پیش نظر ہوں۔

گڑیا شاہ۔ کہروڑ پکا

ادویات کی مختصر تاریخ،

"ڈاکٹر! میرے کان میں درد ہے۔"

- 2000 قبل مسیح:۔ لو یہ بوٹی کھا لو۔
- 1000 قبل مسیح:۔ بوٹی کھانا شرک ہے۔ لو یہ دعا پڑھو۔
- 1850 بعد از مسیح:۔ دعا کرنا وہم پرستی ہے۔ لو یہ عرق پی لو۔
- 1940 بعد از مسیح:۔ عرق تو سانپ کا زہر ہے۔ لو یہ گولی نگل لو۔
- 1925 بعد از مسیح:۔ یہ گولی تو بے اثر ہے۔ یہ اینٹی بائیوٹک لو۔
- 2000 بعد از مسیح:۔ یہ اینٹی بائیوٹک تو مصنوعی ہے۔ لو یہ بوٹی کھا لو۔

خدیجہ سلیم۔ کراچی

کہکشاں ارشد کی ڈائری سے

علامہ اقبال محض ایک شاعر نہیں تھے۔ ان کے حکیمانہ تدبر نے مسلمانوں کے زوال کی سنگینی کو محسوس کیا اور ان کی پیش بین نظر نے اس زوال کے دور رس نتائج کی جو تصویر دیکھی وہ انتہائی عبرت ناک تھی۔ وہ مسلمانوں میں جو خصوصیات دیکھنا چاہتے تھے اس کے لیے انہوں نے شاہین کو مثالیہ بنا کر پیش کیا۔ ان خصوصیات کے لیے اقبال نے مردِ مومن کی کوئی تقسیم نہیں کی۔ خصوصاً آج کی نوجوان نسل کے لیے ان کے کلام کو پڑھنا اور اس کے مقصد کو سمجھنا ناگزیر ہے۔

فنونِ لطیفہ،

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا

جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

سمیرا حیات کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر سعد اللہ شاہ کی یہ غزل مجھے بہت پسند ہے۔ حقیقت کی عکاسی کرتی ہوئی یہ غزل امید ہے آپ سب کو بھی پسند آئے گی۔

دھوپ کا چاند،

یہ جو رشکستہ ہے فاختہ، یہ جو زخم زخم گلاب ہے
یہ ہے داستاں میرے عہد کی جہاں ظلمتوں کا نصاب ہے

جہاں ترجمانی ہو جھوٹ کی، جہاں حکمرانی ہو لوٹ کی
جہاں بات کرنا محال ہو، وہاں آگہی بھی عذاب ہے

مری جان ہونٹ تو کھول تو، کبھی اپنے حق میں بھی بول تو
یہ عجیب ہے تری خامشی، نہ سوال ہے نہ جواب ہے

سرِ راہ چراغ جلے گا کیا، کوئی منزلوں کو چلے گا کیا
ترا دل ہے ابھی بجھا ہوا، تری آنکھ میں ابھی خواب ہے

وہی آب ہیں آبلے، وہی فصل فصل ہیں فاصلے
وہی خار خار ہے راہگزر، وہی دشت دشت سراب ہے

وہی بام و در ہیں جلے ہوئے، وہی چاند چہرے ڈھلے ہوئے
وہی صبح کو نئے ملال ہیں، وہی شام شہر خراب ہے

مجھے سعد تجھ سے گلہ نہیں، کہ میں خود ہی تجھ سے ملا نہیں
مری زندگی بھی عذاب ہے، تری زندگی بھی عذاب ہے

خالدہ جیلانی

میری بیاض سے

ثمین اقبال قریشی ______ گاؤں بدو مرجان

وہ بچپنے کی نیند تو اب خواب ہو گئی
کیا عمر تھی کہ رات ہوئی اور سو گئے
کیا دکھ تھے، کون جان سکے گا نگار شب
جو میرے اور تیرے دوپٹے بھگو گئے

ی قریشی ______ نواب شاہ

پھول خوشبو کو ہوا میں فدا گہرا لکھنا
سات رنگوں میں کبھی اس کا سراپا لکھنا
تتلیاں رنگ لیے پھرتی ہیں چاروں جانب
کتنا مشکل ہے بہاروں کا قصیدہ لکھنا

یسہ بانو ______ پنڈ دادن خان

اس قدر تشنگی کہ دم ٹوٹے
وقت ہے اب کہ جام جم ٹوٹے
پھر بھی روداد جاں ادھوری ہے
انگلیاں گھس گئیں، قلم ٹوٹے

شف ______ پشاور

یادوں کے یہ جگنو مری آنکھوں میں نظر بند
دیکھو مرے آنسو مری آنکھوں میں نظر بند
چہرے کا وہ اک پھول ہے اب تک تر و تازہ
اب تک ہے وہ خوشبو مری آنکھوں میں نظر بند

ح توقیر ______ اٹک

چپ ہوں اب اپنے باب میں جیسے
خواب دیکھا ہو خواب میں جیسے
زندگی کا سفر عجیب سفر
کوئی چلتا ہو خواب میں جیسے

گیلانی سسٹرز ______ کہروڑ پکا

ملا تو اور بھی تقسیم کر گیا مجھ کو
سمیٹتی تھیں جسے میری کرچیاں محسن

عالیہ عروج ______ گھوٹکی

گھر میں پرچھائیں تھی اور خوف کا سرمایہ تھا
تب نیا چاند دریچے میں اتر آیا تھا
ایک اک موج پہ لکھا تھا مرا نام مگر
ایک اک بوند کو دریاؤں نے ترسایا تھا

حرا شاہ ______ شجاع آباد

ہوائیں سرد ہو جائیں یا لہجے برف ہو جائیں
ہم اس کی یاد کی چادر خود پہ تان لیتے ہیں
اگر وہ روٹھ جاتا ہے ہماری جاں نکلتی ہے
یہ سانسیں جاری رکھنے کو ہم اس کی مان لیتے ہیں

زینب احسن زینی ______ فیصل آباد

خود پیاس کا صحرا ہوں مگر دل کی یہ ضد ہے
ہر دشت پہ ساون کی طرح ٹوٹ کے برسوں

اشید امام ______ چنیوٹ

رکھ دے گا بدل کے وہ میرے روپ کی صورت
میں برف کا انساں ہوں تو وہ دھوپ کی صورت

سیدہ فرزانہ ______ حجرہ شاہ مقیم

تیری مجبوریاں درست مگر
تو نے وعدہ کیا تھا یاد تو کر

سنزا شدہ لیلین راؤ ______ کوٹ ادو

یہ بھی آداب ہمارے ہیں تمہیں کیا معلوم
ہم تمہیں جیت کے ہارے ہیں تمہیں کیا معلوم

نسبت سنبع ______ کہروڑ پکا

بغیر وجہ کے نہیں بے رخی عدم ان کی
ضرور ہم سے وہ رغبت زیادہ رکھتے ہیں

باتیں کتابوں کی

سائرہ غلام نبی

کتاب ـــــ وسیلۂ ظفر
ترتیب و تدوین ـــــ انور احمد علوی
م شوکت جمال
زیر اہتمام ـــــ اکادمی بازیافت
قیمت ـــــ 200 روپے

معروف مزاح نگار انور احمد علوی نے جب مجھے نئی شائع شدہ کتاب "وسیلۂ ظفر" کا تحفہ دیا تو میرا ذہن اپنے بچپن کی گلیوں کی طرف مڑ گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ معروف ادیب ابو ظفر زین وہ پہلے ادیب تھے، جنہوں نے مجھے اپنی کتاب "پیازی اردو" اپنے دستخط کے ساتھ عطا کی تھی۔ اسکول کے دور میں۔ چھپنے والے اس قلم کار کے لیے ممنونیت اب تک میرے دل میں ہے کہ مجھ جیسے طفل مکتب کو انہوں نے اپنی کتاب کے لائق جانا۔ جسے میں نے بالکل مختلف کیفیت کے ساتھ پڑھا اور ان کی شگفتہ نثر سے متاثر ہوئی۔ میری یادداشت میں ابو ظفر زین کا چہرہ اب دھندلا دھندلا سا ہے کہ وہ میری سہیلیوں عظمیٰ، انجم کے پرشفیق دادا اور رخسانہ باجی کے والد محترم تھے اور میں ان کی بچوں سے محبت اور کتابوں سے بھری الماریوں کو بڑے رشک سے دیکھا کرتی تھی۔ حال ہی میں ان کے مضامین کا انتخاب "وسیلۂ ظفر" کے عنوان سے شائع کیا گیا ہے۔

ابو ظفر زین صاحب طرز ادیب ہیں۔ انہوں نے مزاح برائے مزاح کے قائل ہوتے ہوئے بھی مزاح برائے اصلاح تحریر کیا ہے۔ تری مقصدیت ان کا مزاج تھا، نہ شعار۔۔۔ وہ ہلکے پھلکے انداز میں پرمعنی باتیں کر جاتے ہیں کہ معاشرے کی ناہمواری کو ان کی چلبلی نظر بھانپ لیتی ہے اور وہ قلم کی نوک سے چبھن دینے کی بجائے ملائمت، نرمی اور شائستگی سے فقرہ کہہ جاتے ہیں کہ سوچ کوئی راہ تو کھلتی ہی ہے۔ مگر وہ فقرہ گدگداتے لگتا ہے۔ سیاست ان کا پسندیدہ موضوع ہے وہ مضحکہ خیز صورت حال کو بڑے سلیقے سے نباہ لیتے ہیں۔

"کراچی 1946ء میں" یہ ایسا مضمون ہے۔ جس میں اس دور کی کراچی کو یاد کیا ہے۔ آج کے کراچی کو دیکھتے ہوئے اس مضمون کو پڑھنے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔ ایک سیٹھ صاحب کو کرائے کے گھر کی تلاش ہے۔ بالآخر انہیں گھر مل بھی گیا ہے۔ اس مضمون کا آخری پیراگراف دیکھیے۔

"چلو میں تمہارا مکان کرائے پر لے تو لوں۔۔۔ تین ماہ کے لیے مگر۔۔۔" چندو کی ماں نے فوراً "میری بات کاٹی۔۔۔ "سرکار مائی باپ ہیں۔ کرایہ تو ساڑھے تین روپے ماہوار ہے۔ لیکن لالہ جانکی لال کے تم دوست ہو، چار آنہ کمتی۔ کیا کروں بابا! ابھی کھرچا بہت بڑھ گیا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے، مگر گھر کے بالکل سامنے یہ خالی پلاٹ پر اتنے سارے گھوڑے اور گدھے جو بندھے ہیں اور گندگی پھیلا رہے ہیں۔"

چاندی کے کڑوں سے بھرے ہاتھ جس سے شاید وہ تھوڑی دیر پہلے اپلے لگا رہی تھی، میرے منہ کے سامنے نچاتے ہوئے چندو کی مائی بولی۔ "بھولا سائیں! یہ سب گھوڑا اور گدھا سرکاری ہے۔ آج کل جمین (زمین) کا جو بھی ٹکڑا جہاں پر بھی کھالی (خالی) پڑا ہو وہ سرکاری گھوڑے اور گدھوں ہی کے لیے تو ہوتا ہے۔"

اور کچھ ان کے چٹکلے ملاحظہ کریں۔

(1) کمیونسٹ ممالک میں کوئی نہیں بولتا، جمہوری ممالک میں کوئی نہیں سنتا۔
(2) میں حق کی حمایت میں جیل کے دروازے تک جا سکتا ہوں۔۔۔ اور بس۔
(3) اس دور میں چوری کرنا جرم نہیں، پکڑے جانا جرم ہے۔
(4) ہاتھیوں کو کبھی کلوریز کی فکر نہ ہوئی، اسی لیے وہ لمبی عمر پاتے ہیں۔
(5) چھوٹا قاتل تختہ پاتا ہے، بڑا قاتل تخت۔
(6) جرم بے شک کرو۔۔۔ اچھا وکیل تمہیں بری کرا دے گا۔

✡ ✡ ✡

ادبی مجلہ ـــــ عندل
ترتیب ـــــ رضیہ خالد رائے، یاسمین کاشف
مقام اشاعت ـــــ گورنمنٹ کالج برائے خواتین اوکاڑہ

دیکھنے میں آرہا ہے کہ کالجز اور یونیورسٹیز میں طلبہ و طالبات کی ترجیحات مختلف ہو چکی ہیں۔ اس کے لیے عموماً طلبہ و طالبات پر الزام دھر دیا جاتا ہے کہ وہ صحت مند تعمیری سرگرمیوں سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ تفریحی سرگرمیاں اولیت حاصل کر چکی ہیں کہ یہ سہل الحصول بھی ہیں اور دسترس میں بھی ہیں۔ یقیناً یہ نازک ترین دور ہے کہ نہ تو جدید ٹیکنالوجی سے بچوں کو دور رکھا جا سکتا ہے اور نہ ہی مکمل طور پر ان کے حوالے کیا جا سکتا ہے۔ ایسے میں وہ اساتذہ قابل قدر ہیں، جو آج بھی طلبہ کی ذہنی تربیت و شعور کے حوالے سے سرگرم رہتے ہیں اور اپنا فریضہ نبھانا جانتے ہیں۔ ایسی ہی کوشش ادبی مجلے کی صورت میں نظر آتی ہے۔ جس کی روایت برسوں سے چلی آرہی ہے۔ پچھلے دنوں ہمیں ایک ایسا ہی ضخیم مجلہ موصول ہوا۔ جو گورنمنٹ کالج برائے خواتین اوکاڑہ کی اساتذہ و طالبات نے ترتیب دیا ہے۔ بڑے ادبی مراکز سے دور اوکاڑہ جیسے شہر سے قلم کاروں کی تحریروں کے ایک کہکشانی جھرمٹ کی شکل دی گئی ہے۔ اس مجلے میں ترتیب و تزئین کا خاص خیال رکھا گیا ہے اور تحاریر کے انتخاب میں بھی معیار کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ بعض تخلیقی کاوشوں سے امید نظر آتی ہے کہ مستقبل میں اردو ادب کو اچھے لکھنے والے ملیں گے۔

مجموعہ کلام ـــــ آنکھ لگتی نہیں
شاعر ـــــ اسد بیگ
زیر اہتمام ـــــ حرف اکادمی
قیمت ـــــ 200 روپے

"آنکھ لگتی نہیں" کا عنوان دیکھ کر میرے ذہن میں خیال ابھرا کہ اسد بیگ کی شاعری میں ہجر کا کرب اور فراق کا دکھ نمایاں ہوگا۔ گریہ و نالہ و شیون ان کا مزاج ہوگا۔ شب بیداری ان کی عادت ہوگی۔ نیند ان کی آنکھ سے کترا کر گزر جاتی ہوگی۔ زیر تبصرہ مجموعہ کی ورق گردانی کرتے ہوئے 'اسد بیگ کی شعری فضا میں سانس لیتے ہوئے اپنے ہی خیال کو فوراً ہی رد کر دینا پڑا کہ جہاں لوگ خواب کی دنیا میں بھٹکتے پھرتے ہیں، وہاں وہ تعبیر کا سرا تھامے بیٹھے ہیں۔

وہ محبتوں کو پالینے کی سرشاری کا احساس وافر رکھتے ہیں یہی کیفیت ان کے وجود میں طمانیت کا سرور بھر دیتی ہے۔ ان کی آنکھوں میں دیے سے جھلملاتے ہیں وہ اس جھلمل روشنی میں زندگی کا تابناک راستہ دیکھتے ہیں کہ یقین ان کا اثاثہ بن جاتا ہے۔ خدا کی عطا کردہ نعمتوں سے طمانیت پاتے ہیں اور یہی طمانیت ان کے اندر عزم کو جگائے رکھتی ہے۔ یہ شعر دیکھیے۔

دیا ہواؤں کے رخ پہ جلا بھی سکتا ہوں
کسی بھی سمت سے منظر جگا بھی سکتا ہوں

"آنکھ لگتی نہیں" کے شاعر کے دل میں محبتوں کا سمندر موجزن ہے۔ جو بھی لہر اندر سے اٹھتی ہے، وہ نرم پھوار میں بھیگا ہوا لہجہ دے جاتی ہے۔ وصال کا رنگ ان کا بنیادی اور گہرا رنگ ہے۔ اس رنگ کی گھلاوٹ ان کی شاعری میں نمایاں ہے۔

زیر تبصرہ مجموعے کا شاعر کسی خیالی وجود کا پیکر تراش کر اس کے خواب آنکھوں میں بسا کر اپنے ہی مدار میں نہیں گھومتا۔ معاملات محبت میں وہ سرگرداں ہے۔ مگر اداس نہیں کہ اس کا محبوب تصوراتی نہیں، بلکہ اس کے آس پاس ہے۔ وہ اس کے ہونے کے احساس سے سرشار ہے۔ یہ شعر دیکھیے۔

حصار جاں میں مجھے بسا کر تم اپنا چہرہ گلاب رکھنا
سنہری صبحوں میں کالی راتوں کا جان جاناں حساب رکھنا

علاوہ ازیں! اسد بیگ کی نظموں میں درد مندی اور حساسیت کا احساس ملتا ہے کہ وہ سچے پاکستانی اور باشعور فرد محسوس ہوتے ہیں۔ ان کی بیشتر نظمیں اسی خصوصیت کی حامل ہیں۔

آپ کا باورچی خانہ

مسز مسرت شاہین

میں عرصہ پندرہ سال سے آپ کے شمارے کی باقاعدہ قاری ہوں۔ اسکول کے زمانے سے آپ کے معیاری رسائل میرے دوست بنے اور ماہ و سال کا سفر طے کرتے ہم سفر بن گئے۔ میں ننھی معصوم کلی سے بچوں کی ماں بنی لیکن میرے تعلق اور پسندیدگی میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔ پہلے پہل کزن کے گھر سے لا کر چھپ چھپ کر پڑھا کرتی تھی کیونکہ امی جان خلاف ہوا کرتی تھیں مگر کالج میں پہنچ کر کھلم کھلا مطالعہ کرنا شروع کیا۔

(1) ہمارے گھرانے میں ماشاءاللہ جوائنٹ فیملی سسٹم ہے' اس لیے افراد خانہ کی تعداد زیادہ ہے' اس کے باوجود کھانا پکاتے ہوئے سب کی پسند' ناپسند' غذائیت اور بجٹ سب کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔ چونکہ کھانا پکانے کی ذمہ داری تمام تر مجھ پر ہے' اس لیے اکثر سب اپنی فرمائش مجھ سے کرتے ہیں۔ والدین کی صحت اور بیماری کو مدنظر رکھتے ہوئے مینیو بناتی ہوں۔ اکثر افراد نوکری کرنے والے ہیں تو ان کی پسند کا خیال رکھتے ہوئے گوشت اور اس سے بنی ہوئی اشیاء کو فوقیت دیتی ہوں۔ بچوں کو لنچ پر خاص طور پر ہلکے پھلکے اسنیکس اور نوڈلز بنا کر دیتی ہوں۔ ناشتے سے لے کر رات کے کھانے تک 4 سے 5 بار کچن کا رخ کرتی ہوں۔ میاں صاحب کباب اور میٹھے کے شوقین ہیں لہٰذا یہ بھی خاص طور پر تیار کرتی ہوں۔

(2) اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ مہمان بتائے بغیر ہی آتے ہیں لہٰذا اس وقت جو چیز مہیا ہو وہ فوراً تیار کرلی جاتی ہے۔ ایک خاص مگر ذائقے دار چیز "چکن ود ساس" ہے' جو میں بہت اچھی اور جلدی بناتی ہوں اور مہمانوں کو پسند بھی آتی ہے۔

چکن ود ساس

اجزا :

چکن	آدھا کلو
پیاز	ایک درمیانی
ادرک لہسن پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
دہی	ایک چمچہ
ٹماٹر	ایک پاؤ (پیسٹ بنا ہوا)
ہری مرچ	چھ سے آٹھ عدد
نمک' گھی	حسب ذائقہ
کالی مرچ	ایک چائے کا چمچہ
زیرہ سفید	ایک چائے کا چمچہ
کارن فلور	ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب :

سب سے پہلے چکن دھو کر پانی نکال لیں۔ دیگچی میں گھی ڈال کر پیاز باریک کٹی ہوئی سرخ کریں اور نکال لیں۔ اس گرم گھی میں چکن کی بوٹیاں ڈال کر گولڈن ہونے تک فرائی کریں اس کے بعد ادرک لہسن کا پیسٹ' نمک ڈال کر بھونیں۔ دہی ڈال کر تیز آنچ پر پکائیں۔ دہی کا پانی خشک ہو جائے تو ہری مرچ لمبائی میں کٹی ہوئی اور کالی مرچ ڈال کر ٹماٹر کا پیسٹ ڈالیں اور دم پر رکھ دیں۔ تھوڑی دیر بعد کارن فلور کو پانی میں مکس کر کے چکن میں ڈال دیں۔ گاڑھا سا سوپ کی شکل بن جائے تو اتار لیں۔ یہ پندرہ سے بیس منٹ میں تیار ہو جاتی ہے اور اگر شام کی چائے پر مہمان آئیں تو جھٹ پٹ تیار ہونے والے نگٹس فرائی کر لیتی ہوں۔ یہ ہمارے گھر بہت شوق سے کھائے جاتے ہیں اور بچے بوڑھے جوان سب پسند بھی کرتے ہیں۔

چکن نگٹس

اجزا :

چکن	بون لیس
	(ایک پیالی بوائل کیا ہوا)
نمک	حسب ذائقہ

کالی مرچ — حسبِ ذائقہ
چائنیز نمک — ایک چائے کا چمچہ
انڈے — 3عدد
ڈبل روٹی کے سلائس — 3عدد
تیل — فرائی کے لیے

ترکیب :

چکن ' بریڈ سلائس اور انڈے بلینڈر میں ڈال کر بلینڈ کرکے اچھی طرح مکس کرلیں۔ اس میں نمک 'کالی مرچ اور چائنیز نمک ڈال کر مکس کوییں اور گھی گرم کرکے اس میں چمچہ کے ساتھ آہستہ آہستہ ڈالتی جائیں اور سرخ ہونے پر اتار کر گرم گرم کیچپ کے ساتھ سرو کریں۔

(3) کچن میں کام کرتے ہوئے بکھراوا تو لازمی ہوتا ہے۔ لیکن میں ساتھ ساتھ سمیٹتی ہوں۔ کچن میں گندگی مجھے پسند نہیں ہے۔ ہفتہ وار صفائی کے دوران میں چولہے کے پیچھے اخبار لگاتی ہوں ' تاکہ کھانے پکاتے وقت دیوار کے اوپر چھینٹے نہ پڑیں۔ اس سے دیوار گندی نہیں ہوتی۔ پندرہ دنوں بعد کچن کے تمام برتن نکال کر صفائی بھی میری خانہ داری کا خاص حصہ ہے۔ مجھے چونکہ آرٹ کا شوق ہے 'اس لیے میں اکثر مختلف اشیاء بنا کر کچن میں آرائش ضرور کرتی ہوں۔ کچن سے متعلق اچھی اشیاء خریدنا بھی میرا شوق ہے۔ اس لیے میرا کچن میری پسندیدہ جگہ ہے اور میری سلیقہ مندی کا منہ بولتا ثبوت بھی۔

(4) ہمارا گھرانہ چونکہ زیادہ تر ملازمت کرنے والے لوگوں پر مشتمل ہے 'اس لیے صبح ہڑبونگ مچی ہوتی ہے۔ نندیں جو میسر ہو ناشتے میں کھالیتی ہیں دیور ذرا دیر سے جاتا ہے تو وہ فل ناشتے کا قائل ہے۔ اس لیے دہی ' پراٹھا ' سالن ' انڈہ اور لسی کا اہتمام ہوتا ہے۔ میاں صاحب ناشتے میں گھر کا بنا ہوا سالن اور پراٹھا شوق سے کھاتے ہیں لیکن اتوار کو مکمل اور باقاعدہ ناشتہ بنتا ہے جس میں — حلوہ پوری ' نہاری ' سری پائے اور مرغ چھولے شامل ہیں۔ ایک مکمل مگر ہلکا پھلکا ناشتہ جو ہم سب پسند کرتے ہیں وہ ہے فرنچ ٹوسٹ اور انڈے کا حلوہ اس کی ترکیب تو تقریباً" ہر ایک کو آتی ہو گی۔

(5) گھر کے کھانے بعض اوقات بور کرنے لگتے ہیں اس لیے باہر کا کھانا کھالیا جاتا ہے۔ لیکن ایسا موقع کم آتا ہے کہ پلان بنا کر کھایا جائے۔ جب گھر میں سبزی یا دال بنتی ہے تو سب اپنی پاکٹ منی سے کباب ' تکے اور باربی کیو منگوالیتے ہیں۔ لیکن میاں صاحب کا جب دل چاہے وہ خاموشی سے لے جاتے ہیں اور اچھا کھانا کھلواتے ہیں۔ ویسے میں اتنی شوقین نہیں ہوں لیکن موقع کی مناسبت سے جاتے ہیں۔ یہ سب موڈ پر منحصر کرتا ہے۔ میرے خیال میں گھر کا کھانا زیادہ مزیدار اور سستا ہوتا ہے۔ کیونکہ باہر کی نسبت گھر میں اتنا کھانا منگا نہیں محسوس ہوتا۔

(6) موسم کے ساتھ انسانی جذبات کا گہرا تعلق ہے۔ مجھ جیسی جذباتی اور حساس انسان کے لیے موسم بہت اہمیت رکھتا ہے بارش میں چکن رول ' سموسے ' چھولے اور پکوڑی بناتی ہوں مہمان آئیں تو زیادہ مزہ آتا ہے۔ گرمی کے موسم میں کڑھی چاول اور سردی میں گرین ٹی ' نہاری ' پائے ' حلیم بہت لطف دیتے ہیں۔

(7) اچھا پکانے کے لیے مشقت کی قائل ہوں کیونکہ محنت کے بغیر اچھے نتائج حاصل نہیں ہوسکتے۔ اس لیے کباب کا مسالا پیسنے کے لیے میں سل بٹے کی قائل ہوں۔ کیونکہ چوپر میں ہرگز وہ مزہ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ جب عورت پوری توجہ ' تندہی اور محنت کے ساتھ کھانے پکائے تو کوئی وجہ نہیں کہ کھانا لذیذ اور ذائقے دار نہ بنے۔

(8) ٹپ ویسے تو بہت سی ہیں لیکن ایک یہ کہ ہمیشہ کھانے پکاتے وقت سر ڈھانپ کر رکھیں بسم اللہ پڑھ کر شروع کریں۔
کھانے میں برکت ہوگی اور غیر معمولی مزیدار ہو جائے گا۔

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

مزیدار آلو آملیٹ مسالہ

ضروری اجزا :

انڈے — 6عدد
آلو (ایک انچ کے کیوبز کاٹ لیں) — دوعدد
ہلدی پاؤڈر — چائے کا ایک چوتھائی چمچہ
سرخ مرچ پاؤڈر — چائے کا آدھا چمچہ
نمک — حسبِ ذائقہ
تیل — کھانے کے 6چمچے
پانی — ڈیڑھ پیالی
پسی ہوئی پیاز — کھانے کے چار چمچے

پیاز کے آمیزے کے لیے

پیاز — دوعدد (بڑی)
ٹماٹر — تین عدد
ادرک — ایک انچ کا ٹکڑا
لہسن کے جوے — 5عدد
ہری مرچیں — 4عدد
سرکہ — چائے کے چار چمچے

ترکیب :

پیاز کا آمیزہ تیار کرنے کے لیے پیاز ' ٹماٹر ' ادرک ' لہسن ' ہری مرچیں اور سرکے کو پیس کر پیسٹ سا بنالیں۔ ایک پیالے میں انڈوں میں نمک ڈال کر پھینٹ لیں۔ ایک سوس پین میں کھانے کا ایک چمچہ تیل گرم کرکے آدھی مقدار انڈوں کی ڈال کر آملیٹ کی طرح فرائی کریں۔ اسے نکال کر 4 ٹکڑوں میں کاٹ لیں۔ اب بقیہ انڈے بھی فرائی کرکے نکال لیں۔ پھر بقیہ تیل گرم کرکے آلو ڈال کر سنہری مائل ہونے تک فرائی کریں اور نکال کر الگ رکھ لیں۔ اسی تیل میں پیاز کا آمیزہ ڈال کر بھونیں جب تیل الگ ہو جائے تو نمک

سرخ مرچ پاؤڈر اور ہلدی پاؤڈر ڈال کر بھونیں۔ اب آلو شامل کرکے بھونیں۔ تھوڑی دیر بعد آملیٹ کے ٹکڑے شامل کریں۔ ڈھانپ کر آلوؤں کو گلالیں۔ گرم گرم سرو کریں۔

انڈوں کے چاول

ضروری اجزا :

انڈے	5عدد (زردے کا رنگ شامل کرکے پھینٹ لیں)
ٹماٹر	ڈیڑھ پاؤ (کاٹ لیں)
ہری مرچیں (کاٹ لیں)	5سے 6عدد
پیاز	تین عدد (درمیانی)
نمک	حسب ذائقہ
پسی ہوئی سرخ مرچ	حسب پسند
ہلدی پاؤڈر	چائے کا آدھا چمچہ
سفید زیرہ	چائے کا ایک چمچہ
آلو (چھیل کر قتلے کاٹ لیں)	ڈیڑھ پاؤ
چاول	تین پاؤ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

پیاز کے لچھوں کو تیل میں سنہری مائل کرلیں۔ اس میں ٹماٹر، ہری مرچیں اور تمام مسالے شامل کرلیں۔ ٹماٹر کے گلنے تک پکائیں پھر آلو بھی شامل کرلیں اور گلنے تک پکائیں۔ آخر میں انڈے باریک تار کی شکل میں شامل کریں اور مستقل چمچہ چلاتی رہیں کہ انڈے پوری گریوی میں اچھی طرح مکس ہوجائیں اور گھی چھوڑ دیں۔ پتیلی کو نیچے اتارلیں۔ ایک دوسری پتیلی میں گھی گرم کرکے پھیلالیں۔ پہلے چاول کی تہہ بچھائیں اس پر انڈے اور آلو کا آمیزہ پھیلادیں۔ آخر میں چاولوں کی تہہ بچھائیں۔ چاہیں تو زردے کا رنگ شامل کرلیں دس سے پندرہ منٹ دم دیں۔ ڈش میں نکالنے سے قبل چاولوں کو اچھی طرح ملالیں۔ مزیدار انڈے والے چاول تیار ہیں۔ رائتے اور اچار کے ساتھ سرو کریں۔

انڈوں کا حلوہ

ضروری اجزا :

انڈے	ایک درجن
دودھ	ایک پیالی
الائچی	پانچ عدد (چھوٹی)
بادام	حسب ضرورت
کھویا	ایک پاؤ
چینی	دو پیالی
پستہ	حسب ضرورت
مکھن	ایک ٹکیہ

ترکیب :

پتیلی میں مکھن ڈال دیں اور پگھلنے کے بعد الائچی کے دانے ڈال دیں کچھ دیر اسے پکائیں پھر کھویا ڈال کر مسلسل چمچہ ہلاتی رہیں۔ یہاں تک کہ کھویا سنہری مائل ہوجائے اور ایک لئی سی بن جائے۔ پھر اس میں دودھ ڈال کر پتلا کرلیں اور تھوڑی دیر تک چمچہ ہلائیں۔ جب دودھ اچھی طرح مکس ہوجائے تو چینی ڈال دیں۔ اگر میٹھا کھویا استعمال کیا ہے تو چینی کی مقدار کم کردیں۔ اچھی طرح پھینٹے ہوئے انڈوں کا آمیزہ ایک باریک تار کی صورت میں پتیلی میں ڈالیں۔ ساتھ ساتھ چمچہ ہلاتی جائیں۔ یہاں تک کہ حلوہ پانی چھوڑ دے۔ اس حلوے کو خشک کرلیں۔ جب پانی تھوڑا سا رہ جائے تو حلوہ برتن میں نکال کر اور باقی رہ جانے والا پانی ڈال دیں۔ یہ اصل میں مکھن ہے۔ حلوے کو پسے ہوئے پستہ اور چھلے ہوئے باداموں سے سجا کر گرم گرم پیش کریں۔

(ثمینہ طفیل..... ضلع خانیوال)

غزل ثوبان

کامیابی

اداکار حسن سومرو کے کریڈٹ پر نازلی نصر سے شادی کے علاوہ کوئی کارنامہ نہیں ہے۔ محض اچھی آواز کی بنا پر وہ ٹی وی اور ریڈیو پر کچھ نہ کچھ کر ہی لیتے ہیں۔ لیکن اب یوں لگتا ہے کہ اپنے کانٹیکٹ کے طفیل وہ واقعی کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ حال ہی میں انہوں نے بھارتی پروڈیوسر سلاج شلالی کی نئی فلم "آنکھیں" سائن کی ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ فلم میں رنبیر کپور، عمران خان سمیت کئی اسٹار نام بھی شامل ہیں۔ فلم کے پروڈیوسر گزشتہ دنوں پاکستان آمد پر یہ کہتے نظر آئے کہ پاکستان میں اچھے ٹیلنٹ کی بالکل کمی نہیں۔ یہاں محنتی فنکار، موسیقار اور مصنف بستے ہیں، بس بجٹ کی کمی ہے۔ اسی لیے بولی وڈ کے فنکار یہاں کام نہیں کرتے۔ (پیسے سے زیادہ یہاں محبت اور خلوص ہے جس کی آپ کے یہاں کمی ہے) پاکستانی فنکاروں کو بھارت میں سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے۔ (پھر زور سے زمین پر پٹخ دیا جاتا ہے) اس کی مثال عدنان سمیع خان ہیں، جن کے ممبئی میں آٹھ فلیٹ ہیں (ان کے انجام سے بھی آپ واقف ہی ہوں گے) بھارت کے کسی موسیقار کے پاس اتنی جائیداد نہیں ہے۔" (غالباً آپ کا مقصد مسلمانوں سے ہے۔ ان سے مقابلتاً عدنان سمیع واقعی بہت بہتر حال میں ہیں)

روٹین

ثمینہ پیرزادہ خاصی متحرک رہتی ہیں۔ اسی لیے

ابھی تک چاق و چوبند نظر آتی ہیں۔ اپنی روز مرہ کی روٹین کے حوالے سے وہ کہتی ہیں "مجھے کام کرنے کا جنون ہے۔ بلکہ میں ہر وقت مصروف رہنے کو ترجیح دیتی ہوں۔ اگرچہ میرے دوست مجھے فلم انڈسٹری سے دور رہنے کا مشورہ دیتے ہیں، تب بھی میرا شوق میری محبت مجھے واپس اسی جانب لے کر جاتی ہے۔ ان دنوں بھی میں مختلف اسکرپٹس پر کام کر رہی ہوں۔ میری تمام تر خوشی کا مرکز میری بیٹیاں اور میری سرزمین ہے۔ میں ان کی کامیابی کو اپنی کامیابی سمجھتی ہوں میری زندگی کے خوب صورت لمحات وہ تھے جب ہمارے یہاں بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ اداکاری کے شعبے میں مجھے روحی بانو نے بے حد متاثر کیا۔ ان کی زندگی ہم سب کے لیے سبق ہے۔" (چلیں اسی بہانے آپ لوگ پرانے فنکاروں کو خراج تحسین ہی پیش کر لیتے ہیں۔)

یہ بیان کالمانہ

☆ 75ء کے اواخر میں پاکستان آیا تو بھٹو صاحب نے درخواست کی کہ میں واپس نہ جاؤں اور رک کر ایٹم بم بناؤں، باقی حالات کہ کس طرح سب کچھ چھوڑا کتنی تنخواہ پر کام کیا اور کن کن مشکلات و سازشوں کا سامنا کرنا پڑا، اب ہماری تاریخ کا حصہ ہے میں نے نہایت کم عرصہ میں اس ملک کو ایک ایٹمی اور میزائل قوت بنا دیا۔ میں نے اربوں ڈالر کی ٹیکنالوجی دی اور ایک پائی معاوضہ نہیں ملا۔ (ڈاکٹر عبدالقدیر خان)

☆ تسلسل کے ساتھ ٹی وی چینلز نے وینا ملک کو بظاہر کٹہرے میں کھڑا کر کے وینا ملک کا خوب پرچار کیا اور جو بظاہر تنقید تھی وہ دراصل وینا ملک کی اشتہاری مہم نکلی اور اگلے دن سے دوسرے چینلز پر بھی یہ شو شروع ہو گیا۔ بار بار وہ فحش سین دکھائے جا رہے تھے جن پر اعتراض تھا۔ اور سب سے بڑھ کر خرابی یہ ہوئی کہ جو لوگ یہ سب کچھ نہیں جانتے تھے۔ وہ بار بار یہ دیکھ رہے تھے۔ (مظفر اعجاز جسارت)

☆ ہم سیلاب کے عذاب سے گزرے، ایک دوسرے کو قتل کر کے عذاب کا مزا چکھ رہے ہیں لیکن اللہ کی یاد اور توبہ تو ایک طرف پاکستان میں انصاف کے لیے بھی قدم نہیں اٹھاتے۔ انصاف کی تعریف کرتے ہوئے قرآن نے ایک شرط عائد کی ہے کہ کسی قوم، قبیلے یا گروہ کی محبت تمہیں اس بات پر مجبور نہ کرے کہ تم انصاف چھوڑ دو۔ اپنے گریبانوں میں جھانکیں۔ کوئی وکیل ہے تو کوئی صحافی، کوئی ڈاکٹر ہے تو کوئی انجینئر کسی کو اپنی پارٹی عزیز ہے تو کسی کو اپنا فرقہ، کوئی اپنی نسلی برتری پر دوسروں کا خون بہاتا ہے کوئی عقیدے کی بنیاد پر قتل کو جائز قرار دیتا ہے۔ دوسروں کے قتل پر خوش ہوتے ہیں۔ اپنے مرنے والوں کی لاشیں اٹھا کر بھاگتے ہیں۔

(اوریا مقبول جان ایکسپریس نیوز)

☆ اللہ کا شکر ہے کہ عمران خان میانوالی میں ورلڈ کلاس یونیورسٹی بنا رہا ہے کیونکہ وہ انقلابی ہے نہ حکمران نہ ہی اتنا دولت مند کہ ہمہ وقت دولت کی ہوس میں مبتلا رہے۔ (ڈاکٹر صفدر محمود۔ جنگ)

☆ ہمارے بیچ سے دلیل غائب ہو چکی ہے، مذہب کا سنجیدہ مطالعہ غیر ضروری ٹھہرا۔ جذباتی نعرے لگاؤ اور لوگوں کے مذہبی جذبات کو بھڑکاؤ۔ سستا اور تیر بہدف نسخہ۔ کہاں سے چل کر ہم کہاں آ پہنچے۔ (بندگی نامہ۔ انتظار حسین)

الجھنیں

اپنی شخصیت کا جائزہ لیں۔

کیا آپ خوش رہتی ہیں؟

اگر آپ کا جواب نفی میں ہے تو یہ سمجھ لیں کہ آپ اپنی زندگی کے نت نئے مسائل سے مطابقت نہیں کر پا رہی ہیں۔ کیونکہ خوشی براہ راست نہیں حاصل ہو سکتی۔ اگر آپ کی زندگی کا کوئی مقصد ہے اور آپ اس کی تکمیل کے لیے جدوجہد کر رہی ہیں تو آپ کو ضرور خوشی حاصل ہوگی۔

کیا آپ لوگوں کو پسند کرتی ہیں؟

ان کے اعتماد' ان کے خلوص' ان کی قربت کی خواہاں ہیں۔

اگر آپ لوگوں کو پسند نہیں کرتیں۔ تنہائی کی زندگی گزارنا چاہتی ہیں تو آپ ذہنی طور پر بیمار ہیں۔

کیا آپ ماضی کی غلطیوں پر بیٹھی روتی رہتی ہیں اور مستقبل کے ڈر سے سہمی رہتی ہیں تو آپ سمجھ لیں کہ آپ اپنے کل اور آج کا خون کرتی رہتی ہیں۔

آپ عمر کے کسی دور میں ہوں' کتنی ہی مال دار اور کتنی ہی غریب' کامیاب' ناکام ہوں' آپ کو اپنے گھر میں ماں باپ یا بھائی' بہن کی شکل میں ایک بااعتماد دوست کی ضرورت ہے۔ جس سے آپ پورے بھروسے' خلوص کے ساتھ سب کچھ کہہ دیں' خواہ کتنا ہی برا واقعہ کیوں نہ ہو۔

یہ اطمینان آپ کی دماغی صحت کے لیے بہت ضروری ہے کہ کام کی زیادتی سے کوئی بھی نہیں تھکتا۔ اور نہ بیمار پڑتا ہے لیکن اگر کسی کو کام سے دلچسپی نہیں ہے تو آسان سے آسان کام بھی نہیں ہو پاتا۔

ایک مفکر نے لکھا ہے کہ یہ ہماری کتنی بڑی بدنصیبی ہے کہ اس تہذیب اور تمدن' ترقی اور نئی روشنی کے دور میں ہم نہیں جانتے کہ ہماری سب سے بڑی دولت' سب سے بڑی نعمت خود اعتمادی ہے اور ہمارے سامنے ایسی راہیں اور ایسے طریقے موجود ہیں جن پر عمل کر کے اس نعمت سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ ہماری تہذیب کتنی پیچھے ہے کہ ہمارے طلبا تعلیمی درسگاہوں میں دنیا کی ساری حماقتیں سیکھتے ہیں لیکن یہ نہیں سیکھتے کہ ان میں خود اعتمادی کا جوہر جو دنیاوی کامیابی کے لیے لازمی ہے' کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں جو شخص اپنے آپ کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا' وہ دنیا میں سب سے زیادہ جاہل ہے۔

ماریہ ارم' خان پور

پہلی بات تو یہ ہے کہ اپنی ہی جنس سے محبت کرنا ایک طرح کی بے راہ روی ہے۔ محبت کرنا چاہیے مگر اسے خانوں میں بانٹنے کی ضرورت ہے جیسے ماں باپ کی محبت' کسی سہیلی یا کسی اور کو نہیں دی جا سکتی۔ بہن بھائی کی محبت بھی بہن بھائیوں کی امانت ہے' اسے نہ کسی اور کو دیا جا سکتا ہے اور نہ کسی پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ آپ کو محبت کی ضرورت ہے تو وہ محبت اپنے والدین' بھائی' بہنوں میں تلاش کریں بلکہ تلاش کرنے کی کیا ضرورت ہے' وہ ان کو دیں۔ یہ ان کا حق ہے۔ سہیلیوں وغیرہ میں محبت کو تلاش کرنا' غیر ضروری تحفے دینا' اپنی بساط سے بڑھ کر ان کے لیے چیزیں خریدنا ایک احمقانہ حرکت ہے' اگر وہی چیزیں اپنے بہن بھائیوں کے لیے خریدیں تو بہن بھائیوں کو خوشی بھی ہوگی اور ان کی ضرورتیں بھی پوری ہوں گی' خاص طور پر ایسے میں جبکہ آپ کا تعلق کسی خوش حال گھرانے سے بھی نہیں ہے۔

یہ سب کچھ لکھنے کا لب لباب یہ ہے کہ اپنی ہی جنس سے محبت کرنا ایک طرح کی بے راہ روی ہے اور دوئم یہ کہ والدین اور بہن بھائیوں کی محبت کسی اور پر لٹانا ایک احمقانہ فعل ہے۔

صائمہ' کراچی

بچپن میں آپ کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آیا ہے یا کوئی زیادتی ہوئی ہے تو اس عمر کے کوئی اثرات وقت گزرنے کے بعد نہیں رہتے۔ اس بات کو اپنے ذہن سے نکال دیں اور بھول جائیں اب اس کو یاد کرنے اور پریشان رہنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ذیل کا ریہ بھی کہتا ہے کہ پریشان رہنا پریشانیوں کا حل نہیں ہے۔

پریشان رہنے سے انسان کا ذہن اور جسم دونوں متاثر ہوتے ہیں۔ میرے حساب سے آپ ایک نارمل لڑکی ہیں۔ ایک ماہر نفسیات کا کہنا ہے' پریشانیوں کا شاہی علاج مذہب ہے۔ آپ بھی پابندی سے نماز اور قرآن کی تلاوت شروع کر دیں انشاءاللہ ان پریشانیوں سے چھٹکارا مل جائے گا۔

ت۔ فلک' خان پور

آپ کی تحریر اس بات کی غماز ہے کہ آپ ماشاءاللہ بہت ذہین ہیں۔ آپ اپنے ذہن کو اس طرف راغب کریں کہ کس طرح لوگوں کی مدد کر سکتی ہیں' ان کے کام آ سکتی ہیں' کوئی بہت بڑا کام انجام دینا ضروری نہیں۔ کسی کو اچھی بات بتانا' کسی سے مسکرا کر ملنا بھی اسے خوشی دے سکتا ہے۔ کسی بچی یا بچے کو پڑھا کر' پڑوس میں کسی بیمار خاتون کی عیادت اور خدمت کر کے بھی ان کی مدد کی جا سکتی ہے۔ جو لوگ دوسروں کی مدد کرتے ہیں' دوسروں کو خوشی دیتے ہیں ان کے کام آتے ہیں بے غرض' بغیر کسی مطلب کے' قدرت انہیں خود بخود ایک سکون' ایک روحانی خوشی کا احساس عطا کرتی ہے۔ دنیا میں محبت بانٹنا اور محبت پانا سب سے بڑی خوشی ہے۔

☆

ا۔ک۔ گاؤں بسم اللہ پور

س: باجی! میں ایم ایس سی سیکنڈ پارٹ کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ میری عمر اکیس سال ہے۔ میرا پہلا مسئلہ یہ ہے کہ میرا قد پانچ فٹ چھ انچ ہے' جبکہ میرا وزن صرف 39kg ہے۔ میں اپنے قد کے حساب سے دبلی پتلی لگتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ کوئی ایسا حل بتائیں کہ میرا جسم بھرا بھرا ہو جائے۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میں نسوانی حسن کی کمی کا شکار ہوں اور مئی' جون تک میری شادی بھی ہونے والی ہے۔ پلیز اس کے لیے بھی کوئی آزمودہ اور آسان نسخہ بتا دیں۔ میرے مسائل کا حل فروری کے شمارے میں بتا دیں۔

ج: دبلے پن کے اسباب درج ذیل ہیں۔

1۔ نامناسب خوراک (یعنی خوراک میں انڈہ' مرغی' مچھلی' دودھ' دہی' پھل' سبزیاں مناسب مقدار میں نہ ہوں' خاص طور پر کیلا زیادہ کھائیں۔)

2۔ جسمانی مشقت کے کام زیادہ کرنا۔

3۔ فکر' غم یا تشویش۔

4۔ کم سونا۔

آپ درج ذیل مشوروں پر عمل کریں۔

رات میں کم از کم دس گھنٹے سوئیں۔

متوازن غذا استعمال کریں۔ سرکہ' چائے' قہوہ اور ترش پھل کم کھائیں' خوش رہنے کی کوشش کریں۔

اگر بھوک کم لگتی ہے تو ڈاکٹر کے مشورے سے کوئی سیرپ لیا جا سکتا ہے۔

نسوانی حسن کی کمی کے لیے روزانہ ایک چھٹانک پنج کھائیں اور ایک چمچہ کلا زیرہ' ایک چمچہ پانی میں پیس کر پیسٹ بنائیں اور دن یا رات میں سونے سے پہلے یہ پیسٹ لگالیں۔ آپ کی شکایت دور ہو جائے گی۔

آپ کا وزن قد کے لحاظ سے کم ضرور ہے' لیکن فکر مند نہ ہوں' شادی کے بعد خود بخود وزن بڑھ جائے گا۔ ویسے بھی آج کل وزن بڑھانا مسئلہ نہیں' وزن کم کرنا مسئلہ ہے۔ آپ خوش نصیب ہیں کہ اس دور میں آپ کو دبلے پن کی شکایت ہے۔

نازیہ یاسمین۔۔۔ لاہور

ج: آپ بہن ۔۔۔ کو بتائے ہوئے مشورے پر عمل کریں۔ بالوں کو ۔۔۔ دور کرنے کے لیے آپ کسی لیڈی ڈاکٹر سے مشورہ کریں۔